سچی کہانیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

ستمبر 2018

عیدالاضحیٰ مبارک

نگران اعلیٰ

معراج رسول

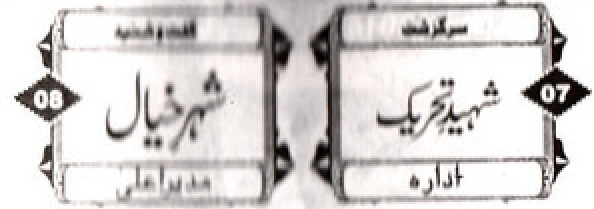
WWW.PAKIBOOKS.SITE

PakiBooks.Site

☆ یہ پراسرار بندے: اس شیرِ جواں کی روداد جس نے نئی تاریخ رقم کی

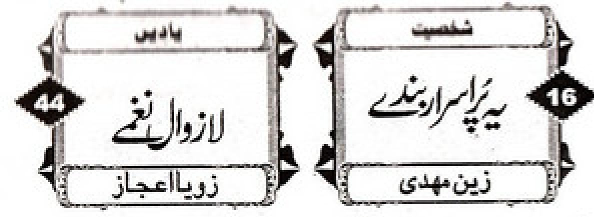
☆ پکار: وطن کی خاطر محبت قربان کر دینے والے کی رُوداد، ایک دلچسپ سچ بیانی

☆ سُپر پرفارمر: ایک معروف اداکار، ایک مشہور گلوکار اور ایک ہردل عزیز نغمہ نگار کی داستان



ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال



اس شیر جواں کا قصہ جس نے دہشت گردوں کو سبق سکھایا

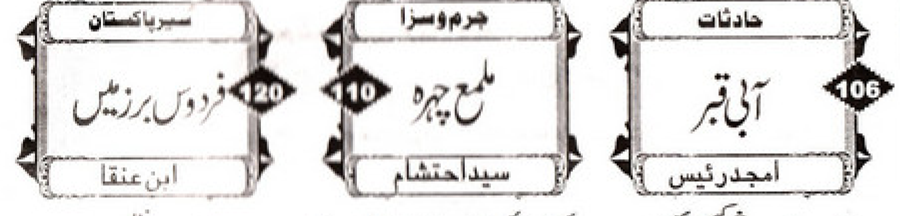
جنگِ ستمبر کے مقبول ترانوں کا ذکرِ خاص



قسمت نے کس طرح اسے عروج پر پہنچایا

عالمی ادب کی نمائندہ مصنفہ کی روداد الم ناک

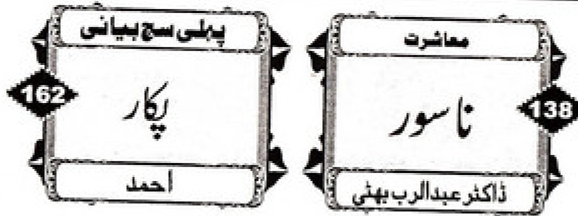
جانباز کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان



حادثے کبھی بھی رونما ہوسکتے ہیں

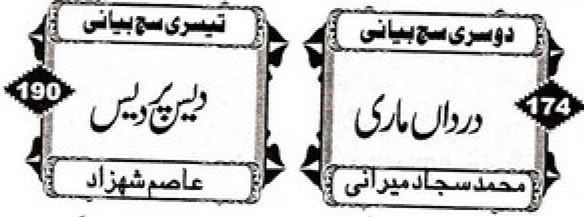
کتنا بھی چھپایا جائے جرم اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے

جنت نظیر وادیوں کی لفظی تصویر



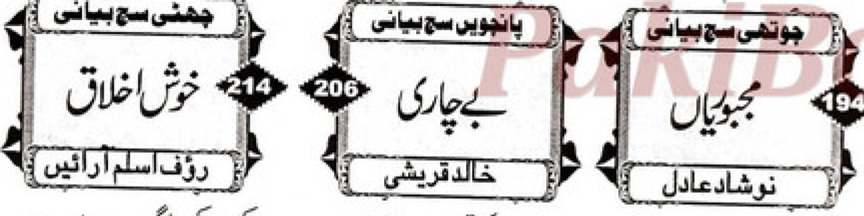
ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ، لہو گرما دینے والی داستان

وطن کی خاطر اس نے اپنے پیار کو ٹھکرا دیا



ایک بدقسمت دوشیزہ کی المناک کتھا

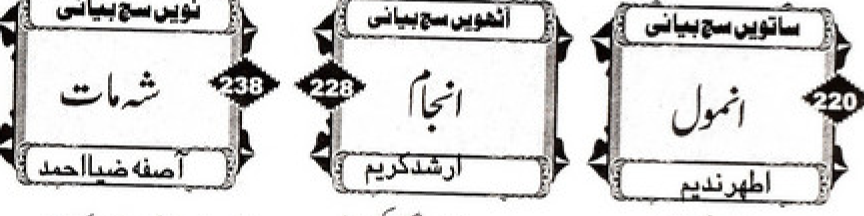
پردیس سے وہ لوٹا مگر گھر نہیں پہنچا



مجبوریاں انسان کو کس طرح جھکا دیتی ہیں

اس کی قسمت میں سکھ نام کی کوئی چیز نہ تھی

کیسے کیسے لوگ ہمارے اطراف میں رہ رہے ہیں



اس نے ماں کو اس کا مقام نہیں دیا تھا

اس نے زندگی کو کھیل سمجھ لیا تھا

انجانے میں اس نے یہ کیا کر دیا؟

PakiBooks.Site

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ❖ شمارہ 08 ❖ ستمبر 2018ء



مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر



منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789



سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269



قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِ سالانہ 900 روپے



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

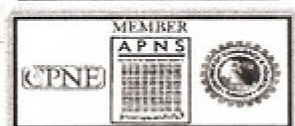
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ابھی کچھ دنوں قبل ایک چھوٹی سی کہانی پڑھی تھی۔ وہ کچھ یوں تھی۔ ’’صبح سے ٹی وی پر پروگرام چل رہا تھا، بیٹا ٹی وی کے سامنے سے ہٹنے پر تیار نہ تھا، میں نے کہا بھی ’’بیٹا اٹھ جا! تیرے پاپا آتے ہوں گے، روٹی بنانی ہے اور آٹا ختم ہے۔‘‘ بیٹے نے ریموٹ اٹھا کر کہا۔ ’’بس ممی اس پروگرام کے ختم ہوتے ہی لے آؤں گا۔ آپ بھی دیکھیں آج مدرڈے ہے، کتنے مقبول لوگ اپنی اپنی ممی کے ساتھ آرہے ہیں۔ کیسی کیسی باتیں شیئر کر رہے ہیں۔‘‘ میں نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور کچن میں آکر آٹے کے ڈبے کو دیکھا۔ دو روٹی کے لائق آٹا تھا۔ اسے نکال کر گوندھنے لگی تبھی بیٹی نے آکر کہا۔ ’’ممی آپ یوں چولہے کے سامنے آ گئیں۔ اتنا سا تو آٹا ہے۔ میں روٹی ڈال لوں گی۔‘‘ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تم تو مدرڈے کا پروگرام دیکھ رہی تھیں۔‘‘ بیٹی نے جواب دیا۔ ’’میں نے جنہیں دیکھا بھی نہیں ان ماؤں کی تعریفیں سننے کے لیے اپنی ماں کو بھلا دوں کہ چولہے کے سامنے کھڑے رہنے سے بلڈ پریشر ہائی ہوجاتا ہے۔‘‘

اس چھوٹی سی کہانی کو آئینہ بنا کر ہم نے اپنا احتساب کیا تو بہت کچھ نظر آیا۔ کیا آپ کو اس کہانی میں کچھ نظر آیا؟ کیا ہم دنیا دکھاوے کو اپنی قدریں، اپنی ذمے داریاں بھولتے نہیں جارہے ہیں؟ کبھی اپنا احتساب کرکے ضرور دیکھیں۔

معراج رسول

شہید تحریک

احمد شاہ ابدالی نے جب ہند کا رخ کیا تو اس کی فوج میں افغانی قبیلے سدوزئی سے تعلق رکھنے والے محمد بہادر خان بھی تھے۔ وہ پیشہ ور جنگجو تھے۔ ہند آنے کے بعد وہ قصبہ بارہ بستی ریاست جے پور میں مقیم ہوگئے۔ کچھ عرصہ بارہ بستی میں گزار کر وہ نواب سکندر جاہ کے عہد میں حیدرآباد دکن آگئے اور مرہٹوں کی شورشوں کو دبانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس خدمت کے عوض انہیں تقریباً 4 لاکھ کی جاگیر، دو ہزار سوار اور بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ آصفجاہی سلاطین سے اس خاندان کی وفاداری ہمیشہ غیر متزلزل رہی اور ہر دور میں ان کے اعزازات میں ترقی ہوتی گئی۔ اسی گھرانے میں 3 فروری 1905ء میں اس نے آنکھیں کھولیں۔ ابھی صرف سات روز کے تھے تو والدہ کا انتقال ہوگیا۔ نانی نے پرورش کے لیے انہیں اپنی گود میں لے لیا، چودہ سال تک وہ نانی کے زیرِ سایہ رہے۔ تعلیم و تربیت کے لیے جید علماء کی خدمات حاصل رہیں پھر انگریزی علم کے لیے شہر کے اس درس گاہ کا رخ کیا جہاں امراء نوابین کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے، ابھی اٹھارہ سال کے ہوئے تھے کہ والد کا سایہ بھی سر سے ہٹ گیا، اس وقت وہ میٹرک کی تیاری کررہے تھے مگر جاگیر کا انتظام سنبھالنا بھی ضروری تھا اس لیے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور جاگیر کے انتظام و انصرام میں وقت دینے لگے۔ 1931ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ وہ دنیاوی بکھیڑوں سے زیادہ وقت دینی کام میں صرف کرتے۔ اپنے اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ تبلیغ دین کھل کر کرتے۔ ان کی کوششوں سے تقریباً بیس ہزار افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دینی کاموں میں لگے رہنے کی وجہ سے مال گزاری پر اثر پڑنے لگا تو انہوں نے کچھ تنخواہ دار لوگوں کو رکھ لیا جو تبلیغ دین کرتے۔ ان سے خط و کتابت کے ذریعے رابطے میں رہتے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کا یہ علاقہ جو متحدہ ہند کی سب سے بڑی مسلم ریاست تھی ایک الگ ملک کی حیثیت لے لے اور یہاں شرعی قوانین نافذ ہوں۔ ہر کام شریعت کے مطابق ہو، اسی خواہش پر انہوں نے مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد رکھی تھی، ابھی وہ شریعت کے نفاذ کی خاطر اتحاد المسلمین کو پھیلا ہی رہے تھے کہ انہیں 1930ء میں یونین آف جاگیردار کا سیکریٹری منتخب کرلیا گیا۔ یہ یونین خاصی قوت رکھتی تھی کیونکہ بنگال سے خیبر تک پورے برصغیر کے جاگیرداروں نے اپنی اہمیت اور قوت دکھانے کے لیے یہ یونین بنائی تھی۔ اس یونین کا قیام 1892ء میں ہوا تھا اور یہ یونین ہر مذہب و ملت کی مشترکہ تھی تمام ارکان انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے ان جیسا خود کو ظاہر کرتے یعنی مذہبی بغض سے خود کو مبرا کیے تبلیغ دین کے کاموں میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن یہ پورپور تبلیغ اسلام کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے تھے ان کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ برصغیر میں مسلمانوں کی الگ حکومت الگ پہچان ہو اور تمام مسلمان اپنے تقویٰ کی وجہ سے پہچانے جائیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے جب اپنے مطالبات میں اس بات کو بھی شامل کیا کہ مسلمانوں کو ان کا الگ حصہ چاہیے۔ ایک الگ ملک تو انہوں نے بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کے قریبی دوستوں میں دو اہم نام تھے، ایک علامہ اقبال اور دوسرا قائداعظم۔ ان دونوں کی وجہ اور مسلم لیگ کا یہ مطالبہ کہ ہمارا الگ ملک ہو۔ انہی باتوں نے انہیں مسلم لیگ سے قریب کردیا تھا۔ جب کہ ابتداء میں ان کا جھکاؤ خاکسار تحریک کی جانب تھا۔ علامہ مشرقی بھی ان کے قریبی دوستوں میں تھے۔ ابتداء میں انہوں نے خاکسار تحریک کے کئی جلسوں میں تقریر بھی کی تھی۔ ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ جب وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو سامعین ساکت ہوجاتے۔ خواہ یہ تقریر گھنٹے بھر کی ہو یا کئی گھنٹے پر محیط۔ سامع اکتاتے نہیں تھے بلکہ جوش میں آجاتے تھے۔ ان کی اسی خوبی کی وجہ سے قائداعظم ان کو فوقیت دیتے تھے اور دشمن خوفزدہ رہتے تھے۔ ایسا شعلہ بیان مسلم لیگ میں اور کوئی نہ تھا، ان کی تقاریر کی وجہ سے وہ علاقہ بھی جہاں کے مسلمان پاکستان کے حق میں نہ تھے قیام پاکستان کی تحریک میں شامل ہوتے چلے گئے۔ 25 جون 1944ء کے دن جب ان کی عمر 39 سال کی تھی۔ وہ حزب اختلاف کے اراکین سے ملاقات کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہاں اس دور کے رواج کے مطابق حقہ پینے کے لیے دیا گیا۔ حقہ پینے کے گھنٹے بھر بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ شک یہی ہے کہ حقہ کی ’’نے‘‘ زہریلی تھی۔ تحریک پاکستان میں حصہ لینے کے جرم میں ان کی جاگیر تو پہلے ہی ضبط ہوچکی تھی اب جان بھی اسی تحریک کی وجہ سے چلی گئی۔ تحریک پاکستان کے ہراول دستے میں شامل اس اہم شخصیت کو ہم نواب بہادر یار جنگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ

☆ رضا احمد اعوان نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے۔ ''سب کو یوم آزادی مبارک ہو۔ سب سے پہلے ''وردی، وعدہ اور وفا'' پڑھی۔ زویا اعجاز نے کرنل شیر خان کے حالات سے آگاہ کرکے ہم پر احسان کیا۔ یہ ملک پاک آرمی کی وجہ سے قائم ودائم ہے اور رہے گا کیونکہ آرمی سرحدوں پر جاگتی ہے تو ہم آرام سے سوتے ہیں ورنہ دشمن تو ہر پل تاک میں ہے۔ ہمیں اپنی پاک آرمی پر فخر ہے کیونکہ وہ اپنا آج ہمارے کل کے لیے قربان کرتے اور قربانی دیتے آئے ہیں۔ قلم نگری سے اس بار انور فرہاد عظیم موسیقار ناشاد کو لے کر آئے اور ہمیں نوشاد اور ناشاد کا فرق سمجھایا ورنہ ہم تو ہمیشہ کنفیوژن کا شکار رہے کہ نوشاد اور ناشاد شاید ایک ہی شخصیت کا نام ہے۔ بے شک ناشاد مرحوم کی پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے بہت زیادہ خدمات ہیں اور پھر ان کے بیٹے اور پوتے کی خدمات کو بھی کسی صورت بھلایا نہیں جاسکتا۔ موسیقار خواجہ خورشید انور کے بارے میں لکھیں۔ ہمیں ان کے حالات جاننے کا شدت سے انتظار اس لیے بھی ہے کہ ان کا تعلق ہمارے سابقہ ضلع میانوالی سے ہے۔ اسی طرح گلوکار مجیب عالم بھی ہمارے ضلع بھکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے متعلق بھی تفصیلاً لکھیے گا۔ یہ پڑھ کر بھی ہماری معلومات میں اضافہ ہوا کہ مشہور و معروف ٹی وی اینکر بشیر لقمان فلم ساز و ہدایت کار لقمان (مرحوم) کے بیٹے اور کامران شاہد اداکار شاہد کے بیٹے ہیں۔ فلم اسکرپٹ رائٹر اور معروف مصنف، افسانہ نگار، فلم ''دھرتی کے لعل'' ممتاز شرافت کے خالق اور قلم کار، کرشن چندر کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ انور فرہاد صاحب! سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کی یہ تجویز کہ اداکارہ روحی بانو پر بھی کچھ لکھیں، میں بھی اس تجویز کی بھرپور تائید کرتا ہوں۔ وہ پہلے پی ٹی وی کی مقبول اداکارہ رہیں۔ فلم انڈسٹری میں آئیں تو سپرہٹ اداکارہ کہلائیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے مختلف مسائل کا شکار ہوگئیں۔ ازدواجی زندگی ناکامی سے دوچار ہوئی۔ معاشی بدحالی میں مبتلا ہوئی۔ رشتہ دار ساتھ چھوڑ گئے۔ ایک ہی بیٹا علی رضا تھا جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر قتل ہوگیا تو روحی بانو کی دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ ہر صدمے کے بعد نیا صدمہ اور ہر غم کے بعد نیا غم جھیلتے جھیلتے ذہنی مریضہ بن گئی بالآخر انتہائی بری حالت میں انہیں فاؤنٹین ہاؤس میں داخل کروا دیا گیا۔ بعد میں کیا ہوا؟ اس سے انور فرہاد صاحب ہی تفصیل سے قارئین کو آگاہ کرسکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنی کامیاب خوب صورت اداکارہ، ایم اے نفسیات، تعلیم یافتہ روحی بانو کی کسمپرسی کی اس حالت نے ہر حساس، ہمدرد، انسان کو رلا کر رکھ دیا۔ ''بیت بازی'' کی جگہ موضوعاتی اشعار کا سلسلہ شروع کریں اس طرح پہلے انعام پر ایک سال، دوسرے انعام پر چھ ماہ اور تیسرے انعام پر چار ماہ کے لیے ماہنامہ سرگزشت جاری کریں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے لیکن ندیم اقبال صاحب نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ یہ شہباز صاحب وہی تو نہیں جو امریکا میں قتل ہوگئے تھے؟ (ندیم اقبال نے بتایا تو تھا کہ یہ ان کے چھوٹے بھائی ہیں) عقیل عباس جعفری کی تحریر ''پہلا سیاسی لوٹا'' معلوماتی اور دلچسپ تھی۔ طارق عزیز خان کی مزاحیہ تحریر ''مشعن خالو'' پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنا وہ غم بھول گیا جو کسی کی بے وفائی کی بھولی بسری یاد دل پر بوجھ بن گئی تھی۔ نسرین منصور صاحبہ کی کہانی ''قربانی'' ہر لحاظ سے بہترین ثابت ہوئی۔ علامہ رشید ترابی کے متعلق سید محمد قاسم کا اقتباس معلوماتی تھا۔ اس بار ''بیت بازی'' میں ساجدہ پروین ڈوگر کمالیہ، آفتاب احمد عطاری سرگودھا، محمد ظفر اللہ ضیاء کمالیہ اور نازنین مجید اسلام آباد کے اشعار معیاری تھے۔ بھکر سے ڈاکٹر روبینہ انصاری صاحبہ، آپ کی مصروفیت اپنی جگہ لیکن آپ کی کمی شہرِ خیال میں شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں کساوزہرا ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آئندہ باقاعدگی سے حاضری لگوایا کیجیے گا۔ سید امتیاز حسین بخاری آپ کی تحریریں بہت پسندیدہ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ رانا محمد شاہد آپ کے والد صاحب کی وفات کا سن کر بے حد دکھ پہنچا۔ کہتے ہیں کہ باپ فوت ہو تو آدھا اور ماں چلی جائے تو انسان پورا یتیم ہو جاتا ہے۔ میں آپ کا دکھ سمجھتا ہوں کہ ماضی قریب میں، میں بھی ایسے کرب سے گزر چکا ہوں۔ میرے ابو بھی 2005ء اور امی 2014ء میں وفات پاگئیں تھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ والدین کے بچھڑنے کا دکھ کیا ہوتا ہے؟ امی، ابو کے جانے کے بعد سارے رشتے ساتھ چھوڑ گئے تو بھری دنیا میں تنہا رہ گیا اور ایسے محسوس ہوا کہ گھنی چھاؤں میں بیٹھا تھا کہ اچانک کڑی دھوپ میں آگیا ہوں۔ اللہ آپ کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے۔ (سرگزشت کا اسٹاف اور قارئین آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔) سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سحار، نور پور تھل اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے تبصرے جامع اور جاندار تھے۔''

☆ پروفیسر کیواے قاسمی نے نور پور تھل سے لکھا ہے۔ ''سب سے پہلے ''باپ، بیٹا اور پوتا'' کو پڑھنے کے لیے منتخب کیا۔ انور فرہاد نے تین نسلوں پر محیط موسیقی کے گھرانے کا بھرپور احاطہ کیا۔ ناشاد صاحب خود تو بہت کہنہ مشق موسیقار تھے، آنے والی نسل میں بھی فن کی محبت تھی لیکن جو شہرت، مقام اور مرتبہ ناشاد کو ملا وہ ان کے بیٹے اور پوتے کو نصیب نہ ہوا بالخصوص نوید کو، اس کی وجہ شاید پاکستان کی دگرگوں فلم انڈسٹری ہے۔ آپ بیتیوں میں ''قربانی'' ایک اچھی تحریر تھی۔ قیامِ پاکستان کے پس منظر میں احساس، محبت، خلوص اور وفا کے جذبات سے بھری کہانی کا اختتام بہت الیہ رہا۔ گمی ماموں اپنی ذات میں غم، دکھ اور قربانی کا ایک سمندر چھپائے ہوئے تھے۔ ''قاتل ڈور'' کا انجام بھی بہت بھیانک اور تکلیف دہ تھا۔ کہانی کے آخر تک سسپنس برقرار رہا۔ مصنف کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ بسنت کے تہوار پر پاکستان بھر میں ایسے واقعات دن بدن بڑھتے جارہے ہیں اور یہ ہمارے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ''مشعن خالو'' ہلکی پھلکی اور مزاح سے بھرپور ایک اچھی تحریر تھی۔ ''صبر کا پھل'' بھی حقائق پر مبنی تحریر تھی، اگر انسان صبر اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرے تو کامیابی یقینی ہے۔ ''انتظار'' خاطر خواہ تاثر چھوڑنے میں ناکام رہی۔ ایک عام سے موضوع کو الفاظ کا لبادہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ شمارہ کی آخری کہانی ''کھڑکی خوابوں کی'' ایک فکر انگیز تحریر تھی۔ جوانی اور خود فریبی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نادیہ کی اڑان بہت اونچی تھی تاہم حالات کی سنگینی اور تلخی نے جب حقیقت کا روپ دھارا تو سب کچھ ایک پچھتاوا ثابت ہوا۔ سجاول بظاہر پینڈو اور سیدھا سادا انسان ہوتے ہوئے بھی انسانیت کے اونچے مرتبے پر براجمان ہوا۔ اقتباسات میں محترم ندیم احسن صدیقی کی تحریر ''بلوچ کا مفہوم'' اور پنجاب کے جٹ معلوماتی تحریر تھی بہت پسند آئی۔ حاجی اعجاز حسین سحار ایک بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے ان کا تبصرہ تمام تبصروں پر اس لیے بھاری ہوتا ہے کہ وہ ہر کہانی کی جزئیات میں جاکر لکھتے ہیں۔ قیصر خان کا تبصرہ بھی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پسند آیا۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

☆ قیصر خان کا بھکر سے تبصرہ۔ ''انکل کی کہانی پاکستانی جمہوریت کی مثال ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں سلمیٰ کا بلما بہت بڑے مصنف کرشن چندر کے بارے میں تھا۔ اللہ تعالیٰ بڑے لوگوں پر آزمائش بھی بڑی رکھتا ہے۔ مسلمان کو جلوہ دیا ایک بڑے ادیب کے ساتھ آخری امتحان بھی بڑا تھا۔ ''شہرِ خیال'' میں کرسی صدارت پر نئے ابھرتے ہوئے ہر ادیب دلعزیز شخصیت نزاہت افشاں تھے بہت مبارکاں بھرپور تبصرہ لکھا ہے۔ اس دفعہ تو معلومات ہی معلومات تھیں۔ بہت سے تبصرے اچھے خیالات سے آراستہ تھے۔ نئے لوگوں کو خوش آمدید۔ انکل ندیم اقبال نے سب دوستوں کو یاد کیا آپ کو بھی نہیں بھول سکتے کہ آپ کی وجہ سے سفرنامہ پڑھنے کو ملا۔ اس بار تو ہماری آپا جان ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری حاضر تھیں۔ آپا جان مصروفیات سے وقت نکال لیا کریں، غیر حاضر دوستوں میں ڈاکٹر قرۃ العین، محمد عامر ساحل، علی صاحب اور جن کے نام یاد نہیں آرہے حاضر ہوں۔ بہن سدرہ بانو سے ہم بھی اپیل کرتے ہیں غصہ چھوڑ دیں۔ قومی ہیروز کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہم سب پر فرض ہے۔ بہت خوب صورتی سے کیپٹن کرنل شیر خان شہید کی زندگی بیان کی ہے۔ ان ہیروز پر لکھنے سے ہمیں آگاہی ملتی ہے کہ کتنی مشکل اور قربانیوں سے وطنِ عزیز زندہ ہے اور آج سوشل میڈیا پر فوج پر تنقید ہورہی ہے (جی ہاں، یہ غداری کہلائے گی۔ فوج ہماری محافظ ہے) پہلا سیاسی لوٹا ہمارے نصیب ہمارے ڈویژن کو ملا، سرگودھا کا تھا وہ، سید امتیاز حسین بخاری کو پتا ہوگا ان کے ضلع کے تھے۔ یہ سیاست اور ملک کے واسطے نقصان دہ ہیں۔ بکاؤ مال ہیں۔ انکل فرہاد اس بار بہت بڑے موسیقار کے بارے میں مضمون لائے، (آمین)۔ بہت اعلیٰ موسیقار تھے اور ان کے پوتے کو اللہ ترقی دے، آمین۔ اس بار سفرنامہ ہمیشہ کی طرح بہت اعلیٰ تھا لیکن ہمارا بار بار انکل کو نسرین کے حوالے سے تنگ کرنا پسند نہیں آیا اور انہوں نے وضاحت کردی کہ ان کا رشتہ انسانیت کا ہے جو کہ سب سے بڑا رشتہ ہے۔ محمد ایاز راہی نے بہت خشک مضمون پیش کیا۔ سید احتشام صاحب نے کہا کہ جرم کبھی نہیں چھپ سکتا۔ سلمیٰ اعوان

قارئین سے التماس

اخبارات اور رسائل کے لیے اس سال کے آغاز سے ہی مالی مشکلات شروع ہو چکی تھیں۔ لاگت میں عمومی اضافے کے ساتھ نیوز پرنٹ کی گرانی نے مستحکم اشاعتی اداروں کو بھی ہلا کر رکھ دیا اور یہ بحران تاحال جاری ہے۔ ان حالات میں ہمارے ادارے کے لیے تین راستے رہ جاتے ہیں: (1) قیمت میں ناگزیر اضافہ۔ (2) صفحات میں کمی۔ (3) آسیبی بحران میں اشاعت معطل کرکے بہتر وقت کا انتظار۔

ادارے اور معزز قارئین کا تعلق بہت گہرا اور بنیادی ہے۔ قارئین کی سرپرستی نے ہی ہمارے رسائل کو موجودہ مقام عطا کیا ہے۔ ہم آپ کی مشاورت سے ہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان تین میں سے کس راہ کا انتخاب ہمارے اور پڑھنے والوں کے لیے سود مند رہے گا۔ ہمیں آپ کی مخلصانہ آراء کا انتظار رہے گا۔

(ادارہ)

PakiBooks.Site

نے اس بار فلسطین کے ایک غیور شاعر کے بارے میں بہت خوب لکھا۔ پُراسرار مخلوق کے بارے میں بس اتنا کہوں گا کہ اس دور میں ایسی مخلوق ہو سکتی ہے۔ ''ناسور'' میں تحرّل سسپنس وغیرہ جاری ہے۔ پہلی سچ بیانی دل کو لگی۔ واقعی پاکستان بہت قربانیوں سے بنا ہے اللہ تعالیٰ کے نام پر بنا ہے انشاء اللہ ہمیشہ قائم دائم رہے گا۔ اس میں خون کے ساتھ احساس کی، جذبوں کی قربانی بھی شامل ہے۔ باقی کہانیاں بھی پسند آئیں۔ بس ایک عرض کرنی ہے انور فرہاد انکل سے کہ مضمون میں صرف فلمی اداکار یا اداکارہ پر مضمون لکھیں تاکہ زیادہ دلچسپی سے پڑھا جائے۔''

☆ بشریٰ افضل کا خلوص نامہ بہاولپور سے۔ ''تمام اہلِ شہرِ خیال کو میری طرف سے سلام۔ نزاہت افشاں کو کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ ان کا تبصرہ بہت خوب صورت تھا۔ ان کے علم کے خزانے میں جو معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ میں محترم بھائی آفتاب احمد کی تجویز سے اتفاق کرتی ہوں۔ خدا ہماری سرزمین کی حفاظت فرمائے، (آمین)۔ نزاہت افشاں ہمیں ہماری محفل میں یاد کرنے کا شکریہ میں آپ کی مشکور ہوں۔ سدرہ بانو ناگوری کو غصے میں پایا۔ بہنا غصہ تھوک دو۔ رانا محمد شاہد آپ کے والد کی رحلت کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے، (آمین)۔ ماں باپ جیسا سایہ دنیا میں نہیں مل سکتا اور دیکھیں کتنے مبارک مہینے میں ان کو موت نصیب ہوئی۔ بس ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس آپ کیسی ہیں؟ اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ نزاہت بھائی آپ نے یاد کیا میں حاضر ہوگئی۔ اعجاز احمد سحار آپ کی خوش نصیبی ہے کہ حضرت بلالؓ کی قبر پر حاضری دی۔ آفتاب احمد نصیر آپ مابدولت کو کیسے بھول گئے۔ یاد کرنے کا شکریہ۔ اہلیانِ محفل نے میری کمی شدت سے محسوس کی ہوگی۔ میں نے بھی سب کو مِس کیا۔ معروفیت کی وجہ سے غیر حاضری زیادہ ہی... ہوگئی۔ باقی میگزین اتنا ہی پڑھ سکی اور معروفیت میں سے یہ مشکل ٹائم نکال کر اتنا لکھ پائی ہوں ''صبر کا پھل'' آصفہ آپ نے اتنی فرمانبرداری سے زندگی گزاری اور اللہ تو صبر کا پھل دیتا ہے۔ ''قاتل ڈور'' چاند نے وعدہ خلافی کی تھی قدرت کی طرف سے یہ اس کی سزا تھی۔''

☆ اریج فاطمہ ضلع جھنگ سے رقمطراز ہیں۔ ''آپ سب کو میری طرف سے جشن آزادی مبارک ہو۔ اگست ہی میں عید آرہی ہے اس لیے عید مبارک۔ میں سرگزشت، پاکیزہ پڑھتی ہوں۔ ان میں اکثر اوقات آپ بیتیاں لکھی ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس معاشرے میں بسنے والے ہر انسان کی اپنی ایک الگ داستانِ حیات ہوتی ہے۔ اس بار جولائی کے اس شمارے میں موجود یہ سچ بیانیاں مجھے بے حد پسند آئیں۔ میں آپ کو خط اس لیے لکھ رہی ہوں کیونکہ میں نے اپنے لیے اور اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک پیغام تحریر کیا ہے جو مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اپنا یہ لکھا ہوا کہاں ارسال کروں کہ میری آواز میرے ہم وطنوں تک پہنچ جائے اور وہ اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی ڈوبتی ہوئی اس نیا کو بچالیں۔ میرے خیال میں، میں اپنے الفاظ صحیح جگہ پر ارسال کر رہی ہوں، اس امید کے ساتھ کہ انہیں تبصرے کے سرگزشت میں جگہ دی جائے گی اور دوسروں تک میرا یہ پیغام با آسانی پہنچ جائے گا۔ (ارسال کردہ تحریر سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے اس لیے معذرت خواہ ہوں اسے کسی اخبار میں بھیج دیں) میں اگلے چند ماہ کے بعد کوشش کر کے دو تین سچی کہانیاں ارسال کروں گی۔ آخر میں اللہ تعالیٰ اس ادارے کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائیں۔ (آمین)۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری کا تحفہ سرگودھا سے۔ ''آپ نے اپنے فکر انگیز اداریہ میں لکھا ہے مشترکہ آواز آئی کہ وہ تاحیات صدر رہیں گے۔ یہی کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس بار بھی بہت سے چہرے پرانے ہیں جنہیں پاکستان کا مفاد عزیز نہیں ہوگا اپنا مفاد عزیز ہوگا۔ عوام بے چاری ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہوتی رہے گی۔ قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ محمد اقبال نے پاکستان بنایا تھا کہ ہر قوم ہر مذہب کو آزادی ہوگی مگر یہاں تو الٹا نظام ہے، دہشت گردی، ڈاکازنی، چوری، قتل و غارت گری، رشوت خوری، سودخوری، الزام تراشی عام ہے۔ عدلیہ اور مسلح افواج پر الزامات لگائے جا رہے ہیں، بدنام کیا جارہا ہے۔ عوام کو گدھا کہا جا رہا ہے ہر امیدوار دوسرے امیدوار کو اپنے سے اچھا نہیں سمجھ رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو بے لوث اور مخلص قیادت عطا فرمائے، (آمین)۔ یکے از صفی سلمیٰ کا بلما عظیم ادیب کرشن چندر کے بارے میں بھرپور معلومات لیے ہوئے تھا جو اردو افسانہ اور ناول کا معتبر نام ہے۔ افسوس کہ مسلمان ہو کر بھی چتا کی آگ میں جلا اور مسلمان پکھو نہ کر سکے۔ شہرِ خیال میں داخل ہوا تو محترم نزاہت افشاں مہورہ مسندِ صدارت پر رونق افروز تھے۔ متاثر کن اور معلوماتی علمی و تحقیقی تبصرہ تھا اور انمول خزانہ تھا۔ موصوف نے لکھا تھا کہ سید امتیاز حسین بخاری سے شکایت ہے کہ وہ پہلے کی طرح بھرپور علمی تبصرہ کیوں نہیں لکھتے وہ تو عرض ہے کہ میں کوئی عالم فاضل شخصیت نہیں ہوں۔ قلم برداشتہ لکھتا ہوں اور مطالعہ عمیق نظر غور و فکر کے ساتھ کرتا ہوں اور میرے سامنے صرف سرگزشت کے مضامین اور کہانیاں ہوتی ہیں میں ان ہی پر تبصرہ کرتا ہوں۔ میں اُدھر اُدھر سے نہیں لکھتا طوالت کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی نے قیمتی آرا اور مشوروں سے نوازا ہے اس پر عمل کیجیے گا بہت ہی بے پایاں خوشی ہوئی کہ ندیم اقبال بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے اور معلومات کا خزانہ تقسیم کر رہے تھے۔ اب امریکا اور کینیڈا میں شہرت اور مقبولیت کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ اعجاز حسین سحار خوب سے خوب تر لکھتے ہیں مگر مجھے کبھی بھولے سے بھی یاد کیا ہو۔ رانا محمد شاہد بورے والا کے عظیم والد ماجد کی حادثاتی اور ناگہانی موت کا پا خط پڑھتے وقت چلا۔ نہایت رنج و غم ہوا۔ میں ان سے اظہارِ تعزیت کرتا ہوں۔ ان کی طرح میری عید بھی اس بار سوگوار گزری ہے۔ میرے ماموں جان سید زوار حسین نقوی 29 رمضان المبارک 14 جون کی شب چلتے پھرتے نمازیں پڑھتے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ موت برحق ہے موت کا ایک دن متعین ہے جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا۔ شاہ ولایت،

ضیاء تسنیم بلگرامی کی ایک معلوماتی اور خوب صورت تحریر تھی۔ اولیاء اللہ کی کرامتیں برحق ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ترین بندے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جب دعا کرتے ہیں، اللہ ان کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا پر صابر و شاکر رہتے ہیں۔ جو اللہ چاہتا ہے یہ وہی چاہتے ہیں اور حکم میں پہل نہیں کرتے یہی حقیقی اولیاء اللہ بزرگ بندے ہوتے ہیں جو مخلوقِ خدا کو فیض پہنچاتے ہیں اور مرجعِ خلائق ہوتے ہیں ان کا احترام و عزت واجب ہے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی نسلِ مبارک میں بہت سے اولیاء اللہ گزرے ہیں اور امیر المومنین حضرت امام علی سلطان اولیاء ہیں عشق را سرمایۂ ایمان علیؓ۔ زویا اعجاز کا حب الوطنی پر مبنی مضمون وردی وعدہ وفا نے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ بقول سیف الدین سیف، اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا۔ تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں۔ ہمیں اپنے دلیر جانبازوں پر فخر کرنا چاہیے اور وطن دشمنوں کو کسی قیمت پر معافی نہیں، بہادری و شجاعت وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کرے، عقیل عباس جعفری کا تحقیقی مضمون ''پہلا سیاسی لوٹا'' معلومات سے بھرپور تھا۔ انور فرہاد صاحب کا قلم نگری میں ''باپ بیٹا پوتا'' ایک بھرپور جامع اور تفصیلی تحقیقی مضمون تھا واقعی انور فرہاد نے لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ اتنا طویل ترین مضمون محنتِ شاقہ اور عرق ریزی سے لکھا گیا۔ عظیم موسیقار خواجہ خورشید انور کی طرح شوکت علی ناشاد بھی منفرد موسیقار اعظم تھے اور موسیقار اعظم نوشاد کے حقیقی جانشین تھے۔ واجد علی ناشاد بھی منفرد موسیقار تھے۔ نوید علی ناشاد کا سفر جاری و ساری ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ ان کے کمپوز کیے ہوئے نغمے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ میں سنتا رہتا ہوں مسرور ہوتا رہتا ہوں۔ ندیم اقبال کی نئی قسط نے اس بار بھی ایسا لطف دیا ہے کہ پڑھ کر میں پُرسکون ہو گیا اور دل کو قرار آگیا۔ ذہن نئی نئی معلومات سے لبریز ہو گیا۔ ماسیرہ سے محمد ایاز راہی صاحب طویل ترین عرصہ کے بعد ''تذکرہ گنگا جمنی تہذیب'' لے کر رونقِ سرگزشت ہوئے ہیں۔ جو متاثر کن اور معلومات افزا تھی۔ شہرِ خیال میں ان کی غیر حاضری سمجھ میں نہیں آتی۔ سلمیٰ اعوان کی شاعر درد اور محمد یاسر اعوان کی ''ایجاد کی ماں'' نے حیرت انگیز طور پر متاثر کیا ہے۔ کہانیوں میں سب سے اوّل نمبر کہانی ''قربانی'' ہے جسے نسرین منصور نے قلم بند کیا ہے، پسند آئی۔ تاوان جسے محمد لطیف نے سپردِ قلم کیا تھا خوشی و غم اشک و آہ کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ ''بدمعاش'' آصف علی کی عبرت ناک کہانی تھی جو قابلِ مطالعہ ہے باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرا مرسلہ اور خط شاملِ اشاعت کیا ہے۔''

☆ محمد ظفر اللہ ضیاء کا اظہاریہ کمالیہ سے۔ ''ماہنامہ سرگزشت کا شمارہ زیرِ مطالعہ رہتا ہے مگر خط لکھنے کا موقع کبھی نہ مل سکا۔ اس میں شائع ہونے والی کہانیاں اردو ادب کا عمدہ شاہکار ہوتی ہیں۔ ''بیت بازی'' اچھا سلسلہ ہے۔ بیت بازی میں معیاری اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ مقابلہ بیت بازی میں تین بہترین اشعار ارسال کرنے والے قارئین کی حوصلہ افزائی انعام دے کر کی جائے، اس طرح یہ سلسلہ اور بھی اچھا ہو جائے گا۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تجزیہ کراچی سے۔ ''اس سال یومِ آزادی والے دن قوم کو باور کرا دیا گیا ہے کہ تبدیلی آگئی ہے اور ہم نے نئے پاکستان کے خواب [illegible] میں سجا لیے ہیں۔ کرکٹ کے کپتان کو ریاست کی سربراہی ملی ہے۔ طویل اور انتھک محنت کا صلہ قدرت کے پاس امانت ہوتا ہے جو مل کر رہتا ہے۔ ہرچند کہ انصرامِ حکومت اور امورِ سربراہی کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں لیکن توانا مثبت سوچ اور عزمِ صمیم کا پھل بہت لذیذ ہوتا ہے۔ بے خوف نڈر اور بے باک وزیراعظم قوم کا نبض شناس ثابت ہوا تو وہی قوم کے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔ خدا سے دعا ہے کہ بحیثیت پاکستانی ہمیں اس قابل کر دے کہ ہم اپنی حالت بدلنے کے لیے صرف نئے قائد پر ہی تکیہ نہ کریں خود بھی اپنے اپنے حصے کا فرض ادا کریں فرائض ادا کیے بغیر حقوق کی طلب نفسانی خواہش کے سوا کچھ نہیں۔ اگست کا شمارہ خوب صورت سرورق کے ساتھ بہت بھلا لگا۔ چیف صاحب آپ کی گفتگو کاٹ دار تھی اور موجودہ حالات پر برمحل اور بروقت بھی۔ سلمیٰ کا بلما کرشن چندر سلمیٰ صدیقی سے شادی کے بعد مسلمان ہو گیا تھا پھر بھی اس کے ہندو بیٹے نے اس کی چتا جلوا دی۔ بیٹے کی نفرت سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کرشن چندر نے اپنا مسلمان ہونا زیادہ نمایاں نہ کیا ہو۔ ''شہرِ خیال'' میں نزاہت افشاں کے ایک نمبر تبصرے پر دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ حنیف ادیب کے شعر پر شاعر کا نام بتا کر اس کے کلام کا انتخاب کر کے بھیجنے کو کہا جائے۔ ہارون ملک کو پہلی آمد پر سلام۔ سدرہ بانو ناگوری اور اعجاز حسین سحار خوش قسمت ہیں کہ چیف صاحب ان کے تبصروں کا انتظار کرتے ہیں اس شرف پر مبارک باد۔ ہماری تجاویز نوٹ کرنے کا شکریہ۔ رانا محمد شاہد صاحب کو خدا صبر دے۔ انجم فاروق ساحلی کی معذرت کچھ کمزور ہے لیکن شہرِ خیال کے ساتھی معذرت قبول کرتے ہیں آپ بھی درگزر فرمائیں۔ ڈاکٹر روبینہ انصاری کی نجی مصروفیات ہم سب سے دوری کا سبب ہیں پھر بھی ہماری خواہش ہے کہ وقت نکال لیا کریں۔ شاہ ولایت انتہائی شاندار تھی لیکن شجرۂ نسب کی تفصیل نہ تھی۔ برادرانِ یوسف ہمیشہ کسی کے بلند مرتبہ و مقام کی وجہ بنے ہیں۔ یہ سب مشیتِ خداوندی کا حصہ ہے۔ وردی وعدہ اور وفا تسلسل ہے زویا اعجاز کی محنت کا۔ کرنل شیر خان کو جنم دینے والوں کو بھی سلام عقیدت۔ ڈاکٹر شیخ محمد عالم کو پون صدی بعد سیاسی لوٹا قرار دے کر عقیل عباس جعفری نے عجیب کام کیا ہے۔ یہ پڑھ کر تو اور بھی حیرت ہوئی کہ اس وقت بھی لوٹا کریسی کی اصطلاح موجود تھی (پہلی بار یہ لقب گھڑا گیا تھا) باپ بیٹا پوتا موسیقار ناشاد کی نجی روداد اچھی لگی۔ ندیم اقبال صاحب دیارِ غیر میں ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کے لیے جتن کرتے نظر آئے۔ محمد ایاز راہی ہمیشہ کی طرح مشکل کا سبب بنے گنگا جمنی تہذیب سمجھنے سے زیادہ ان کی تحریر سمجھنا مشکل ہے۔ تعاون بھی قاتل کی طرح ہی لگی۔ سلمیٰ اعوان کا شاعر درد سب سے شاندار تھا۔ ایجاد کی

PakiBooks.site

ماں اور پراسرار مخلوق بھی اچھی تھیں سچ بیانیاں ابھی پڑھ رہے ہیں۔''

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا مختصر نامہ بھکر سے۔ ''اگست کا شمارہ ہم تک آج پہنچا ہے۔ بھکر آنے میں اتنا لیٹ۔ پلیز پلیز بھکر ذرا جلد پہنچا دیا کریں (اس سلسلے میں آپ اپنے ہاں کے بک اسٹال والوں کے کان کھینچیں۔ یہ ان کی کوتاہی ہے ورنہ پچیس تاریخ تک پورے پاکستان میں پرچہ تقسیم ہو جاتا ہے) ابھی ایک بھی تحریر پڑھی نہیں ہے۔ صرف شرکت کو یقینی بنانے کے لیے یہ ''پرزہ'' ارسال خدمت ہے۔ اشعار ہمیشہ کی طرح اعلیٰ تھے۔ جن احباب نے یاد رکھا ان کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔''

☆ کسا زہرا کا ای میل۔ ''میری جانب سے تمام قارئین مع اعجاز حسین سٹھار، سدرہ بانو ناگوری، نزاہت افشاں، عبدالجبار رومی انصاری، ندیم اقبال شکا گو، آفتاب احمد نصیر اشرفی، سید امتیاز حسین بخاری کو سلام جن سے شہر خیال میں رونق ہے۔ میں خاموش قاری ہوں لیکن گزشتہ ماہ جب میں نے یوں ہی ایک ای میل بھیج دی اور ادارہ نے عزت دے کر شہر خیال میں لگا دیا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ سنجیدگی سے شہر خیال میں حصہ لیا جائے۔ سرگزشت سے میرا ناتا 2010ء سے ہے جب میں انٹر میں تھی۔ ایک بار میں نے امی کا رسالہ چپکے سے اٹھا لیا کہ اس میں ایسا کیا ہے کہ امی اس میں منہ چھپائے رہتی ہیں پھر جب پڑھنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ یہ تو معلومات کا خزانہ ہے اور زندگی کی تلخ حقائق سے بھرا ہے۔ تب میری دلچسپی مزید بڑھ گئی جب ندیم اقبال کا سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' پڑھا اور پھر میں نے سفرنامے کے لیے باقاعدہ گزشتہ شمارے جمع کرنا شروع کر دیے۔ ڈاکٹر ساجد امجد، زویا اعجاز، سید احتشام، سلمیٰ اعوان، منظر امام، انور فرہاد، فرزانہ نگہت، شکیل صدیقی کی میں بے حد ممنون ہوں کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ مجھ ایسے لوگوں کو بے بہا معلومات فراہم کرتے ہیں۔''

☆ دانش احمد انی نے داجل راجن پور سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کا پرانا قاری ہونے کے باوجود بھی چند مجبوریوں کے سبب کوئی تحریر نہ بھیج سکا۔ سوائے وارث الانبیاء کے، افسوس کہ ای میل کے ذریعے بھیجنے پر بھی گزشتہ دو ماہ سے بے پتا ہے (سرگزشت میں ایسی تحریر سے اجتناب کیا جاتا ہے جو متنازع ہو) خیر ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم صاحب کے فرشتہ بننے کی گتھی نہیں سلجھائی جارہی۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ کے سوا شاید ہی کوئی لفظوں سے کھیلنے والا لکھاری پاکستان میں ہو۔ ''شاعر درد'' ایک معروف شاعر کی زندگی کے کرب ناک حالات اور زبردست شاعری پر مشتمل بہترین تحریر تھی۔ انور فرہاد صاحب کے بغیر تو سرگزشت میں چاشنی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ''باپ، بیٹا، پوتا'' بہترین تحریر رہی۔ کاشف زبیر کی ''پراسرار مخلوق'' پڑھ کر ایسا لگا جیسے وہ کراچی سے اٹھ کر راولپنڈی چلے گئے ہوں مگر افسوس صد افسوس وہ گوہر نایاب اب نہ تو پنڈی میں ہے نہ کراچی میں صرف اور صرف سرگزشت اور سسپنس کے قارئین اور اپنے عزیزوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کدھر گم ہو گئے؟ ان سے گزارش کر رہا ہوں کہ سعادت حسن منٹو کی زندگی پر مفصل تحریر عنایت فرمائیں۔ ''انتقام'' ایک ایسی سچ بیانی ہے جس کا مقصد تفریح نہیں بلکہ سبق حاصل کرنا ہے، جو ارسال خدمت سرگزشت ہے۔ اسے شائع فرما کر بندۂ ناچیز پر احسان فرمائیے (اس پرچے سے فارغ ہو کر دیکھ لوں گا) سدرہ بانو ناگوری بجھی بجھی سی تھیں مگر تحریر روشن چمکدار ضوفشاں تھی، کمال ہے بھائی۔ رانا محمد شاہد بورے والا ہم سب آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ اعجاز حسین سٹھار کا پارہ ریڈ پوائنٹ پر تھا۔ ویسے سرگزشت سے یہ حضرت ناتا نہیں توڑ سکتے میری گارنٹی ہے کیونکہ ان کی محبت اور خلوص کا وہ جذبہ جو سرگزشت کے لیے مختص ہے ان کے خطوط سے نمایاں رہتا ہے۔ زویا اعجاز سے عرض ہے کہ مسلسل ایک موضوع ٹھیک نہیں۔ لکھیے مگر وقفے سے اور ناسور کو ناسور مت بنائیں ڈاکٹر صاحب۔''

☆ ارم ناز نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''کہانی ارسال کر رہی ہوں گزارش ہے کہ میری کہانی کو سرگزشت میں جگہ دیجیے آئندہ بھی کہانیاں ارسال کرتی رہوں گی میں خواتین کے کئی ڈائجسٹوں میں لکھتی رہی ہوں۔ سرگزشت کے لیے دو کہانیاں ڈائجسٹ رائٹر اور بھاگنے والیاں ارسال کر رہی ہوں (دونوں کہانیاں سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہیں)۔''

☆ محمد اسماعیل اجاگر نے پنڈی گھیب ضلع اٹک سے لکھا ہے۔ ''تین چار ماہ سے کوشش کر رہا تھا کہ خط لکھوں لیکن ہائے یہ دنیا کی.... مصروفیت، پچھلے ماہ کا خط آدھا لکھا ہوا رہ گیا۔ خیر یہ تو زندگی کا حصہ ہے۔ اگست 2018ء کے شمارے کا سرورق خوب صورت تھا جب سے آپ نے سرورق پر تین چار قسم کے رنگ دینے شروع کیے ہیں۔ تب سے سرگزشت کی رونق میں مزید اضافہ ہوا ہے لیکن پچھلے کچھ عرصے سے قارئین کتب مشکل میں ہیں۔ ڈالر میں اضافہ، ہمارے ملک کو اتھل پتھل کر دیتا ہے۔ پہلے چند بہت بڑے ادیب دنیا سے چلے گئے اور اب ادارے نے صفحات میں کمی کا فیصلہ کیا۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ یقیناً پرابلم کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا پڑا لیکن میری ادارے سے گزارش ہے کہ اس کارواں کو جاری رکھنا ہے کیونکہ میں خود بچپن میں غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکا تو میں نے آپ کے ادارے کے رسالے پڑھنے شروع کیے۔ 2000ء سے لے کر 2018ء تک بلا ناغہ، میں نے بہت کچھ سیکھا ہے ان سے۔ آج سوشل میڈیا کا دور ہے۔ کتاب و رسائل کی اہمیت کم ہو رہی ہے لیکن میں اپنا ٹائم کتب و رسائل کو دیتا ہوں۔ سوشل میڈیا کو نہیں۔ اداریے میں آپ کی باتیں ہمیشہ فکر انگیز ہوتی ہیں لیکن کیا کریں اہل فکر اور احساس ذمہ داری رکھنے والے لوگوں سے دنیا خالی ہو رہی ہے۔ دنیا کا نظام سمیٹنے کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ اللہ پاک ایمان بالخیر پر خاتمہ فرمائے۔ کہانیاں اور

تحریریں ابھی پڑھی نہیں اس لیے ان پر بات نہیں کر سکا۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ آدھی ملاقات ہوگی۔''

☆ رانا محمد شاہد کی تشریف آوری بورے والا سے۔ ''سرورق کی ہریالی اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ یہ اس مبارک مہینے کا شمارہ ہے جب ہم ایک الگ مملکت پاکستان کی صورت میں آزاد ہوئے تھے۔ قائداعظم اور ان کے رفقاء کی بے مثال جدوجہد کی بدولت جہاں مسلمانان ہند کو آزادی نصیب ہوئی۔ وہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ملک اگر دنیا کے نقشے پر آج بھی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے تو کرنل شیر خان جیسے بہادروں کی وجہ سے ہے۔ معراج رسول صاحب اپنے اداریے میں اپنے اپنے مفادات کی خاطر جینے والوں کی کہانی سنا رہے تھے۔ یک تی سرگزشت نامور قلم کار کرشن چندر کے بارے میں تھی۔ ویسے اگر کرشن چندر دوسری بیوی سلمیٰ صدیقی سے شادی سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے تو یقیناً تاریخ میں یہ بھی ہوگا کہ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد اپنا نام بھی تبدیل کر لیا تھا۔ شہر خیال کی صدارت بھائی نزاہت افشاں کے پاس تھی اور یقیناً ان کا بہترین تبصرہ اس کا حقدار بھی تھا۔ خصوصاً ناصر کاظمی کے حوالے سے انہوں نے جو معلومات افزا باتیں کیں اس کے بعد تشنگی محسوس ہو رہی ہے۔ یقیناً سرگزشت میں ناصر کاظمی کے حوالے سے تفصیلی تحریر بھی آئی ہوگی (جی ہاں)۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ انہوں نے انور فرہاد سے روحی بانو پر لکھنے کے لیے کہا تھا۔ ہم اس میں مزید اضافہ کیے دیتے ہیں کہ خالدہ ریاست، عظمیٰ گیلانی، مرینہ خان، فردوس جمال، جمیل فخری، شفیع محمد اور توقیر ناصر وغیرہ پر بھی لکھیں۔ پی ٹی وی کے اچھے دنوں میں یہی فنکار نوجوان نسل کے ہیروز تھے۔ وہ سنہری دور یاد کر کے دل سے آہ نکلتی ہے کہ آج ہمارا ڈراما کہاں ہے اور اس وقت کہاں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں ایک تقریب میں توقیر ناصر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر بالکل نہیں لگا کہ یہ وہی فنکار ہے جو کبھی ہمارا تصوراتی ہیرو تھا۔ وہ آج بھی نوجوانوں کی طرح ایکٹو ہیں اور سدرہ جی، برس ہا برس سے دھوکا کھانے والی عوام کے پاس ان عیار سیاستدانوں کے علاوہ کوئی آپشن بھی تو نہیں ہے نا۔ سید امتیاز حسین بخاری اور اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ بھی خوب رہا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! قلمی دوستی کا ذکر کر کے آپ نے بچپن یاد کرا دیا۔ آپ کی دوسری تجویز بھی بہت اچھی ہے۔ والد محترم کے لیے آپ کی تعزیت پر شکر گزار ہوں۔ انسانی رشتوں میں والدین سے محرومی کا احساس بہت تنہا اور اداس کر دیتا ہے اور اکثر انسان خوشبوؤں اور محبتوں کی وہ لذت حاصل ہی نہیں کر پاتا جو والدین کے ساتھ ہونے سے ہوتی تھی۔ ندیم اقبال کا ای میل ہمیشہ کی طرح ''شہر خیال'' کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتا نظر آیا۔ ان کا سفرنامہ قارئین کو پسند آرہا ہے تو اس کی تعریف تو ہوگی اور ندیم صاحب بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ کسی بھی لکھاری کا اصل تحفہ قارئین کی تعریف اور بہتر ردعمل ہی ہوتا ہے۔ انجم فاروق ساحلی! اشکاریات کے حوالے سے ترجمہ شدہ یا ماخوذ کہانیاں ہوں یا معلوماتی مضامین حوالہ جات نہ صرف تحریر کی اہمیت کو چار چاند لگاتا ہے بلکہ مصنف کی قدرومنزلت میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس نے سچ لکھا کہ زندگی اتنی مصروف ہوگئی ہے کہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ اصل میں انسان مشینی انداز میں زندگی گزار رہا ہے اسی لیے شاید اس کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے ورنہ اکثر کامیاب لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو انہوں نے اپنے مقررہ ٹائم ٹیبل کے مطابق کامیاب زندگی گزاری اور کبھی وقت نہ ملنے کا شکوہ نہیں کیا۔ اللہ کے ولیوں کو دنیا کی کسی چیز کا شوق و حاجت نہیں ہوتی۔ دنیا اور دنیاوی خواہشات سے وہ بے نیاز ہوتے ہیں اس لیے ان کی نظر میں شہنشاہوں یا ان کے بھیجے تحائف سب بے معنی اور بے وقعت ہیں، محترم ضیاء تسنیم بلگرامی ایسی ہی برگزیدہ ہستی شاہ ولایت کی خوب صورت زندگی کے بارے میں لکھ رہے تھے (ضیاء تسنیم بلگرامی محترمہ ہیں، محترم نہیں) زویا اعجاز نے کارگل کے ہیرو کرنل شیر خان کی زندگی کے بارے میں تفصیلی مضمون تحریر کیا۔ کرنل شیر خان کی زندگی کے بہت سے گمنام گوشوں سے آگاہ کرتا یہ ایک بہترین مضمون تھا۔ ستمبر میں یوم دفاع پاکستان ہے۔ یہ دن کرنل شیر خان اور ان جیسے شہیدوں و غازیوں کو یاد کرنے اور انہیں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا دن ہے جنہوں نے مادر وطن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک کرنل شیر خان جیسے محافظ اور ان جیسی قربانیاں دینے والے موجود ہیں اس مملکت خداداد کی جانب کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ''پہلا سیاسی لوٹا'' عقیل عباس جعفری کی معلومات سے بھرپور دلچسپ تحریر تھی معلومات کے حوالے سے تو ان کا نام ہی کافی ہے۔ سید جاذب کی ''قاتل'' تجسس اور دلچسپی برقرار رکھے ہوئے تھی۔ ویسے یہ سچ ہے کہ اس انداز میں تفتیش یورپ میں ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے جرائم کی شرح کم ہے کہ قانون قاتل تک پہنچنے کے لیے ہر بار یک زاویے سے تفتیش کرتا ہے۔ عرب دنیا کے منفرد شاعر محمود درویش پر سلمیٰ اعوان کی تحریر ان کی زندگی اور شاعری کا مکمل احاطہ کرتی نظر آئی۔ اپنی اور اپنی قوم کے دکھوں اور تکلیفوں کا اظہار جسے اس فلسطینی شاعر نے کیا، یہی بات اسے عظیم شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری، ملیر کراچی سے رقمطراز ہیں۔ ''لیجیے جناب خدا خدا کر کے ایک لمبے اور طویل انتظار کے بعد الیکشن کی ٹینشن سر سے ٹلی، امیدوں، دعوؤں، وعدوں اور کئی سنہری خوابوں کی سیر کرانے کے بعد جیتنے والے جشن منا رہے ہیں اور ہارنے والے ''ووٹ کو عزت دو'' کا نعرہ بھول کر دھاندلی کا الزام عائد کرتے ہوئے تلملا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے انکل، جیت تو صرف ایک کی ہوتی ہے باقی سب کو تو ہارنا ہوتا ہے پھر کیوں ہم ہر پانچ سال بعد اس ایک کی جیت کو قبول کیوں نہیں کرتے، پانچ سال پہلے بھی دھاندلی کا الزام لگا تھا یہ اور بات کہ الزام لگانے والے خود اس دفعہ اس الزام کی زد میں آگئے۔ نئے پاکستان کا خواب دکھانے والے ہوں یا ملک کی تقدیر بدلنے کا بلند و بانگ دعوے کرنے والے سب کو اس جیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنا دل بڑا رکھنا چاہیے دل بڑا ہو تو نفرتیں مٹیں گی، محبتیں

PakiBooks.site

بڑھیں گی اور یہ محبتیں وطن عزیز کی ترقی میں اہم کردار ادا کریں گی انہی نیک خواہشات کے ساتھ ’’شہر خیال‘‘ کا رخ کرتے ہیں جہاں نزاہت افشاں ہمیں یاد تو کرہی رہے تھے مگر یہ جان کر بھی بے حد خوشی ہوئی کہ معراج انکل میرے تبصرے کا انتظار کرتے ہیں یقین کیجیے۔ دونوں خط شائع نہ ہونے کی ساری کلفت پل بھر میں دور ہوگئی اتنا سراہنے اور سیروں خون بڑھانے کا بہت شکریہ انکل آپ کے یہ الفاظ میرے لیے کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں ہیں یہ الفاظ اور یہ اعزاز مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ آفتاب احمد کی تجویز معقول ہے اس پر عمل ہونا چاہیے رانا شاہد سوچا تھا کہ آپ کو بیٹی کی سالگرہ کی مبارک باد دوں گی مگر یوں اچانک سے آپ کے والد کی ڈیتھ کا سن کر بہت افسوس ہوا، رب تعالیٰ آپ کو صبر جمیل دے۔ ’’ناسور‘‘ نہ نہ کرتے بھی بس پڑھ ہی لی۔ ڈاکٹر صاحب شمیم کے مرنے پر نعمان کا خاص ایکشن دکھائی نہیں دیا حالانکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک بات اور نعمان سے جو بھی مخلص ہونے کی کوشش کرتا ہے اسے موت کی سزا بھگتنی پڑتی ہے اب شہزادی نیلم کا تذکرہ چل پڑا ہے اور ابھی سے لگ رہا ہے کہ یہ قصہ بھی طوالت پکڑتے ہوئے بیزار کردے گا۔ زویا اعجاز نے پاک فوج کے جوانوں سے متعارف کروانے کا بہترین سلسلہ شروع کیا ہے اس کے لیے زویا صاحبہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کبھی کبھی وطن عزیز کا حال دیکھ کر دل دکھی سا ہو جاتا ہے مگر پاک فوج کا خیال آتے ہی روح میں اطمینان اور سکون سا اتر آتا ہے کہ کوئی تو ہے جو صرف اس وطن کے لیے اپنا تن من دھن کو پورے خلوص، سچائی، ہمت اور عزم کے ساتھ قربان کرنے کو تیار رہتا ہے پھر وہ سپاہی مقبول حسین ہو یا کرنل شیر ہمارا ایک ایک سپاہی کل بھی ہمارا مان تھا اور آج بھی ہمارا فخر ہے۔ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ اس دفعہ کئی رنگوں سے سجی تھی۔ ندیم بھائی کا بیٹیوں سے محبت کا رنگ، نسرین سے اپنائیت کا رنگ وطن پاکستان سے چاہت کا رنگ سرجی کی دیگر ساتھیوں سے نوک جھوک سے سجا رنگ ہر ہر رنگ اس شاہکار (سفرنامے) کی رنگینی کو بڑھا رہا تھا بہت خوب اور ہاں وہ ڈرائیونگ والا قصہ تو خوب مزہ دے گیا۔ ’’باپ، بیٹا، پوتا‘‘ پاکستانی فلم انڈسٹری کے تین نسل در نسل چمکنے والے ستاروں سے تعارف ہمارا پہلی بار ہوا گو کہ یہ تینوں ستارے ہی ہمارے لیے نئے تھے مگر ان تینوں کی چمک نے متاثر کیا۔ ’’قربانی‘‘ پر قربان جائیں شمی ماموں کا محبت کو وطن پر نثار کردینے کا ہلکا پھلکا انداز دل چھو گیا چلبلے اور نٹ کھٹ سے ’’شمن خالو‘‘ لبوں پر مسکان بکھیر گئے زندگی بھر من مانی کرنے والے لٹے بھی تو اس طرح کہ ہم بھی پڑھ کر حیران رہ گئے۔‘‘

☆ نزاہت افشاں گاؤں مہورہ، تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک سے لکھ رہے ہیں۔ ’’خلاف توقع اس دفعہ سرگزشت 23 جون کو ہی مل گیا ورنہ یوں تو ہمیں یکم تک ملتا ہے شاید الیکشن کی وجہ سے جلدی مل گیا ہے۔ اداریہ حسب معمول زبردست تھا۔ نام نہاد سیاستدانوں کے دلوں میں آج کل ملک وملت کی محبت جاگ پڑی ہے۔ شور و واویلا اس قدر کہ توبہ! پریس کانفرنس کے حمام میں ایک دوسرے کو یوں ننگا کیا جارہا ہے کہ گویا ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ برداشت اور اعلیٰ ظرفی کا مادہ قریب قریب ناپید ہوچکا ہے۔ ’’سیاست برائے خدمت‘‘ کا زمانہ بیت چکا ہے اور اب ’’سیاست برائے کرپشن‘‘ کا دور دورہ ہے۔ یہ لوگ سیاست داں ہیں نہ کہ مخلص لیڈر کیونکہ سیاستدان تو آج کے لیے سوچتا ہے جب کہ لیڈر آنے والے کل کے لیے سوچتا ہے۔ یک گی سرگزشت اس بار کرشن چندر کے حوالے سے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شادی سے قبل مسلمان ہوگئے تھے اور ان کا اسلامی نام وقار الملک رکھا گیا تھا۔ ان کی بیوی سلمٰی صدیقی مشہور مزاح نگار رشید احمد صدیقی کی بیٹی اور پروفیسر احسان رشید کی بہن تھیں۔ کرشن چندر کے علاوہ فراق گورکھپوری، دیوان سنگھ مفتون اور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بھی اردو ادب کی گراں قدر خدمت کی۔ ’’شاہ ولایت‘‘ زبردست تحریر تھی۔ اللہ والوں کے اسرار اللہ پاک ہی جانتے ہیں۔ زویا اعجاز معرکہ کارگل کے ہیرو کرنل شیر خان پر زبردست تحریر لائیں لیکن اس میں مزید بہتری کی گنجائش موجود تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل اقتدار کی بزدلی اگر واشنگٹن معاہدے پر دستخط نہ کرتی تو ہمیں بھاری نقصان نہ اٹھانا پڑتا۔ ’’پہلا سیاسی لوٹا‘‘ واہ کیا زبردست عنوان رکھا ہے ڈاکٹر عالم لوٹا کے حوالے سے میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ یقیناً جب آپ کا کردار اچھا نہیں ہوگا تو تاریخ اچھے الفاظ میں یاد نہ کرے گی۔ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ زبردست عروج پر ہے۔ خیر سے اس بار نسرین کا ذکر موجود تھا۔ ندیم صاحب بہت ہی زبردست لکھ رہے ہیں میں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں کہ میرا چھوٹا انس افتخار جو کہ کراچی میں رہتا ہے وہ سرگزشت صرف ندیم صاحب کے سفرنامے کی وجہ سے پڑھتا ہے۔ ’’قربانی‘‘ زبردست تحریر تھی۔ شمی صاحب نے اپنے دلی جذبات کی خاطر ذاتی جذبات کی پروا نہ کی اور وطن عزیز کی خاطر قربانی دے دی۔ ’’تاوان‘‘ سبق آموز کہانی تھی ایسی کہانیوں کو شمارے کی زینت بنتے رہنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے وقت جو فسادات ہوئے ان میں خاندانوں کے خاندان اجڑ اور بچھڑ گئے اور جو اغوا ہوئے ان کی داستان سننے کے لیے پتھر کا دل چاہیے۔ آغا شورش کاشمیری اپنی کتاب ’’بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل‘‘ میں لکھتے ہیں کہ ’’ہم بعض دوست اور خاکسار تحریک کے کارکن فسادات کے دنوں میں مہاجرین کی مدد کے لیے ہندوستان کے دور دراز دیہاتوں میں گئے تو یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک عورت کی برہنہ لاش پڑی ہے، اس کا پیٹ چاک ہے اور اس کے دونوں پستان کٹے ہوئے ہیں۔‘‘ ایسے واقعات کی بنا پر ہی سردار عبدالرب نشتر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور رو پڑے تھے بلکہ ہندو لیڈر سردار پٹیل کو سر عام تھپڑ بھی دے مارا تھا اس دن سے یہ مثل بھی مشہور ہوگئی کہ ’’بھارت کو تھپڑ کی ضرورت ہے۔‘‘ ’’قاتل ڈور، صبر کا پھل، پشیمانی اور کھڑکی خوابوں کی عمدہ تحریریں تھیں۔ شمن خالو بھی گزارے لائق تھی۔ منظر امام صاحب بھی کبھی ایسی تحریریں دیا کرتے تھے۔ استاد محبوب نرالے عالم کے بارے میں آج کل خاموش ہیں۔ یاد رہے کہ جوش ملیح آبادی کی کتاب یادوں کی برات میں بھی بعض ایسی شخصیات کا ذکر

ہے۔ ’’بدمعاش‘‘ سبق آموز کہانی تھی۔ ایک غیرت مند باپ نے غنڈے کو صحیح سبق سکھایا۔ شہر خیال میں اس بار ہمیں نگران حکومت کی طرح ایک ماہ کی صدارت سے نوازا گیا۔ بہت بہت شکریہ۔ قیصر خان، اعجاز حسین ستار، سید امتیاز حسین بخاری، رانا محمد شاہد اور آفتاب نصیر اشرفی صاحب بھی اپنے اپنے رنگ میں حاضر تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، ارے سسٹر یہ کیا کہ اتنے عرصے بعد آپ آئیں اور ہنگامی لینڈنگ کے بعد اڑن چھو ہوگئیں ویسے ایک بات بتائیں کہ آپ نے آپی بشریٰ افضل کو اغوا کرکے کہاں چھپا رکھا ہے۔ صوبی شاہ سسٹر میری پکار پر آپ حاضر ہوئیں بہت بہت شکریہ، پہلے کی طرح جاندار تبصرے لکھنا شروع کریں آپ بھی، سدرہ بانو نا گوری ارے بجھے دل کے ساتھ تبصرہ نہ کیا کرو کیونکہ ہم ریگولر تبصرہ لکھنے والے ہی اگر مایوس ہوجائیں تو نو آموز سخن کی حوصلہ افزائی کون کرے گا۔ پری زادہ جہاں فرام سیالکوٹ سسٹر آپ کدھر گم ہیں جلدی سے شہر خیال میں حاضر ہوجائیں۔ بھکر سے دیرینہ اور مخلص تبصرہ نگار انور عباس شاہ بھائی بھی کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں۔ شاہ جی جب سے میں نے آپ کو بتایا کہ میں لڑکا ہوں تو آپ شہر خیال سے غیر حاضر ہوگئے میں نے تو اس لیے بتایا تھا کہ آپ کہیں کوئی روگ نہ پال لیں۔ آخر میں ایک تصحیح کرتا چلوں کہ عبدالحکیم ثمر صاحب نے بیت بازی میں غالب کا مشہور شعر لکھا لیکن اس شعر کا مصرعہ ثانی درست نہیں پورا شعر درست یوں ہے کہ

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگِ دل تیرا سنگِ آستاں کیوں ہو؟

(ملاحظہ کیجیے دیوان غالب اور نوائے سروش از مولانا غلام رسول مہر)۔‘‘

☆ اویس شیخ کا ای میل ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ’’یوم آزادی کی مناسبت سے سرگزشت کا سرورق دیدہ زیب تھا۔ اداریے کی کہانی خوب لکھی ہے۔ ’’سلمٰی کا بلما‘‘ کی روداد خوب صورت انداز میں پیش کی گئی، سندھ کے عظیم شاعر اعجاز منگی نے کرشن چندر پر چند لائنیں لکھی تھیں۔ افسوس کہ ادب کی دنیا میں اب کوئی کرشن چندر نہیں، کاش! کوئی کرشن چندر ہوتا اور وہ سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان نفرت کی جھوٹی دیوار، اپنے قلم سے گراتا، ان دونوں کو بتاتا، اصل تضاد لسانیات کا نہیں، اصل تضاد طبقات کا ہے، اس کے علاوہ کرشن چندر کا عبداللہ حسین کو لکھے گئے خط میں یہ جملہ بہت قیمتی تھا جو لوگ لفظوں سے پیار کرتے ہیں بہت دکھ اٹھاتے ہیں۔ شہر خیال میں محترم نزاہت افشاں صاحب بھرپور تبصرے کے ساتھ جلوہ افروز تھے، ان پر ماشاء اللہ قسمت خوب مہربان ہے، اعجاز صاحب اور سدرہ صاحبہ محکمہ ڈاک کی نااہلی پر نالاں نظر آئے میرا انہیں مشورہ ہے کہ آپ اپنے خطوط ای میل کردیا کریں، ٹائپنگ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اشرفی صاحب کی تجاویز قابل ستائش بھی ہیں اور قابل قدر بھی۔ رانا شاہد بھائی کے والد کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتا ہوں۔ اللہ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، (آمین)۔ سبھی احباب نے اچھا لکھا ہے۔ ’’شاہ ولایت‘‘ ایمان افروز حکایت تھی، ان کی درست سیاسی پیش گوئیاں ورطہ حیرت میں ڈال گئیں۔ ’’وردی، وعدہ اور وفا‘‘ بے مثال داستان پڑھ کر کرنل شیر کی شجاعت اور ذہانت پر رشک آتا ہے اور تو اور جب ان سے سوال کیا گیا، بتائیں زندگی میں کتنے عشق کیے؟ جواب دیا کہ میری وردی ہی میرا عشق ہے، یقین مانیں اس سے آگے پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی، کرائم اسٹوری ’’قاتل‘‘ پڑھی۔ جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کھیل تو ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ لڑکی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے موقع کی تاک میں تھے۔ آفیسر پیٹر کی فراست کو داد دیتا ہوں۔ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ سفرنامہ اچھا جارہا ہے۔ ’’تعاون‘‘ میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ ایجاد کی ماں اور گنگا، جمنی تہذیب معلوماتی تحریریں تھیں۔ شاعر درد کا تذکرہ دل کو لگا۔ محمود درویش کی انقلابی شاعری فلسطینی مجاہدین کے لیے مشعل راہ ہے۔ محترمہ سلمٰی اعوان سے التماس ہے فیمنسٹ شاعر نزار قبانی کی شخصیت پر قلم اٹھائیں۔ (سلمٰی اعوان نزار پر بھی لکھ چکی ہیں) سچ بیانیوں میں ’’قربانی‘‘ ہر لحاظ سے ایک بہترین کہانی تھی۔ شمیم احمد کی ادھوری محبت پر بے حد افسوس ہوا۔ تاوان وطن سے محبت اور محبوبہ کی بے وفائی کے ملے جلے جذبات واحساسات سے بھرپور کہانی تھی۔ بلاشبہ اس بٹوارے نے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا لیکن ہم آج آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ قائداعظم کی دوراندیشی تھی کہ انہوں نے بہت جلد مکار ہندو کی ذہنیت کو پرکھ لیا تھا۔ ’’قاتل ڈور‘‘ پڑھ کر کچی ڈوریوں سے مینوں تو باندھ لے سونگ یاد آگیا۔ مصنف نے پوچھا آخر اس حادثے کا قصوروار کون ہے؟ میرے نقطہ نظر کے مطابق محبت ہے، کیونکہ صاحبہ نے محبت کے بھرم میں ہی چاند سے کنگن کے تحفے کا مطالبہ کیا اور چاند نے اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے بھائی سے کیا وعدہ توڑ دیا۔ یہی محبت کا طلسم ہے، قاتل ڈور نہیں قاتل محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی کیونکہ محبت ہمیشہ قربانی مانگتی ہے۔ شمن خالو کی روداد پڑھ کر نہ جانے کیوں چوہدری نثار علی خان کی سیاست اور پریس کانفرنس یاد آگئیں۔ ’’صبر کا پھل‘‘ اچھی کہانی تھی۔ ’’انتظار‘‘ پڑھ کر افشاں کے لیے دعا کرسکتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے گھر کی خوشیاں جلد دیکھنی نصیب کرے، آمین۔ ’’بدمعاش‘‘ سبق آموز تحریر تھی۔ ’’پشیمانی‘‘ کا آغاز کیا تھا اور انجام کتنے بدصورت موڑ پر ہوا۔ شاید یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ ’’کھڑکی خوابوں کی‘‘ پڑھی، کیا خوب لکھا خواب تو سب کے ہوتے ہیں لیکن پورے وہی ہوتے ہیں جو حد میں رہ کر دیکھے جائیں۔‘‘

تاخیر سے موصول خطوط:

احمد جان، مانسہرہ۔ یوسف علی، سرگودھا۔ انس ملک، لاہور۔ حافظ عثمان غنی، ڈیرا مراد جمالی۔ نصیر احمد، جھنگ۔ زاہد خان آفریدی، پشاور۔ شیخ توفیق احمد، ملتان۔ انصر علی انصر، کوئٹہ۔ لیاقت علی، محمد معین، شاہ زیب، کراچی۔

PakiBooks.site

یہ پُراسرار بندے

زین مہدی

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحر و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

علامہ اقبال کے یہ اشعار کتنے سچے، کتنے برمحل ہیں۔ دورِ حاضر میں اشعار کی ترجمانی کرنے والے بھی ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر ہم متلاشی نظر ڈالیں، ان کی زندگی پر غور کریں تو احساس ہوگا کہ یہ لوگ اور ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ بچپن سے ہی ان کی زندگی گواہی دینے لگتی ہے کہ انہیں خدا نے کسی خاص کام کے لیے بھیجا ہے۔ کیونکہ حب الوطنی ان کی رگوں میں دوڑ رہی ہوتی اوز اس کا اظہار ایک بالکل الگ انداز سے ہوتا ہے۔

شہادت کا درجہ پانے والے ایک مرد جواں کا زندگی نامہ

تاریکی کا عفریت جس نے ہر جانب پنجے گاڑ رکھے تھے اب بے بس ہو رہا تھا۔ افق پر صبح کاذب کی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ وہ لوگ جو اللہ کے حضور حاضری کے عادی ہیں وہ اپنے اپنے بستروں سے نکل نکل کر مسجد کا رخ کر رہے تھے۔ اس علاقے میں صرف ایک مسجد تھی۔ ایک چھوٹی سی مسجد۔ اس مسجد میں صرف بیس افراد نماز فجر ادا کر سکتے ہیں۔ زیادہ کی گنجائش بھی نہیں ہے مگر اس مسجد کے لیے اتنی ہی گنجائش کافی ہے۔ اس لیے کہ یہاں باہر کے نمازی نہیں آتے صرف ائرفورس کے مختلف شعبہ سے تعلق رکھنے والے آتے ہیں۔

نیند کے خمار کو بھگانے کی کوشش کرتے ہوئے نمازی ایک کے بعد ایک آتے جا رہے تھے۔ خاصے لوگ آچکے تھے مگر امام صاحب ابھی آئے نہیں تھے اس لیے نمازی سنتی نمازیں ادا کر رہے تھے یا پھر درود و اوراد میں مشغول تھے۔

اٹھارہ ستمبر کا دن طلوع ہونے ہی والا تھا۔ نائیک محمد کیانی اور نائیک محمد شفیع بھی ایک جانب بیٹھے وضائف پڑھ رہے تھے کہ دونوں ہی چونک اٹھے۔ وضو خانے کی جانب سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ فوجی اور گولی، دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عام عوام ہو تو وہ فائر کی گونج سے خوفزدہ ہو جائے لیکن ان کو تو گولیوں سے کھیلنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے اس لیے وہ صرف تجسس میں مبتلا تھے۔ نائیک کیانی نے وضائف ختم کیا' دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ وہ باہر جا کر وجہ جاننا چاہتا تھا کہ اسی وقت دو آدمی مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں مسلح تھے۔ ان کے چہرے پر داڑھی تھی مگر نور نہ تھا اور خباثت بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔ ''دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے۔ ہم آپ کو بچانے آئے ہیں۔ آپ سب ایک طرف اکٹھے ہو جائیں۔''

نمازیوں میں گھبراہٹ پیدا ہونا لازمی تھا لیکن نائیک کیانی کی نظر ان دونوں کے جوتوں پر جم گئی۔ وہ مسجد میں کھڑے تھے۔ کوئی مسلمان مسجد میں جوتوں کے ساتھ کسی حال میں بھی داخل نہیں ہو سکتا، اور وہ دونوں گندے جوتے پہنے صفوں پر کھڑے تھے۔ آنے والوں کے چہروں پر گھبراہٹ بھی تھی۔ فوجی کسی حال میں بھی اس طرح گھبراتے نہیں ہیں۔ مستعد ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے کیانی کو شک ہوا اور اس نے اسلحہ کا خوف بھلا کر زوردار آواز میں پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو؟''

اس کڑکتی ہوئی آواز نے اندر آنے والوں پر گرز کا کام کیا۔ ان کے چہروں پر پھیلی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی۔ انہوں نے خونی نظروں سے نائیک کیانی کی طرف دیکھا اور گن سیدھی کر کے وہاں جمع نمازیوں پر برسٹ چلا دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسجد میں ادھر ادھر بیٹھے ہوئے لوگ ایک جگہ آ جائیں تو ایک ہی بار میں سب کے سینوں میں گولیاں بہ آسانی اتار دیں لیکن ہوا الٹا۔ جو جہاں تھا وہی رہا اور اس برسٹ میں صرف انہی لوگوں کو گولیاں لگیں جو طارق کیانی کے ساتھ کھڑے تھے۔ نائیک محمد شفیع بھی تیورا کر زمین پر گرتا چلا گیا۔ اسے احساس تک نہ ہوا کہ اس دہشت گرد کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے اسے کتنی گولیاں لگی ہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہی سبب پیدا کرتا ہے۔ وہی فوجیوں کو زندگی دیتا ہے اور شہادت بھی۔ شہادت ایک بہت بڑا منصب ہے۔ ہر فوجی کی تمنا ہوتی ہے کہ اسے شہادت ملے لیکن یہ رتبہ ہر ایک کو نہیں ملتا۔

نائیک محمد شفیع کوئی کمزور دل کا بندہ نہیں تھا اور نہ ہی گولیوں سے گھبرا جانے والا بندہ تھا۔ وہ تو اسلحے سے کھیلنے کی خاطر فوج میں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ وہ کس وجہ سے تیورا کر زمین پر گرا تھا یہ بات وہ آج تک سمجھ نہیں پایا ہے۔ زمین پر گرنے سے پہلے ہی وہ بے ہوش ہو چکا تھا پھر جب وہ ہوش میں آیا تو ایک عجیب منظر اس کے سامنے تھا۔ اس کے آس پاس بہت سارے ساتھی خون میں لت پت پڑے تھے۔ زیادہ تر زندگی سے تعلق توڑ چکے تھے۔ اس نے اپنے جسم پر زخموں کو محسوس کرنے کی کوشش کی کہ اسے کتنی گولیاں لگی ہیں؟ اور ان گولیوں نے کہاں کہاں زخم ڈالا ہے لیکن اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ اسے کہیں بھی زخم کا احساس نہیں تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ وہ پوری طرح محفوظ تھا۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی۔ اس کی طرف رخ کر کے اس خارجی نے برسٹ مارا تھا جو یقیناً اس کے گرنے کی وجہ سے اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ محمد شفیع نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ایک پر ایک نمازی گرے ہوئے تھے۔ شاید جب برسٹ چلا تو وہ ایک دوسرے کو بچانے کے لیے ڈھال بن گئے تھے اور دوسرے کی گولیاں اپنے جسم پر لے لی تھیں۔ نماز کے لیے بچھی صفیں خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اس نے جھک کر دیگر ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ سب شہادت کا مرتبہ حاصل کر چکے تھے۔ اسے ہاتھ اور گالوں پر کچھ جگہ جلن محسوس ہوئی تو اس نے ٹٹول کر جائزہ لیا۔ ہلکی ہلکی خراش لگی تھی۔ اس نے کہنی اٹھا کر دیکھی تو کانچ کے ٹکڑے نظر آئے جو کسی کھڑکی یا کہیں لگے شیشے کی کرچیاں تھیں۔ وہ چہرے پر چبھی کرچیاں نکالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے سیڑھیوں پر بھی کچھ لوگ گرے نظر آئے۔ ان کے گرد خون کا تالاب سا بنا ہوا تھا۔ ابھی وہ ان کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ ایک زخمی کے جسم میں حرکت سی نظر آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ ابھی شہادت کے درجے پر پہنچا نہیں ہے۔ صرف زخمی ہے۔ وہ زخمی کو اٹھانے بڑھ ہی رہا تھا کہ ستون کے پیچھے سے ایک دہشت گرد باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشن کوف تھی۔ وہ شاید زخمیوں کو چیک کرنے آ رہا تھا کہ اس کی نظر نائیک محمد شفیع پر پڑی، اس نے کلاشن کا رخ اس کی طرف کر لیا۔ محمد شفیع کو لگا کہ اب وہ بھی شہادت کا درجہ پانے والا ہے۔ اس کے قدم پہلی سیڑھی پر ہی جم گئے تھے۔ وہ پتھر کا بن گیا تھا۔ اس کی نظریں بدستور کلاشن پر تھیں کہ ٹریگر کب دبتا ہے، دور نزدیک کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا کہ وہ جست لگا کر اسے اٹھا لیتا، مقابلے پر اتر آتا۔ اس کے سامنے نہتے لوگوں کی لاشیں تھیں اس لیے شہادت کا منظر تھا کہ اسی وقت ایک معجزہ سا ہوا۔

اس نے اب تک صرف کتابوں میں پڑھا تھا کہ معجزہ



PakiBooks.site

روندا ہوتے ہیں۔ آج پہلی بار اس نے معجزہ دیکھا۔ جی ہاں وہ معجزہ ہی تو تھا۔ ادھر وہ دہشت گرد کلاشن کی نال اس کی طرف اٹھا ہی رہا تھا کہ ایک فوجی گاڑی آگئی۔ نہایت تیزی سے، گویا ہوا میں اڑتی ہوئی۔ اس کی اسپیڈ کم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس وین سے ایک بجیلا سا بندہ چھلانگ مار کر اترا۔ وہ کسی شہزادے کی طرح خوبصورت تھا اور اس کے جسم پر وردی بھی خوب سج رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔

پھر ایسا لگا جیسے کسی فلم 'انگلش فلم' کا منظر سامنے چلنے لگا۔ وہ چھلانگ مار کر گاڑی سے اترا تھا اور فائرنگ کرتے ہوئے دور تک پھسلتا چلا گیا تھا۔ وہ دہشت گرد جو نائیک محمد شفیع کی طرف بڑھ رہا تھا وہ اچنبھے میں آگیا۔ اس کے رکتے ہی نوجوان نے آواز دی۔ ''او بزدل کتے میری طرف آ...''

نوجوان غصے میں بھرا ہوا تھا، ایسا غضب ناک شیر ہو رہا تھا جو اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ اس کی للکار میں ایسی گرج تھی کہ ہتھیار سے لیس وہ دہشت گرد جو کچھ دیر پہلے گولیاں برسا رہا تھا نوجوان کی للکار سے گھبرا اٹھا اور حواس باختہ ہو کر اس نے دوڑ لگا دی۔ تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا تھا۔ 1965 میں لاہور کے شالیمار گارڈن میں چائے پینے کا دعویٰ کر کے آگے بڑھنے والے بھی تو اسی طرح جوتے چھوڑ کر بھاگے تھے۔

اس دہشت گرد کو بھاگتے دیکھ کر نوجوان نے للکارا، اسے رکنے کے لیے کہا مگر وہ رکا نہیں۔ اسے اپنی پڑی تھی وہ اس آواز پر کیسے رک جاتا؟

بہادری دکھانا آسان نہیں ہے۔ بہادری دکھانا تو صرف ان کا کام ہے جو زندگی کو خدا کی امانت سمجھتے ہیں۔ وہ بزدل' نہتے لوگوں کا خون بہانے والا' ملک دشمن کیسے پاک فوج کے افسر کا سامنا کرتا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگنے کا ریکارڈ توڑ دیتا مگر اس وقت اس کے سامنے پاک فوج کا شیر تھا اسی لیے وہ دم دبا کر فرار ہونا چاہتا تھا اور اس مرد مجاہد نے گویا قسم کھالی تھی کہ اسے بھاگنے نہیں دے گا۔ اس نے فائر کیا۔ اس کی دھاڑ اور پھر گن کی گرج۔ دھماکے کی آواز۔ دہشت گرد کا حوصلہ پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا مگر وہ بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جبکہ آنے والے جوان کی کوشش تھی کہ وہ بھاگنے نہ پائے۔ شاید وہ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے پیر کا نشانہ لیا تھا۔

نوجوان نے اسے روکنے کے لیے پیر پر فائر کیا تھا۔ وہ ......اوندھے منہ گرا تھا کہ اسے دبوچ لینے کے لیے نوجوان دوڑا۔ خوف سے اس گرے ہوئے دہشت گرد نے فائر کیا۔ گولی نوجوان کے پاس سے گزر گئی۔ نوجوان نے بھی اسی وقت اس پر فائر کیا۔

گولی مرد مجاہد نے چلائی تھی۔ کیسے اثر نہ دکھاتی۔ ایک گولی' صرف ایک گولی اپنا کام دکھا گئی۔ وہی شخص جو نہتے لوگوں پر گولیاں چلا رہا تھا۔ وہ صرف ایک گولی سے واصل جہنم ہو گیا۔ اس مرد میداں کو یقین تھا کہ اس کی گولی خالی نہیں گئی ہے پھر بھی وہ للکارتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ اسے ٹھوکر مار کر اندازہ لگا تا کہ اسی وقت بیرک میں چھپے ہوئے کسی دہشت گرد نے فائر کیا۔ اس سیماب صفت مجاہد کو نشانہ بنانا چاہا مگر فائر ہوتے ہی وہ جوان کسی اسپرنگ کے گڈے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور گولیوں کی بوچھاڑ سے خود کو بچاتا ہوا ایک ستون کی آڑ میں چلا گیا۔

اب ایک ہیجانی کیفیت کا عالم تھا۔ بیرک میں دہشت گرد تھے۔ ان کی تعداد کتنی ہے کسی کو معلوم نہیں تھا پھر بھی وہ جوان اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا۔ اس کا رخ بیرک کی طرف تھا۔ اس کی عقابی نگاہیں بیرک کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی اندر سے فائر ہوتا۔ جواب میں وہ بھی فائر کر دیتا۔ وہ اس کی ہر گولی کا جواب گولی سے دے رہا تھا۔ مقابلہ کانٹے کا تھا۔ تبھی اس نے ایک نئی چال چلی۔

یہ شیر جوان کون ہے اور یہ واقعہ کہاں کا ہے اسے بتانے سے پہلے اس جوان کا مکمل تعارف کرا دوں۔ اس مرد میداں نے عین اس تاریخ کو جنم لیا تھا جس تاریخ کو مسلمانانِ برصغیر کو اللہ تعالیٰ نے ایک نئے ملک کا تحفہ دیا تھا یعنی چودہ اگست۔

چودہ اگست 1988 کو اٹک اسپتال میں ہر شخص خوش تھا کہ ڈاکٹر بخاری کو اللہ تعالیٰ نے ایک تحفہ دیا ہے، ایک انمول تحفہ۔ ان کا نام روشن کرنے کے لیے ایک مشعل روشن ہو اٹھی ہے۔ ایک بچے نے جنم لیا ہے۔

ڈاکٹر بخاری جو کوری ڈور میں تھے انہیں اندر بلا یا گیا۔ اندر آتے ہی انہوں نے شفقت بھرے ہاتھ بڑھا کر بچے کو اٹھا لیا۔ کان میں اذان دی اور پھر ماں سے کہا۔ ''اس کا نام اسفندیار رکھوں گا۔''

ماں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ ''نہیں' اس کا پورا نام اسفندیار احمد بخاری رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے یہی نام رہے گا۔'' بچے کے والد ڈاکٹر سید فیاض بخاری نے جواب دیا اور بچے کو پیار کرنے لگے۔

یہ ان کا پہلا بچہ نہیں تھا۔ عام طور سے پہلے بچے میں باپ کو زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے لیکن یہاں بات ہی کچھ اور تھی۔ انہیں بڑے بیٹے سے زیادہ کشش محسوس ہو رہی

تھی۔ شاید اس بچے میں کچھ ایسا تھا کہ ڈاکٹر بخاری کے دل میں پیار کا سمندر سا امنڈ آیا تھا۔ ایسی کشش محسوس کر رہے تھے جسے کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے۔ بس ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ شاید یہ ایک اعلامیہ تھا کہ یہ بچہ ان کا نام روشن کرے گا۔ اس کی شہرت ان کے حصے میں آئے گی۔ تاریخ میں وہ امر ہو جائے گا۔ آخر ایسی کیا بات تھی اس پر روشنی ڈالنے سے پہلے بچے کے بارے میں کچھ اور باتیں ہو جائیں۔

نویں دن بچے کا عقیقہ ہوا۔ دو بکرے خیرات کیے گئے۔ باری حجام نے بال اتارے اور بالوں کے ہموزن چاندی خیرات کی گئی۔

بچہ ابھی نو دن کا ہوا تھا مگر اس میں سیماب صفتی نظر آ رہی تھی۔ ابھی ادھر دیکھ رہا ہے تو ابھی ادھر سر موڑ رہا ہے۔ اس کی ہر ادا منفرد نظر آتی تھی۔ کچھ وقت اور گزرا تو ہر ایک کو احساس ہونے لگا کہ وہ کچھ منفرد ہے۔

دیگر بچوں سے اس لیے منفرد تھا کہ اس نے وقت سے پہلے دانت نکالے۔ وقت سے پہلے چلنا سیکھا اور وقت سے پہلے بولنے لگا۔ اس کی ان باتوں پر سب ہی حیران تھے۔ ایسا چنچل تھا کہ سب کہتے اس کے جسم میں پارا ہے پارا' چپ بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں ہے۔

دوڑنا بھاگنا' شور کرنا اس کی فطرت کا حصہ تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ابھی وہ ڈیڑھ برس کا تھا مگر اس قدر چنچل تھا کہ بہتوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ صرف ڈیڑھ سال کا ہے۔ ماں عظمیٰ بخاری میکے گئی ہوئی تھیں۔ ننھیال میں بھی اس کی سیماب صفتی عروج پر تھی۔ ایک دن جب وہ بیٹھیں سلائی مشین پر کپڑے سی رہی تھیں کہ وہ دوڑتا ہوا آیا اور ماں کی گود میں جانے کی اس نے عجیب کوشش کی۔ ماں اور اس کے درمیان سلائی مشین تھی۔ وہ عام سا بچہ ہوتا تو گھوم کر ماں کے پاس جاتا مگر اس نے تو ہمیشہ ہی مشکل انداز پسند کیا تھا۔ بجائے دائیں یا بائیں سے جانے کے اس نے اچھال بھری اور ماں کی گود میں جانے کی کوشش کی۔ اتنی سی عمر۔ وہ جمپ لگانا کیا جانے؟ اس نے اچھال تو بھری مگر اتنی اونچی اچھال نہیں تھی کہ وہ مشین کو پار کر لیتا۔ وہ پیٹ کے بل مشین پر گرا۔ دھاگے کی ریل لگانے کی جو کیل ہوتی ہے وہ پیٹ میں دھنس گئی۔ خون کا فوارہ سا اچھلا اور کپڑے و مشین کو بھگو گیا۔ بچے کی چیخ کسی نے سنی یا نہ سنی مگر ماں کی چیخ تمام گھر میں گونج گئی۔ سب دوڑ پڑے۔ بچے کو گود میں اٹھایا اور اسپتال کی جانب بھاگے۔ بچے کی حالت دیکھتے ہی اسپتال میں کھلبلی مچ گئی۔ فوراً سرجن ڈاکٹر محمد شفیع کو کال کیا گیا۔ انہوں نے معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا، کیل جگر کے پاس چبھی تھی۔ زخم گہرا تھا پھر بھی سرجن صاحب کا تجربہ کہ کیس بگڑنے نہیں دیا اور کچھ ہی ہفتے میں زخم بھر گیا۔ دیکھیں تو بات معمولی سی' سوچیں تو بات ابھی ہوئی۔ کیل بہت معمولی سی دوری سے گزری تھی۔ شاید اس لیے کہ ابھی وہ کچھ نہیں ہوا تھا جس کے لیے وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ راز کیا تھا۔ یہ بتانے سے پہلے اس کی زندگی کے کچھ اور واقعات بتا دوں۔

گو کہ زخم بھر گیا۔ بچے کو پتا بھی نہیں کہ اس نے اپنی نادانی سے کیسے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا مگر وہ بھی تو مجبور تھا۔ اس کے اندر کچھ ایسا پروان چڑھ رہا تھا جو تاریخ رقم کرنے والا تھا۔ یہ سیماب صفتی ہی اس کی پہچان بننے والی تھی۔ اسی کی یہ پہلی سیڑھی تھی۔ ماں کی گود جب پکارے تو اپنی جان کی بھی پروانہ کرو' یہی اس نے عملی طور پر وقت سے پہلے بتا دیا تھا۔ عملی طور پر جواب دے دیا تھا مگر اصل پکار پر لبیک کہنا ابھی باقی تھا۔

وقت مٹھی میں بند ریت کی طرح پھسلتا رہا۔ وہ عمر کی سیڑھیوں پر چڑھتا رہا۔ قد کاٹھ میں تبدیلی آتی رہی۔ اسی مناسبت سے اس کے اندر بھی بدلاؤ آ رہا تھا۔ کچھ کر دکھانے کا جذبہ بھی بڑھ رہا تھا۔ سیماب صفتی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک ہی وقت میں بہت کچھ کر لینا چاہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ ''آج کا کام کل پر نہ ڈال'' اور یہ نئی روایت ڈال رہا تھا کہ آج کا کام' ابھی اور اسی وقت کر۔ گویا وہ اپنی عمر سے بڑھ کر کام کرتا...، اور باتیں؟ باتیں بھی وہ ایسی کرتا کہ لوگ حیرانی سے اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اس دن تو سب کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی' صرف پانچ سال کا تھا۔ اس کی دادی حج سے لوٹی تھیں۔ گھر کے تمام افراد انہیں گھیرے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی روداد سنا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا ایک خواب سنانا شروع کیا۔ وہ کہنے لگیں۔ ''میں نے دیکھا کہ اپنے سارے کپڑے دھو لیے۔''

تبھی کسی نے کہا۔ ''یہ اشارہ ہے کہ آپ کا حج قبول ہو گیا ہے۔ کپڑا جسم ہے گویا آپ نے کپڑے سے میل کچیل دھو دیے یعنی تمام گناہ دھل گئے۔''

سب انہماک سے سن رہے تھے۔ ان میں وہ بھی تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جیسے وہ ایک دم سے بڑا ہو گیا ہے۔ اسی دن شام کو یہ بات ثابت ہو گئی۔

شام میں ٹی وی کے سامنے دادی بیٹھی تھیں، اپنا پسندیدہ ڈراما دیکھ رہی تھیں۔ وہیں وہ بچہ بھی بیٹھا تھا۔ ڈرامے کا وقفہ آیا۔ وقفے میں اشتہار چلنا ضروری ہے۔ اشتہار چلنے

PakiBooks.Site

لگا۔اشتہار میں ایک خوبرو لڑکی رقص کر رہی تھی۔بچے نے اسکرین کی طرف دیکھا پھر دادی کو دیکھا۔وہ تو پہلے ہی ڈراما میں منہمک تھیں اسی لیے اشتہار پر بھی ان کی نظریں مرکوز تھیں کہ بچے نے کہا۔"دادی آپ ڈانس دیکھ رہی ہیں،آپ کا ایک کپڑا تو میلا ہوگیا۔"

اتنے چھوٹے سے بچے کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر سب حیران رہ گئے۔سب اسے ایسے دیکھنے لگے کہ وہ عجوبہ ہے۔انہیں کیا خبر کہ یہ واقعی اپنی مثال آپ ہے۔اسے کسی خاص مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے،یہ باتیں اسی جانب اشارہ ہیں ورنہ اتنا چھوٹا بچہ ایسی گہری باتیں کب کرتا ہے۔شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی دماغی صلاحیت دیگر بچوں سے کئی سو فیصد زیادہ تھیں۔اس کی حاضر جوابی کا ایک اور نمونہ اس وقت سامنے آیا جب اٹک کے ایس پی آغا محبوب نے اس کے والد ڈاکٹر سید فیاض بخاری کو اپنے ہاں چائے پر بلایا۔بخاری صاحب جاتے وقت اسے بھی ساتھ لیتے گئے۔آغا صاحب نے ڈاکٹر بخاری کا پُرجوش استقبال کیا۔وہ انہیں ساتھ لے کر لان میں بچھی کرسیوں کی طرف آگئے۔وہاں بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے۔

وہ دونوں باتوں میں مشغول تھے کہ بچے نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر کرسی چھوڑ دی۔وہ کیاریوں میں لگے پھولوں کا جائزہ لینے کے لیے ادھر بڑھ گیا۔کیاریوں کا جائزہ لیتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔سامنے ہی اصطبل تھا۔بچے کو گھوڑوں سے بہت دلچسپی تھی۔وہ اصطبل کے سامنے کھڑے ہو کر گھوڑے کا جائزہ لینے لگا۔ایس پی صاحب کی نظر پڑی تو وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئے اور بولے۔"یہ گھوڑا سرکش ہے قریب نہ جانا۔"

بچے کا منہ بن گیا۔یہ بات ایس پی صاحب نے بھی نوٹ کی۔اسے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئے۔دیوار پر یحییٰ خاں کی تصویر لگی تھی۔انہوں نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔"جانتے ہو یہ کون ہیں؟"

اتنا چھوٹا بچہ کیا جانے کے فوجی وردی میں ملبوس یہ شخص کون ہے۔وہ ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ آغا صاحب نے کہا۔"یہ میرے چچا ہیں۔جنرل یحییٰ خان۔یہ صدر پاکستان بھی رہ چکے ہیں۔ان کے پاس بھی بہت سے گھوڑے تھے۔"

شاید وہ اسے رعب میں لانا چاہ رہے تھے مگر وہ کب رعب میں آنے والا تھا۔اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔"دیکھا ہے،دیکھا ہے۔آپ کو پتا ہے میرے دادا جان کون تھے؟وہ پولیس میں بڑے افسر تھے.....تھانے دار تھے تھانے دار۔ان کی بھی ایک بڑی سی تصویر ہمارے گھر میں لگی ہوئی ہے۔کبھی آیئے گا تو دکھاؤں گا۔"

بچے کے اعتماد کو دیکھ کر ایس پی صاحب بھی حیران رہ گئے۔شاید انہیں اُمید بھی نہ ہو کہ ایک چھوٹا سا بچہ اتنا پُراعتماد ہوگا۔وہ کچھ اور کہتے کہ ملازم نے آکر کہا۔"سر چائے تیار ہے۔"

سب چائے پینے چل پڑے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔بچے کے قدم عمر کی سیڑھیوں پر آگے بڑھتے رہے۔بڑے بھائی شہریار کو اسکول جاتا دیکھ وہ اب ضد کرتا کہ میں بھی اسکول جاؤں گا۔وقت بے وقت وہ بڑے بھائی کی کتابوں کو بھی ذوق وشوق سے الٹ پلٹ کر دیکھتا۔اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اسے بھی آرمی پبلک اسکول میں داخل کرا دیا۔ابھی وہ نرسری میں تھا۔اس کا داخلہ 1992 میں کرایا گیا تھا تب اس کی عمر چار سال میں چار ماہ کم تھی۔کمزور تو وہ پہلے ہی تھا۔اس وجہ سے کلاس کے بچے اسے شرارتوں کا نشانہ بناتے۔کبھی اس کے لنچ باکس پر ہاتھ صاف کر دیتے تو کبھی کسی اور طرح تنگ کرتے۔زچ ہو کر وہ ہاتھ اٹھا کر کہتا۔"تھپڑ دیکھا ہے؟"اور پھر کہتا۔"تھپڑ آیا۔"پھر چٹاخ کی آواز کے ساتھ تھپڑ سامنے والے کے منہ پر پڑتا۔گویا صغیر سنی میں ہی اس نے اپنا دفاع کرنا سیکھ لیا تھا۔اور یہی بات اسے امر بنانے والی تھی۔

نرسری میں پہلا سال مکمل ہوا، امتحانات میں وہ اوّل آیا۔گویا تعلیمی سال کا آغاز اس نے نہایت شان سے کیا۔اپنی کامیابی کی خبر اس نے سینہ تان کر ہر ایک کو سنائی۔اس کا انداز ایسا تھا جیسے پی ایچ ڈی کر لیا ہو۔اس معصومانہ انداز پر سب لطف لیتے اور بار بار اس سے پوچھتے۔"سنا ہے تم نے امتحان دیا تھا،رزلٹ کیسا رہا؟"اور وہ پھر سے اسی شان سے دوبارہ سناتا کہ میں کلاس میں فرسٹ آیا ہوں۔پریپ میں بھی اس نے نام کمایا۔اس سال اس نے ایک اور کارنامہ انجام دیا۔زندگی کی پہلی تقریر کی جسے سب نے پسند کیا۔اس سال سب سے زیادہ نمبرز بھی اس نے حاصل کیے۔1994 میں بھی کلاس میں فرسٹ آیا۔1995 میں اسے معلومات عامہ کا شوق ہوا اور اس نے تمام ممالک کی دارالحکومت، کرنسی،زبان،جغرافیہ وغیرہ یاد کر لیے جسے وہ فخر سے سب کو سناتا۔اس سال بھی اس نے فرسٹ پوزیشن پر قبضہ برقرار رکھا۔اسی سال کے امتحان کا واقعہ ہے کہ جب وہ کمرۂ امتحان میں پہنچا تو وہاں کرسی تو تھی لیکن میز نہ تھی۔وہ میز لانے کے لیے برابر والے کمرے میں چلا گیا۔میز بھاری تھی پھر بھی وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔اس کوشش میں میز الٹ گئی۔اسے سنبھالنے کی کوشش میں وہ بھی گر گیا۔اس کا سر میز کے کونے سے لگا اور خون جاری ہوگیا۔اتنی چھوٹی عمر میں بچے خون دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔روتے ہیں،چیختے ہیں لیکن وہ خاموش تھا۔دوسرے بچے شور مچانے لگے۔شور کی وجہ سے ٹیچر آگئیں۔انہوں نے پہلے خود خون روکنے کی کوشش کی،ناکامی کے بعد آیا سے بولیں۔"اسے سی ایم ایچ لے جاؤ۔"

آیا اسے سی ایم ایچ لے جانے کے لیے گیراج میں لے گئی مگر وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔وہ ایک ہاتھ کو زخم پر رکھے پیدل ہی سی ایم ایچ کی طرف بھاگی۔قسمت شاید اس بچے کو سی ایم ایچ دکھانا چاہتی تھی۔سو اس نے دیکھ لیا۔

ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر دی۔آیا واپس لے کر آئی تو ٹیچر نے کہا۔"آپ گھر چلے جاؤ،آپ کا پیپر ہم بعد میں لے لیں گے۔"

اس نے ٹیچر کو ایک نظر دیکھا پھر بولا۔"نہیں میڈم،معمولی چوٹ ہے۔میں پیپر دوں گا۔"

اس نے ضد کر کے نہ صرف پیپر دیا بلکہ 100/ 98% مارکس حاصل کیے۔یہ سال اس کے لیے اس لیے بھی اہم ثابت ہوا کہ اسی سال اس کے چھوٹے بھائی نے نرسری میں اور بڑے بھائی نے فورتھ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔

انڈور گیم میں اسے تقریباً سب ہی پسند تھے۔اب اس کے شوق میں ایک اور کھیل کا اضافہ ہوگیا۔اسے اسکریبل سے دلچسپی ہو گئی تھی۔وہ اس کھیل میں خوب دماغ لگاتا۔ڈاکٹر بخاری نے بیٹے کا رجحان اسکریبل میں دیکھا تو اس کے گر بتانے لگے کہ کیسے کھیلا جاتا ہے۔وہ والد کے بتائے ہوئے پوائنٹس کی وجہ سے دوسروں کو چت کر دیتا۔اس کھیل میں وہ دقاق بن چکا تھا۔والد بھی کبھی جان بوجھ کر اس سے ہار جاتے تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی۔اسی زمانے میں اس نے ایک مضمون لکھا جسے اٹک نامہ میں تحسین صاحب نے شائع کرا دیا۔اب وہ اٹک نامہ کو لیے ایک ایک کے پاس جاتا اسے دکھاتا کہ دیکھو یہ میں نے لکھا ہے۔

اتنی سی عمر میں تیسری جماعت کا طالب علم اور اس کا یہ انداز،جیسے کوئی اہم کتاب لکھ لی ہو۔یہ اس کی خوداعتمادی ہی تھی جو اسے سب سے الگ دکھا رہی تھی۔اس کی خوداعتمادی ہی تھی جو اسے ممتاز بناتی تھی۔وہ پُراعتمادی میں اتنا آگے بڑھ رہا تھا کہ لوگ انگشت بہ دنداں رہ جاتے۔گھر کی ملازمہ نازو کو ایک بھڑ نے کاٹ لیا۔بھڑ کے ڈنک کی جلن سے بے حال ہو کر نازو نے رونا چیخنا شروع کر دیا۔بچے نے نازو کی آہ و بکا سنی تو اس نے اپنا بیڈمنٹن کا ریکٹ اٹھایا اور بھڑوں کے چھتے پر پہنچ گیا۔پیچھے سے لوگ آواز دیتے رہ گئے مگر اس نے کسی کی نہ سنی اور ریکٹ مار مار کر چھتا نیچے گرا دیا۔بھڑ غضب ناک ہو کر اس پر حملہ آور ہو گئیں۔اس نے اس چھوٹی سی عمر میں بھی ایک سسکی تک نہ بھری اور فاتحانہ انداز میں ریکٹ اٹھائے نازو کے پاس آکر بولا۔"دیکھا نازو میں نے تمہارا بدلہ لے لیا۔"

نازو نے بھڑوں کے کاٹنے سے سوجے ہوئے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔"اسفند بھائی۔بھڑوں نے تو آپ کو بھی کاٹ لیا ہے۔کیا آپ کو درد تکلیف نہیں ہو رہی ہے؟"

اسفند نے سینہ اونچا کر کے کہا۔"میں مرد ہوں اور مرد کبھی روتے چیختے نہیں ہیں۔"

اس چھوٹی سی عمر میں بھی اس کا لہجہ کسی شیر جواں سا تھا۔بھڑ کے کاٹنے سے کئی دن تک چہرہ سوجا رہا۔بخار بھی آگیا تھا مگر اس نے کسی سے کوئی شکایت نہیں کی۔گویا وہ ہر قدم پر بتا رہا تھا کہ مرد ہوتے کیسے ہیں۔

وہ قدم قدم پر خود کو مرد ثابت کرنے پر آمادہ رہتا۔جب وہ دوسری جماعت میں تھا۔اس وقت کا واقعہ ہے کہ اسے کسی نے اطلاع دی کہ اس کے بڑے بھائی شہریار سے کسی لڑکے کی لڑائی ہو گئی ہے۔اتنا سننا تھا کہ وہ ادھر دوڑ پڑا۔راستے میں اسے ایک چھڑی پڑی ہوئی مل گئی۔اس نے اسے اٹھا لیا اور وہاں جا پہنچا۔وہاں شہریار سے ایک لڑکا گتھم گتھا تھا۔اس نے

یہ بات قابل غور ہے کہ بڈھ بیر معرکے میں اسفند یار بخاری کے کمانڈ سنبھالنے سے پہلے 28 لوگ شہید اور 29 زخمی ہو چکے تھے۔شہید نے تقریباً 6:30 پر کمانڈ سنبھالی۔اس کے بعد پاک فوج کے صرف دو جوان زخمی ہوئے اور ایک کو شہادت نصیب ہوئی یعنی اسفند یار نے یہ شہادت خود ڈھونڈ کے حاصل کی۔یہ آپریشن دو گھنٹے میں ختم ہوگیا۔پاک فوج نے 14 دہشت گردوں کو انجام تک پہنچایا۔ایک بھی دہشت گرد بچ کر نہ جا سکا۔اسفند یار کی بہترین حکمت عملی نے ملک وقوم کو ایک خوفناک سانحے سے بچالیا۔اس عظیم قربانی پر پاک فوج اور حکومت اسفند یار کو جتنے بڑے اعزازات سے بھی نوازے کم ہے۔

PakiBooksSite

آؤ دیکھا نہ تاؤ' چھڑی سے اس لڑکے کی پٹائی شروع کر دی۔ایک ساتھ دو سے نمٹنا مشکل تھا اس لیے وہ لڑکا میدان چھوڑ کر بھاگ لیا۔

شاید وہ بچہ سمجھ گیا تھا کہ لڑائی حوصلے' ہمت سے جیتی جاتی ہے۔اسی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کئی گنا بڑے لڑکے سے بھڑ گیا تھا۔چھڑی کے استعمال سے اس نے عقلمندی کا بھرپور ثبوت دیا تھا۔اتنے چھوٹے سے بچے کے گھونسے تھپڑ میں وہ بات نہ ہوتی جو چھڑی نے کر دکھایا تھا۔اتنی سی عمر میں وہ بتا رہا تھا کہ وہ حوصلے کا پہاڑ ہے۔یہ بھی آرمی پبلک اسکول کا ذکر ہے۔میڈم زرینہ بچوں کو آرٹ ورک کرا رہی تھیں۔اسفند کو کارڈ بورڈ کاٹنا تھا۔وہ کٹنگ کر رہا تھا کہ بلیڈ اس کی انگلی میں لگا اور خون ٹپکنے لگا۔خون دیکھ کر بچے شور مچانے لگے۔''خون خون'' لیکن اس کے چہرے پر نہ کوئی تکلیف کا احساس تھا اور نہ خوف کا۔میڈم اس کے پاس پہنچیں تو اس وقت تک اس نے انگلی سے ٹپکتے خون سے کاپی پر PAK لکھ لیا تھا۔میڈم نے ڈانٹا۔''یہ کیا بے وقوفی ہے؟''

اس جملے کا اثر اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر چھوڑ گیا۔اس نے کہا۔''میڈم خون تو نکل ہی چکا تھا۔اسے ضائع کیوں جانے دیتا۔سوچا اس سے وطن کا نام لکھ لوں۔''

اف ایسا جذبہ'میڈم کو اندر تک دہلا گیا۔اتنی سی عمر اور وطن سے محبت کا یہ عالم۔گویا وطن کے نام پر وہ اپنا خون دینا اتنی سی عمر میں سیکھ گیا تھا۔وہ لوگ جو ائر کنڈیشن گھروں میں بیٹھ کر لمبی لمبی تقریریں تیار کرتے ہیں'وطن کی ایسی محبت ان کے دل میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔وطن کی محبت تو بچپن سے رگوں میں سرائیت کرتی ہے۔یہ وہ جذبہ ہے جو ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔برسوں کی ریاضت سے حاصل ہوتا ہے اور اس بچے میں یہ جذبہ پیدائشی تھا۔

اب وہ کلاس فور میں پہنچ چکا تھا۔اس نے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو آرمی پبلک اسکول سے ایم آر ایف ڈگری سائنس کالج' کامرہ میں منتقل کر دیں۔جب کہ شہریار نے جماعت ششم میں ٹاپ کیا تھا۔گویا بچے ذہین تھے شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ بچوں کے ٹی سی لینے اسکول پرنسپل کے پاس پہنچے تو انہوں نے اسکول چھوڑنے کی سند دینے سے انکار کر دیا۔اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اتنے ذہین بچے ان کے اسکول سے نکل جائیں۔دونوں میں کافی دیر تک بحث جیسی کشیدگی رہی۔دونوں ہی باتوں سے قائل کرنے کی مہم چلاتے رہے۔وہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست تھے۔دونوں کی اپنی اپنی مجبوری تھی۔وہ بچوں کو جانے دینا نہیں چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب بھی اپنا ارادہ بدلنے پر راضی نہ تھے۔ان کی ضد سے مجبور ہو کر پرنسپل نے سند دے دی۔

شہریار کو ایم آر ایف میں جماعت ہفتم اور اسے جماعت پنجم میں داخلہ ملا۔گویا 1998 ان کے لیے تبدیلی کا سال بنا۔اسی دوران ایک اور تبدیلی رونما ہوئی جس نے ڈاکٹر صاحب کا سر فخر سے بلند کر دیا۔شہریار کو چیف آف ائر اسٹاف گولڈ میڈل مل گیا۔

اگر غور کیا جائے تو یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ڈاکٹر بخاری کے سارے ہی بچے پڑھائی میں تیز تھے اور کیوں نہ ہوتے کہ ان پر ڈاکٹر بخاری کی توجہ خصوصی تھی۔وہ بچوں کو دوست بنا کر مشورہ دیتے تھے۔ہر ہر قدم پر رہنمائی کرتے تھے اس لیے بچے میدانِ علم کے شہسوار بنے ہوئے تھے۔بڑا بیٹا شہریار وہ تو گویا تیز رفتاری میں اپنی کلاس کو پیچھے چھوڑے جا رہا تھا۔اس نے چیف آف ائر اسٹاف گولڈ میڈل جیتا پھر 1999 کے کیڈیٹ کالج حسن ابدال کے تحریری مقابلے میں شاندار کامیابی حاصل کی اور اب وہ انٹرویو کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔جب کہ اسفند یار جماعت ششم میں تھا پھر وہ وقت بھی آ گیا جب شہریار کا کیڈیٹ کالج میں داخلہ ہوا۔اس دن گھر بھر کو ایک ایسی خوشی محسوس ہوئی جیسے سب کی دلی تمنا یہی تھی۔

اتوار کے اتوار گھر والے اس سے ملنے کیڈٹ کالج جایا کرتے تھے۔اس موقع پر ماں ڈھیر ساری چیزیں بناتی تھی اور پھر یہ چھوٹی سی فیملی وہیں Visiting hour میں ایک طرف بیٹھ کر کھانا کھاتی۔

کیڈٹ کالج میں یوم والدین کا خاصا اہتمام ہوتا تھا۔اس موقع پر تمام والدین شرکت کے لیے آتے تھے۔اعلیٰ افسران بھی شریک ہوتے تھے۔نومبر 1999 میں منعقدہ یہ تقریب اس معنوں میں اہم تھی کہ شہریار کی وجہ سے پوری فیملی ناظرین میں شامل تھی جبکہ ڈاکٹر بخاری میڈیکل ٹیم کے سربراہ تھے۔ان کی ڈیوٹی صدر پاکستان جو خصوصی شرکت کے لیے آئے تھے ان کے ساتھ تھی۔

چائے کے وقفہ میں ڈاکٹر بخاری صدر پاکستان جناب رفیق تارڑ کے ساتھ تھے کہ انہیں ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی Sir i am asfand yar bukhari

صدر پاکستان نے حیرانی اور شفقت سے اس بچے کی

طرف دیکھا جو بڑے اعتماد سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ڈاکٹر بخاری بھی حیران کہ وہ اتنی سخت سیکیورٹی میں یہاں کیسے آ گیا۔انہوں نے جلدی سے کہا۔''سر یہ میرا بیٹا ہے۔''

صدر محترم نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور کہا۔''please take tea''

دعوت دینے پر اسفند یار نے اس خود اعتمادی کے ساتھ ایک ایسا جملہ ادا کیا کہ صدر پاکستان اور پرنسپل کے علاوہ تمام متوجہ مہمان بھی مسکرا دیے۔اس نے نہایت پُر اعتماد انداز میں کہا۔''جناب صدر بہت بہت شکریہ...ذرہ نوازی ہے آپ کی۔''پھر اس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینے لگا۔

ایسا اعتماد ہر کسی میں نہیں ہوتا'صرف ان میں آتا ہے جن کی پرداخت ہی اس نہج پر ہوئی ہو۔ڈاکٹر بخاری بچوں کو تاریخ کے باہمت اور جری کرداروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے تاکہ بچے ان کی زندگی سے کچھ حاصل کر سکیں۔ایک بار انہوں نے میجر شبیر شریف شہید نشان حیدر کی سوانح سنانی شروع کی جسے اسفند یار بڑے غور سے سن رہا تھا۔کلی طور پر منہمک تھا جیسے ہر طرف سے بے خبر ہو گیا ہو۔سنتے سنتے یکا یک اس نے سوال کر دیا۔''شہید کی حالات زندگی پر کوئی کتاب مل جائے گی؟''

''لکھی تو ضرور گئی ہوگی۔میں پتا کرواتا ہوں۔''والد نے اسے تسلی دی۔

یہ ایک المیہ ہے۔ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں'ہمارے ہیرو کی حالاتِ زندگی پر بہت کم لکھا جاتا ہے'ڈھونڈے سے شاید گنتی کی کتابیں ملیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے اپنے ہیرو سے ناواقف ہوتے ہیں اور وہ معاشرے کو بگاڑنے والی فلمیں جن کو ایک سازش کے تحت وطن عزیز میں دکھایا جا رہا ہے اس کے بارے میں زیادہ جاننے لگے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بچے سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے کتاب کی تلاش شروع کر دی۔کئی کتب فروش سے بھی استدعا کی کہ وہ میجر شبیر شہید کی حالاتِ زندگی پر کتاب ڈھونڈیں۔بالآخر میجر شبیر شہید پر کتابیں مل گئیں۔ڈاکٹر صاحب نے دوستوں سے تلاش کروا کر اشفاق حسین کی ''فاتح سبونہ'' منگوا دیں۔وہ اسے دن رات اس طرح سے پڑھنے لگا جیسے وہ اسے حفظ کر کے چھوڑے گا۔

اس کتاب میں اس کی دلچسپی دیکھ کر گھر والے بھی حیران

☆2006ء میں اٹک میونسپل کمیٹی ہال میں کیڈٹ ہال میں کیڈٹ اسفند یار کے اعزاز میں میونسپل ایڈمنسٹریشن نے ایک باوقار تقریب کا اہتمام کیا۔تحصیل ناظم قاضی خالد محمود اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے آخر میں کیڈٹ اسفند یار بخاری کو انعامات سے نوازا گیا۔

☆تحصیل ناظم قاضی خالد محمود نے کیڈٹ اسفند یار بخاری کو یادگاری شیلڈ پیش کی۔

☆پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر سجاد احمد نے اسفند یار کو گولڈ میڈل پہنایا اور دو ہزار روپے کیش پرائز بھی دیا۔

☆معززین شہر نے اٹک کے اس قابلِ فخر سپوت پر انعامات کی بارش کر دی۔

☆تحصیل کونسل نے ایک قرارداد منظور کی اور اس پر عمل کرتے ہوئے کیڈٹ اسفند یار بخاری کی تصویر تحصیل پبلک لائبریری میں آویزاں کر دی گئی تاکہ ضلع اٹک کے طلبہ میں جذبہ مسابقت نمو پائے۔یہ کسی بھی سترہ سالہ طالب علم کے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔

☆ضلع کونسل اٹک نے 21 فروری 2006ء میں قرارداد نمبر 12 پاس کی کہ کیڈٹ اسفند بخاری نے پورے ملک میں اٹک کا نام روشن کیا ہے'لہٰذا یہ اٹک کا فخر ہے۔یوں اسفند کو باضابطہ فخرِ اٹک کے خطاب سے نواز دیا گیا۔

☆اپریل 2006ء اٹک فیسٹیول میں اسفند یار کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب منعقد کی گئی جس میں صوبائی وزیر شجاع خانزادہ نے کیڈٹ اسفند کو ''فخرِ اٹک'' کی اعزازی شیلڈ سے نوازا۔

☆2006ء میں اسی تقریب میں صوبائی وزیر محمد انور نے کیڈٹ اسفند یار کو چمکتا ہوا گولڈ میڈل پہنایا اور مبلغ 1000 روپے کیش پرائز بھی پیش کیا۔یہ انعام ایجوکیٹر کلب اٹک کی طرف سے تھا۔

☆2006ء میں اسی تقریب میں ڈی سی او اٹک نے مبلغ دس ہزار روپے کیش پرائز ضلع کونسل کی طرف سے اس ہونہار طالب علم کو پیش کیے۔

☆2006ء میں اسی موقع پر ناظم یونین کونسل ناڑہ، سردار واحد علی خان نے اٹک کے اس سپوت کو 1000 روپے کیش پرائز دیا۔

PakiBooks.Site

☆ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں 2007ء میں بہترین کارکردگی پر 3rd ٹرم میں کارپورل کا عہدہ دیا گیا۔
☆ 2007ء میں ملٹری کی مشقوں میں اعلیٰ کارکردگی پر ٹرم کمانڈر نے آپ کو ”جنرل رومیل“ کا خطاب دیا۔
☆ 2007ء میں باکسنگ مقابلے میں اپنے حریف کو ناک آؤٹ کر کے مقابلے میں فاتح ٹھہرے۔
☆ 2007ء میں پیرا گلائیڈنگ کورس بطریق احسن کرنے پر سرٹیفکیٹ آف میرٹ ملا۔
☆ 2008ء میں پیرا ٹروپنگ کورس خوش اسلوبی سے مکمل کیا۔ سرٹیفکیٹ آف میرٹ کے مستحق بنے۔
☆ 2008ء میں تیراکی میں گولڈ میڈل جیت لیا۔
☆ 2008ء میں گھڑ سواری میں شیلڈ حاصل کی۔
☆ 2008ء میں اسفند ہاکی ٹیم کے کپتان تھے۔ آپ کی کپتانی میں طارق کمپنی نے چیمپئن شپ جیت لی۔ فائنل میں واحد گول اسفند نے کیا تھا، اس نے گولڈ میڈل اور ٹرافی حاصل کی۔
☆ 2008ء میں عسکری مضامین میں پورے کورس (118-L/C) کو ٹاپ کیا اور ملٹری Tactics میڈل جیت لیا۔
☆ 25 اکتوبر پورے کورس کے بہترین کیڈٹ قرار پائے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کے سب سے بڑے اعزاز Sword of Honour حاصل کیا۔
☆ 2009ء میں سعودی عرب میں جنگی مشقوں الصمصام 3 میں حصہ لیا۔ گورنمنٹ آف سعودیہ عربیہ نے اعلیٰ کارکردگی پر گولڈ میڈل عطا کیا۔
☆ 2010ء میں لیفٹیننٹ ٹو کیپٹن امتحان میں پاکستان آرمی میں ٹاپ کیا۔

تھے۔ ایک دن کسی نے سوال کرہی دیا کہ اس کتاب میں ایسی کیا بات نظر آ گئی کہ اسے بار بار پڑھ رہے ہو؟

اس نے جواب دینے سے پہلے سوال کرنے والے کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”دلچسپی لینا الگ بات ہے اور لفظوں میں چھپی باتوں کو سمجھنا الگ بات ہے۔ میں اس کتاب کو اس لیے نہیں پڑھ رہا ہوں کہ لکھنے والے نے قلم کا جادو جگایا ہے بلکہ اس کتاب کے ذریعہ میں شہید کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان کی حالات زندگی نے مجھے ایک نئی راہ سجھا دی ہے۔ انہیں میں نے اپنا آئیڈیل مان لیا ہے۔ وہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں۔ اس کتاب میں مذکور واقعات نے بتا دیا ہے کہ وہ معمولی انسان نہیں عظیم سے عظیم تر تھے۔ ہر عظیم انسان اپنے افعال اور کردار سے بتا دیتا ہے کہ وہ عظیم ہے۔ میں تو انہیں سپر نشان حیدر کہوں گا۔ اگر میں خطاب دینے کا اختیار رکھتا تو انہیں اسی لقب سے یاد کرتا، مجھے اس کتاب سے ان کی زندگی کے بہت سارے گوشے سے واقفیت ہوئی اور میں نے جان لیا ہے کہ عظیم انسان کیسے بنتا ہے۔“ اس نے اپنا جملہ پورا کر کے سوال کرنے والے کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہا۔ ”1965ء میں ان کی جواں مردی نے کس طرح میدان کا پانسا پلٹا تھا۔ اس کا ذکر پڑھ کر تو میں جذباتی ہو رہا ہوں۔“

بار بار جنگ ستمبر کے ان واقعات کو وہ پڑھتا جس کی وجہ سے میجر شہید ستارۂ جرأت کے حقدار بنے تھے۔ 1971ء میں انہوں نے کس طرح میجر نارئین کو اپنے ہاتھوں سے جہنم کی راہ دکھائی تھی یہ پڑھ کر اس کا لہو جوش میں آ جاتا۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگتا جیسے وہ خود بھی میجر شریف جیسا جری بننا چاہتا ہو۔ میجر شریف شہید کی سوانح نے گویا اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس نے شاید ابھی دنوں ٹھان لیا تھا کہ وہ بھی پاک فوج کا حصہ بنے گا۔

شہریار بخاری کیڈیٹ کالج حسن ابدال پہنچ چکا تھا۔ اب وہ بھی بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کیڈٹ کالج میں داخلے کا خواب دیکھنے لگا۔ جبکہ والدین کا خیال تھا کہ وہ اپنے والد کی طرح ایک کامیاب معالج بنے لیکن اس نے دل میں کچھ اور ٹھان لیا تھا اور دل تو پاگل ہے جو سوچ لے وہی ہو کر رہتا ہے مگر ابھی اس میں کئی اڑچنیں تھیں۔

اڑچنیں کیسی بھی ہوں وہ ان سے نبرد آزما ہونا زیادہ پسند کرتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ وہ جو ٹھان لیتا اسے پورا کر کے ہی دم لیتا۔ اپنی تیز دماغی اور حاضر جوابی کے سبب وہ یہاں بھی یعنی ایم آر ایف کالج کے اساتذہ کی آنکھ کا تارا تھا۔ کھیل کے میدان کا ہیرو تھا اور ایک اچھا مقرر بھی تھا۔ جماعت ششم میں اس نے اوّل آ کر ایک بار پھر سب پر دھاک بٹھا دی تھی۔ اب وہ جماعت ہفتم میں تھا لیکن سر میں سودا سما گیا تھا کہ اسے کیڈٹ کالج جوائن کرنا ہے۔ کیڈٹ کالج حسن ابدال میں داخلہ آسان نہیں۔ یہ کوئی انگلش اسکول نہیں کہ ڈونیشن دیا

☆ 2011ء میں کوئٹہ میں Basic Infantry Course بطریق احسن کیا اور Certificate of Honour کے حق دار قرار پائے۔
☆ 2011ء میں کوئٹہ میں Heavy Weapon Course کیا اور Cerificate of Honour ملا۔
☆ اسفند نے پاکستان آرمی کے لیے دشمن کی پوزیشن کا پتا لگا کر نشانہ بنانے والا آلہ Target Acquisition Instrument ایجاد کر کے واہ فیکٹری بھجوایا۔ اس وقت کے COAS جنرل پرویز کیانی کی طرف سے تعریفی خط ملا۔ یقیناً یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔
☆ 2012ء میں جنوبی وزیرستان میں 80-75 دہشت گردوں سے 11 جوانوں کے ساتھ مقابلہ کیا۔ دہشت گردوں نے ان کو گھیرے میں لیا تھا مگر کپتان اسفند اور ان کے ساتھیوں نے 8 دہشت گردوں کو جہنم کی راہ دکھائی اور متعدد کو زخمی کیا۔ نہایت بہادری کے ساتھ ان کا گھیرا توڑ کر باہر نکل آئے۔ ان کا صرف ایک سپاہی تاج محمد زخمی ہوا۔ اس کارنامے پر یونٹ میں بہت پذیرائی ملی۔
☆ 2013-U-N مشن پر لائبیریا گئے۔ وہاں سے Advance Succesful Leader Diploma حاصل کیا۔
☆ 2013ء میں لائبیریا میں آپ کو اعلیٰ کارکردگی پر U-N امن میڈل دیا گیا۔
☆ 2015ء نوشہرہ میں Mid Career Course میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ سرٹیفکیٹ آف ایکسی لینس ملا۔

اور کاؤدی اسٹوڈنٹ کو بھی کامیاب قرار دے دیا گیا لیکن یہاں سخت قوانین کی سیڑھی سے ہی اوپر تک پہنچا جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہاں داخلہ بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ داخلے کے امتحان میں کامیابی ضرور حاصل کرے گا۔

پڑھائی میں تو وہ تیز تھا ہی اتنا تیز کہ اساتذہ نے اس سے ڈھیروں امیدیں باندھ لی تھیں۔ اس کی کلاس ٹیچر میڈم امتیاز تھیں۔ انہوں نے اس کی پروگریس رپورٹ پر لکھا تھا۔ ”مجھے فخر ہے کہ میں نے اسفند یار کو پڑھایا۔ یہ ایک منی کمپیوٹر ہے۔“ وہ اس کی فارسی دانی پر بھی خوش تھیں کہ اردو میں جس طرح وہ فارسی کا استعمال کرتا تھا وہ اسے ممتاز بنا دیتا۔ ایک بار انہوں نے فیس معافی کی درخواست لکھنے کے لیے کہا جو اس نے لکھ کر دکھایا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ درخواست آج تک انہیں لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ اس نے لکھا تھا۔ ”بخدمت جناب پرنسپل ایم آر ایف ڈگری سائنس کالج کامرہ کینٹ۔ جناب عالی! مدبانہ التماس ہے کہ غربت و افلاس نے برسوں سے فدوی کے گھر ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ پدر بزرگوار ایک سرکاری ملازم ہیں۔ ان کی تنخواہ ارد پر سفیدی کی مانند ہے۔ ان دگرگوں حالات میں گزر اوقات انتہائی دشوار ہے۔ نیز فیس کی ادائیگی تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ براہ کرم فدوی کی فیس معاف فرما کر دعاؤں کا حسین تحفہ حاصل کریں۔ آپ کا شاگرد رشید اسفند یار بخاری جماعت ہفتم بی۔“

یہ ایک درخواست نہیں ایک شہ پارہ تھا اس لیے کہ اسے ایک ساتویں کلاس کے لڑکے نے لکھا تھا۔ اگر وہ کلاس میں بیٹھ کر نہ لکھتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اس نے نقل کیا ہے، ایسی اردو ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اسی وجہ سے میڈم امتیاز کو وہ درخواست یاد رہ گئی تھی۔

ایک میڈم امتیاز ہی نہیں اسکول کے تمام اساتذہ، تمام طلبا اس کی تیزی و طراری کے قائل تھے اسی لیے سب اس سے پیار کرتے تھے۔ اسکول فیلو مرعوب رہتے۔ انہی طلبا میں ایک بلال باسط بھی تھا۔ وہ دونوں جماعت ہفتم میں تھے مگر سیکشن جدا تھے۔ بلال تو اسے جانتا تھا اس کی صلاحیت اور لیاقت کا وہ معترف تھا مگر اسفند یار اس سے ناواقف تھا۔ پھر ایک چھوٹے سے واقعے نے ان دونوں کو بہت قریب کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ بلال کی اپنی کلاس کے ایک لڑکے سے تکرار ہو گئی۔ تکرار کے دوران اس لڑکے نے ایک دوسرے لڑکے کو بلا لیا۔ اس نے جسے بلایا وہ لڑکا کلاس کے بدمعاش لڑکوں میں سب سے زیادہ مشہور تھا اور اسے سب ڈان کہہ کر پکارتے تھے۔ ڈان نے آتے ہی بلال پر چڑھائی کر دی۔ کئی گھونسے لگا دیے۔ بلال نے گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔ اسفند کی نظر پڑی تو وہ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے گلوخلاصی کرا دی۔ جاتے جاتے

PakiBooks.Site

ڈان دھمکی دے گیا کہ چھٹی کے وقت دیکھ لوں گا۔ اس دھمکی سے بلال بری طرح ڈر گیا۔ اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسفند نے کہا۔ ”ڈرو نہیں ان کو میں دیکھ لوں گا۔“ پھر وہ اپنے سیکشن کی طرف چلا گیا۔

چھٹی کی گھنٹی بجی تو بلال خوفزدہ سا باہر نکلا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ لڑکے لڑاکا ہیں۔ ہر ایک سے لڑتے بھڑتے ہیں۔ یقیناً دونوں باہر انتظار میں ہوں گے کیونکہ وہ خود ایک سیدھا سادا بندہ تھا۔ نہایت امن پسند، سب سے پیار کرنے والا۔ اب تک اس کی کسی سے لڑائی ہوئی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے زیادہ خوفزدہ تھا کہ ان سے کیسے نمٹے گا۔

وہ سہمتے ہوئے گیٹ سے باہر نکلا۔ اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں کہ ایک پیڑ کے نیچے کھڑے وہ دونوں نظر آگئے۔ وہ ان سے کترا کر میدان پار کرنا چاہتا تھا کہ وہ دونوں اس کی جانب لپکے نزدیک پہنچتے ہی انہوں نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ بری طرح پٹ رہا تھا کہ پتا نہیں کہاں سے اسفند یار کسی شیر کی طرح دھاڑتا ہوا آیا اور ان لڑکوں پر پل پڑا۔ ذرا سی دیر میں پانسا ہی پلٹ گیا۔ اس نے مار مار کر ان دونوں کی حالت خراب کر دی تھی۔ وہی ڈان جس کی دہشت پورے اسکول میں تھی اس نے فرار میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ اس کے جانے کے بعد دوسرے لڑکے نے جس سے بلال کی تکرار ہوئی تھی اس نے بلال سے معافی مانگی تب جا کر اس کی جان چھوٹی۔

ان دونوں کے فرار کے بعد اسفند یار نے بلال سے کہا۔ ”کبھی کسی سے الجھنا نہیں اور حق پر ہو تو ڈرنا نہیں۔“

بلال آج ایک بڑی کمپنی Loreal میں مینیجر کے عہدے پر ہے مگر اس نے اسفند کے اس جملے کو زندگی کا اہم ترین سبق سمجھ رکھا ہے۔

اسفند یار ایسا ہی تھا کہ ناانصافی پر ہر ایک کی مدد کرنے پر تیار ہو جاتا تھا اور کوئی نہ کوئی ایک ایسا نکتہ سمجھا دیتا کہ مقابل کے لیے سبق ثابت ہوتا۔

1999 میں جب شہریار کا داخلہ کیڈٹ کالج میں ہوا تو اسے چھوڑنے گھر کے تمام لوگ کالج تک آئے۔ اس وقت اسفند یار جماعت ششم میں تھا۔ اس نے بھائی سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اکیلے ہونے کی وجہ سے پریشان نہ ہونا......بس دو سال کی بات ہے...... مجھے بھی آیا ہی سمجھو۔“

اس نے یہ بات اتنے اعتماد سے کہی تھی کہ سب حیران رہ گئے۔ بات تھی بھی حیرانی کی اس لیے کہ ابدالین بننا آسان نہیں، وسیع مطالعہ، تیز حاضر دماغی، جسم چست درست اور پھرتیلا ہو تو سوچا بھی جائے کہ شاید قسمت ساتھ دے دے اور لڑکا ابدالین بن جائے۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ آیا ہی آیا اور اس نے اپنی بات سچ کر دکھائی۔ یکم مئی 2001 کو وہ اس کالج کا اسٹوڈنٹ بن گیا۔ اسے چھوڑنے کے لیے بھی سب کے سب گئے تھے۔ شہریار سے پہلی بار رخصت طلب کرتے ہوئے سب آبدیدہ تھے۔ خود شہریار کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں لیکن اسفند یار سے مل کر جاتے ہوئے الٹا ہوا تھا۔ سب کی چشم گریاں تھیں اور وہ ہنس رہا تھا۔ لطیفے سنا رہا تھا۔ سب کو تسلی دے رہا تھا کہ آپ لوگ میری فکر ہی نہ کریں۔

عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ لوگ جاتے جاتے بچوں کو حوصلہ دیتے، سمجھاتے کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ اکیلے رہنا سیکھو۔ یہاں سے جب نکلو گے تو فوجی پوشاک میں ہو گے۔ تمہاری زندگی ایک نیا رخ لے رہی ہے اس لیے یہ تھوڑی سی پریشانی جھیل لو۔

بچے روتے سسکتے اور پھر اداسی کا بوجھ ڈھوتے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ جاتے لیکن اسفند یار تو ایسے خوش تھا جیسے وہ برسوں سے یہیں رہتا ہو۔ اس نے خود گھر والوں کو احساس کرایا کہ اب جانے کا وقت ہو چکا ہے پھر وہ سب کو الوداع کہنے گیٹ تک آیا تھا اور شگفتہ جملوں سے سب کو ہنسا رہا تھا جیسے یہی اس کی منزل ہے اور اپنی منزل پر وہ پہنچ چکا ہے اس لیے اتنا خوش ہے۔

اس نے خوشی خوشی سب کو الوداع کہا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ یہاں سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہونے والا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیا۔

ابدالین بننے کے ساتھ اس نے اپنی محنت اور صلاحیت آزمانا شروع کر دیں تاکہ خود کو منوا سکے۔ مقابلہ ہیرا کی ہو یا کوئی اور گیم ہر ایک میں اس نے بھرپور مہارت کا ثبوت دکھایا لیکن ہاکی تو گویا اس کا جنون تھا۔ وہ میدان میں اترتا تو مقابل ٹیم دیکھتی رہ جاتی۔ وہ گیند کو لے کر یوں آگے بڑھتا جیسے گیند اس کی اسٹک سے چپک گئی ہے۔ شروع کے دنوں کے کئی میچ تو یادگار کہے جا سکتے ہیں۔ انہی میں ایک میچ وہ بھی ہے جو اس کی ٹیم نے ملٹری کالج جہلم میں کھیلا تھا۔ اس ٹیم کے انچارج عابد صاحب تھے۔ ایم سی جے اور سی اے ایچ دونوں روایتی حریف رہے ہیں۔ مقابلہ کانٹے کا ہوتا تھا۔ اس دفعہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ فٹ بال اور باسکٹ بال کے میچز میں سی سی ایچ کو شکست کا مزہ چکھنا پڑا۔ اب سب ہاکی ٹیم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُمید سب نے ایک ہی لگا رکھی تھی کہ اسفند یار میدان میں آیا اور میچ ان کے حق میں ہوا۔ لیکن کرنی کو کون روکے؟ جس دن میچ ہونا تھا اسی رات اسفند یار کو بخار نے پچھاڑ دیا۔ وہ ساری رات بخار میں تپتا رہا پھر بھی جب ٹیم میدان میں جانے کے لیے نکلی تو وہ بھی ساتھ ہو گیا۔ میچ شروع ہونے سے قبل عابد صاحب نے اس کی حالت دیکھی تو اسے کھیلنے کی اجازت نہ دی اور کہا تم کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ میچ تھا اس لیے کمرے میں تنہا سو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا دل ہی نہیں لگا اس لیے وہ دوبارہ سے فیلڈ میں آگیا کہ تماشائی بن کر وہ کھیل دیکھے گا۔ بیٹھنے کو وہ تماشائیوں کے درمیان بیٹھا تھا مگر اس کی آواز پورے میدان میں گونج رہی تھی۔ وہ وہیں سے اپنے ٹیم کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ شاید اس کے نہ ہونے سے ہی ایسا ہوا کہ ایم سی جے، بی سی ایچ پر حاوی ہونے لگی اور ہاف تک ایک گول سے برتر تھی۔ اپنی ٹیم کی شکست دیکھ کر اس نے عابد صاحب سے التجا کی کہ اسے ایک موقع دیا جائے مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

ٹیم پر دباؤ برقرار تھا۔ لڑکے ویسا کھیل نہیں پا رہے تھے جیسا انہیں کھیلنا چاہیے تھا۔ ان کی کمزوری کو وہ سمجھ چکا تھا۔ اس لیے وہ پہلے سے زیادہ تیز آواز میں ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ ایک اور گول ہو گیا۔ اب صفر کے مقابلے میں دو گول تھے۔ شکست یقینی تھی۔ لڑکوں کا رہا سہا حوصلہ بھی ٹوٹ چکا تھا کہ اسفند یار اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے عابد صاحب کے آگے گویا ہاتھ جوڑ دیے کہ ایک موقع دیا جائے۔ ٹیم کی گرتی ہوئی حالت اور اس کا بار بار اجازت طلب کرنا۔ عابد صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اجازت دے دی۔

ایک شانِ بے نیازی سے اسفند یار میدان میں اترا اور ایک معجزہ سا ہو گیا۔ پہلے ایک گول کیا اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اختتام سے کچھ قبل اس نے اعجاز کو پاس دے کر دوسرا گول بھی کرا دیا۔ اس طرح خاتمہ سے چند لمحے پہلے میچ ڈرو ہو گیا۔

اسفند یار صرف ہاکی ہی کا کھلاڑی نہیں تھا، وہ فٹ بال، ٹیبل ٹینس اور بیڈمنٹن کا بھی غضب کا کھلاڑی تھا۔ گویا اس میں ایک ایسا نوجوان تھا جو ہر کھیل میں صرف اول آنا جانتا تھا۔ یہی نہیں وہ قلم کا بھی دھنی تھا۔ مسلسل پانچ سال تک اس کی اردو اور انگریزی کی تحریریں کالج میگزین کی زینت بنتی رہیں۔ یوں وہ مسلسل بورڈ آف رائٹرز، ایڈیٹرز کا ممبر رہا۔ ”ابدالین“ کا نائب مدیر بھی رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر ایک بے چین روح تھی جو ہمہ وقت اسے کچھ نہ کچھ کر دکھانے پر اکساتی رہتی اسی لیے اس کے دوستوں نے اسے Rare یعنی نایاب کا خطاب دے رکھا تھا، اسے سب ہی ہیرو مانتے تھے۔

اس کا ہر عمل بتاتا تھا کہ وہ ہیرو ہے۔ بار بار وہ یہ بات سب کو سمجھاتا بھی تھا۔ 2005 میں اس نے اپنے ونگ کو چیمپئن ہونے کا تمغہ بھی دلوا دیا، یہ تمغہ اسے ”یومِ والدین“ کے موقعے پر پیش کیا جانا تھا، اعلان ہو چکا تھا۔ یوم والدین سے قبل ”یوم نمائش“ کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس موقع پر بھی اسے کئی انعامات سے نوازا گیا پھر یومِ والدین کی تقریب کا دن بھی آگیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی گورنر پنجاب جناب خالد مقبول تھے۔ انہیں سیلیوٹ کرتا ہوا دستہ بڑے کروفر سے گزرا اس لیے بھی وہ دستہ سب کی نگاہوں کا مرکز تھا کہ اس دستے کی قیادت اسفند یار جیسی فسوں ساز شخصیت کر رہی تھی جس نے اس ونگ کو سب کی نظروں میں لا دیا تھا۔ اس تقریب میں بھی اسے کئی انعامات سے نوازہ گیا۔ پھر جب اس دستے کو چیمپئن شپ کی شیلڈ دی گئی تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اسفند یار نے شیلڈ حاصل کی اور اسے لا کر اپنے ہاؤس ماسٹر کے قدموں میں رکھ دیا اور کہا۔ ”سر یہی وعدہ تھا نا آپ سے...آپ کی رہنمائی اور طلبا کی محنت نے ہم سب کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔“

ملک صاحب نے دل کھول کر بچوں کو دعائیں اور مبارک باد دیں۔

ضلع اٹک کے ناظم میجر (ر) طاہر صادق جو یوم نمائش کی تقریب میں بھی موجود تھے۔ دوران تقسیم انعامات جب بار بار اسفند یار کا نام پکارا جانے لگا تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کی واقفیت ڈاکٹر بخاری سے بڑی گہری تھی اسی لیے انہوں نے اسفند یار کو بلا کر پوچھا where is your proud father پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ بھی ناظرین میں موجود ہیں تو انہوں نے ڈاکٹر فیاض بخاری کو بلوا لیا اور اگلی نشست پر بٹھا دیا۔ ناظم اٹک ان کی پیشہ وارانہ مہارت اور نیک نامی کے سبب پہلے سے ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ اسفند یار کے انعامات حاصل کرنے پر وہ ان کی تربیت کی تعریف کیے بنا نہیں رہے، انہیں گرمجوشی سے مبارک باد بھی دی۔ جب چائے کا وقفہ ہوا تو پنڈال میں سب جمع تھے۔ اس موقع پر ایک جنرل صاحب نے اسفند یار کو دیکھ کر میجر طاہر صادق سے کہا۔ ”آپ اس بچے کو جانتے ہیں

میجر صاحب۔ یہ آپ کے اٹک کی شان ہے۔ ضلع کا فخر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں یہ آپ کے ضلع کے لیے عزت وتوقیر کا باعث بنے گا۔"

یہ کوئی معمولی جملہ نہیں تھا' ایک بڑے فوجی افسر کا دوسرے بڑے افسر سے کسی کی تعریف میں کہا گیا جملہ تھا جو آنے والے دنوں کا ہلکا سا عکاس بھی تھا۔ معروف شاعر قابل اجمیری نے برسوں پہلے شعر کہا تھا۔ "وقت کرتا ہے پرورش برسوں' حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔" بڑے افسران کی نظریں بھی تیز ہوتی ہیں' وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ یہ معمولی نوجوان نہیں ہے' اسے ایک بڑے کام کے لیے بھیجا گیا ہے۔ وہ کام کیا ہے یہ ابھی تک پردۂ غیب میں ہے اور پردہ ہٹتے ہی اٹک کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھ جائے گا۔ لیکن ابھی پردہ باقی تھا اس لیے اس راز کو رہنے ہی دیا جائے اور گزرتے وقت کے ساتھ سفر جاری رکھا جائے۔

اس تقریب کے ایک ماہ بعد کا ذکر ہے۔ اٹک میں ضلعی اسمبلی کا اجلاس جاری تھا۔ ضلع ناظم طاہر صادق بھی موجود تھے۔ انہوں نے ضلعی انتظامیہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا پھر اسفندیار کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس ضلع میں ایسا نابغۂ روزگار بچہ موجود ہے' جس نے اٹک کے لیے افتخار و سربلندی کا موقع پیدا کیا ہے۔ جس نے یوم والدین کی تقریب میں چیمپئن ونگ کی قیادت کی۔ اس کی تعریف کور کمانڈر نے بھی کی۔ میرا مشورہ ہے کہ ایسے ہیرے کی ہمیں قدر کرنی چاہیے۔ اسے "فخرِ اٹک" کا خطاب دیں۔ اس اجلاس میں ناڑہ کے ناظم سردار واجد خان نے اسفندیار کو فخرِ اٹک قرار دینے کی تحریک پیش کی جس کی تمام اراکین نے تائید کی۔

تحریک پیش کی جا چکی تھی، تائید بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اب صرف اسے تعبیر دینا تھا۔ 12 اپریل 2006 کو اٹک فیسٹیول میں ایک تقریب کا اہتمام ہوا اس تقریب میں صوبائی وزیر شجاع خانزادہ کے دست مبارک سے اسے فخر اٹک کی سند اعزازی اور شیلڈ حاصل ہوئی۔

اس کا کمرا انعامات' شیلڈ اور اسناد سے سجایا جاتا تو دیوار پر جگہ نہ ہوتی۔ ہر طرف فریم ہی فریم ہوتے لیکن اسے انعامات و اسناد کی نمائش پسند نہ تھی اس لیے وہ رکھے رہ گئے۔ وہ امتحانات کی تیاری کرتا رہا اور وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ انہی دنوں بری فوج کے لانگ کورس میں شمولیت کے لیے طلبا کا ایک گروپ تیار ہوا کہ وہ بری فوج کا حصہ بننے کے لیے قسمت آزمائی کریں گے۔ اسفندیار تو کب سے یہ خواب دیکھ رہا تھا۔

اس نے بھی ان کے ساتھ جانے کی ٹھان لی اور گھر فون کر کے اطلاع بھی دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے فون پر ہی اس سے کہا۔ "اپلائی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اپنی صلاحیتوں کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا تم ڈاکٹر بننا نہیں چاہتے؟"

اس نے جواب میں بس اتنا کہا۔ "دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔"

اگلے دن وہ سینٹر پہنچا۔ ٹیسٹ دیے۔ جیسا کہ اندازہ تھا' وہ اور اس کے تمام ساتھی ٹیسٹ پاس کر گئے پھر جب وہ لانگ ویک اینڈ پر گھر آیا تو اس نے فوج میں جانے کا عزم مصمم ظاہر کیا۔ گھر والے حیران کہ یہ اسے کیا سوجھی ہے۔ اچھا خاصا ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ اب میڈیکل میں جانے کی بجائے فوج میں جا رہا ہے۔

دراصل گھر والے سامنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ انہیں کیا خبر کہ وہ کس وجہ سے فوج میں جانا چاہ رہا ہے بلکہ وہ فوج کی جانب کھنچ رہا ہے۔ ایک کزن نے سوال کر دیا کہ اسفند بھائی آپ اتنے لائق ہیں، تیز دماغ والے ہیں۔ آپ کو تو ڈاکٹر ہونا چاہیے۔ فوج میں تو ایف ایس سی پاس جایا کرتے ہیں۔"

یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ کوئی برا مانے لیکن اسفند کی پیشانی پر بل پڑ گئے' جیسے وہ غصے میں بھر اٹھا ہو مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ "تم نے جو کہا وہ ایک عمومی رویّہ ہے۔ ہماری قوم کا المیہ ہے ہر لائق بچے کو اس کے والدین ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ بچے پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں' جس سے ان کی اپنی اولاد سے محبت ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے آسودہ حال زندگی گزار سکیں۔ عیش و عشرت اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں مگر میں سوچتا ہوں کہ پاکستانی فوج ایک منظم ادارہ ہے۔ یہاں دولت و ثروت تو نہیں مگر عزت و احترام ضرور ہے۔ یہی حقیقی دولت ہے۔ پاک فوج ارضِ پاک کی حفاظت کرتی ہے۔ وطن اور اہلِ وطن محفوظ ہوں گے تو زندگی کے ہر شعبہ میں پاکستان کی خدمت کر سکیں گے، پاک فوج جاگتی ہے تو لوگ امن اور آشتی کی نیند سو سکتے ہیں۔ آنزہ میاں! فوج کو میری لیاقت و قابلیت کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہاں میں اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر سکوں گا، وطن کا پاسبان بن کر پورے ملک کی خدمت کروں گا۔ وطن کے لیے میرا ایک ایک سانس وقف ہے۔ پیارے بھائی، وطن کی خدمت میں جیوں گا تو میرے قلب و روح مجھے اطمینان دیں گے مگر یہ باریکی تم نہیں سمجھ پاؤ گے اور اگر فی سبیل اللہ ملک کی خاطر جان سے بھی گزرنا پڑا تو میری روح کو کس قدر قرار حاصل ہوگا شاید یہ بھی تم نہ سمجھ پاؤ۔ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن۔"

آنزہ بخاری کو اس کے لب پر کھیلتی مسکراہٹ کچھ عجیب سی لگی۔ بڑی معنی خیز سی۔

ٹیسٹ دیے ہوئے وقت ہو گیا تھا مگر ابھی تک وہاں سے کال آئی نہیں تھی۔ وہ مایوس ہو چکا تھا کہ کال آ گئی جس میں کہا گیا تھا کہ وہ اکیڈمی میں رپورٹ کرے۔ اسفندیار بخاری ایسے خوش ہوا تھا جیسے یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم پروانہ ہے۔ وہ اسی لیٹر کے انتظار میں زندگی گزار رہا ہے۔ ایسی خوشی کہ چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

جب وہ اکیڈمی پہنچا تو کافی لیٹ تھا۔ کلاس میں ٹیچر نے پوچھا کہ آپ اتنی تاخیر سے کیوں آئے تو اس نے نہایت شستہ انگریزی میں پورے حالات بتائے کہ اسے لیٹر لیٹ ملا تھا۔ جب سب کو معلوم ہوا کہ موصوف فوج کی محبت میں شعبہ طب چھوڑ کر آئے ہیں تو ایسا کوئی نہ تھا جو متاثر نہ ہوا۔ کلاس ختم ہوتے ہی بہت سے لڑکوں نے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اسے کمانڈر ملا وہ بھی کافی کوآپریٹو تھے۔ کمپنی ملی جو آنے والے وقتوں میں اس کے لیے اہم ثابت ہونے والی تھی۔ اس کی کمپنی میں کچھ ایسے لڑکے بھی تھے جن کی انگریزی کمزور تھی۔ وہ خالی وقت میں انہیں انگریزی کی تعلیم دینے لگا تا کہ ٹیچر کے سامنے انہیں شرمندگی نہ ہو۔ اس کے اس خلوص نے سب کو گرویدہ کر لیا تھا۔

لانگ کورس کے ٹرم کمانڈر نہایت دبنگ اور بے باک تھے۔ وہ پورے کورس کو جمع کر کے ان کے ساتھ گفتگو کے عادی تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک مشکل سوال پوچھ لیا۔ ساری انٹری کو سانپ سونگھ گیا لیکن جب وہی سوال انہوں نے اسفندیار کو مخاطب کر کے پوچھا تو اس نے تفصیل سے جواب دیا۔ میجر صاحب اش اش کر اٹھے۔ تعریف بھی کی اور اس کا نام اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا۔

یہاں بھی ہر دل عزیزی اور عزت اسے بھرپور انداز میں مل رہی تھی۔ ایسی عزت پا کر لوگوں میں غرور آ جاتا ہے مگر اس میں منکسر المزاجی آتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک تیقن اور پیش بینی کے ساتھ اپنی تربیت کا آغاز کیا تھا، اس لیے سیلیوٹ ٹیسٹ اور دوسرے ٹیسٹ کلیئر کرنے میں بھی اسے کوئی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ وہ صرف اپنی کامیابی پر اکتفا نہیں کرتا تھا ان کامیابیوں کے بعد اس نے اپنے ان ساتھیوں پر بھی توجہ دی جو سیلیوٹ ٹیسٹ اور دیگر ٹیسٹ پاس نہیں کر سکے تھے۔ یہ اس کی ذمے داری نہیں تھی کہ وہ دوسروں کو بھی سکھائے، سمجھائے۔ لیکن اسفندیار کے جاننے والے اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ ایک مخلص دل والا ہے، اسے دوسروں کی مدد کر کے تسکین ملتی ہے۔ اس وقت جو کمپنی کا کارپول تھا' اسے ٹریننگ دیتا تھا، وہ بھی اس کی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا۔ دوسری ٹرم میں اسفند کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آئیں۔ اس ٹرم میں وہ اپنے پسندیدہ کھیل ہاکی کی ٹیم میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ نقشہ بینی میں تو اس نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ صرف پندرہ منٹ میں وہ نقشے کو دیکھ کر ذہن نشین کر لیتا تھا۔ اس کا مظاہرہ اس دن سامنے آیا جب اس کی کمپنی کو ایک مشکل ٹاسک دیا گیا۔ سب کی نظریں اس پر

قوم، عوام اور گورنمنٹ کا خراج تحسین

☆ شاہراہ اسفندیار بخاری کورنگی ٹاؤن، کراچی۔
☆ کیپٹن اسفندیار چوک نزد الائیڈ اسپتال، فیصل آباد۔
☆ کیپٹن اسفندیار چوک، گوجرانوالہ۔
☆ 11-F کانفرنس روم، گوجرانوالہ۔
☆ کیپٹن اسفندیار شہید ایڈمن بلاک۔ 102 بریگیڈ، پشاور۔
☆ خیابان اسفند گیٹ، شین باغ (اٹک)۔
☆ اسفندیار بخاری ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ، بڈھ بیر پشاور۔
☆ اسفندیار بخاری ڈسٹرکٹ اسپتال، اٹک۔
☆ کیپٹن اسفندیار بخاری چوک نزد لاری اڈہ اٹک شہر۔
☆ کیپٹن اسفندیار بخاری QRF بڈھ بیر ایئر فورس کیمپ پشاور۔
☆ کیپٹن اسفندیار شہید آڈیٹوریم فضائیہ ڈگری کالج MRF کامرہ۔
☆ کیپٹن اسفندیار روڈ (لاری اڈہ تا خیابان اسفند) اٹک۔
☆ شہید کیپٹن اسفندیار بخاری ریلوے پارک اٹک۔
☆ شہید کیپٹن اسفندیار آڈیٹوریم APS اٹک۔

PakiBooks.Site

تھیں۔اس نے ایک نظر نقشے پر ڈالی اور پھر نتیجہ بتا دیا۔سب نے اس کی تائید کی صرف ایک نے اختلاف کیا۔لیکن جب نتیجہ آیا تو صرف وہی ایک بندہ فیل تھا جس نے اختلاف کیا تھا۔اس بات نے اس کی قدرو منزلت سب کی نظروں میں بڑھا دیں۔

اس ٹرم میں اسفند نے کئی اور مثالیں بھی قائم کیں۔وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا کہ کام محنت اور لگن سے کریں' صلہ اللہ پر چھوڑ دیں۔آپ سارجنٹ کی نگاہ سے تو بچ سکتے ہیں لیکن اللہ کی نگاہ سے نہیں۔ٹرم کمانڈر اس کی ذہانت و ذکاوت کے قائل ہو چکے تھے اس لیے جب وہ انٹری سے کسی سوال کا جواب چاہتے تو اسفند کو بولنے کا موقع نہ دیتے،سب کیڈٹس کے جواب سننے کے بعد اسے بولنے کا موقع دیتے کیونکہ کوئی بھی موضوع ہو وہ مدلل جواب دیتا تھا۔

گلائیڈنگ کا موقع آیا تو اس نے اس طرح کمال دکھایا کہ لوگ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ اس کی پہلی گلائڈنگ نہیں ہے۔اس سے پہلے بھی لگتا ہے کہ وہ اس مشق کو کرتا رہا ہے۔

تیسرا ٹرم نومبر 2007 میں شروع ہوا۔اس ٹرم میں اس کا داخلہ بہ حیثیت فل کارپول ہوا۔یہ منصب ایک شان دار اعزاز تھا۔اس کی عادت تھی کہ وہ ہر بات کی گہرائی جاننے کی کوشش کرتا تھا۔اس کی فہم و فراست کی وجہ سے پلاٹون کمانڈر اور ٹرم کمانڈر اسے عزیز رکھتے تھے۔اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔

ایبٹ آباد ایک پہاڑی مقام ہے۔سرسبز اور شاداب علاقہ ہے۔سردیوں میں ہلکی برف باری بھی ہوتی ہے۔ٹھنڈی ہوا میں گھومنا کبھی کبھی نقصان کا باعث بھی بن جاتا ہے۔وہاں سے اس نے گھر فون کیا تو ڈاکٹر صاحب نے فون ریسیو کیا۔اس کی آواز میں بھاری پن سے ڈاکٹر صاحب نے اندازہ لگا لیا اور کہا کہ وہ فوراً اپنے ڈاکٹر سے رجوع کرے۔اس نے جواب دیا ابو اگر میں ڈاکٹر کے پاس چلا گیا تو وہ مجھے اسپتال میں داخل کر لیں گے جو میں ہونا نہیں چاہتا۔میں اپنے جونیئر کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا کمانڈر مصائب اور پریشانی میں بھی آرام نہیں کرتا۔

''پھر کیا کیا جائے؟ کیا تم اسی طرح بیماری کو پالتے رہو گے؟''ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''آپ ایسا کریں کہ دوا کا نام بتا دیں میں منگوا لوں گا۔''

ڈاکٹر صاحب نے اسی وقت دوائیں لکھوا دیں لیکن انہیں چین نہ آیا اور انہوں نے نور رحمت کو بلا کر بازار سے کچھ دوائیں منگوائیں اور نور کے ہاتھ سے اسی دن بیٹے کو بھجوا دیں۔اس لیے کہ انہیں یقین تھا وہ دوا کبھی نہیں منگوائے گا صرف اس لیے کہ جونیئروں کو بتایا جاسکے کہ کسی بھی مصائب میں گھبرانا نہیں چاہیے۔

اس کے افسر اسفند کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ایک بار ایک مشق کے دوران شاندار کارروائی دیکھ کر انہوں نے سب کے سامنے کہا۔''اسفند تم اپنی یونٹ کے جنرل رومیل ہو۔''

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ایک اعزاز تھا۔اس لیے کہ دوسری جنگ عظیم کے وقت جنرل رومیل جسے فیلڈ مارشل رومیل بھی کہا جاتا ہے اس نے اتحادیوں کو زچ کر دیا تھا۔اسے ریگستانی لومڑی بھی کہا گیا ہے۔ایک میجر کے رینک کا افسر اسے رومیل کہہ رہا تھا اس لیے وہ اپنی یونٹ میں جنرل رومیل کے نام سے پکارا جانے لگا۔

تیسرے ٹرم میں ایک اہم مشق ہو رہی تھی جسے یرموک کا نام دیا گیا تھا۔مشق اور فوجی لازم ملزوم ہیں۔کہتے ہیں کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے۔اسی طرح فوجی جوان کو مشقت کے ذریعے نکھارا جاتا ہے۔یہ اہم ہونے کے ساتھ دشوار مشق تھی جو چار دن پر محیط تھی۔اتنی دشوار کہ کوئی سویلین اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔اس مشق میں تقریباً 150 کیلو میٹر پیدل چلنا پڑتا ہے۔اس میں سب سے مشکل امر یہ ہے کہ LMG اٹھا کر چلنا ہوتا ہے۔ذرا تصور کریں کہ اتنی دور چلنا ہے اور ساتھ میں بوجھ بھی لدا ہے۔فوجی بھی انسان ہوتے ہیں۔وہ اس معرکہ کو کس طرح سر کرتے ہوں گے؟

مہم پر چلنے کے لیے تیاری مکمل ہوئی اور سب چوکس کھڑے ہو گئے۔اسفند یار کی پلاٹون بھی مہم پر چلنے کے لیے اٹینشن ہو گئی۔وہ مکمل طور پر تیار تھی لیکن ایک مسئلہ تھا کہ LMG کون اٹھائے گا؟ پلاٹون پہلی بار اس مشقت میں حصہ لینے والی تھی اس لیے جوان ایل ایم جی کو دیکھ کر سہم گئے تھے۔اتنا بوجھ کس پر لادا جائے گا۔سب اسی سوچ میں تھے۔اسفند یار کو تو چہرہ پڑھنے کی عادت تھی۔وہ سمجھ گیا کہ جوان کس سوچ میں الجھے ہوئے ہیں۔اس نے ایک نظر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جوانوں پر ڈالی پھر آگے بڑھا اور افسر ہوتے ہوئے بھی اس نے ایل ایم جی کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔اگر وہ چاہتا تو کسی بھی جونیئر سے وہ اٹھوا سکتا تھا مگر وہ تو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ افسر بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔میدان جنگ میں

ہر سپاہی کو ناقابل یقین کارکردگی دکھانی پڑتی ہے۔اس نے ابتدا میں ہی خاموش لفظوں سے جوانوں کو بتا دیا کہ پاک فوج کے افسر کیسے ہوتے ہیں۔

وہ ایل ایم جی کے علاوہ اپنا بھاری بھرکم کیٹ بھی اٹھائے ہوئے تھا اور دوسروں کی نسبت زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اب ذرا تصور کریں' کٹ کا وزن' ایل ایم جی کا وزن اور ڈیڑھ سو کلو میٹر کا فاصلہ۔راستے بھی ایسے کہ کہیں پتھریلی چٹانوں پر تو کہیں گھاٹیوں میں، کہیں نالوں میں تو کہیں خار دار جھاڑیوں سے ہو کر جانا پڑ رہا تھا۔مگر اس اللہ کے بندے کی پیشانی پر ایک بھی بل نہ تھا۔وہ ایسے چل رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے ایسے ہی راستوں پر چلتا رہا ہو۔فوجی مشق میں اگر اتنا سامان اٹھا لیا تو کون سی بڑی بات ہے،یہ تو فوجی زندگی کا حصہ ہے۔وہ یہی پیغام دے رہا تھا مگر زبان خاموش تھی۔

یہ ایک ایسی مشقت تھی' ایک ایسی جفاکشی تھی جس کی مثال ملنا مشکل ہے کہ اتنا وزن اٹھا کر اتنا طویل سفر طے کیا جائے اور کسی جونیئر کو لمحے بھر کے لیے بھی تکلیف نہ دی جائے۔

اس نے تیسرے ٹرم میں جو کچھ کر دکھایا تھا۔اس کا صلہ تو ملنا ہی تھا۔کوئی بھی کام کتنا ہی چھپ کر کیا جائے' ایسی باتیں افسران بالا تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔شاید اس کے افسران تک بھی اس کی خوبیوں کی خبر پہنچ رہی تھی۔اس کی محنت اور عمل نے اسے سرخرو کر دیا تھا۔اسے چوتھی ٹرم میں ایک بڑی خوش خبری مل گئی۔اسے بٹالین کا سینئر انڈر آفیسر فسٹ پاک بنا دیا گیا۔یہ ایک بڑی خوشخبری تو تھی ہی لیکن ایک الجھاؤ بھی اس کا منتظر تھا۔اس کے دو سینئر آفیسر' اس کے ٹرم کمانڈر اور پلاٹون کمانڈر جو اس کی صلاحیتوں اور استعداد سے واقف اور شناسا تھے ان کا تبادلہ ہو گیا۔اس کے قریبی دوستوں نے پریشانی کا اظہار کیا کہ اب تمہارا کیا ہو گا؟ تمہارے قدردان تو چلے گئے؟

اس سوال کے جواب میں اس نے یہ کہا کہ اگر وہ چلے گئے ہیں تو کیا ہوا۔دوسرے جو نئے آئے ہیں وہ بھی تو اسی فوج کا حصہ ہیں۔وہ بھی گہری نظر رکھتے ہوں گے اور جلد ہی انہیں میری اہمیت کا احساس ہو جائے گا۔وہ میری کارکردگی دیکھیں گے تو انہیں بھی پتا لگ جائے گا کہ میں محنت سے جی نہیں چراتا ہوں۔ایک فوجی کو کیسا ہونا چاہیے وہ میں عملی طور پر دکھاتا ہوں۔

اپریل دو ہزار آٹھ میں جب لانگ کورس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوئی تو BSUO کا اعزاز اسفند یار کو حاصل ہوا۔ڈاکٹر سید فیاض بخاری بھی مدعو تھے۔انہوں نے جو شاندار تقریب دیکھی تو بہت زیادہ متاثر ہوئے۔تقریب کے بعد اسفند یار نے اپنے والد سے پوچھا۔''آپ کو اس تقریب میں سب سے اچھا کیا لگا؟''

شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ابو کہیں گے کہ شمشیر اعزاز مگر ڈاکٹر صاحب نے جو کہا وہ اس کے لیے مشعل راہ تھا۔انہوں نے کہا۔''مجھے آج کے پریڈ میں بہت سے مردوں کو ایک ساتھ دیکھنا اچھا لگا۔''

اسفند یار نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔''میں سمجھا نہیں؟''

''زندگی میں میں نے بارہا بہت سے لوگوں کو اکٹھا دیکھا ہے مگر وہ صرف بھیڑ تھی۔ایک ہجوم تھا۔آج جن کو دیکھا وہ سب نظم وضبط کے پابند تھے۔بوجھ اٹھا کر کئی کئی میل بھاگتے چلے جاتے۔جب یہ چلتے ہیں تو ان کے بوٹوں کی دھمک سے دھرتی کانپ جاتی ہے۔جب ہالٹ کہہ کر ساکن ہوتے ہیں تو پوری کائنات پر گویا سکوت طاری ہو جاتا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جو قلیل اُجرت پر کثیر خدمت کرتے ہیں۔یہ دن دیکھتے ہیں نہ رات، نہ ذاتی خواہش، نہ دلی جذبات۔سرحدوں کی حفاظت کے ضامن ہوتے ہیں' امن کی دولت کے خازن ہوتے ہیں' شوق شہادت رکھنے والے سچے مومن ہوتے ہیں۔''

انہی باتوں نے اس کے دل میں ایک مدوجذر سا پیدا کر دیا تھا۔قوم کو سہارا دینے کے لیے امن کی ضرورت ہے اور امن کے لیے سرحدوں پر کھڑے محافظوں کا ایک اپنا رول ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر ایک نیا جذبہ امنڈتا ہوا محسوس کرتا۔

ملٹری سبجیکٹ میں ٹیک ٹکس میڈل کا حصول ہر بہترین کیڈٹ کا خواب ہوتا ہے لیکن اس میڈل کا حصول آسان بھی نہیں ہے۔اس کے حصول کے لیے انتہائی قوی قوت ارادی، برق رفتاری' حاضر دماغی، مستعدی اور مسلسل کارکردگی کا اعتراف کروانا پڑتا ہے۔اس میڈل کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کا بیٹا اسے حاصل کر لے گا اسی لیے اسفند یار کا فون آیا تو وہ گویا اچھل ہی پڑے تھے۔اس نے فون پر کہا۔''ابو جی! آپ اور امی دونوں 18 اکتوبر کو صبح نو بجے تشریف لے آئیں۔اس دن تمام کیڈٹس کو ڈگریاں ملیں گی اور مجھے ملیٹری سبجیکٹس میں ٹاپ کرنے پر ٹیک ٹکس میڈل سے نوازا جائے گا۔''

یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی۔ ڈاکٹر بخاری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے کہا۔ ''اتنی بڑی کامیابی' یہ تو بہت بڑا اعزاز ہے۔'' پھر انہوں نے بیگم کو خبر دی اور وہاں جانے کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگے۔

18 اکتوبر 2008 کو وہ صبح سویرے ہی روانہ ہوگئے۔ مہمان خصوصی راحیل شریف تھے۔ میڈل حاصل کرنے کے بعد وہ سیدھا ماں کے پاس آیا اور بولا۔ ''امی یہ میڈل آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔'' پھر وہ والد کی طرف مڑ کر بولا۔ ''ابو دعا کیجیے گا کہ مجھے شمشیر اعزاز بھی حاصل ہوجائے۔''

یہ اعزاز بھی کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا لیکن بیٹے کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ انشاء اللہ شمشیر اعزاز بھی تمہیں ہی ملے گا، دعائیں قبول ہونے کی وہ ساعت تھی کہ 25 اکتوبر 2008 کو اسے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی کے دست مبارک سے اسے شمشیر اعزاز بھی حاصل ہوگیا۔

کامیابی کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے لیکن اسفند یار پر کوئی نشہ چھا نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ خود کو جھکائے رکھتا۔ اتنے بڑے اعزاز کے بعد بھی اس کا رویّہ یکساں رہا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لیے اب اسے پہلا قدم اٹھانا تھا۔ اسے اپنی پسند کی بٹالین کا پوچھا گیا تو اس نے فرسٹ پٹھان کا انتخاب کیا اور اسے جوائن کرنے کے لیے چل پڑا۔

عملی زندگی کا فوجی انداز' اس سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اکیڈمی میں ہی اک تجربہ ہوچکا تھا بلکہ اس کی ٹریننگ وہیں پوری ہوگئی تھی۔ اب اسی ٹریننگ کا تجربہ کام آرہا تھا۔ فوجی مشقوں کا عادی تھا اس لیے اسے کوئی دشواری نہیں ہورہی تھی۔ ہر مشق میں وہ کامیاب ٹھہرتا۔

دفاعی افواج کی چابک دستی اور مستعدی میں اضافے کے لیے دو ملکوں کی افواج مشترکہ مشق بھی کرتی ہے اسی سلسلہ میں ''الصمصام'' کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس بار سعودی افواج اور پاکستانی فوج کے درمیان مشق ہونا تھی۔ اسفند بھی اپنی یونٹ کے ساتھ اس مشق میں حصہ لینے سعودی عرب پہنچا۔ وہاں ایک مشق کے دوران فوجی دستے کی کمانڈ اسے سونپی گئی۔ اس کی جنگی حکمت عملی نے مقابل کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ ہر بار ایسی ترکیب اور چال آزماتا کہ مخالف فوج انگشت بدنداں رہ جاتی۔ اس نے اپنی مہارت و ذہانت سے ہر بار مخالف دستے کو شکست دی۔ ایک بار مشق کے دوران اس نے اپنے جوانوں کو درختوں پر چڑھا دیا اور انہیں پتوں میں چھپا دیا۔ اب جب مخالف دستہ حملے کے لیے آیا تو انہیں ٹارگیٹ کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے اپنے دستے کو اشارہ کیا تو سب نے درختوں سے چھلانگ لگائی اور انہیں گھیر لیا۔ وہ بے بس ہوگئے۔ سعودی افواج کو اس کی چالوں نے بہت متاثر کیا۔ اس مشق کے اختتام پر اسے سعودی حکومت نے گولڈ میڈل سے نوازا اور اسے سند امتیاز بھی عطا کیا۔

اسفند یار بہترین نشانے باز تھا۔ جبکہ اس نے اس قسم کا کوئی باقاعدہ کورس بھی نہیں کیا تھا۔ انفنٹری اینڈ ٹیکٹیکس اسکول میں اسے بعد میں بھیجا گیا تھا۔ یہ طویل کورس تھا۔ اس نے لاتعداد مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھی Heavy weapon course میں پانچویں پوزیشن حاصل کی۔ اسی دوران اسے ایک ایسے آلہ کی تخلیق کا جنون سوار ہوا جو فوج کے بہت کام آتا۔ لوگ اس کے خیال کا مذاق اڑاتے کہ ایسا آلہ کیسے بن سکتا ہے لیکن وہ اپنے کام میں جتا رہا۔ جون 2011 میں اس کا یہ کورس مکمل ہوگیا۔ اسے سرٹیفکیٹ آف آنرز بھی مل گیا لیکن اسے چین نہ تھا۔ وہ ہمہ وقت اپنے خیالی آلہ کو عملی شکل دینے پر غور کرتا رہا۔ کورس کے مکمل ہونے پر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے مگر اسے ایک ماہ کے لیے روک لیا گیا۔

اب وہ دن رات اسی آلے پر کام کرتا رہا۔ اس کی عقل سلیم اور کمال صنعت گری نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور اس نے Target Acquisition instrument جیسا کامیاب آلہ ایجاد کرلیا۔ افسران نے تجربہ کیا تو اسے بہت پسند کیا، اسے خوب شاباشی ملی۔ ہر ایک نے اس کی محنت کو سراہا۔

جب وہ چھٹیاں گزارنے گھر آیا تو اسے گھر والوں نے ہیرو کی طرح استقبال کیا۔ ہر ایک کو اس پر فخر تھا کہ اس نے ایسا بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس نے اپنے اس آلہ کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ اس آلے کی خوبی یہ ہے کہ دشمن آپ سے کتنی دور ہے۔ کس جگہ چھپا ہوا ہے۔ یہ رات کے اندھیرے میں بھی کام کرتا ہے۔ اس کا سائز بہت چھوٹا ہے جس کی وجہ سے ہر سپاہی اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔

5 ستمبر 2011 کا دن آپہنچا۔ اس روز صبح سے ہی اس کی والدہ بے چین و پریشان تھیں کیونکہ اس کی چھٹیاں ختم ہوچکی تھیں۔ اسے اگلے ہی دن یعنی 6 ستمبر کو جنوبی وزیرستان کے کارزار کو ہسار میں جاکر اپنے فرائض پورے کرنا تھے۔ اس کی یونٹ وہیں پوسٹ تھی۔ وہ مقام ایسا تھا جہاں دشمنان ملک وہ کیا نے اڈے ڈال رکھے تھے۔ جب جب آکر پاک فوج کے حوصلے آزماتے تھے۔ آئے دن وہاں سے تشویش ناک اطلاعات موصول ہوتی تھیں۔

ماں کی دعاؤں کے سائے میں اس نے سفر شروع کیا۔ والد نے بنوں تک اپنی کار میں پہنچانے کی پیشکش کی۔ وہ اسے ساتھ لے کر چل پڑے۔ ڈاکٹر صاحب نے بنوں میں اپنے ایک دوست کرنل زاہد کو فون کردیا تھا۔ وہ چشم براہ تھے۔ بنوں پہنچ کر وہ لوگ کرنل صاحب کے ہاں اترے۔ کافی دیر تک گپ شپ چلی پھر ٹھہرانے میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب وہیں سے واپس ہوگئے جب کہ اسفند یار اگلے دن اپنے اگلے سفر پر روانہ ہوگیا۔ رزمک سے آگے بٹالین کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہیں اسے پہنچنا تھا۔

جب وہ اپنے C.O کے دفتر میں اپنی آمد بتانے پہنچا تو سب اسی کے منتظر تھے۔ اس کا والہانہ استقبال ہوا اس لیے کہ پوری یونٹ پہنچ چکی تھی صرف وہ پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ وہ کورنٹ میں رک گیا تھا۔

پورا علاقہ حالت جنگ میں تھا۔ اسے ایک دن آرام کے لیے دیا گیا۔

اگلے دن اس نے اردگرد کی تمام چوکیوں اور دشمن کی ٹولیوں سے نمٹنے کے لیے جائزہ لیا۔ دہشت گرد تقریباً تمام وادی میں پھیلے ہوئے تھے اور کہیں سے بھی حملہ آور ہوجاتے تھے۔ وہاں پر سب سے خطرناک چوکی کھڑا منزا کی تھی۔ وہ دشمن کے ٹھکانوں کے بالکل سامنے تھی اور وہ اس پر کئی بار حملہ آور ہوچکے تھے۔ اس پوسٹ کا دفاع باقی سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اسفند یار تو خطروں کا کھلاڑی تھا۔ اس نے خود کو اس پوسٹ کے لیے پیش کیا۔ اس پیشکش پر کرنل صاحب بھی چونک گئے تھے لیکن انہیں اس کا ماضی پتا تھا۔ جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ خطرناک مہم کو ہی پسند کرتا ہے۔ انہوں نے ہدایت دی۔ ''اسفند' وہ خطروں سے گھری پوسٹ ہے۔ آپ کو اپنا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ چوکنے' ہوشیار اور ہر دم تیار رہنا ہوگا۔ وہاں کے لیے آپ کو صرف تین مہینے کے لیے پوسٹ کیا جارہا ہے۔''

اسفند جس کمپنی کا کمانڈر تھا اس کا ہیڈ کوارٹر منزا پہاڑ کے نیچے تھا۔ یہاں سے پوسٹ تک جانے میں تقریباً پون گھنٹا لگتا تھا۔ پلاٹون اوپر چوکی پر اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی جب کہ اسفند کو ان سب مقامات کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ اس نے اوپر چوکی پر رہنے کو ترجیح دی۔ حالانکہ ہیڈ کوارٹر میں رہنا زیادہ آسان تھا۔ اوپر پوسٹ میں قیام وطعام کا بندوبست بھی مناسب نہیں تھا مگر جوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اس نے اوپر رہنے کو ترجیح دی۔ اس پوسٹ پر 30 سے 40 جوان ڈیوٹی دیتے تھے۔ عام سویلین ہوتے تو ہمت ہار جاتے مگر فوجی جوان تھے ان کے لیے یہ خطرناک صورت حال کچھ بھی نہ تھی۔ وہ ان پریشانیوں میں بھی محافظت کرتے تھے۔

اسفند نے چارج سنبھالتے ہی پوسٹ کی حفاظت پر غور کرنا شروع کردیا۔ اس نے پہلے ہی دن سمجھ لیا تھا کہ اس پوسٹ پر دہشت گرد بار بار حملہ اس لیے کرتے تھے کہ اس پوسٹ کا حفاظتی نظام کمزور تھا۔ اس نے تمام جوانوں کو اکٹھا کیا اور ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اس نے کہا۔ ''آپ پاک وطن کے رکھوالے ہیں۔ اللہ نے آپ کو ایک نہایت نیک مقصد کے لیے چنا ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ پوسٹ پاکستان دشمن عناصر کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے اسی لیے اس پر پے در پے حملے ہورہے ہیں۔ وہ اسی راستے سے آگے بڑھ سکتے ہیں لیکن ہم ان پر نگاہ رکھیں گے تو وہ ناکام رہیں گے۔ اس کے لیے اس چوکی کو ناقابل تسخیر بنانا ہوگا اور اس کے لیے انتھک محنت کرنا ہوگی۔ آپ کے تعاون کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہر مشکل گھڑی میں آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔ میرا منصوبہ یہ ہے کہ یہاں ایک بلند ٹاور قائم کیا جائے جس پر ہر وقت ایک جوان کی ڈیوٹی ہوگی۔ اس کو دوربین اور گن دے دی جائے گی تاکہ گردو پیش پر نظر رکھ سکے۔ وہی جوان پوری پوسٹ کا محافظ ہوگا۔ اس کے بعد ہم ایک پتھروں کی دیوار قائم کریں گے۔ تین فٹ چوڑی اور پانچ فٹ اونچی، جس کا فرنٹ دشمن کے علاقے کی جانب ہوگا۔ یہ ہمارا قلعہ ہوگا۔''

یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ پہاڑ کی اونچی چوٹی پر ٹاور اور دیوار تعمیر کرنا جوئے شیر لانا تھا مگر جوان اپنے افسر کے جذبے کو دیکھ کر فوراً تیار ہوگئے۔ کام بھی شروع ہوگیا۔ اب ذرا تصور کریں، ان جوانوں کا تعلق انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ سے نہیں تھا۔ ان کا کام محافظت تھا مگر انہوں نے اس مشکل کام کو سر انجام دینا شروع کردیا۔ سارا سارا دن وہ پتھر ڈھو کر اوپر لاتے اور ٹاور کی تعمیر کرتے۔ حوصلہ کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹاور تیار ہوگیا۔ یہ 15 فٹ بلند تھا۔ اس پر سے دور دور تک نظر رکھی جاسکتی تھی۔ اب جوانوں پر بھی اس کی اہمیت آشکار ہوگئی۔ وہ وہاں بیٹھ کر ہر طرف نظر رکھ

سکتے تھے۔ان کی نظروں سے بچ کر ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔

ٹاور کی تعمیر ایک مشکل امر تھا۔اس کی تعمیر کے بعد جوانوں نے سمجھا کہ اسفند صاحب دیوار والی بات بھول گئے ہیں۔وہ سب آرام ہی کر رہے تھے کہ اسفند یار نے پھر ایک دن سب کو جمع کیا اور تقریر شروع کر دی۔"میرے بلند حوصلہ جوانو! تم نے ٹاور تعمیر کر کے ملک و قوم پر ایک احسان کیا ہے۔اس کے لیے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔مگر جوانو ابھی ایک کام اور کرنا ہے، اپنی حفاظت کے لیے دیوار کی تعمیر جیسے دیوار چین جو ملک کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھی۔تو پیارے بھائیو اٹھو اور دیوار کی تعمیر شروع کر دو۔"

جوانوں میں سے ایک نے سوال کیا۔"سر کیا ٹاور کافی نہیں ہے؟"

"نہیں......اگر دشمن تعداد میں زیادہ ہوئے تو؟ آپ تعداد میں تیس چالیس ہو، وہ سیکڑوں کی تعداد میں آگئے تو؟"

ایک اور جوان نے پوچھا۔"مگر یہ پتھر آئیں گے کیسے؟"

"اس کا حل یہ ہے کہ ہم جب اوپر آتے ہیں تو راستہ بہت تنگ ہے۔ہم اسے مزید وسیع کریں گے۔اس کھدائی سے جو پتھر نکلیں گے انہیں کام میں لائیں گے۔"

دیوار کی تعمیر شروع ہوئی۔یہ کام رات میں کیا جاتا۔بالآخر دیوار بھی مکمل ہو گئی۔جن کی وجہ سے دیوار کی ضرورت پڑی تھی وہ ایک رات آدھمکے۔اس کا پتا ایسے چلا کہ اس رات جس کی ڈیوٹی ٹاور پر تھی اس نے چیخ چیخ کر بتایا۔"ہوشیار ہو جاؤ۔دشمن بڑھا چلا آرہا ہے۔"

اس چیخ و پکار پر سب لوگ جاگ گئے اور اسفند جو اس وقت لیپ ٹاپ پر کوئی کام کر رہا تھا اس نے لیپ ٹاپ پھینکا اور اپنی ایس ایم جی تھامی اور باہر نکل آیا۔اسے بھی اب چند سائے اپنی طرف بڑھتے نظر آئے۔اس نے ان پر شست باندھی اور فائر کر دیا۔

اس وقت تک تمام جاں باز جاگ چکے تھے اور اپنی اپنی پوزیشن سنبھال چکے تھے۔اسفند کے فائر کرتے ہی ادھر سے بھی فائر ہوا اور آگے بڑھنے والے اپنی اپنی جگہ دبک گئے۔شاید وہ سب اس ارادہ سے آئے تھے کہ انہیں رات کا اندھیرا شیلٹر دے گا اور وہ بہ آسانی چوکی پر پہنچ کر ہنگامہ مچا دیں گے مگر انہیں خبر نہ تھی کہ پاک فوج جاگ رہی ہے۔اسفند ابھی بیدار ہے۔ان کی طرف سے فائر ہوتے ہی جواب دینا شروع ہو گیا۔دونوں جانب سے شدید فائرنگ شروع ہو گئی تھی تبھی اسفند نے مشورہ دیا۔"اندھیرے میں صرف گولیاں برباد ہوں گی۔وہ بزدل ہیں اب وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھیں گے۔وہ نہتے عوام پر ظلم ڈھا سکتے ہیں، مقابل میں جب شیر آجائے تو وہ دم دبا کر بھاگتے ہیں۔اب ان کی ہمت بھی نہ ہوگی کہ ایک قدم بھی آگے بڑھائیں اس لیے گولیاں برباد نہ کرو۔یہ عوام کے پیسوں سے آتی ہیں۔ہمیں نیچے اتر کر دشمن سے مقابلہ کرنا ہوگا۔"

"لیکن سر یہ خطرناک ہوگا۔" وہاں کھڑے جوانوں میں سے کسی نے کہا۔

اسفند نے کچھ سوچا پھر کہا۔"ٹھیک ہے آپ لوگ ہوشیار رہیں۔میں ابھی آیا۔" پھر اس نے تیزی سے کافی سارے گرنیڈ اٹھائے ایس ایم جی اٹھایا اور دیوار سے کود کر نیچے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔یہ سب اتنی جلدی ہوا تھا کہ کسی کو سوچنے سمجھنے کا بھی وقت نہ ملا۔ لیکن یہ پاک فوجی تھے۔افسر کو اکیلا کیسے چھوڑ دیتے۔اس کی تقلید میں کئی ایک جوانوں نے بھی دیوار پھلانگ لی۔

اسفند ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔دشمنوں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ انہیں گھیرنے کے لیے فوجی نیچے آگئے ہیں۔انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔اسفند نے اندازہ لگا لیا کہ وہ سب کس جگہ جمع ہیں۔اس نے تاک کر ان پر گرنیڈ پھینکا۔پوری فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔

دو طرفہ فائرنگ۔ایسی شدید فائرنگ۔چوکی پر جو جوان رہ گئے تھے انہوں نے سمجھا کہ اسفند نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا لی ہے۔اب تک وہ شہید ہو چکے ہوں گے۔باقی رہ گئے جوانوں میں سے کچھ اور جوانوں نے بھی دیوار پھلانگ لی۔ان کے نیچے پہنچنے تک فائرنگ بند ہو چکی تھی۔اب ہر طرف خاموشی تھی۔تبھی انہوں نے دیکھا کہ اسفند اسلحہ اٹھائے واپس آرہا ہے۔اس نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا، اسی لیے دور سے ہی اس نے کوڈ لفظ کہا پھر اوپر چڑھتے ہوئے نزدیک آ گیا۔نزدیک پہنچ کر وہ بولا۔"دلتفتی، میری پاک زمین کو ناپاک کرنے آئے تھے۔میں نے بھی ان کے سر پر پہنچ کر گرنیڈ سے حملہ کر دیا۔زیادہ حملہ آور مر چکے ہوں گے باقی بھاگ گئے۔صبح جا کر ان کی لاشیں دیکھ لینا۔"

چوکی کے تمام جوان اس کی بہادری پر اش اش کر اٹھے تھے۔گویا انہیں فخر ہو رہا تھا کہ ان کا افسر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے والا ہے۔اگلے دن شہزاد نے کہا۔"سر آپ نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا لیا۔آپ افسر ہیں۔آپ کی جان کی بہت قیمت ہے۔ایسے میں اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟"

اسفند نے ہنستے ہوئے اس کے سینہ پر مکا مارا اور کہا۔"جان چلی جائے تو کیا ہوگا؟ جان کو تو جانی ہی ہے۔اگر کسی مقصد کی خاطر جان دی جائے تو پھر کیا غم ہے؟ شہزاد غور سے سنو اب تک افسر نہ لڑے سپاہی نہیں لڑتا۔میں تو کہتا ہوں افسر دلیر ہو تو ہی جوان بھی شیر۔افسر آگے نہیں بڑھے گا تو جوان بھی آگے نہیں بڑھے گا۔اگر میں فرنٹ کی جانب ایک قدم بڑھاؤں گا تو یہ دس قدم بڑھائیں گے۔آج میں نے تنہا دشمن کو بھگا دیا۔میرے پیچھے اسی لیے وہ آئے کہ انہیں اپنے افسر کو اکیلے جانے پر پشیمانی ہوئی۔اگر میں انہیں کچھ کہتا تو وہ بھلا دیتے مگر میرا عمل انہیں ہمیشہ یاد رہے گا۔میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔"

ابھی اس مقابلے کی گونج کم نہ ہوئی تھی کہ مخبر نے ایک اہم خبر دی۔اس کے مطابق 75 سے 80 دہشت گرد گڑھ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ان میں ازبک کثرت سے ہیں جو تربیت یافتہ ہیں۔ازبکستان سے آئے ان ناگوں کا سر کچلنا ضروری تھا۔ان کو سبق سکھانے کی ذمے داری ایک دوسری یونٹ کو دی گئی تھی۔اس یونٹ نے کور دینے کے لیے اسفند یار کی یونٹ سے مدد مانگی۔ان کو کور کون دے یہ سوال سی او نے سب کے سامنے رکھا۔جھٹ اسفند یار بول اٹھا۔"سر! مجھے حکم دیجیے میں جاؤں گا۔"

کرنل صاحب نے اس کی بات کو رد نہیں کیا اور کہا۔"او کے آپ پوری تیاری کر لیں۔"

اسفند یار اپنے گیارہ ساتھیوں کے ہمراہ رات کو نکلا اور صبح اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے کور دینا تھا۔یہ پہاڑی کی چوٹی تھی۔وہاں پہنچ کر اسفند یار نے ساتھیوں کو مورچے بنانے کا حکم دیا۔ایک صوبے دار نے کہا۔"سر! رات بھر کے سفر سے تھک چکے ہیں کچھ دیر آرام نہ کر لیں؟ یوں بھی ہمیں تین گھنٹے ہی تو ٹھہرنا ہے۔"

اسفند جواباً بولا۔"صاحب! معاملہ دو تین گھنٹے کا نہیں، معاملہ دفاع کا ہے، جہاں بھی جائیں سب سے پہلے اپنے دفاع کا سوچیں۔آپ خود محفوظ ہوں گے تبھی آپ دشمن کو غیر محفوظ کر سکتے ہیں۔ایک بادشاہ کا قصہ آپ نے سنا ہوگا، اس نے حملہ کر کے بہت سا علاقہ فتح کر لیا اور جشن فتح منانے لگا۔یوں وہ دفاع سے غافل ہوا تھا کہ شکست خوردہ فوج زخمی شیر کی طرح پل پڑی۔بادشاہ اپنی غفلت اور دفاع کی کمزوری کے باعث جیتی ہوئی جنگ ہار گیا، لہٰذا ہمیں غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

آدھا گھنٹا آرام کے بعد مورچے کھودے جانے لگے جس میں خود اسفند یار نے بھی حصہ لیا۔جب مورچے تیار ہو گئے تو اپنے تین ساتھیوں سے کہا کہ عقبی حصے کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے، پھر باقی جوانوں کو مختلف مقامات پر چوکس رہنے کی تنبیہ کی۔

اب سب اس یونٹ کے منتظر تھے جسے کور دینا مقصود تھا۔وہ یونٹ ابھی پہنچی بھی نہ تھی کہ دہشت گرد پہنچ گئے۔ان سے نمٹنے کی تیاری ہو ہی رہی تھی کہ وائرلیس پر پیغام آگیا کہ ہیڈ کوارٹر واپس آجائیں۔

اسفند یار نے جواب دیا۔"کیسے آجائیں۔دہشت گردوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ہم ان کے نرغے میں ہیں، ان کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ہمیں فضائی مدد درکار ہوگی۔"

جواب آیا کہ اس وقت یہاں ہیلی کاپٹر نہیں ہے۔

صورتِ حال نازک ہو چکی تھی۔دہشت گرد بار بار اسپیکر پر اعلان کر رہے تھے کہ آپ لوگ ہر طرف سے گھیرے جا چکے ہیں۔اپنے ہتھیار پھینک کر نیچے آجائیں۔آپ لوگوں کو کچھ کہا نہیں جائے گا، صرف تبادلے میں ہم اپنے قیدی آزاد کرائیں گے۔

یہ وقت اسفند یار کے لیے بہت کٹھن تھا۔اس نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا تھا۔اس مشکل ترین وقت میں بھی اس کے چہرے پر ایک بشاشت طاری تھی۔اس نے ایک مختصر قائدانہ خطاب کیا۔"جوانو! گھبرانا مت، موت اور زیست اللہ کے ہاتھ ہے۔اللہ چاہے تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔اللہ چاہے تو ہمیں اس سے بھی بڑا رتبہ بخش سکتا ہے اور وہ ہے شہادت کا رتبہ۔ہمارے پاس دو راستے ہیں۔ایک ہم ہتھیار پھینک دیں اور خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔دوسرا راستہ ہے ہم اپنے آپ کو اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جو یقیناً رحیم و کریم ہے۔پہلے راستے میں یعنی سرنڈر کرنے پر یہ ہماری گردنیں کاٹ کر اس کی فلمیں بنائیں گے اور انہیں دہشت پھیلانے کے لیے استعمال کریں گے۔دوسرے طریقے میں ہم بہادروں کی طرح لڑیں گے۔شہادت سے قبل تیس چالیس درندوں کو جہنم واصل کر ہی دیں گے۔موت نے تو آنا ہی آنا ہے، کیوں نہ اس شان سے مریں کہ جنت کے فرشتے ہمارے

PakiBooks.Site

استقبال کے لیے کھڑے ہوں۔“

اسفند یار کی اس تقریر نے سب کے منتشر عزائم کو یکجا کردیا۔ خوف کے بادل چھٹ گئے۔ جوش و جنوں عروج پر آگئے۔ سب نے ایک ساتھ کہا۔ ”ہم آخری سانس تک لڑیں گے۔“

عین اسی وقت ایک دہشت گرد عقب سے چڑھ آیا جو جوانوں کی عقابی نگاہوں سے بچ نہ سکا اور جہنم کا مسافر بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوگئی۔ مجاہدین پاکستان نے مورچے سنبھال لیے اور جوابی فائرنگ کا آغاز کردیا۔

مقابلہ شباب پر آگیا تھا۔ جوانوں کو احساس ہوگیا تھا کہ مورچے بنانا کام آگیا ورنہ وہ مقابلہ نہ کر پاتے۔

کچھ دیر کے بعد اسفند یار نے جوانوں کو فائر روک دینے کا حکم دیا۔ ادھر سے فائرنگ رکی تو دہشت گردوں نے بھی فائر روک دیا۔ انہوں نے اسپیکر سے پھر اعلان کیا۔ ”آپ ہمارے گھیرے میں ہیں، بہتر یہی ہے کہ ہتھیار پھینک کر نیچے آجائیں۔“

اسفند یار نے ایک اونچی آواز والے جوان کو کھڑا کیا تاکہ وہ جواب دے سکے۔ اس جوان نے کہا۔ ”ہمارے پاس اسلحہ کم ہے۔ ہم مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہمیں محفوظ انداز میں جانے کا راستہ دیا جائے۔ ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔“

دونوں طرف سے اعلانات ہوتے رہے لیکن نہ وہ اوپر آئے اور نہ یہ نیچے گئے۔ وقت گزرتا رہا۔ اسفند یار کا وقت گزارنے کا حربہ کامیاب رہا۔ اچانک دشمن نے پھر سے فائرنگ شروع کردی۔ اسفند یار نے جوابی فائرنگ سے جوانوں کو منع کردیا جبکہ اس فائرنگ سے ایک سپاہی تاج محمد شدید زخمی ہوگیا تھا۔ گولی اس کے داہنے رخسار پر لگی تھی اور بائیں رخسار سے باہر نکل گئی تھی۔

اسفند یار نے اسے گود میں اٹھایا اور ساتھیوں کو طبی امداد دینے کا کہا۔ تبھی اس نے دیکھا کہ دہشت گرد اوپر بڑھتے چلے آرہے ہیں، اسفند یار نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ انتہائی صبر و تحمل سے وہ سب انہیں اوپر آتے دیکھ رہے تھے۔ دشمن نے جب دیکھ لیا کہ ان پر فائرنگ نہیں ہورہی ہے تو ان کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ سب بھرا مار کر اوپر چڑھنے لگے۔ جب دشمن پاک فوج کی زد میں آگئے تو پھر اسفند نے فائر کا آرڈر دیا۔

اب دہشت گردوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ سب کھلے میں آگئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ کھلے میں جتنے بھی دہشت گرد تھے وہ سب لقمۂ اجل بن گئے۔ اس اچانک افتاد سے وہ سنبھل نہ پائے اور اپنے ساتھیوں کو تڑپتے چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس طرح گھیرا بھی ٹوٹ گیا اور ان لوگوں کو سبق بھی مل گیا کہ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی۔

اسفند نے جوانوں کو شاباشی دی۔ ”میرے غیور ساتھیو! تم نے دلیری کی وہ مثال قائم کی ہے جس سے ٹیپو اور ابن قاسم کی روحیں مطمئن ہوگئی ہوں گی۔ مگر دوستو! یاد رکھو ابھی اپنے آپ کو محفوظ مت جانو۔ دشمن مثل روباہ چالاک ہے۔ وہ گھنٹے دو گھنٹے میں دوبارہ زیادہ تعداد میں اور شدت سے حملہ کرے گا۔ اس لیے آپ لوگ یہاں سے نکلیں، زخمی تاج محمد کو بھی لے جائیں۔ آپ لوگوں نے نالے کی جانب سیدھے کوچ کرنا ہے۔ یہاں دو آدمی رہیں گے تاکہ دشمن لاشیں اٹھا نہ سکے۔ انہیں علم نہ ہوسکے کہ مورچہ خالی ہوچکا ہے۔ کئی جوانوں نے خود کو پیش کیا کہ ہم یہاں رہیں گے مگر اسفند نے صرف صوبے دار دلنواز کو روک لیا باقی سب کو بھیج دیا۔“

اس دوران دہشت گردوں نے کئی بار لاشیں لے جانے کے لیے کوشش کی، آگے بڑھے مگر اوپر کی فائرنگ نے انہیں روک دیا۔ کافی وقت گزر گیا تب اسفند یار اپنے ساتھی کے ساتھ مورچے سے نکلا اور نالے میں اپنے ساتھیوں سے جاملا۔ اسفند یار کا یہ چھوٹا سا قافلہ فتح کے شادیانے بجاتا ہوا اپنی یونٹ میں جا پہنچا۔

6 جنوری 2013ء کو اسفند یار وزیرستان سے دو ہفتے کی چھٹی لے کر گھر آیا اس لیے کہ اس کا بڑا بھائی شہریار انگلینڈ سے آیا ہوا تھا۔ لہٰذا گھر پر خوب ہلا گلا ہونے لگا۔ شہریار کی واپسی 20 جنوری کو تھی اور اسفند یار کی تعطیلات 19 جنوری تک تھیں۔

19 جنوری 2013ء کو اسفند یار وزیرستان چلا گیا اور 20 جنوری کو شہریار لندن فلائی کرگیا، گھر ایک بار پھر سونا ہوگیا، دونوں بھائیوں کی وجہ سے جو رونق آئی تھی وہ رخصت ہوچکی تھی مگر اگلے ہی دن گویا معجزہ سا ہوگیا۔ ابھی پرسوں ہی تو اسفند وزیرستان کے لیے نکلا تھا اس کی واپسی کب ہوگی کسی کو معلوم نہ تھا خود اسفند یار کو بھی علم نہ تھا مگر آج ایسا ہوگیا 21 جنوری کو ڈاکٹر صاحب اسپتال کے لیے روانہ ہونے ہی

والے تھے کہ پورے گھر میں ایک شور سا گونج اٹھا۔ ڈاکٹر صاحب ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے وہاں کا منظر دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئے۔ اسفند یار مع ساز و سامان کے آگیا تھا۔ اس کی آمد نے سب کو شادمان کردیا تھا، بقول اس کے وہ وزیرستان کو خیر آباد کہہ آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی پوسٹنگ ایک دوسری بٹالین میں ہوگئی ہے اور وہ ان کے ساتھ ایک سال کے لیے یو این مشن پر جارہا ہے۔ اسے لائبیریا جانا ہے۔ فروری کے آخر تک وہ چھٹی پر ہے پھر اسے وہاں حاضر جاکر رپورٹ کرنا ہے۔

اسفند یار کی چھٹیاں شاندار گزریں۔ حسان اور والد صاحب نے اس کے ساتھ خوب ان ڈور گیم کھیلے، سے فرصت ملتی تو وہ والدہ کے ساتھ گپیں لگانے بیٹھ جاتا۔ گھنٹوں ان کی نصیحت آموز باتیں سنتا اور پھر تمام اہل خانہ کے ساتھ اردگرد کے مقامات کی سیر کرتا، کئی بار اس نے گھر والوں کے ساتھ پکنک بھی منائی۔ کئی بار باہر جاکر کھانا بھی کھایا۔ اسی میں ایک ماہ گزر گیا۔ اب 26 فروری آچکی تھی اور اسے وہاں حاضر رپورٹ کرنا تھا۔

والد کے اداس چہرے اور والدہ کی اشک بار آنکھوں اور دل کی گہرائیوں سے نکلتی دعاؤں کے سایہ میں، بھائی کی بھیگی ہوئی مسکراہٹوں کے جلو میں وہ رخصت ہوکر پنوں عاقل پہنچا پھر چار دن بعد 2 مارچ 2013ء کو لائبیریا کے لیے پرواز کر گیا۔

لائبیریا افریقا کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جو پاکستان سے سو سال قبل یعنی 26 جولائی کو 1847ء کو امریکا کی تسلط سے آزاد ہوا تھا۔ اس کا دارالحکومت کا نام مانرویا ہے جو وہاں کا سب سے بڑا شہر ہے۔

جب اسفند یار لائبیریا پہنچا تو وہاں جاکر اسے معلوم ہوا کہ یہاں افسروں کی اکثریت کنٹینرز میں رہتی ہے۔ اسے رہنے کا یہ انداز بالکل پسند نہ آیا مگر مجبوری تھی اس لیے وہ دل پر جبر کرکے کنٹینرز میں سونے لگا۔

دفتری امور سے وقفہ ملتے ہی وہ اسکائپ پر گھر والوں سے رابطے میں آجاتا۔ گھنٹوں باتیں کرتا، لائبیریا کی باتیں، یہاں کے لوگوں کی بود و باش پر، ان کے رسم و رواج پر خوب باتیں ہوتیں۔ دوسری طرف ماں ہوتی اور ان کی نصیحتوں بھری باتیں۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا کہ 18 اکتوبر 2013ء کو وہ دفتری کام سے گھانا گیا۔ سرکاری کاموں کو نمٹانے کے بعد جب وہ اکرا کی سیر کو نکلا تو اسے ایک ہاکی اسٹیڈیم نظر آگیا۔ وہ حیران رہ گیا کہ اتنے چھوٹے سے ملک میں اتنا شاندار اسٹیڈیم، ہاکی اس کا جنون تھا اس لیے وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا اور اسٹیڈیم کے اندر داخل ہوگیا۔ چند نوجوان ہاکی کھیل رہے تھے وہ اسے دیکھ کر قریب آگئے۔ جب اسفند نے انہیں بتایا کہ وہ پاکستان سے آیا ہے تو ان کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ہے۔ انہوں نے دعوت دی کہ وہ ان کے ساتھ کچھ دیر کھیلے اسفند یار نے ہاکی اسٹیک تھام لی پھر جو اس نے گیند کو پکڑا تو ایسا لگا کہ گیند اس کی اسٹیک سے چپک گئی ہے۔ وہ سب اس کی مہارت دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ انہوں نے پیشکش کی کہ وہ انہیں کوچ کرے۔

ان کی دعوت وہ ٹھکرا نہیں سکتا تھا مگر ایک بڑی مجبوری حائل تھی اس لیے اسفند یار نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک سرکاری کام سے یہاں آیا ہے اور اسے کل لوٹ جانا ہے۔

وہ سب بہت اکسائیٹڈ تھے۔ انہوں نے اس کے ساتھ تصویریں بنوائیں کہ اپنے دوستوں کو دکھا سکیں، انہیں بتاسکیں کہ ہم نے ایک پاکستانی چیمپئن کے ساتھ ہاکی کھیلی ہے۔

تصویر کھنچوا کر وہ بابائے لگانا کے مزار پر گیا پھر اگلے دن واپس لائبیریا آگیا۔

اکتوبر 2013ء میں اس نے گھر والوں کو اسکائپ پر بتایا کہ اسے چھ ہفتے کی چھٹیاں مل رہی ہیں۔ والدہ نے فوراً کہا کہ بس تم ٹکٹ کٹاؤ اور پاکستان آجاؤ مگر جب یہی بات اس نے اپنے ابو سے کہی تو انہوں نے کہا۔ ”اسفند سوچ لو، ابھی تمہیں فراغت ہے۔ ازدواجی ذمے داریوں سے بھی آزادی ہے۔ ان چھٹیوں کا بہتر مصرف ڈھونڈ لو۔“

اسفند نے پوچھا۔ ”ایسا کون سا مصرف؟“

ڈاکٹر بخاری نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ نے بہت خوب صورت کائنات بنائی ہے۔ گھومو پھرو تاکہ تمہیں اللہ کی قدرت حکمت اور طاقت کا اندازہ ہوجائے۔ تمہارے پاس نیلا پاسپورٹ بھی ہے۔ ساٹھ سے زیادہ ممالک کی سیر بغیر کسی جھنجٹ کے کرسکتے ہو۔“

اسفند یار کو یہ تجویز پسند آئی اور وہ یورپ کی سیاحت پر نکل گیا۔ اس نے دورہ یورپ کا آغاز جمہوریہ چیک سے کیا پھر جمہوریہ سلواکیہ پہنچا۔ ہنگری، آسٹریا، جرمنی، ہالینڈ،

PakiBooks.Site

بیلجیئم، لکسمبرگ، فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، اسپین، مراکش اور ترکی کی سیر کرتا ہوا 20 دسمبر 2013ء کو واپس لائبیریا آ گیا۔

لائبیریا میں اقوام متحدہ کے امن مشن میں معاونت کے دوران اس نے ایک ڈپلوما بھی کیا جس کا نام Advance suc cessful leader Deploma تھا۔ اس کورس کی تکمیل پر اسے ایک سرٹیفکیٹ بھی ملا۔

مارچ 2014ء میں سندھ رجمنٹ کی واپسی شروع ہوئی۔ رجمنٹ کے تمام لوگ مختلف پروازوں سے وطن لوٹ رہے تھے۔ ایک سال سے وہ سب عزیز واقرباء سے دور تھے۔ اب اپنوں میں جانے کی خوشی سے سرشار تھے۔ تقریباً 75 افراد واپس ہو گئے تو اسفند نے گھر والوں کو اطلاع دی کہ اس کی بھی واپسی طے ہو چکی ہے اور وہ چند دنوں میں گھر آ جائے گا۔

اطلاع دینے کو دے چکا تھا مگر قسمت کچھ اور دکھانا چاہ رہی تھی۔ انہی دنوں اسفند کو بخار نے آن دبوچا۔ بخار اتنا تیز ہو جاتا کہ جسم بھٹی بن جاتا۔ رجمنٹ کے ڈاکٹر ذوالفقار نے معائنہ کیا اور پیناڈول کی دو گولیاں دے دیں جنہیں کھانے سے بہت پسینا آیا اور بخار اتر گیا۔ اسفند نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ عام بخار نہیں ملیریا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب اس کی بات سے متفق ہو گئے اور کئی ٹیسٹ لکھ کر دے دیا۔ جب رپورٹ سامنے آئی تو اس کی تائید تھی مگر یہ ملیریا عام ملیریا نہیں تھا۔ ایک بہت خطرناک قسم کا ملیریا تھا۔ اس کے علاج میں دس دن لگ گئے۔ جب علاج مکمل ہوا تو پیارے وطن پاکستان کے لیے وہ روانہ ہوا۔

20 مارچ 2014ء کو بخاری ہاؤس میں گویا بہار آ گئی۔ اسفند کے گھر آتے ہی سب کے چہرے کھل اٹھے۔ شہریار بھی آئے ہوئے تھے اور احسان تو تھا ہی۔ تینوں بھائیوں کے قہقہے پھر سے گونجنے لگے۔ کھیل مقابلے بازی انہی سب مصروفیات میں وقت تیزی سے گزر رہا تھا کہ کرنل صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ فوراً آ کر مجھ سے ملو۔

اس ایک کال نے سب کے چہروں پر مردنی طاری کر دی۔ وہ جانتے تھے، فوجی نوکری میں آرام نہیں۔ جب بلاوا آ جائے تو ہر حال میں جانا پڑتا ہے۔

جب کرنل صاحب کے بلاوے کی خبر ماں تک پہنچی تھی تو انہوں نے کہا۔ ''ابھی تو آئے ہو میرا جی بھی نہیں بھرا اور تم جا رہے ہو۔''

ان کے آنسو دیکھ کر اسفند گھبرا اٹھا اور ماں سے لپٹ کر بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر یہ بھی تو سوچیں، اس وقت افسران کی بہت کمی ہے۔ ایک ایک افسر کئی کئی کام انجام دے رہے ہیں، ہم سب نے خواہ افسر ہو یا جوان، سب نے پاکستان کی خدمت اور سربلندی کی قسم کھا رکھی ہے۔ ہم کسی کام سے نہیں گھبراتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت پاک فوج دنیا کی صف اول کی فوج ہے۔ آپ کو تو فخر ہونا چاہیے کہ پاک فوج میں آپ کے فرزند کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔''

ڈاکٹر بخاری نے اس کی تائید میں کہا۔ ''ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دیں تو یہ ملک بنا اور فوج کی قربانیوں کے باعث یہ ملک قائم ودائم ہے۔ تم جانے کا انتظام کرو اور کرنل صاحب کو کنفرم کرو کہ تم کل آ رہے ہو۔''

اسفند کے جاتے ہی شہریار بھی انگلستان روانہ ہو گیا۔

اسفند یار کے پنوعاقل پہنچتے ہی اسے ایجوٹنٹ کے فرائض سونپ دیئے گئے۔ وہ مصروف تو ہو گیا مگر گھر سے مسلسل رابطے میں بھی تھا، ہر روز اسکائپ پر اپنی والدہ سے گھنٹوں باتیں کرتا۔ بس یہی وقت ہوتا تھا جب اس کے سامنے فائلیں نہیں ہوتی تھیں۔

ایک دن میجر خالد کسی کام سے اس کے دفتر آئے۔ وہ عقبی طرف سے آئے تھے اس لیے کہ مرکزی دروازے سے آنے کے لیے انہیں لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ اس وقت رات گہری ہو رہی تھی مگر میجر خالد کو اطمینان تھا کہ اسفند یار ابھی بھی دفتر میں بیٹھا ہوگا لیکن جب وہ اس کے دفتر میں داخل ہوئے تو اسفند کہیں نظر نہ آیا۔ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ باہر نکلے تو دیکھا کہ ہاتھ میں گن لیے وہ سنتری کی جگہ کھڑا ہے۔

میجر صاحب اس کے نزدیک پہنچ کر بولے۔ ''یہ کون سی ڈیوٹی ہے؟''

''سر! دراصل میں تھکان رفع کرنے باہر آیا تو دیکھا کہ سنتری کچھ سست ہے، چاق و چوبند نہیں۔ میں نے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ مصروفیت کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکا ہے اور بھوکے ہی ڈیوٹی پر آ گیا ہے۔ اس وقت اسے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس طرح تو اس کا ڈیوٹی دینا محال ہے۔ یہاں مستعد جوان کی ضرورت ہے اس لیے میں نے اسے کھانا کھانے بھیج دیا تا کہ وہ فریش ہو کر آ جائے اتنی دیر کے لیے اس کی جگہ میں کھڑا ہو گیا۔''

میجر خالد اس کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''دفتر سامنے ہی ہے چلو اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چند اہم باتیں کرنی ہیں۔''

اسفند نے جواب دیا۔ ''نہیں سر میں سنتری کی ڈیوٹی پر ہوں، کہیں نہیں جا سکتا، آپ اندر جا کر بیٹھیں، سنتری آتا ہے تو میں اسے ڈیوٹی سونپ کر آتا ہوں۔''

اسی وقت سنتری لوٹ آیا۔ اسفند نے اسے گن سونپی اور دفتر میں آ گیا۔ تب میجر صاحب نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے ابھی بھی کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔''

اسفند بولا۔ ''سر وہ بھوکا تھا بھوکے پیٹ ڈیوٹی ناممکن اس لیے اسے ریلیف دیا، اگر آپ کے کہنے پر میں اسے چھوڑ کر اندر آ جاتا تو اس پر اچھا اثر نہیں پڑتا، منہ پر نہ صحیح مگر دل میں کہتا کہ یہ افسر ہیں، اسلحے کی حفاظت کا درس ہمیں دیتے ہیں اور خود اندر بیٹھ کر گپیں لگا رہے ہیں۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم اہم امور پر تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ اب اسے یقین آ چکا ہو گا کہ ہمارے افسر ہم سے پیار کرتے ہیں۔''

اس واقعے کے کچھ دن بعد کا ذکر ہے۔ میجر جواد یونٹ کی تزئین وآرائش کرا رہے تھے۔ انہوں نے تجویز دی کہ مسجد کی بھی مرمت کرائی جائے۔ اسفند بھی قریب تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''سر مسجد تو اللہ کا گھر ہے۔ اللہ ہی نے ہم سب کو نوازا ہے، تو کیوں نہ اس کی نوازش سے یعنی اپنی جیب سے یہ خرچ اٹھالیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ رقم بھی زیادہ جمع ہو جائے گی اور اس کا فائدہ ہم سب کو قیامت تک ملتا رہے گا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ہم سب اپنا ایک اکاؤنٹ کھول لیں گے جس میں قیامت تک ثواب جمع ہوتا رہے گا۔''

اسفند کی یہ تجویز سب کو پسند آ گئی اور مسجد کی مرمت مزید بہتر انداز میں ہو گئی۔

2015ء کی بات ہے ان دنوں اسفند یار پشاور میں پوسٹڈ تھا۔ اسے خبر ملی کہ شہریار انگلینڈ سے آیا ہوا ہے۔ وہ چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ تینوں بھائی جمع ہوئے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں پھر گفتگو کا رخ ملک میں بڑھتی دہشت گردی کی طرف ہو گیا۔ حسان نے اسفند یار سے کہا۔ ''بھائی اب پورے خاندان کی عزت آپ پر ہے۔''

حسان کی اس بات نے سب کو حیران کر دیا کہ یہ بے

جناح کچھ یادیں، کچھ باتیں

برصغیر کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بین الاقوامی تناظر میں کچھ مختلف نظر آتی ہے۔ مغلوں کے زوال کے بعد انگریز تاجر (East India Company) حکمران بن گئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے زیر اثر آ گیا جس کے بعد برطانوی قوانین کا نفاذ ہوا۔ ہندو ہر میدان میں انگریزوں کے ساتھ تھے جب کہ مسلمان 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد زیر عتاب تھے۔ سرسید احمد خان کی کوششوں سے مسلمانوں کو عام معافی ملی لیکن عملی طور پر مسلمان سیاست سے دور رہے۔ یہ وقت کی ضرورت تھی اور سرسید احمد خان کی حکمت عملی بھی۔ 1914ء سے 1919ء جنگ عظیم اوّل اور 1939ء سے 1945ء تک جنگ عظیم دوم میں انگریز حکمرانوں کو مسلمان فوجیوں کی شجاعت اور وفاداری کا شدت سے احساس تھا اور وہ مسلمانوں کو ناراض کرنے کے موڈ میں نہ تھے۔ خلافت تحریک کے بھی دور رس اثرات ہوئے۔ مسلمانوں کو موہن داس گاندھی کی سیاسی قلابازی کا اس وقت خمیازہ بھگتنا پڑا جب تحریک کے عروج پر علی برادران پورے ملک میں متحرک تھے کہ وہ تحریک سے الگ ہو گئے۔ مسٹر جناح کی حکمت عملی انتہائی کامیاب تھی، انہوں نے گاندھی اور کانگریس کے کسی بھی غیر قانونی اقدام کی حمایت نہیں کی اور قانونی ذرائع پر عمل کرتے رہے۔

اقتباس: جناح کچھ یادیں کچھ باتیں
از: پروفیسر محمد تقی چاندنہ
مرسلہ: احمد جاوید۔ ملتان

PakiBooks.Site

وقت کی راگنی کیسی؟ سب کے حیران چہروں پر ایک نظر ڈال کر اس نے بات مکمل کی۔ ''ہماری نسل سادات صدیوں سے قربانی دیتی آ رہی ہے۔ پانچویں پشت میں سید صاحب شاہ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں اپنے دستے کی کمانڈ کی اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اگلی نسل نے آرام کیا پھر ہمارے دادا جان نے گیارہ نومبر 1939ء کو جب سکھوں نے ٹانڈہ کی مسجد پر حملہ کیا تو انہوں نے سردار جسا سنگھ کو واصل جہنم کر کے مسجد کی حرمت بچائی، ابو والی پشت نے آرام کیا۔ اب ہماری باری ہے لیکن ہم ایسے شعبہ میں ہیں جو بہادری کا مظاہرہ کر نہیں سکتے۔ اس لیے خاندان کی روایت کو قائم رکھنا آپ کی ذمے داری ہے۔''

حسان کی بات سن کر سب ہنس پڑے مگر ڈاکٹر صاحب نے اچھی خاصی کلاس لے لی۔ خوب ڈانٹ پلائی تبھی اسفند یار نے کہا۔ ''میرے لیے میرا ملک، میری قوم اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں اگر ان کے لیے کچھ کر گزرا تو یہ میری نسل، میرے خاندان اور میرے شہر کے لیے قابل توقیر ہوگا۔''

اسفند یار کی یہ باتیں صرف زبانی نہیں عملی بھی ہوتی تھیں۔ بریگیڈ میں کنسٹرکشن کا کام ہو رہا تھا۔ اس کی تعمیر کا ٹھیکا طاہر کے پاس تھا، اسفند یار نے ٹھیکے دار سے پوچھا۔ ''اس نقشے میں گاڑیوں کا شیڈ کہاں ہے؟''

ٹھیکے دار نے جواب دیا۔ ''سر ہمیں کسی شیڈ کا تو بتایا نہیں ہے؟''

''ٹھیکے دار صاحب آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ شیڈ کتنا اہم ہے۔'' پھر اس نے میجر صاحب سے بات کی، انہوں نے بریگیڈیئر صاحب سے مشورہ کرنے کا کہا، بریگیڈیئر صاحب نے سنا تو کہا کہ اس طرح تو اخراجات بڑھ جائیں گے اور نئے سرے سے ٹھیکا منظور کرانا ہوگا۔

جب کسی نے اس کی بات پر توجہ نہ دی تو اس نے ٹھیکے دار کو اپنے دفتر میں بلوایا۔ ایک میجر صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ٹھیکے دار سے پوچھا۔ ''اگر آپ پوری ایمانداری اور نو پرافٹ نو لوس پر یہ شیڈ بنائیں گے تو کتنی رقم درکار ہوگی؟''

ٹھیکے دار نے کاغذ پینسل سے حساب لگا کر کہا کل رقم 123000 روپے بنے گی۔ اسفند نے اسی وقت چیک بک نکالی اور 123000 روپے لکھ کر چیک اسے دے دیا۔

میجر صاحب بول اٹھے۔ ''اسفند یہ کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے یہ رقم اب واپس آسانی سے نہیں ملے گی کئی مہینے لگ جائیں گے۔''

اسفند نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''سر! اس ملک نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے، اگر ہم اسے یہ معمولی سی رقم نہیں دے سکتے تو ہمیں اپنا جائزہ لینا پڑے گا۔ یہ رقم میں صدقہ جاریہ کے طور پر دے رہا ہوں جس جس کی گاڑی کھڑی ہوگی جس جس کو اس شیڈ سے فائدہ ہوگا، اس کی نیکی میرے کھاتے میں لکھی جائے گی۔ اس معمولی سی رقم سے میں نے اپنا ایک منافع بخش اکاؤنٹ کھلوایا ہے۔ اس بینک میں جس کے دیوالیہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔''

وہ اسی طرح نیا نیا اکاؤنٹ کھولتا رہتا۔ گو کہ ہر بار انداز بالکل نیا ہوتا۔ ایک دن اپنے این سی او شہزاد سے بولا۔ ''چلو آج جوانوں کا کھانا چیک کرتے ہیں۔'' پھر وہ جوانوں کی میس میں پہنچے۔ جوان کھانا کھا رہے تھے۔ صاحب کو دیکھتے ہی سب تعظیم میں کھڑے ہونے لگے تو اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا پھر ایک ایک جوان کے پاس گیا اور کھانے کے معیار و لذت کے بارے میں پوچھا۔ پھر ایک جوان کے ساتھ بیٹھ کر اسی کی پلیٹ میں وہ کھانے لگا۔ میس حوالدار نے دیکھا تو ایک پلیٹ میں کچھ بوٹیاں ڈلوا کے لے آیا۔

اسفند نے کہا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں، میں جوان کے ساتھ کھا رہا ہوں لہٰذا یہ بوٹیاں اس کی پلیٹ میں ڈال دیں۔'' پھر اس نے میس حوالدار کو کچھ ضروری ہدایتیں دیں اور واپس ہو گیا۔

ان دنوں اسفند یار کے ایم اے پرویس کے پرچے بھی چل رہے تھے، اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا تھا۔ 16 ستمبر کی شام کو اسفند یار کی، اپنی امی سے اسکائپ پر بات ہوئی۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیا تم جمعہ کو چھٹی لے کر گھر آ سکتے ہو؟''

''بالکل آ سکتا ہوں، کوئی خاص بات۔''

''جمعہ کو آؤ گے تو ہفتے کو تمہارے ہونے والے سسرال جائیں گے۔ انہوں نے دعوت کی ہے۔ اب میں انہیں کنفرم کر دیتی ہوں۔''

گھر والے اس کا انتظار کرنے لگے۔ 17 ستمبر کی رات تقریباً آٹھ بجے اس نے حسان کو اسکائپ پر کہا۔ ''امی سے کہہ دینا کل دن نماز جمعہ پڑھ کر پشاور سے نکلوں گا۔'' پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ کال بند کرنے کے بعد اس نے

شہزاد سے کہا۔ ''میں بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ باڑہ فورٹ جا رہا ہوں۔ واپسی میں رات ہو جائے گی آتے ہی سو جاؤں گا۔''

اسفند یار اور بریگیڈیئر صاحب باڑہ فورٹ کے لیے نکل گئے۔ یہاں وہ پہلی بار آیا تھا اس لیے اسے بہت اچھا لگا۔ اس نے وہاں کی تصویریں بھی بنوائیں پھر رات گئے باڑہ فورٹ سے واپس آگیا۔ آتے ہی شہزاد سے بولا۔ ''میرے دفتر میں جاؤ اور میری ٹیبل پر جو فائل رکھی ہے وہ لے آؤ۔''

شہزاد گیا اور متعلقہ فائل لے آیا۔

فائل لے کر اسفند نے کہا۔ ''شہزادے اب جا کر سو جاؤ۔''

''آپ بھی سو جائیں، رات کا ایک بج رہا ہے۔ صبح کام کر لیجیے گا۔''

اسفند نے مسکرا کر کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں فوج میں بڑی موج ہے۔ میں کہتا ہوں فوج کی وجہ سے لوگوں کی موج ہے۔ فوج جاگتی ہے تبھی تو عوام موج سے سوتے ہیں۔ مجھے ابھی کام کرنا ہے۔ تم جا کر سو جاؤ۔''

پھر وہ لیپ ٹاپ پر فائل کھول کر کام میں مشغول ہو گیا۔

وہ رات کتنے بجے تک کام میں مشغول رہا شہزاد کو بھی پتا نہیں۔ وہ مزے سے سو رہا تھا کہ موبائل کی بیل بجنے لگی۔ لیٹے لیٹے اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ گھڑی 5:45 بجا رہی تھی۔

اتنی صبح کال آنے کا مقصد ہے کہ ایمرجنسی ہے وہ فوراً اسفند یار کے کمرے میں پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی اسفند یار نے کہا۔ ''شہزاد فوراً میری وردی تیار کرو، مجھے بہت جلدی میں نکلنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اسفند کے چہرے پر بہت زیادہ سنجیدگی تھی۔ اس نے شیو کیا اور منہ دھو کر باہر نکل آیا۔

اتنی دیر میں وردی تیار ہو چکی تھی۔ فوراً وردی پہنی اور باہر نکل گیا۔ شہزاد نے ناشتے کا پوچھا تو جواب ملا۔ ''ٹائم نہیں ہے۔''

باہر Aviation کی گاڑی کھڑی تھی۔ باہر نکلتے ہی اس نے ڈرائیور سے چابی لی اور اسے برابر والی سیٹ پر بٹھا کر تیزی سے گاڑی بھگانے لگا۔

ایمرجنسی یہ ہوئی تھی کہ بریگیڈیئر عنایت کو جوں ہی اطلاع ملی کہ دہشت گردوں نے بڈھ بیر کیمپ پر اپنے ناپاک قدم رکھ دیے ہیں تو انہوں نے اسفند یار کو فون کیا اور فوراً آنے کا کہا۔ اسفند نے اپنی ٹرانزٹ پلاٹون کو متحرک کیا اور مختصر وقت میں بریگیڈ اٹیک تیار کیا۔ جب بریگیڈیئر صاحب باہر نکلے تو اسفند یار بالکل تیار کھڑا تھا۔ اس نے سیلوٹ کیا اور کہا۔ ''سر جلدی کریں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ وہاں اسکول بھی ہے، پشاور جیسا سانحہ ہو سکتا ہے۔''

وہ دونوں بجلی کی طرح وہاں سے نکلے۔ بریگیڈیئر صاحب نے اپنا وائرلیس سیٹ اسفند یار کو دے دیا تھا، اس حکم کے ساتھ کہ وہ سب سے رابطہ کرے اور موجودہ صورت حال سے باخبر رکھے۔ اس نے کئی ایک سے رابطہ کیا پھر بریگیڈیئر صاحب سے کہا۔ ''سر جلدی کریں۔ دہشت گرد دو گروہ میں بٹ کر دونوں گیٹوں سے اندر داخل ہوئے ہیں۔ فائرنگ شدت سے جاری ہے۔ وہ اقامتی کالونی میں جانا چاہتے ہیں۔ سر اگر یہ لوگ وہاں چلے گئے تو بہت خوفناک صورت حال ہوگی۔''

اس وقت وہ شدید ہیجان میں تھا۔ چہرے سے پریشانی عیاں تھی، اس کے ہاتھوں اور انگلیوں کی حرکات سے لگ رہا تھا کہ سخت جذباتی کشمکش میں ہے۔ وہ مسلسل بول رہا تھا۔ ''سر یہ درندے ہیں بھیڑیے ہیں اگر وہ اقامتی کالونی میں داخل ہو گئے تو بہت برا ہوگا۔ وہ عورت دیکھیں گے نہ بچے، سب کے ساتھ بہیمانہ سلوک کریں گے۔''

بریگیڈیئر صاحب بھی فکر مند تھے مگر کئی جنگوں کا تجربہ تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہے، اسی لیے وہ خاموش تھے مگر اسفند یار مسلسل بول رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اڑ کر وہاں پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل اپنی انگلیوں کو چٹخار رہا تھا جو غماز تھا کہ جوش و ولولے میں ابال آ رہا ہے۔ وہ سخت ذہنی تناؤ میں مبتلا ہے۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''خبیثو! کتو! ہمیں پہنچنے دو۔ تمہیں عبرت کا نشان بنا دیں گے۔ بس ہمارا انتظار کرو۔''

وہ جذبات کی رو میں بہتا جا رہا تھا۔ 6:25 پر وہ بڈھ بیر پہنچ گیا۔ بڈھ بیر ایک متروک ہوائی اڈہ تھا جو انگریزوں کا تعمیر کردہ تھا۔ 1959ء میں اس ایئربیس کو نیٹو کے نام پر دے دیا گیا تھا مگر بعد میں اسے واپس لے لیا گیا۔ پھر 1970ء میں پاک فوج نے اسے ایمرجنسی کے استعمال کے لیے حاصل کر لیا اور اسے ایئرفورس کا بیس کیمپ بنا دیا۔ اسی بیس کیمپ پر دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا۔

وہ دونوں کیمپ میں داخل ہوئے تو پورا کیمپ فائرنگ کی

PakiBooks.Site

آواز سے گونج رہا تھا۔ وہ دونوں برق رفتاری سے کنٹرول روم میں پہنچے تو خبر ملی کہ QRF کے کمانڈر زخمی ہو گئے ہیں۔ اسفند نے بریگیڈیئر صاحب سے التجا کی کہ اسے کمانڈ دی جائے تو وہ بولے۔ ”اسفند! میجر صاحب کے بعد دوسرے آفیسر بھی وہاں موجود ہیں۔ جن کی ذمے داری ہے وہ نبھا رہے ہیں۔ آپ ایک اسٹاف آفیسر ہیں۔ آپ کو کیسے اجازت دے دی جائے۔“

وہ خود بھی جانتا تھا کہ اسے اتنی بڑی ذمے داری نہیں دی جا سکتی ہے کیونکہ وہ اسٹاف آفیسر ہے مگر اس پر تو جنون سوار تھا۔ اس نے ضد کی۔ ”سر! وہ کیپٹن ناتجربہ کار ہے، جونیئر ہے جب کہ دہشت گرد ٹرینڈ ہوں گے، ان کے پاس اسلحہ بھی جدید ترین ہو گا، اگر یہ کالونی میں داخل ہو گئے تو قیامت ہو جائے گی۔ وہ رہائشیوں کو یرغمال بنا لیں گے۔ پلیز سر ایک بار مجھے چانس دے دیں۔ میں انہیں چُن چُن کر شکار کروں گا۔“

بریگیڈیئر صاحب نے بادلِ نخواستہ اسے اجازت دے دی کیونکہ انہیں اسفند کی قابلیت سے واقفیت تھی۔ بھروسا تھا، انہوں نے اسفند سے کہا۔ ”Well equipped ہو کر جانا۔“

اجازت ملتے ہی وہ چیتے کی پھرتی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی گاڑی تیزی سے ان دہشت گردوں کی جانب بڑھنے لگی۔ اس نے فی الفور QRF کو منظم کیا پھر دہشت گردوں کے ان راستوں پر جوانوں کو کھڑا کر کے مکمل طور پر بند کر دیا جو اقامتی کالونی کی جانب جاتے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب چیدہ نشانے بازوں کو کیموفلاج کر کے بٹھا دیا۔ اگر دہشت گرد بڑی تعداد میں بھی بڑھنے کی کوشش کرتے تو ناکام رہتے۔

اسفند یار نے نہایت قلیل عرصے میں گھیرا سخت کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی گاڑی کو مسجد کے چاروں طرف گھما رہا تھا۔ اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد وہ دہشت گردوں کے مزید نزدیک ہو گیا۔ تمام دہشت گرد اِدھر اُدھر بیرکوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ان کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ انہیں باہر لانا ضروری تھا اسی لیے وہ ان کے نزدیک پہنچا تھا پھر اس نے ایک دہشت گرد کو گھیر لیا۔ وہ مسجد کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس دہشت گرد نے موت کا ہرکارہ بن کر اسفند یار کو اپنی جانب آتے دیکھا تو اس نے اسفند کی گاڑی پر فائر کیا۔ دوسری جانب بنے بیرک سے بھی اس پر برسٹ چلایا گیا۔ اس وقت اسفند پر جنون سا طاری تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا رسک لیا، گاڑی سے اتر گیا۔

اس نے مسجد کی سیڑھیوں سے پلٹ کر بھاگنے والے دہشت گرد کے گردو کو نشانے پر لے لیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دہشت گرد فائر کرنے کی بجائے اپنی جان بچانے کے لیے بیرک کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی وہ بہ آسانی اسفند کو ڈھیر کر سکتا تھا مگر اسفند کی دہشت نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہتوں کو نشانہ بنانے والے اس دشمن وطن کو شاید علم ہو گیا تھا کہ وہ اسفند کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

اس بزدل کو بھاگتے دیکھ کر اسفند نے اس پر دوسرا فائر کیا۔ پہلا فائر ٹانگ پر کیا تھا مگر دوسرا فائر جسم پر ہوا اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا، اپنے ساتھی کو مرتے دیکھ کر دیگر دہشت گردوں نے بیرک سے برسٹ چلانا شروع کر دیا۔ اسفند نے بھاگ کر ایک ستون کی آڑ لی اور اس نے وہاں سے بیرک کی طرف فائر کیا۔

سپاہی نوشاد علی بھی بہادری سے لڑ رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کوئی بھی دہشت گرد بچنے نہ پائے۔ ابھی مقابلہ جاری تھا کہ اس کی ٹانگ میں گولی لگی اور وہ شدید زخمی ہو گیا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ناچار اس نے ایک ستون کی آڑ لے لی۔ تبھی ایک دہشت گرد بیرک سے نکلا اور اس کے بہت قریب سے گزرا۔ اس کی نظر نوشاد پر پڑی تو وہ رک گیا۔ اس نے نوشاد علی پر فائر کرنے کے لیے گن سیدھی کر لی۔ نوشاد علی کو لگا کہ موت اس پر جھپٹنے والی ہے۔ اس نے کلمہ کا ورد شروع کر دیا۔ دہشت گرد کی انگلی ٹریگر دباتی کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور اس کا بھیجا اڑا گئی۔ وہ زمین پر گرا تھا کہ سپاہی نوشاد علی نے مڑ کر دیکھا۔ اسفند یار مسکراتا ہوا اس کی جانب آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے کہا۔ ”جوان! تم نے اس کتے پر فائر کیوں نہیں کیا۔“

وہ جواب دیتا کہ اسفند کی تیز نظروں نے بھانپ لیا کہ وہ شدید زخمی ہے۔ اس نے سہارا دے کر نوشاد علی کو ایک محفوظ مقام پر پہنچایا اور خود اس برستی گولیوں کی بارش کی طرف دوڑ گیا۔ اس ہنگامہ میں بھی وہ گھبراہٹ کا شکار نہ تھا۔ ایسے اعصاب شکن ماحول میں بھی وہ موبائل فون پر دوستوں سے رابطے میں تھا۔ اس نے ایک دوست کو فون پر کہا۔ ”دو کتوں کو پھڑکا چکا ہوں۔“

دوست نے کہا کہ اپنا خیال رکھنا تو اس نے جواب دیا۔ ”فکر نہ کر شہزادے میرے ہاتھوں یہ تمام کتے کی موت مریں گے۔“

اس موت کے کھیل میں الجھے ہوئے اسے کافی دیر ہو چکی تھی مگر اس کی یہ مصروفیت ہنوز جاری تھی۔ ان دہشت گردوں کو نشانہ بناتے ہوئے بھی فون پر سب سے رابطے میں تھا۔ اس نے اپنے سابق سی او کو بھی فون کیا تو انہوں نے کہا۔ ”تم نے حفاظتی اقدامات تو کیے ہوئے ہیں نا؟“

اسفند نے جواب میں کہا۔ ”یس سر بلٹ پروف جیکٹ بھی ہے میرے پاس......“

کرنل صاحب نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ”آپریشن کے بعد پوری تفصیل سنوں گا۔ اپنی پوری توجہ آپریشن پر رکھو۔“

اس معرکہ میں اس کے ساتھ حصہ لینے والوں میں سے ایک سپاہی نے بعد میں سب کو بتایا۔ ”صاحب نے ہمیں محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ کسی قسم کا خوف ان کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہ مسلسل ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ”وہ بزدل اور ڈرپوک ہیں۔ یہ نہتے اور کمزوروں پر ہی رعب جما سکتے ہیں، تم جیسے مردوں کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ گیدڑ آج شیروں سے پنجا لڑا بیٹھے ہیں۔ یہ چوہے ہیں، ان پر جھپٹ پڑو، وہ خود بھی ان دشمنانِ دین و وطن پر ایسے جھپٹ رہے تھے جیسے شیر شکار پر جھپٹتے ہیں۔“

ایسے معرکے میں روم کلیئرنس سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ کیپٹن اسفند یار نے بہت سے روم کلیئر کرائے۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دہشت گرد اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں مگر 18 ستمبر کو سب نے دیکھ لیا کہ وہ گیدڑوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ شیر کی ایک دہاڑ نے ان کی اوقات بتا دی تھی۔ وہ صرف بھاگنے کے لیے راستے تلاش کر رہے تھے اور اللہ کے یہ سپاہی پاک وطن کے یہ شیر، ان بزدلوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکار کر رہے تھے۔ دہشت گرد کبھی ایک بیرک میں چھپتے تو کبھی دوسرے میں ایک دہشت گرد جان بچانے کے لیے باتھ روم میں بند ہو گیا۔ کیپٹن اسفند یار نے اسے باہر نکلنے کو کہا مگر اس نے اپنی آواز تک بند کر لی تھی۔ کوئی جواب نہ پا کر اسفند یار نے یہ کھیل سمیٹنے کے لیے باتھ روم میں دستی بم اچھال دیا۔ اس خارجی کا بھرتا باتھ روم میں بن گیا۔

کچھ دیر بعد فائرنگ بالکل ختم ہو گئی۔

8 بج کر 7 منٹ پر اسفند یار نے کمانڈر صاحب کو فون کیا تاکہ فتح کی نوید سنائے۔ انہیں مبارک باد پیش کرے۔ اسی لمحے اس کی نظر ایک دہشت گرد پر پڑی، وہ دہشت گرد لطیف بیرک کے کمرا نمبر 4 میں چھپنے کے لیے داخل ہو رہا تھا۔ اسفند نے فوراً جوانوں سے کہا کہ اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لیں۔ سب نے اسی کمرے کی طرف توجہ مرکوز کر لی تھی۔

12 پنجاب کا ایک دلیر حوالدار بولا۔ ”سر اس جہنمی کو میں اس کے ٹھکانے پر پہنچاتا ہوں۔“

”نہیں صاحب!“ اسفند یار نے کہا۔ ”یہ Reflex کی گیم ہے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے۔ میں آگے بڑھ کر خود اسے جہنم واصل کروں گا۔“ کچھ توقف کے بعد اسفند یار نے ایک جوان سے کہا۔ ”تم دوسری طرف سے آؤ اور لات مار کر دروازے کھول دو۔“

اسفند کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اسے لات مار کر دروازہ کھولنا تھا اور اسفند چھلانگ مار کر اندر داخل ہو جاتا، فائرنگ کر کے اسے جہنم میں بھیج دیتا۔ اس جوان نے اپنے مضبوط بوٹوں سے دروازے کو ٹھڈا مارا تو دروازہ کھل گیا۔ اسفند نے گن تان کر للکارا کہ اپنے ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔

اس للکار نے عجب اثر ڈالا۔ اسفند یار کے ساتھ کھڑے جوانوں نے دہشت گرد کو دیکھ لیا تھا۔ وہ کمرے کے درمیان کھڑا خشک پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ہاتھ میں گن تھی مگر چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دیدنی تھی، اسے کیا کرنا ہے شاید وہ یہ بھی بھول گیا تھا۔ اسے نشانے پر لے کر اسفند نے پھر للکارا، یہ شاید اضطراری کیفیت کا نتیجہ تھا کہ اس کا ٹریگر دب گیا۔ گولی نکلی اور زمین سے ٹکرا کر اسفند کے پیر میں پیوست ہو گئی۔ کیپٹن نے گرتے ہوئے فائر کھول دیا۔ گھبراہٹ میں اس خارجی کتے کی گن سے ایک اور گولی نکلی جو عظیم بہادر اسفند یار کے سینے میں بائیں طرف پیوست ہو گئی۔ دہشت گرد تڑپ تڑپ کر جان دے چکا تھا۔ جوانوں کی توجہ اسفند یار پر مرکوز ہو گئی۔ انہوں نے زخموں سے چور کیپٹن اسفند یار بخاری کو اٹھایا اور باہر لے آئے۔ ہیلی کاپٹر کو فوراً کال کی گئی۔ ہیلی کاپٹر آیا مگر تب تک یہ عظیم مجاہد شہادت کے مرتبے پر فائز ہو چکا تھا۔ یعنی جس کام کے لیے وہ اس دنیا میں آیا تھا وہ کام اس نے انجام دے دیا تھا۔ ”شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن“ کی تشریح اپنی جان دے کر اس نے کر دیا۔

اس تحریر کی تیاری میں
معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو از پروفیسر محمد ظہیر قندیل اور اخبارات سے مدد لی گئی ہے۔

لازوال نغمے

زویا اعجاز



یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ جنگ سپاہی لڑتے ہیں۔ وہی دشمن کو پیچھے دھکیلتے ہیں لیکن تاریخ عالم میں ایک جنگ ایسی لڑی گئی ہے جس میں سپاہیوں کے ساتھ قوم کا بچہ بچہ سینہ سپر تھا۔ ہر ایک نے اپنے محاذ پر جم کر لڑا۔ دشمن کو وہ سبق دیا کہ برسوں تک وہ اپنے زخم چاٹتا رہا۔ ماضی کے وہ سترہ دن کبھی بھولنے کے نہیں ہیں کہ ان سترہ دنوں میں قلم کار بھی خود کو محاذِ جنگ پر محسوس کررہے تھے۔ ایسے ایسے نغمے تخلیق ہوئے جو آج بھی لہو کو گرما رہے ہیں۔

سیکڑوں مقبول نغموں میں سے چند ایک کا تذکرہ

فضا میں ابھی صبح کاذب کے آثار تھے۔

واہگہ بارڈر پر تازہ دم فوجی اپنی عقابی نظروں سے ہر سمت پر دھیان مرکوز کیے ہوئے تھے۔ ہوا ساکت تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق رواں دواں تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں حسیات کسی انہونی کا اشارہ دیے جارہی تھیں۔ گھڑی کی سوئیاں اپنا مخصوص سفر طے کرتی پونے چار تک جا پہنچیں۔ کچھ دیر اور گزرتی تو فضاؤں میں تکبیر کی پُرکیف صدائیں بلند ہونے لگتیں اور ایک نیا روشن سویرا طلوع ہوجاتا مگر اس روز تو تقدیر کی قبا میں کچھ اور ہی سمٹا تھا۔ وقت کے گجر نے چپکے سے ایک خوفناک نقارہ بجاتا تھا۔ فضا میں طاری سکوت اور امن ایک ہی پل میں منتشر ہوگیا۔ ہندوستان کی جانب سے ایک گولا پاکستان کی سمت داغا گیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کو یہ 'اٹکھیلیاں' اکثر سوجھا کرتی تھیں۔ کچھ ہی پل اور بیتے تو بھارتی جانب سے فائرنگ کا بھی آغاز ہوگیا جس کی شدت اور جارحیت نے 'ایس جے سی پی پلاٹون کمانڈر محمد شیراز' کو چوکنا کردیا۔

"دشمن کے ارادے اچھے نہیں لگتے سر!" ایک جوان کی سرسراتی آواز ان کی سماعت میں پڑی۔

"میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ آج کا سورج اپنے سنگ بہت سے ہنگامے لیے طلوع ہوگا۔" محمد شیراز کے جبڑے بھینچ گئے۔

دوطرفہ فائرنگ کا یہ سلسلہ تیز تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف جارحیت تھی تو دوسری جانب جذبہ جنون۔ تھوڑی دیر مزید گزری تو لڑائی اس قدر شدت اختیار کرگئی کہ بھارتی فوجیوں نے اندھیرے کی آڑ لیتے ہوئے قریب آکر دستی بم بھی پھینکنے کا آغاز کردیا۔ یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ اس سے قبل دشمن نے کئی بار بلا اشتعال جارحیت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن آج تو وہ سبھی سابقہ ریکارڈز توڑنے کے درپے دکھائی دیتا تھا۔ پاکستانی فوج کی جانب سے اس کے ہر ایک وار کا بھرپور جواب دیا جارہا تھا۔ دستی بم کے حملوں میں تو صورتِ حال یہاں تک آن پہنچی کہ سپاہی رینگ کر اگلی سمت میں موجود ساتھی سپاہیوں کو بم تھمانے لگے۔ ہر سمت میں بارود کی ہی بارش تھی۔

"شاباش جوانو! جب تک جسم میں آخری سانس رگوں میں لہو کی آخری بوند اور بندوق میں آخری گولی بھی موجود ہے دشمن کو ایک انچ بھی آگے مت بڑھنے دینا۔" زخمی پلاٹون کمانڈر کی آواز ڈوب رہی تھی۔ کلمۂ شہادت کی ادائیگی کرتے محمد شیراز کی سانسوں کی لڑی پل بھر میں ہی بکھر گئی۔

چھ ستمبر انیس سو پینسٹھ کی صبح کے اس سورج کی نرم کرنیں نہایت احترام سے ان کے جسدِ خاکی کو بوسے دینے لگیں۔ اس تاریخی دن اور متوقع جنگ کے اس پہلے شہید نے وقت شہادت اپنے سبھی جوانوں میں مزاحمت اور جنون کی ایک نئی لہر پھونک دی تھی۔

☆......☆

ملک بھر میں معمولات زندگی پوری آب وتاب سے رواں دواں تھے۔

اسکولوں' کالجوں اور دفاتر میں روزمرہ کی سرگرمیاں مخصوص پُرسکوت انداز میں جاری تھیں۔ چائے خانوں' بازاروں' ریلوے اسٹیشنوں' بس کے اڈوں میں بھی ازلی چنگھاڑ نما شور تھا۔ اس شور شرابہ میں ریڈیو سے ابھرنے والی صدائیں بھی شعوری یا لاشعوری طور پر ہر ایک ہی کے ذہن کو اپنی جانب مائل رکھے ہوئی تھیں۔ انیس سو پینسٹھ کے اس سادہ دور میں ریڈیو کے سوا عوام کے پاس اور تفریح بھی تو کوئی نہ تھی۔ گھڑی کی سوئیاں نو اور دس کے درمیانی پڑاؤ میں رقصاں



تھیں کہ دفعتاً اس وقت چلنے والے پروگرام کو روک دیا گیا اور ایک مانوس بارعب ٹھہری ہوئی آواز نے سب ہی کو الرٹ کردیا۔

"میرے عزیز ہم وطنو! السلام علیکم!

دس کروڑ پاکستانیوں کے امتحان کا وقت آن پہنچا ہے۔ آج صبح سویرے ہندوستانی فوج نے پاکستانی علاقے پر حملہ کیا اور بھارتی ہوائی بیڑے نے وزیر آباد اسٹیشن پر ٹھہری ہوئی ایک مسافر گاڑی کو اپنے بزدلانہ حملے کا نشانہ بنایا۔ بھارتی حکمران شروع ہی سے پاکستان کے وجود سے نفرت کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی علیحدہ آزاد مملکت کو انہوں نے کبھی دل سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ پچھلے اٹھارہ برس سے وہ پاکستان کے خلاف جنگی تیاریاں کرتے رہے ہیں۔ پاکستان کی دس کروڑ عوام جن کے دل کی دھڑکن میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی صدا گونج رہی ہے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دشمن کی توپیں ہمیشہ کے لیے خاموش نہ ہوجائیں۔ ہندوستانی حکمران شاید ابھی تک نہیں جانتے کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔ ہمارے دلوں میں ایمان اور یقین موجود ہے اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہم سچائی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ملک میں آج ہنگامی صورت حال کا اعلان کردیا گیا ہے۔ جنگ شروع ہوچکی ہے۔ دشمن کو فنا کرنے کے لیے ہمارے بہادر فوجیوں کی پیش قدمی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی مسلح افواج کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع عطا کیا ہے۔ میرے ہم وطنو! ! آگے بڑھو اور دشمن کا مقابلہ کرو۔ خدا تمہارا حامی وناصر ہو...... آمین۔"

صدر ایوب خان کی یہ تقریر حقیقی معنوں میں سانس روک کر سنی گئی تھی۔ دشمن کی جانب سے ملی حمیت کو للکار نے پاکستانی قوم میں اتحاد اور یک جہتی کی ایک نئی لہر دوڑادی اور ہر قومی ونجی ادارے کے علاوہ فرد واحد بھی اپنی بساط سے بڑھ کر ملک' قوم اور فوج کو تقویت دینے کے لیے جت گئے۔

☆......☆

جنگ کا آغاز ہوئے دو روز بیت چکے تھے۔

انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر جانب ہی ذمہ داری' محبت اور لگن کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں اس وقت کا سب سے بڑا اور معتبر ذریعہ ابلاغ 'ریڈیو پاکستان' بھی افواج پاکستان کو تقویت دینے کی اس ملی خدمت سے بھلا کیسے چوکتا؟

آٹھ ستمبر کی اس صبح اسٹیشن ڈائریکٹر لاہور شمس الدین بٹ' اپنے معاون عملہ کے ساتھ تکنیکی کاموں میں مصروف تھے کہ فون کی تیز گھنٹی نے یکدم تعطل پیدا کردیا۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر اپنے تعارفی کلمات ادا کیے ہی تھے کہ دوسری جانب سے سماعت میں پڑنے والے الفاظ نے انہیں بحر حیرت وبے یقینی میں مبتلا کردیا۔

"میں نور جہاں بات کررہی ہوں اور ریڈیو کے توسط

سے ملی نغمے ریکارڈ کروانا چاہتی ہوں۔‘‘

اب خدا جانے کہ کام کے بوجھ کا اثر تھا یا بے یقینی کی کیفیت۔ شمس الدین کو وہ فون کال جعلی محسوس ہوئی اور انہوں نے کسی بھی لفظ کی ادائیگی کے بغیر ہی فون بند کر دیا۔

’’کیا ہوا سر؟ آپ کا مزاج یکدم برہم نظر آنے لگا ہے۔‘‘ سامنے موجود معتمد خاص نے کہا۔

’’کوئی خوا مخواہ پریشان کر رہا ہے۔‘‘ انہوں نے ناگواری سے کہا۔

’’عجیب لوگ ہیں! ایسے نازک موقع پر بھی مذاق کرنے اور غیر اخلاقی و غیر ذمہ دارانہ حرکات سے باز نہیں آتے۔‘‘ مقابل نے بھی سر جھٹکا اور سابقہ کاموں میں مشغول ہوگئے۔

کچھ ہی دیر اور گذری تھی کہ فون کی گھنٹی نے ایک بار پھر ارتکاز میں خلل پیدا کر دیا۔ اس مرتبہ فون ’اعظم خان‘ نے اٹھا کر اپنا تعارف کروایا تو حیرت کا شدید جھٹکا اس کا منتظر تھا۔

’’کیسے ہو بھئی اعظم میاں؟ میں حسن لطیف ملک بات کر رہا ہوں۔‘‘ ایک شستہ آواز نے کہا۔

’’اللہ کا کرم ہے ملک صاحب! خاکسار کو کیسے یاد فرمایا؟‘‘ اس نے بھی خوش خلقی سے جواب دیا۔ حسن لطیف ملک ایک نامور کمپوزر تھے اور ان کا یہ اچانک فون بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔

’’ابھی میڈم نور جہاں نے مجھے ٹیلی فون کیا ہے کہ وہ ریڈیو پاکستان کے لیے نغمے ریکارڈ کروانا چاہتی ہیں۔‘‘ حسن لطیف کی یہ بات سن کر اعظم خان کا بے یقینی اور سنسنی میں مبتلا ہونا تو طے تھا۔

’’میڈم کو اس کے لیے پوچھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے ملک صاحب؟ ان کے لیے تو یہ در ہمیشہ وا ہے...... وہ جم جم آئیں...... میں ابھی بٹ صاحب کو اطلاع کیے دیتا ہوں۔‘‘ اعظم نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے الوداعی کلمات کے بعد فون بند کیا اور شمس الدین کو بتایا کہ کچھ دیر پہلے موصول ہونے والی فون کال جعلی یا مبنی بر مذاق نہیں بلکہ حقیقتاً نور جہاں ہی کا تھا۔

نور جہاں جب ریڈیو اسٹیشن آئیں تو اس موقع پر صوفی تبسم اور ناصر کاظمی بھی وہیں موجود تھے۔ ایک خصوصی اور ہنگامی میٹنگ میں ریکارڈنگ کے انتظامات پر مشاورت کی جانے لگی۔ نور جہاں کی رنگت میں جوش کی سرخی اور آنکھوں میں الوہی سی چمک تھی۔ وہ کچھ دیر تو خاموشی سے اپنی انگلیاں مسلتی رہیں پھر اپنی مخصوص مترنم آواز اور مٹھاس بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

’’کیا آج کا دن یونہی ضائع چلا جائے گا؟‘‘

’’جی؟ کیا مطلب؟‘‘ شمس الدین کو اچنبھا ہوا۔ ’’کیا آپ کے ذہن میں کوئی خاص تجویز موجود ہے؟‘‘

’’میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ آج کا دن ضائع نہیں جانا چاہیے۔ اگر کوئی نغمہ تیار کر لیا جائے تو میں اس میں اپنی بساط سے بڑھ کر جان ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔‘‘ میڈم کے باوقار اور پُرجوش انداز نے وہاں موجود سبھی افراد کے ولولے مہمیز کر دیے۔

’’استادِ محترم!‘‘ شمس الدین نے صوفی تبسم کو مخاطب کیا۔ ’’ایک تڑپتا پھڑکتا ہوا شاہکار تو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیجیے۔‘‘

’’ہاں ضرور! میں اس موقع پر ہر تخلیق اپنے لہو سے سینچنے کے لیے تیار ہوں۔‘‘ صوفی تبسم نے مسکرا کر کہا اور کچھ ہی دیر میں ایک نغمہ لکھ دیا۔

’’میریا ڈھول سپاہیا! تینوں رب دیاں رکھاں
اج تکدیاں تینوں سارے جگ دیاں اکھاں

(اے میرے عزیز از جان محافظ وطن! پروردگار تجھے اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آج اس مشکل گھڑی میں سارا جگ تیرے حوصلوں پر نظریں جمائے ہوئے ہے)

جدھر نظراں پانویں‘ اونھوں مار نساویں
جنہاں راہواں توں جانویں‘ جنہاں راہواں توں آویں
اونہاں راہواں دی مٹی چمن میریاں اکھاں
میریا ڈھول سپاہیا! تینوں رب دیاں رکھاں

(تیری نظر جس جانب جاتی ہے‘ اسے تسخیر کر لیتی ہے۔ تو جس جس راہ سے بھی گذرتا ہے وہ مٹی میرے لیے مقدس ہو جاتی ہے اور میں اسے اپنی آنکھوں سے بوسے دیتی ہوں۔ اے میرے وطن عزیز کے محافظ! پروردگار تجھے ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے)

دشمن ویریاں دے ملے اپنے سینے تے جھلے
جتھے قدم جمانویں‘ اوتھوں قدموں نہ ہلیں
اونہاں قدماں توں واری‘ میری جندیاں اکھاں
میریا ڈھول سپاہیا! تینوں رب دیاں رکھاں

(تو نے دشمنوں کے حملے مردانہ وار اپنے سینے پر سہے ہیں۔ تیرے قدموں کی مضبوطی چٹان جیسی ہے۔ ان قدموں پر مجھ جیسی کروڑوں آنکھیں قربان ہو سکتی ہیں۔ اے میرے

وطن عزیز کے محافظ! پروردگار تجھے ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے)‘‘

اس نغمہ نے ابتدائی طور پر ہی سب کو بہت متاثر کیا۔ اس کی دھن مرتب کرنے کا بیڑہ ’سلیم اقبال‘ نے اٹھایا۔ میڈم نور جہاں کی جادوئی آواز نے اسے سروں کے قالب میں ڈھالا۔ اس رات گیارہ بجے ’ڈھول سپاہیا‘ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا تو ذرا سی دیر میں ہی عوام الناس کے دلوں میں گھر کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆......☆

اگلی صبح ذمہ داری اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے میڈم نور جہاں نو بجے کے بعد ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئیں۔

گذشتہ روز ہی کی طرح بہترین دماغ سر جوڑے نیا شاہکار تخلیق کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ڈپٹی کنٹرولر ایوب رومانی کے کہنے پر صوفی تبسم نے ایک اور شاندار نغمہ تخلیق کر دیا۔

’’او ماہی چھیل چھبیلا! ہائے نی کرنیل نی جرنیل نی
سارے جگ کولوں پیارا‘ سانوں سب کولوں پیارا
او ماہی رنگ رنگیلا ہائے نی کرنیل نی جرنیل نی
اپنی جان دکھاں وچ پا کے دیس دی عزت آن بچاوے
اوہنیں دین دعائیں شالا دور بلائیں

(میرے وطن کے محافظوں کی شان ہی نرالی ہے۔ یہ سپاہی ہمیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہ اپنی جان پر ہر دکھ جھیلتے ہیں لیکن دیس کی عزت و آن پر کوئی حرف نہیں آنے دیتے۔ ہم وطن انہیں دعائیں دیتے ہیں کہ ہر بلا ان سے سدا دور رہے)‘‘

اپنے تمام تر وسائل اور ہنر بروئے کار لاتے ہوئے اس نغمہ کی دھن مرتب کر لینے کے بعد میڈم نور جہاں نے بہترین انداز میں اسے صوتی آہنگ میں ڈھال دیا۔ اس شام جب یہ نغمہ فوجی بھائیوں کے پروگرام میں نشر ہوا تو سرحدوں پر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نبرد آزما دھرتی کے ان سپوتوں کا جوش و ولولہ آسمان چھو رہا تھا۔

☆......☆

تیسرے روز ریڈیو پاکستان کے ان کارکنان نے جب اپنے مخصوص جذبہ و محبت سے کام کرنے کے لیے نشستیں سنبھالیں تو کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ آج تخلیق ہونے والا نغمہ ایک نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے ان سبھی کی کاوش امر کر دے گا۔

خوب صورت گفتگو کا فن

مؤثر گفتگو جہاں آپ کی شخصیت کو دوسروں کے لیے زیادہ پُرکشش بناتی ہے وہاں آپ کے سماجی روابط اور تعلقات پر بھی بے حد اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی بھی فرد کی گفتگو نہ صرف اس کی شخصیت، دلچسپیوں اور محرکات کی آئینہ دار ہوتی ہے بلکہ اس کے سماجی طور پر پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا بھی تعین کرتی ہے۔ آپ کے لفظ آپ کا قیمتی خزانہ ہیں۔ اس خزانے کو سلیقہ مندی سے خرچ کر کے آپ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتے ہیں، ان کی توجہ، ہمدردی، ستائش، محبت اور خلوص سب حاصل کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیے اس خزانے کی فضول خرچی آپ کو سماجی طور پر کنگال بھی کر سکتی ہے۔ گفتگو کرتے وقت دوسروں کی دلچسپیوں کا خیال رکھیے، آپ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں اپنے نقطۂ نظر کو کھل کر پیش کرنے کا موقع دیں۔ دوران گفتگو محض اپنی ذات کو بھی نہ مقدم رکھیے بلکہ دوسروں کو بھی گفتگو میں شامل ہونے کا پورا موقع فراہم کریں۔

مرسلہ: روبینہ ناز۔ سیالکوٹ

نیند بھی اہمیت رکھتی ہے

امریکا میں ایک ہزار افراد کے گیلپ سروے سے معلوم ہوا کہ بالغ افراد سات گھنٹے سے کم سوتے ہیں کیا اتنی نیند کافی ہے؟ ڈاکٹر رونالڈ کے مطابق ضرورت سے کم نیند ہمارے ہیجانات (Emotions) کو بہت نقصان پہنچاتی ہے اگر کوئی پریشان کن بات ہو جاتی ہے تو اس پر قابو پانے میں ہمیں شدید دشواری ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے تھکے ہوئے بچے ایسی صورتِ حال میں پریشان ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے اسپتال میں اپنے اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں پر تجربہ کیا اور نیند سے محروم رکھنے کے بعد ان کے رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا۔ ’’میں نے انتہائی خوش مزاج اور بااخلاق نوجوان ڈاکٹروں کو نرسوں اور مریضوں پر غصے میں دہاڑتے ہوئے پایا۔ ان علامات کا سبب نیند سے محرومی اور تکان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔‘‘

مرسلہ: زاہد تابانی۔ کراچی

PakiBooks.Site

صوفی تبسم اس روز کسی جذب کے عالم میں دکھائی دے رہے تھے۔ کاغذ اور قلم سنبھالا تو پردہ تصور پر وہ مناظر گردش کرنے لگے جب وہ رضا کارانہ امداد کے لیے ایک مقامی اسپتال گئے تھے۔ جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہی بغرض علاج وہاں لائے جا رہے تھے۔ وارڈ کے باہر اور اسپتال کے صحن میں عوام کا جم غفیر موجود تھا۔ ان کی آنکھوں میں اپنے فوجی بھائیوں کے لیے لازوال محبت تھی۔ ایسی محبت جو ہر دنیاوی رشتے سے مبرا دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ سرحدوں سے دشمن کو ان تک پہنچنے سے روکنے ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے سیسہ پلائی دیوار بنے ان جوانوں کے وہ قرضدار ہیں۔ صوفی تبسم نے وہاں جذبوں کی عجب ہی اڑان دیکھی تھی۔ کمزور نیم جان لوگ اپنے فوجیوں کو خون دینا چاہتے تھے۔ وہ ہرگز نہیں جانتے تھے آیا ان کا بلڈ گروپ زخمی کے خون سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ انہیں تو بس اپنا قرض ادا کرنا تھا۔

وارڈز کے فرش لہو رنگ تھے۔ بستروں پر زخموں سے چور جوان لیٹے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ اپنے لہو اگلتے زخموں سے بے نیاز ایک بار پھر محاذ پر جانے کے لیے بے تاب تھے۔

''الٰہی! یہ کیسا جذبہ ہے؟ یہ کس دنیا کے باسی ہیں۔'' انہوں نے آنکھوں میں چھلکتی نمی صاف کرتے ہوئے سوچا تھا۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ان کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گونج اٹھا۔ اپنے وجود میں جذبوں کا ایک طوفان سموئے وہ اسپتال سے لوٹ تو آئے تھے لیکن کاغذ اور قلم ہاتھ میں تھامے بھی وہ مکمل طور پر انہی لوگوں اور جوانوں کے درمیان ہی سانس لے رہے تھے۔ دل و دماغ پر ایک دھند طاری تھی اور پھر قلم نے خود بخود ہی پھسلنا شروع کر دیا۔

ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے توں لبھدی ایں وچ بازار کڑے
ایہہ سودا نقد وی نئیں ملدا توں لبھدی پھریں ادھار کڑے

(دیس کے یہ کڑیل جوان برائے فروخت ہرگز نہیں۔ یہ انمول اور سچے نگینے ہیں)

اے پتر وکاؤ چیز نئیں' مُل دے کے جھولی پائیے نی
ایہہ ایڈا سستا مال نئیں' کی توں جا کے ملک لیایئے نی
اے سودا نقد وی نئیں ملدا، توں لبھدی پھریں ادھار کڑے
ایہہ دیس اپنے دی عزت توں' جان اپنی دیندے وار کڑے

(یہ ایسا مال ہرگز نہیں جسے خرید کر اپنی ملکیت بنا لیا جائے۔ یہ ایک گرانقدر نعمت ہے جو اپنے دیس کی عزت کے لیے جان بھی قربان کر دیتے ہیں)

صفحہ قرطاس پر بکھرنے کے بعد یہ لازوال نغمہ جب ریہرسل کے لیے میڈم نور جہاں کے پاس پہنچا تو وہ بھی جذبات و احساسات سے بوجھل ہو چکی تھیں۔ اس وقت ان کے وجود میں وہ کوئی سپر اسٹار تھیں نہ ہی گلوکارہ۔ اس وقت وہ صرف ایک ماں تھیں۔ ان کے دل میں ان ہزاروں ماؤں کی کیفیات سما چکی تھیں جن کے بیٹے سرحدوں کی حفاظت میں اپنا تن 'من' ہار رہے تھے۔ اسی جذبہ سے لبریز انہوں نے اشکوں پر قابو پاتے ہوئے ریکارڈنگ شروع کروائی تو دل میں ایک خوف کروٹ لے رہا تھا کہ کہیں کسی آنچ کی کمی نہ رہ گئی ہو لیکن ایسا کیونکر ممکن تھا؟ صوفی تبسم اور میڈم نے ریکارڈنگ کے بعد جب دیگر افراد کے ساتھ یہ نغمہ سنا تو ان کے ساتھیوں کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔

جذبوں اور ہمتوں سے لبریز وہ فنکار اپنے امور کی تکمیل میں کوشاں تھے کہ دشمن کے جہازوں کی آمد پر فضا میں ہر سو سائرن کی آوازیں گونج اٹھیں۔ عملہ میں موجود لوگ بمع جب ہدایات مورچہ بند ہونے لگے لیکن میڈم اپنے مخصوص باوقار انداز میں وہیں بیٹھی رہیں۔

''آپ بھی ہمارے ساتھ ہی آ جائیے میڈم! یہاں شدید خطرہ ہے۔'' ایک سینئر ساتھی نے عجلت میں کہا۔

''چلیے میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں لیکن کیا آپ مجھے ضمانت دے سکتے ہیں کہ وہاں موت میرا کچھ نہیں بگاڑ پائے گی۔''

''ایسی ضمانت تو کوئی بھی بشر نہیں دے سکتا۔''

''بس! پھر تو بات ہی ختم ناں! جب موت ہمیں کہیں بھی' کسی بھی حالت میں اپنا شکار بنا سکتی ہے تو ہم اپنا کام کیوں روکیں؟ ہم سب ایک نیک مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اور ایسی چھوٹی موٹی رکاوٹوں کو خاطر میں لانے سے ہم اپنے مقدس جذبے کی توہین کریں گے۔''

''یہ تو آپ نے ٹھیک ہی کہا۔'' ساتھی نے گہری سانس لی۔

''تو پھر ہم کسی صورت بھی کام بند نہیں کریں گے..... مریں گے تو یہیں مریں گے۔'' متانت اور ملائمت سے کہتی میڈم نور جہاں کو یہ کہاں علم تھا کہ ان کی یہ کوشش سرحدوں پر نہایت اہم حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ بارڈر پر ہر سمت اسپیکرز نصب کیے جا چکے تھے جہاں فوجی منتظر ہوتے تھے کہ

آج شام ریڈیو پاکستان سے کون سا نیا نغمہ چلایا جائے گا۔ پاک فوج کے جوان لہو گرما دینے والے محبتوں' چاہتوں اور عقیدتوں سے لبریز وہ بول سنتے تو انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ ان کی رگوں میں تازہ لہو شامل ہو گیا ہے۔

جنگ ستمبر میں لاہور ریڈیو 'اگلے محاذ' کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اناؤنسمنٹ اور موسیقی کے شعبہ میں کیا جانے والا کام سنہرے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ شعبۂ موسیقی میں پروڈیوسر اعظم خان اور تصدق علی جانی کی ان تھک محنت بھلائی جا سکتی ہے نہ ہی قومی نغموں کی سب سے زیادہ دھنیں بنانے والے 'کالے خان' کو تاریخ کبھی فراموش کر سکے گی۔

☆......☆

ریڈیو پاکستان لاہور کے بعد کراچی سے ایک ایسا لازوال جنگی نغمہ تخلیق ہوا جس نے پاک فوج کے جوانوں کے حوصلے مہمیز کیے تو دوسری جانب بارڈر پر لگے اسپیکرز کے باعث یہ مخالف فوج کے لیے کسی بدترین ذہنی عذاب سے کم نہ تھا۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر رشید انور کے قلم کی کاٹ میں استاد نتھو خان نے موسیقی کے رنگ بھرے تو تاج ملتانی' نسیمہ شاہین' عشرت جہاں اور ہمراہیوں نے اسے پاکستان کی جنگی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔

''اج ہندیاں جنگ دی گل چھیڑی
اکھ ہوئی حیران حیرانیاں دی
مہاراج ایہہ کھیڈ تلوار دی اے
جنگ کھیڈ نئیں ہوندی زنانیاں دی

(ہندوستان نے خطے میں جنگ برپا کر دی ہے۔ ہر کوئی اس امر پہ حیران ہے۔ جنگ تیر و تلوار سے لڑی جاتی ہے۔ یہ نسائی کھیل ہرگز نہیں)

اسیں سندھی' بنگالی' بلوچ پٹھے
اسیں پت پنجاب دے پانیاں دے
اسیں نسل محمود دے غازیاں دے
دودھ پیتے نیں ماواں پٹھانیاں دے
سانوں چھیڑ کے ہن دے نسدے او
سٹ سہوتے پاکستانیاں دے

(ہم پنجاب کے منہ زور پانیوں کے سپوت ہیں۔ محمود غزنوی اور غازیوں کی نسل کے امین ہیں۔ ہم نے غیور ماؤں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ ہم سے الجھنا تمہارے لیے بہت مہنگا ثابت ہوگا)

سوہنہ رب دی جیبھ نوں وڈ دیئے

مندی جووی کرے پاکستان دی گل
اسلحہ ہور کجھ اے جذبہ ہورشے اے
کفر سمجھ نئیں سکے ایمان دی گل
مُل ہور شہیداں دے خون دا اے
قیمت ہورا ے گنگا دے پانیاں دی
مہاراج ایہہ کھیڈ تلوار دی اے
جنگ کھیڈدی ہوندی زنانیاں دی

(جو زبان ہمارے ملک کے بارے میں نازیبا کلمات ادا کرے ہم اسے کاٹ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جنگ میں صرف اسلحہ نہیں' جذبہ ہی حقیقی معنی رکھتا ہے۔ ایمان کی یہ باتیں کفر کے لیے سمجھنا آسان کہاں؟ شہیدوں کا لہو انمول ہوتا ہے۔ یہ گنگا جل کے مساوی کیونکر ہو سکتا ہے بھلا؟)

تسی گنڈے نوں دیوتا مندے او
اساں رگ تہاڈی پہچان لئی اے
اسیں موت نوں زندگی جان دے آں
ساڈی موت اسلام دی شان لئی اے

(تم پتھر کی بے جان مورتیوں کے پجاری ہو۔ ہم شہادت میں حیات جاوداں کے متلاشی ہیں۔ ہماری موت صرف اور صرف دین اسلام کی شان سے منتج ہے)

پاویں زندگی تے پاویں موت ہووے
جو کجھ وی اے پاکستان لئی اے
ساڈے جذبیاں دی سونہہ جگ کھاندا
سانوں جاچ اے سچی قربانیاں دی
مہاراج ایہہ کھیڈ تلواروی اے
جنگ کھیڈ نئیں ہوندی زنانیاں دی

(زندگی ہو یا موت' ہمارا ہر ایک انفرادی و اجتماعی عمل صرف پاکستان کے مفاد سے مشروط ہے۔ ہمارے جذبوں کی سچائی ازل سے وقت کرتا آیا ہے۔ ہمیں سچی قربانیوں کی بخوبی پرکھ ہے)

سانوں ظلم اقلیتاں نال کرکے
تڑی بال دے وانگ وکھاندے او
دلی دور دا نئیں اساں غازیاں توں
کاہنوں جان کے موت بلاندے او

(اپنے ملک میں اقلیتوں سے ظلم روا رکھنے والے ظالمو! ہمیں بچگانہ دھمکیاں دے کر تم جانے کس خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ اتنا جان رکھو کہ دلی ہماری پہنچ سے دور ہرگز نہیں۔ کیوں اپنی موت کو دانستہ طور پر صدائیں دے

رہے ہو؟)

لال قلعہ تے تاج محل ساڈے
سانوں چھیڑکے چھیڑ یاد دلانوندے او
اسیں کبھی حساب چکاؤنے نیں
سانوں قسم اے اپناں نشانیاں دی
موت تابع ساڈے شہیدی اے

(لال قلعہ اورتاج محل ہمارے آباؤاجداد کا ورثہ ہیں۔ہم سے الجھنے کی کوشش میں تم ان سے بھی محروم ہوسکتے ہو۔تمہاری طرف ہمارے بہت سے حساب باقی ہیں۔ہمیں اپنے اجداد کی ان نشانیوں کی قسم! ہم شہادت سے ہمہ وقت بغلگیر ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں)

مومن موت کولوں کدے رجدے نیں
ملے موت تے ملے شہادتاں دی
غازی وچ میدان گجدے نیں

(مومن بھی بھلا کبھی موت سے خائف ہوا ہے کیا؟ اس کی تو اولین تمنا ہی شہادت ہوا کرتی ہے۔غازی میدان جنگ میں بجلیوں کی طرح کڑکتے ہیں)

ویلا آیا جہاد دا فیرا نور
قسمت جاگ پئی اے پاکستانیاں دی
مہاراج ایہہ کھیڈ تلواردی اے
جنگ کھیڈ نیئں ہوندی زنانیاں دی

(زندگی ایک بار پھر ہمیں جہاد کا موقع فراہم کررہی ہے۔یہ انمول موقع حاصل ہونے سے تو پاکستانیوں کے بخت جاگ اٹھے ہیں۔جنگ وجدل تیر وتلوار اور حقیقی مردانگی سے مشروط ہے کیونکہ یہ نسائی کھیل ہرگز نہیں)

ایسے کئی شواہد بھی ملے ہیں جن کے مطابق سیزفائر کے بعد بھی پاک فوج کے جوان لاؤڈ اسپیکر پر یہ نغمہ چلاتے بھارتی فوج اس سے ایسی خائف تھی کہ انہوں نے باضابطہ طور پر اسے اسپیکرز پر نہ چلائے جانے کی درخواست دے دی جسے بعدازاں تسلیم کرلیا گیا۔

☆......☆

جنگ ستمبر میں فنکاروں کے عملی کردار کے ضمن میں ’عنایت حسین بھٹی‘ کا نام بھی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ عنایت حسین بلا معاوضہ خدمات سرانجام دینے والوں میں سرفہرست تھے۔’اے مردمجاہد جاگ ذرا اب وقت شہادت ہے آیا‘ سے قوم کا لہو گرمانے کے علاوہ انہوں نے ناصر کاظمی کے لکھے گئے گیت ’زندہ دلوں کا گہوارہ سرگودھا شہر ہمارا‘ جیسا لازوال گیت گایا۔ان کاوشوں کے باوجود وہ وطن عزیز کے لیے مزید خدمات سرانجام دینے کے لیے مضطرب تھے۔انہی دنوں شہریوں سے پاک فوج کے دفاعی فنڈ میں اثاثے جمع کروانے کی اپیل کی گئی تو ان کے رگ وپے میں گویا ایک اضطراب برپا ہوگیا۔بھٹی صاحب کی یہ کیفیت اہلیہ سے بالکل بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

’’کیا بات ہے؟ آپ اس قدر پریشان کیوں دکھائی دیتے ہیں؟‘‘ انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

’’ملکی حالات دیکھ رہی ہو ناں! اس صورت حال میں کوئی بے نیاز اور مطمئن کیسے رہ سکتا ہے؟‘‘

’’اللہ پر بھروسا رکھیے۔دشمن اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔‘‘ اہلیہ نے خلوص سے کہا۔

’’اللہ پر ہی تو بھروسا ہے۔یہ ملک اسی کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور اس سے بڑھ کر حفاظت کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے بھلا؟‘‘ عنایت نے ایک جذب کے عالم میں جواب دیا۔اہلیہ بھی مطمئن سی ہوگئیں کہ وہ پُرسکون ہوگئے ہیں لیکن انہیں یہ علم ہی نہ تھا کہ مجازی خدا درحقیقت کس نہج پر سوچ رہے ہیں۔اگلے ہی روز ایک حیرت ان کی منتظر تھی۔

’’الحمدللہ! میں نے اپنا فرض ادا کردیا۔ایک قرض تھا جو چکا آیا ہوں۔‘‘ عنایت نے گھر آتے ہی خوشی، جوش اور سرشاری سے کہا۔

’’ارے! ایسا کیا کر آئے آپ؟‘‘

’’میں نے اپنا تمام سرمایہ پاک فوج کے دفاعی فنڈ میں جمع کروادیا ہے۔‘‘ ان کی مسرت دیدنی تھی۔

’’اوہ! کیا سب کچھ؟‘‘ اہلیہ کی حیرت اور ردِعمل بالکل فطری تھا۔

’’ہاں! سب کچھ......میں نے اپنے پاس صرف اڑھائی سو روپے رکھے ہیں۔‘‘

’’میں آپ کے اس جذبہ کی قدر کرتی ہوں لیکن صرف اڑھائی سو؟‘‘ وہ کسی کشمکش میں مبتلا دکھائی دینے لگیں۔’’اگر یہ جنگ طویل ہوگئی تو کس طرح گزارا ممکن ہوگا؟‘‘

’’میرے لیے ملکی سلامتی اور بقاء سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔اگر میری کاوش سے فوج کو تقویت ملتی ہے تو میں اپنا آپ بھی فروخت کرکے انہیں مضبوط کرنے کے لیے نہیں چوکوں گا۔ہم نے غلامی کی ایک طویل شب کاٹی ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ جنگ تاریک شب جیسی طوالت ہرگز نہیں رکھے گی۔فتح کا سورج بہت جلد طلوع ہوگا۔‘‘ عنایت حسین اپنی وطن اور لمحہ میں پُرعزم تھے۔اہلیہ بھی اپنا شوہر کی ہم نوا بن گئیں۔

☆......☆

جنگ ستمبر میں فنکار برادری کی یہ عملی کوششیں یہیں ختم نہ ہوئی تھیں۔یہ سلسلہ ایک مضبوط کڑی کی طرح رنگ، نسل، مذہب اور ذات برادری سے مبرا ہوکر پاکستان کے طول وعرض میں پھیل چکا تھا۔

ان دنوں (غالباً ستمبر کا پہلا ہفتہ) ایک نئی فلم ’مجاہد‘ ریلیز ہوئی تھی۔اس کے تناظر میں ’حمایت علی شاعر‘ نے ایک گیت لکھا۔’ساتھیو! مجاہدو! جاگ اٹھا ہے سارا وطن۔‘ اس کی موسیقی ’خلیل احمد‘ نے ترتیب دی تھی۔’مسعود رانا‘ اور ’شوکت علی‘ کے ہمراہ کورس کی آوازوں میں گایا گیا یہ گیت اس قدر مقبول ہوا کہ آج بھی ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکن ہے۔ قابل غور بات یہ بھی ہے کہ اس فلم کی تیاری کا آغاز ہوا تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی لیکن تقدیر نے اسے پاکستانی قوم کی مشترکہ آواز بنا دیا۔

پروفیسر کرم حیدری کا لکھا گیا گیت ’’اے وطن پیارے وطن‘‘ بھی بھلا کوئی کیسے فراموش کرسکتا ہے جس کے ہر لفظ میں جو ہر ہی اشکوں میں ڈھل گیا تھا۔

میرا دل تیری محبت کا ہے جاں بخش دیار
میرا سینہ تیری حرمت کا ہے سنگین حصار
میرے محبوب وطن تجھ پہ اگر جاں ہو نثار
میں یہ سمجھوں گا ٹھکانے لگا سرمایہ تن
اے میرے پیارے وطن‘‘

☆......☆

ملی نغموں کا یہ سلسلہ اس قدر طوالت اختیار کرگیا کہ آج یہ گیت ایک ورثہ کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔’ہر لحظہ ہے مومن......‘ ’اپنی جان نذر کروں۔‘ ’رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو‘ ’میرے ماجرے دی راکھی‘۔’اے وطن کے سجیلے جوانو‘ جیسے قومی نغمے پانچ دہائیوں کا سفر طے کرنے کے بعد بھی تازگی اور حدت میں اپنی مثال آپ ہیں۔

سترہ روز جاری رہنے والی اس جنگ نے پاکستان کی تاریخ، ثقافت، ادب اور فن پر لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ہمارے ان آباؤاجداد نے اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کا مظاہرہ کیا اور ہمیں اس نظم کی صورت میں ایک ’قرض‘ فراہم کرگئے ہیں جسے بہر صورت اپنی نوجوان نسل تک منتقل کرنا ہے جو نظریاتی اور ثقافتی اعتبار سے بھارت کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔اس قرض کو سود سمیت ادا نہ کیا گیا تو ہماری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں۔

’’حمیت اور یک جہتی حوالہ چھ ستمبر کا
بتاتا غیرت ملی حوالہ چھ ستمبر کا
اسی دن دشمن بے دین نے ہم کو پکارا تھا
ہماری شان ہے قومی حوالہ چھ ستمبر کا
یہ لالے اور بنیے دیس کے دشمن ہوئے آخر
ہماری سمت دشمن نے بہت حملے کیے آخر
بزعم خویش یہ کثرت کے بل پہ دندناتے تھے
جواب ان کو اسی انداز میں ہم نے دیے آخر
ہراک بچہ، جواں، بوڑھا وطن کے کام آیا تھا
سپاہ قوم نے بھی ولولہ اپنا دکھایا تھا
تھے ہراک موڑ پر دشمن پہ ہم چھائے ہوئے گوہر
محبت اور اخوت کا مثالی دور آیا تھا
لڑے تھے ہم چونڈہ پر بھی بڑے ہی جوش وجذبے سے
اگرچہ سلسلہ در سلسلہ تھے ٹینک دشمن کے
ہماری فوج نے بھی جرأت مومن دکھائی تھی
وطن کے لوگ بھی دشمن پہ سینہ تان کر نکلے
ارادہ بھارتی سینا کا تھا لاہور پہ قبضہ
کہ جم خانے کلب میں بیٹھ کر پھر عیش کرنے کا
نہیں معلوم تھا ان کو کہ ہم ایمان والے ہیں
کہ ان پہ چھا گیا تھا اک ہماری فوج کا دستہ
بتایا تھا یہ دشمن کو کہ ہم جذبے سے رہتے ہیں
پڑے جو وار بھی ہم پر وہ سینوں پہ ہی سہتے ہیں
تمہاری توپ تلواروں سے ڈر سکتے نہیں مسلم
ستمبر کے حوالے سے بس یہی تم سے کہتے ہیں ہم‘‘

(محمد رمضان گوہر)

ان کے علاوہ بھی کئی سو نغمے، ریڈیو پاکستان کے مختلف اسٹیشنوں سے گونجے اور امر ہوگئے۔اگر سب کا ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ان سترہ دنوں نے ہر پاکستانی کے لہو کو گرما دیا تھا۔

ماخذات:

’شہیدان وطن‘ (ایم۔آر۔شاہد)

’نوائے وقت‘۔۔۔’جنگ‘ کے فیچرز اور مضامین

فلم نگری

سپر پرفارمر

انور فرہان

محنت، لگن اور دلچسپی ہی انسان کو شہرت کے اوج پر پہنچاتی ہے۔ اس نے بھی جی جان سے محنت کی تو نتیجہ مثبت آنا ہی تھا۔ بطور ایکسٹرا آرٹسٹ وہ فلمی دنیا میں آیا تو کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ قسمت اسے سپر اسٹار بنانے والی ہے۔ خود اس کا بڑا بھائی جو اس کی سفارش کرنے کا روادار نہ تھا وہ بھی اس سے پیچھے رہ جائے گا۔ اسی کی طرح قسمت نے ایک دینی مدرسے کے طالب علم کو بھی فلمی دنیا کا نامور گیت نگار بنا دیا، کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

قسمت کا ستارہ کس طرح عروج بخشتا ہے اس کی ایک جھلک

اللہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔

یہ اس کے اختیار میں ہے اس کی مرضی وہ جسے چاہے نوازے۔ خدا کی دین کا احوال موسیٰ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ اس نے کس طرح ایک ایکسٹرا اداکار کو فرش سے اٹھا کر شہرت کے عرش تک پہنچا دیا۔ یہ ہمارے دور میں ہوا، اس لیے ہم بھی اس کے گواہ ہیں۔

اجمل خان کے چھوٹے بھائی اکمل خان کو بھی بڑے بھائی کی طرح اداکاری کا شوق تھا۔ اجمل خان پاکستان کے ابتدائی دور کے ایک نامور اداکار تھے۔ وہ تقسیم ہند سے پہلے ہندوستانی فلموں میں بھی اداکاری کرتے رہے تھے پھر پاکستان بننے کے بعد اس کی تباہ حال فلمی صنعت کو جن لوگوں نے از سرِ نو زندہ کیا، ان میں اجمل خان بھی تھے پھر اجمل خان کو اس وقت زبردست شہرت ملی جب انہوں نے شاہکار پنجابی فلم ''ہیر رانجھا'' میں کیدو کا کردار کر کے اسے امر کر دیا۔ اس لازوال اداکاری کے بعد اجمل خان کو سپر اسٹار جیسی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ان کی شہرت، مقبولیت اور عزت کو دیکھ کر ان کے چھوٹے بھائی کے دل میں بھی گدگدی ہوتی تھی کہ وہ بھی اداکاری کرے، اداکار بن جائے اور ایک دن شہرت کے آسمان پر چاند سورج بن کر چمکے۔

ایک دن اس نے بھائی سے کہا۔ ''بھائی جان! مجھے بھی اپنی طرح اداکار بنا دو نا۔''

اجمل خان نے بھائی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''آصف خان! میں تمہیں اداکار کیسے بنا سکتا ہوں؟''

اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اجمل خان کے چھوٹے بھائی کا اصل نام آصف خان تھا۔ جب وہ اداکار بنے تو اجمل خان نے ان کا فلمی نام اکمل خان رکھ دیا۔ اکمل خان ان دونوں کے ایک بھائی تھے جو بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اجمل خان نے مرحوم بھائی کا نام آصف خان کو دے کر گویا اس بھائی کو نئی زندگی دی تھی۔

''آپ اتنے بڑے ایکٹر ہیں۔'' آصف خان نے کہا۔ ''جس پروڈیوسر یا ڈائریکٹر سے کہیں گے۔ میرے بھائی کو بھی......''

''نا بھائی نا!'' اجمل خان نے فوراً بھائی کی بات کاٹی۔ ''یہ کام میں نہیں کر سکتا۔''

آصف خان نے مایوسی کے ساتھ بھائی کو دیکھا جو کہہ رہے تھے۔ ''نہ میں کسی کی سفارش سے اداکار بنا۔ نہ یہ چاہتا ہوں کہ کوئی کسی کی سفارش سے اداکار بنے۔''

''پھر...... پھر میں کیا کروں؟''

''تم خود کوشش کرو۔''

آصف خان نگار خانے آتے جاتے تھے، بھائی سے مایوس ہو کر خود ہی کوشش شروع کر دی۔

اس بات سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پہلے ہمارے ہاں اقربا پروری کا کلچر نہیں تھا۔ لوگ اپنوں کو آگے بڑھانے کے لیے سفارش نہیں کرتے تھے، دھکے نہیں لگاتے تھے۔

آصف خان کے تعلقات کسی پروڈیوسر یا ڈائریکٹر سے نہیں تھے۔ وہ چھوٹے آدمی تھے، عام آدمی تھے، اس لیے عام فلمی لوگوں تک ان کی رسائی تھی۔ ایسے ہی ایک چھوٹے فلمی آدمی سے ان کی دوستی ہوگئی۔ یہ ایک میک اپ مین تھا۔ اس دوستی کے نتیجے میں آصف خان اپنے دوست کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے اور پھر ان کے اسسٹنٹ بن گئے۔ باضابطہ میک مِنی کرنے لگے۔ اداکاروں کے چہروں پر نئے چہرے سجانے لگے۔ اس طرح کچھ اداکاروں سے بھی ان کی شناسائی ہوگئی۔ ان سے میل ملاپ کے نتیجے میں انہیں معلوم ہوا کہ اداکار بننے کے لیے بڑے





[illegible] ہیں۔ بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بہت [illegible] پھر اگر مولا کسی پر مہربان ہو [illegible] کی قبول ہو جاتی ہے۔ ایسے بہت کم [illegible] ایک عام آدمی سے اداکار بن جاتے ہیں [illegible] جاتے ہیں۔

آصف خان کی میک اپ مِنی کے دوران ہی انہیں ایکسٹرا کے طور پر اداکاری کرنے کا موقع ملا۔ فلمی زبان میں ایکسٹرا ان اداکاروں یا اداکاراؤں کو کہا جاتا ہے جو کسی بھیڑ بھاڑ کے منظر میں شامل ہوتے ہیں یا پھر ایک آدھ سین میں اک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

آصف خان کے ایک اداکار دوست نے ایک دن ان سے کہا۔ ''یار آصف خان! ایک فلم میں ایک بالکل مختصر سا کردار ہے، کرو گے؟''

آصف خان نے جواب دینے سے پہلے اپنے دوست میک اپ مین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ ''استاد! کیا جواب دوں؟''

''ہاں ہاں ضرور کرے گا۔'' آصف خان کی بجائے میک اپ مین بول پڑا۔ ''ایک دم تو اسے ہیرو کا کردار نہیں مل سکتا۔''

اس فلم کا نام ''محبوبہ'' تھا۔ یہ اردو زبان کی فلم 1953ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ آصف خان نے جب کیمرے کا سامنا کیا تو انہیں پسینا آ گیا تھا۔ انہیں پتا چلا کہ اداکاری کرنا آسان نہیں مگر انہوں نے اپنا یہ مختصر کردار بڑے اعتماد اور بڑی خوبی سے ادا کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں مزید فلموں میں ایکسٹرا کے طور پر کام ملنے لگے مگر یہ بس ایسے ہی ہوتے تھے کہ فلم دیکھنے والے ان پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ ادھر سے آئے ایک جھلک دکھائی یا ایک آدھ مکالمہ بول کر چل دیے۔ ایسی فلموں میں ایسے کام کرنے کا معاوضہ بھی بس چند روپے دیے جاتے تھے۔ جب کہ ایسے کام کرنے والوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ آصف خان کو ایسے مختصر ترین پرفارمنس میں کچھ مزہ نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بہت مایوس ہو جاتے۔

''یہ بھی کوئی اداکاری ہے!'' وہ خود سے کہتے۔ ''میں خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔''

مگر ان کی مایوسی کو ان کے دوست احباب یہ کہہ کر ختم کر دیتے۔ ''گھبراتا کیوں ہے یار! جس دن اللہ مہربان ہوا تیری قسمت کے تمام دروازے کھل جائیں گے۔''

1955ء میں انہیں اس وقت کے ایک سپر ڈائریکٹر انور کمال پاشا کی ایک بہت بڑی اور سپرہٹ فلم ''قاتل'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ بھی ایک مختصر کردار تھا مگر مختصر ترین نہیں تھا۔ پاشا صاحب نے اس فلم میں نیر سلطانہ کو پہلی

PakiBooks.Site

بار متعارف کرایا تھا۔ اس فلم میں وہ نازلی کے نام سے پیش ہوئی تھیں۔ انور کمال پاشا کی فلم میں کام کرنا اس دور میں بڑے اعزاز کی بات تھی۔ آصف خان نے اپنے مختصر کردار میں بھی متاثر کیا تھا۔ اس کردار کو دیکھ کر اس دور کے سپرڈوپر اداکار اور فلم ساز لالہ سدھیر کی دور بین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس کے اندر ایک ہزار اداکار چھپا ہوا ہے۔ اسے اگر بہتر موقع دیا گیا تو وہ فلم انڈسٹری کا ایک بڑا اور سپر اسٹار بن سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے خود ہی اپنی فلم ''بغاوت'' میں اسے ایک بڑے اور اہم کردار میں پیش کیا اور اس نے لالہ سدھیر کو مایوس نہیں کیا۔ اس کی کردار نگاری سے دوسرے بھی متاثر ہوئے۔

اب جب کہ آصف خان اپنی کوششوں اور کاوشوں کے نتیجے میں اداکاری کے شعبے میں کچھ کر دکھانے کے قابل ہوئے تھے، ان کے بڑے بھائی اجمل خان نے ان سے کہا۔ ''اگر تم میری طرح اس فیلڈ میں شہرت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنا نام بدل دو۔''

''کیوں، آصف خان میں کیا خرابی ہے؟''

''میرا تو خیال ہے کہ یہ نام ذرا بھاری ہے۔ تم اجمل خان کے بھائی ہو اس لیے اکمل خان بن جاؤ اور اجمل خان کی طرح کامیابی حاصل کرو۔''

''اکمل خان!'' آصف خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہمارے مرحوم بھائی کا نام تھا۔''

''ہاں! میرا دل کہتا ہے کہ یہ نام تمہارے لیے بڑا اچھا ثابت ہوگا۔''

''آپ چاہتے ہیں تو یہی سہی۔ آج سے بلکہ ابھی سے میں اکمل بن جاتا ہوں۔'' اور اکمل ان کے لیے حقیقتاً بڑا اچھا نام ثابت ہوا۔ ''بغاوت'' کے بعد انہیں ایک فلم میں بطور ہیرو کام کرنے کی دعوت ملی۔ یہ پنجابی فلم ''جبرو'' تھی۔ اکمل خان نے جبرو کے ٹائٹل رول کو اس قدر جاندار انداز میں ادا کیا کہ ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ ان کی گاڑی ایسی چلی کہ پھر رکی نہیں۔ انہوں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ فلم انڈسٹری میں چلتی کا نام گاڑی ہے مگر اس گاڑی کو چلانے والا بھی بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ رب اس پر اب مہربان ہو گیا تھا اس لیے اس دور کے بڑے ہیروز لالہ سدھیر اور اسلم پرویز وغیرہ بھی اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے۔ ''جبرو'' نے اکمل کو پنجابی فلموں کا صف اوّل کا اداکار بنا دیا۔ قسمت اس پر ایسی مہربان ہوئی کہ اس کی ہر فلم کامیابی سے ہمکنار ہونے لگی اور وہ کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا۔ فلم ساز و ہدایت کار اسے پنجابی فلموں کے لیے لازم و ملزوم سمجھنے لگے۔

''اگر پنجابی فلم بنانی ہے تو آپ کو اکمل کو لینا ضروری ہوگا۔''

ڈائریکٹر پروڈیوسر سے کہتے اور پروڈیوسر سر ہلاتے ہوئے کہتا۔ ''آہو! تسی غلط نہیں کہندی او۔''

اگر کسی اداکار کی ایسی ڈیمانڈ ہو تو اس کی مقبولیت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ اکمل تھوڑے ہی عرصے میں پنجابی فلموں کے مقبول ہیرو بن گئے اور ان کی پنجابی فلمیں نت نئے ریکارڈ بنانے لگیں۔ پنجابی فلموں کی ہر ہیروئن کی خواہش ہوتی کہ اسے اکمل کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جائے مگر اکمل کی جوڑی شیریں، لیلیٰ، نغمہ اور فردوس کے ساتھ زیادہ پسند کی جاتی تھی جس طرح آج نوجوان نسل فواد خان کو پسند کرتی ہے یا ماضی قریب میں وحید مراد کو پسند کرتی تھی اسی طرح اس دور میں اکمل نوجوان نسل کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے۔

پنجابی فلموں کے حوالے سے ویسے تو لالہ سدھیر، حبیب، اعجاز، اقبال حسن، یوسف خان، کیفی، سلطان راہی بھی کامیاب ہیرو رہے۔ ان کے دور میں انہیں چاہنے والوں کی تعداد بہت ہوتی تھی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی؟ جو بات اکمل کی تھی وہ کسی اور میں نظر نہیں آئی کیونکہ اگر اکمل کی زندگی میں ریلیز ہونے والی پنجابی فلموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں اکمل کی موجودگی کا صاف پتا چلتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ پنجابی فلموں پر مکمل اجارہ داری رکھتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں پنجابی فلموں کے ہیرو، ایک آئیڈیل ہیرو اور پنجاب کے دیہات کے گھبرو جوان لگتے تھے۔ اکمل کی اداکاری میں جو سادگی اور پنجاب کے گھبرو جوانوں کا جو رنگ روپ تھا وہ کسی اور ہیرو میں نظر نہیں آیا۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں پنجابی فلموں کا دلیپ کمار کا خطاب دیا گیا۔

فلموں میں پیار محبت کا سوانگ رچانے والے ہیرو ہیروئن، کبھی کبھی اپنی حقیقی زندگی میں بھی حقیقی ہیرو ہیروئن کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اکثر ایک ساتھ اداکاری کرنے والے، ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان کی شادی ہو جاتی ہے جیسے صبیحہ سنتوش کی، نیر سلطانہ اور درپن کی ہو گئی، کبھی ظالم سماج ان کے درمیان دیوار بن جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے نہیں بن سکتے۔

[illegible] اکمل کو بھی اپنی ہیروئنوں میں سے [illegible] پیار ہو گیا تھا۔ یہ اس دور کی اکھڑ مٹیار فردوس [illegible]

ایک دن یوں ہوا کہ اکمل نے بڑے جذباتی انداز میں فردوس سے کہا۔ ''مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔''

فردوس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ یہ کسی فلم کا سیٹ نہیں [illegible] فردوس نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کون سی فلم کا ڈائیلاگ ہے؟''

''او ظالما! یہ کسی فلم کا مکالمہ نہیں، یہ میرے دل کی آواز ہے۔''

فردوس نے جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا [illegible] بولی۔ ''اچھا! تو پھر میں کیا کروں؟''

''تم بھی...... مجھ سے...... پیار کرو۔''

''وہ تو...... میں تم سے کرتی ہوں۔''

اکمل خوشی سے اچھلا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنی [illegible] اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

''ارے...... ارے...... یہ کوئی فلم کا سیٹ نہیں، کسی نے دیکھ لیا تو......''

''میں کہہ دوں گا۔ سب سے کہہ دوں گا۔'' فردوس [illegible] پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں ابھی یہ بات کہنے [illegible] نہیں۔''

میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی والی بات ہو تو وہ پیار کرنے والوں کو من تو شدم، تو من شدم من تن تو جاں شدی۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔'' سے کون روک سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دونوں نے چپکے سے چھپ کر شادی کر لی۔ اس قدر رازداری سے کہ آج تک اس کی تصدیق نہ ہو سکی کہ واقعی شادی کی تھی یا نہیں۔

اس رازداری کی وجہ یہ تھی کہ شاید وہ دونوں بھی اس غلط سوچ کے شکار تھے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ انہوں نے شادی کر لی ہے تو ان کی پاپولریٹی متاثر ہوگی۔ اگرچہ ایسا سوچنا درست نہیں۔ تماشائی اداکاروں اور اداکاراؤں کو ان کی خوب صورت کارکردگی کی وجہ سے چاہتے ہیں۔ ان کی اعلیٰ معیار کی اداکاری ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ بنتی ہے جس کی متعدد مثالیں ہیں۔ لالہ سدھیر نے شمیم سے شادی کر لی تھی۔ اس کے باوجود ایک طویل عرصے تک وہ بے شمار شائقین فلم کے پسندیدہ فنکار رہے۔ اسی طرح محمد علی، وحید مراد، ندیم، شبنم اور شمیم آراء وغیرہ کی شہرت اور مقبولیت

چہرہ نما

اصلی نام: آصف خان

فلمی نام: اکمل خان

فلمی کیریئر: فلم انڈسٹری میں انٹری بحیثیت میک اپ مین، پھر بطور ایکسٹرا اداکار کئی فلموں میں کام کیا۔ اس کے بعد 1953ء میں ریلیز ہونے والی اردو فلم ''محبوبہ'' میں ایک مختصر کردار ادا کیا۔ 1955ء میں بھی اردو فلم ''قاتل'' میں ایک مختصر کردار کیا۔ اس طرح لالہ سدھیر کی فلم ''بغاوت'' میں بھی ایک اہم کردار کیا۔

بحیثیت ہیرو: پہلی بار بطور ہیرو پنجابی فلم ''جبرو'' میں جلوہ گر ہوئے۔ 1956ء میں ریلیز ہونے والی اس فلم نے دھوم مچا دی اور ایکسٹرا اداکاری کرنے والے نے بطور ہیرو فلم انڈسٹری کے صف اوّل کے ہیروؤں میں اپنا مقام بنا لیا۔

اعزاز: پنجابی فلموں کے مکمل ہیرو کے روپ میں اتنی شہرت حاصل کی کہ ان کے چاہنے والوں نے انہیں پنجابی فلموں کے دلیپ کمار کے خطاب سے نوازا۔ اکمل کو اس کی اداکاری کی وجہ سے گولڈن اسٹار کہہ کر بھی پکارا گیا۔

شادی: اس دور کی نامور اداکارہ فردوس سے اکمل کا افیئر چلا، اسے تو سب نے دیکھا مگر ان کی شادی کب ہوئی اور کیسے ہوئی یہ راز کبھی نہیں کھلا۔ ان کی طرف سے انکار یا اقرار کا اظہار کبھی نہیں ہوا مگر مصدقہ ذرائع کا کہنا ہے کہ انہوں نے شادی کر لی تھی۔

انتقال پُر ملال: اکمل جب اپنے عروج کے دور میں تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ 11 جون 1967ء کا دن تھا۔ ان کی موت کا سبب متنازعہ قرار دیا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں زہر دے کر مارا گیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ گردن توڑ بخار میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔

PakiBooks.Site

شادی کے بعد بھی برقرار رہی۔ یہ درست ہے کہ فنکاروں کی شادی سے کچھ بے وقوف نوجوان لڑکے لڑکیاں ناخوش ہوتے ہیں مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جب کہ آج کے نوجوان اور پڑھے لکھے پرستار ایسی فضول بات پر توجہ نہیں دیتے۔

شادی تو ایک ضرورت ہے۔ عام آدمیوں کی طرح سلیبریٹز کی بھی ذاتی ضرورت ہے جو وقت پر پوری کی جاتی ہے اس لیے تصدیق نہ ہونے کے باوجود فلمی پنڈتوں کا کہنا ہے کہ ان پیار کے متوالوں نے یقیناً شادی کرلی ہوگی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں جس برق رفتاری کے ساتھ اکمل نے اپنا فلمی سفر طے کیا، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کررہا تھا جو شادی کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔

اس گولڈن اسٹار نے بہت سی فلموں میں کام کیا جن میں پنجابی فلموں کی تعداد زیادہ اور اردو فلموں کی کم ہے۔ ان کی جن خاص فلموں کا علم مجھے ہے وہ یہ ہیں ''جبرو، یار دوست، ولایت پاس، پنجاب دا شیر (واضح رہے کہ یہ اقبال حسن کی پہلی پنجابی فلم تھی)، بھرجائی، دشمن، ڈھول سپاہی، سوکن، من موجی، بھریا میلہ، گونگا، پیدا گیر، شیر جوان، جگری یار، پنج دریا، لٹ دا مال، امام دین گوہاویہ، رونی، چاچاجی، اکبرا، ہتھ جوڑی، چوڑیاں، بہادر، کسان، بہروپیا، چاچا خوامخواہ، میرا ماہی، ملنگی اور خاندان وغیرہ۔

اکمل کی چند فلموں کی خاص خاص بات بتاؤں گا تاکہ اس کے چاہنے والوں اور پرستاروں کی معلومات میں اضافہ ہو۔

جبرو: یہ وہ پہلی پنجابی فلم تھی جس میں اکمل پہلی بار مکمل ہیرو کے روپ میں پیش ہوئے۔ اس فلم کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ لیجنڈ اداکار آغا طالش نے پہلی بار اس فلم میں مزاحیہ اداکاری کی تھی۔ یہ ایک ایکشن فلم تھی جس کی شاندار کامیابی کے بعد پنجابی فلموں میں ایکشن فلموں کا دور شروع ہوگیا۔ جبرو کے فلم ساز سید فقیر صلاح الدین ہدایت کار، مظفر طاہر۔ موسیقار عاشق حسین اور مکالمہ نگار سیکدار تھے۔ اکمل نے ٹائٹل رول ادا کیا تھا۔ دیگر فنکاروں میں یاسمین، آغا طالش، سعید اختر اور اجمل خان شامل تھے۔ یہ سپرہٹ فلم 6 جولائی 1956ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس نے اس دور میں کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ میں نے یہ فلم بنگالی زبان میں دیکھی تھی۔ حیران نہ ہوں، میں بتاتا ہوں۔ اس فلم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اس کے ڈھاکا کے تقسیم کار نے اسے مشرقی پاکستان میں ریلیز کرنے کا ارادہ کیا تو یہ سوچ کر وہ اداس ہو گئے کہ یہ پنجابی زبان میں ہے۔ لہٰذا زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم والی بات ہوگی۔ محض پنجابی زبان سے ناآشنائی کی وجہ سے لاکھوں بنگالی تماشائی اس سے محروم ہو جائیں گے۔ ڈسٹری بیوٹر ہر صورت میں اس کی کامیابی سے کامیاب ہونا چاہتا تھا اس لیے اس نے اس پوری فلم کو اپنے خرچ پر بنگالی زبان میں ڈب کروایا اور فلم ریلیز کردی۔ اس کا نام جبرو ہی رکھا۔ میں نے یہ فلم نیو مارکیٹ کے سامنے واقع سنیما گھر ''بلاکا'' میں دیکھی تھی۔ اس زمانے میں میرا فلم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے مجھے حیرت ہوئی تھی کہ مغربی پاکستان کے فنکاروں نے بنگالی زبان میں فلم کیسے بنوائی لیکن جب فلم جرنلزم سے وابستہ ہوا تو اصل بات معلوم ہوئی۔

بہروپیا: اکمل کی یہ فلم طنز و مزاح کا مرقع تھی۔ اس فلم کا ٹائٹل رول کامیڈی کنگ ظریف مرحوم نے ادا کیا تھا۔ اکمل خان کے علاوہ لیلیٰ، نیر سلطانہ، اے شاہ شکار پوری اور اجمل خان اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ بہروپیا کے فلم ساز ایم تاج ایم عاشق، ہدایت کار اسلم ایرانی، موسیقار طفیل فاروقی تھے۔ یہ فلم 29 جنوری 1960ء کو ریلیز ہوئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

چاچا خوامخواہ: یہ ایک خوب صورت پنجابی فلم تھی۔ اس کا ٹائٹل رول کامیڈین اے شاہ شکار پوری نے ادا کیا تھا۔ اکمل خان اس فلم میں بطور مہمان اداکار پیش ہوئے تھے مگر یہ کردار بہت اہم اور جاندار تھا دیگر آرٹسٹوں میں لالہ سدھیر، مظہر شاہ، آصف جاہ، ناصرہ، ساون، ترانہ، لیلیٰ اور رنگیلا شامل تھے۔ اس کے فلم ساز اکبر ایرانی ہدایت کار اسلم ایرانی، موسیقار جی اے چشتی اور روز پر افضل تھے۔ 13 دسمبر 1963ء کو یہ کلاسک مووی ریلیز ہوئی۔

میرا ماہی: میرا ماہی کا ٹائٹل رول اکمل خان نے ادا کیا تھا۔ نیلو ان کی ہیروئن تھیں، دیگر فنکاروں میں اسد بخاری، الیاس کاشمیری، خلیفہ نذیر، زینت بیگم، نذر، زلفی، اجمل خان اور اے شاہ شکار پوری شامل تھے۔ نیازی ملک اس فلم کے فلمساز اور ایم جے رانا ہدایت کار اور بابا چشتی موسیقار تھے۔ اس فلم میں اکمل نے ایک پوسٹ مین کا کردار اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ وہ حقیقی ڈاکیہ لگتے تھے۔ یہ فلم باکس آفس پر سپرہٹ ہوئی۔ یہ اکمل کی ایک یادگار فلم ہے جو 14 اگست 1964ء کو نمائش پذیر ہوئی۔

ہتھ جوڑی: پنجابی ثقافت کی علمبردار فلم تھی۔ اکمل کے ساتھ مظہر شاہ نے اس فلم میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ نغمہ، اکمل کی ہیروئن تھیں۔ دیگر فنکاروں میں رنگیلا، اجمل خان، سلمیٰ ممتاز، چمن چمن، رضیہ، ایمی مینوالا اور غلام قادر شامل تھے۔ یہ ایک نغماتی فلم تھی جس میں رقص و موسیقی کے شعبے میں زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ اس فلم میں جبرو جیسے ایکشن ہیرو نے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ لائٹ رومانوی کردار بھی اسی خوبی سے ادا کرسکتا ہے جس خوبی سے مار دھاڑ سے بھرپور اداکاری کرتا ہے۔ ہتھ جوڑی کے فلم ساز اکبر ایرانی ہدایت کار اسلم ایرانی، موسیقار جی اے چشتی تھے۔ یہ فلم 14 دسمبر 1964ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

''چاچا خوامخواہ'' اور ''ہتھ جوڑی'' ایک ہی فلم ساز و ہدایت کار کی فلمیں تھیں۔ ''چاچا خوامخواہ'' میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اکمل کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی اسے فلم میں لیا گیا مگر ایسا خوامخواہ نہیں کیا گیا تھا۔ اکمل کی وجہ سے فلم کی اہمیت بڑھانے کے لیے کیا گیا تھا۔

فلم ساز اور ہدایت کار نے ان سے کہا تھا۔ ''ہم تمہیں اپنی ایک فلم میں جلد ہی مکمل ہیرو کاسٹ کرنے والے ہیں جس میں تمہیں ایک نئے انداز سے ہم پیش کریں گے۔ جو تمہارے کیریئر کی ایک اہم فلم ہوگی۔ ''چاچا خوامخواہ'' چونکہ اے شاہ شکار پوری کو سامنے رکھ کر بنائی جارہی تھی اس لیے اس میں تمہارا کوئی کردار نہیں ہے پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ تم مہمان اداکار کے طور پر ایک مختصر مگر اہم کردار کرلو۔

اور اکمل نے واقعی برا نہیں منایا تھا اور جب ''ہتھ جوڑی'' میں اسے کاسٹ کیا گیا تو اکبر ایرانی اور اسلم ایرانی نے کیا ہوا وعدہ پورا کردیا۔

چاچاجی: یہ فلم خونی رشتوں پر مبنی تھی۔ حقیقی جذبوں کی حامل اس فلم کا ٹائٹل رول علاؤ الدین نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ اکمل اس فلم کے ہیرو تھے۔ ان کی کردار نگاری لاجواب تھی۔ ان کی ہیروئن فردوس تھیں۔

یہ اکمل کے عروج کا دور تھا۔ تماشائی ان کی فلموں کو بار بار دیکھا کرتے تھے۔ سلمیٰ ممتاز نے اس فلم میں ایک ظالم چوہدرانی کا کردار ادا کیا تھا۔ منور ظریف، خلیفہ نذیر، سلطان راہی، بجگی ملک، فضل حق اور مظہر شاہ اس فلم کے دیگر فنکار تھے۔ اس فلم کے فلم ساز شیخ نذیر حسین، ہدایت کار وحید ڈار اور موسیقار بابا جی اے چشتی تھے۔ یہ خوب صورت اور

کامیاب فلمیں

اکمل مرحوم نے اپنے مختصر فلمی کیریئر میں بے شمار اردو اور پنجابی فلموں میں کام کیا۔ جن میں پنجابی فلموں کی تعداد زیادہ اور اردو کی بہت کم ہے۔ ان کی قابل ذکر فلمیں یہ ہیں۔ جبرو، یار دوست، ولایت پاس، پنجاب دا شیر، بھرجائی، دشمن، ڈھول سپاہی، سوکن، من موجی، بھریا میلہ، گونگا، پیدا گیر، شیر جوان، جگری یار، پنج دریا، لٹ دا مال، امام دین گوہادیہ، رونی، چغل خور، ملنگی، خاندان، بغاوت، بہروپیا، میرا ماہی، چاچاجی، اکبرا، ہتھ جوڑی، چوڑیاں اور بہادر کسان۔

اعزاز

اکمل کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے کیریئر میں لیجنڈ فلم رائٹر حزیں قادری کی لکھی ہوئی فلمی کہانیوں میں اداکاری کی۔ ایسی فلموں میں ملنگی، بہروپیا، ہتھ جوڑی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حزیں قادری فلموں کی کامیابی کی ضمانت تصور کیے جاتے تھے اس لیے ان کی فلموں میں کام کرنا فنکاروں کے لیے خوش نصیبی سمجھی جاتی تھی۔

فنی صلاحیتوں سے مالا مال

اداکار ہو یا اداکارہ اس کو شہرت اور مقبولیت اسی صورت میں ملتی ہے جب وہ اپنی فنی خوبیوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اکمل کو جو عروج حاصل ہوا اس کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ہوا۔ اپنی پہلی مکمل فلم ''جبرو'' میں وہ ایک ایکشن ہیرو کے روپ میں سامنے آیا تھا مگر بعد میں اس نے ہر طرح کے کردار میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے ثابت کیا کہ وہ ورسٹائل اداکار ہے۔ اس نے محمد علی اور حبیب جیسے سپر پرفارمر کے باپ کے کردار میں بھی ان سے بڑھ کر اداکاری کی اور ظریف جیسے لیجنڈ کامیڈین کی موجودگی میں بھی اپنی موجودگی کا ثبوت دیا۔ رومانوی اداکاری میں پنجاب کے دیہات کے گھبرو جوان کے روپ میں بھی اپنے آپ کو منوایا اور در در کی ٹھوکریں کھانے والے ایک افلاس زدہ نوجوان کا کردار ادا کر کے بھی اپنی اداکارانہ عظمت کا ثبوت دیا۔ اکمل کو اگر پنجابی فلموں کا دلیپ کمار کہا گیا تو حقیقتاً وہ اس کا حقدار تھا۔

PakBooks.Site

کامیاب فلم 10 مارچ 1967ء کو نمائش پذیر ہوئی۔

روٹی: یہ اکمل کی یادگار فلموں میں شمار کی جانے والی ایک فلم تھی۔ اس میں اکمل نے ایک ایسے نوجوان کا کردار ادا کیا تھا جو روٹی کے حصول کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ کئی مناظر میں ان کی اداکاری انتہائی عروج پر تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی فردوس اس فلم میں ان کی ہیروئن تھیں۔ دیگر کاسٹ میں طارق عزیز، ننھا، خلیفہ نذیر، اجمل خان، فضل حق، زلفی، نگو، اسد بخاری، سلمیٰ ممتاز، صبا، رضیہ اور نعیم ہاشمی شامل تھے۔ فلم ساز نیازی ملک، ہدایت کار رحید چوہدری، موسیقار جی اے چشتی تھے۔ 2 جنوری 1968ء کو یہ فلم ریلیز ہوئی اور اچھی کہانی، اکمل اور دیگر فنکاروں کی شاندار اداکاری کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

چوڑیاں: یہ پنجابی فلم اکمل کی کامیاب ترین کلاسک فلم شمار کی جاتی ہے۔ اس نغمہ بار فلم میں اکمل اور لیلیٰ شروع سے آخر تک چھائے رہے۔ ان کی ناقابل فراموش کردار نگاری نے فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس فلم کی وجہ سے اکمل کو مزید شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ امین ملک چوڑیاں کے ہدایت کار اور جے اے چشتی موسیقار تھے۔ اس کے مکالمہ نگار بابا عالم سیاہ پوش تھے۔ اس فلم کی نمائش 1963ء میں ہوئی اور ہر لحاظ سے ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس موقع پر یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسی نام سے بہت دنوں بعد سید نور نے بھی ایک فلم بنائی اور اس نے بھی کامیابی کے ریکارڈ قائم کیے۔

ملنگی: ہر دور میں ایک دو فلمیں ایسی بنتی ہیں جو دھوم مچا دیتی ہیں۔ ملنگی بھی ایک ایسی ہی پنجابی فلم تھی جس کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ جس نے ملنگی نہیں دیکھی اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے فلم ساز اچھا شوگر والا کا کہنا ہے۔ ''جب بھی مجھے پیسوں کی ضرورت پڑتی میں ملنگی ریلیز کر دیتا اور خوب کماتا۔''

ملنگی کیا ریلیز ہوئی ایک طوفان برپا ہو گیا جس طرح لوگ ''آن'' اور ''مغل اعظم'' دیکھنے کے لیے صبح ہی سے سنیماؤں کی لائنوں میں لگ جاتے تھے بالکل اسی طرح ''ملنگی'' کے ساتھ بھی ہوا۔ یہ ایک ایکشن فلم تھی مگر رقص و موسیقی کا تڑکا بھی اس میں شامل تھا جس کی وجہ سے فلم کی دلچسپیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ اس کے ایکشن کی طرح اس کا میوزک بھی سپرہٹ تھا۔ مادام نور جہاں اور مالا نے دل میں اتر جانے والے گیت اس فلم کے لیے گائے تھے۔

☆ ماہی وے سانوں بھل نہ جاویں
☆ چھڈ چلی بابلا تیریاں میں گلیاں
☆ بلے بلے نی لوکاں اپنے چھل
اور مسعود رانا کا گیت
☆ اٹھ وے ماہیے دیا شیر جواناں

کانوں میں آج بھی رس گھولتے ہیں۔

اس فلم کے ٹائٹل رول میں اکمل نے ناقابل فراموش کردار نگاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں یوسف خان، فردوس، شیریں، ساون، رنگیلا، منور ظریف اور زلفی وغیرہ شامل تھے۔ فلم ساز چوہدری اسلم، اچھا شوگر والا، ہدایت کار رشید اختر، موسیقار عبداللہ تھے۔ یہ فلم 25 فروری 1966ء کو ریلیز ہوئی اور سپرہٹ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس فلم کا ایک مکالمہ بے حد مقبول ہوا جو یہ ہے: ''راج فرنگی دا تے رانی راج ملنگی دا''

خاندان: خاندان اکمل کی اردو فلم تھی جو اس کی کامیاب پنجابی فلموں سے بڑھ کر کامیاب ہوئی۔ اکمل کو پنجابی فلموں کا دلیپ کمار کا خطاب اس کے چاہنے والوں نے دیا تھا۔ اکمل خان کی شہرت جب انڈیا تک پہنچی اور انہوں نے سنا کہ پاکستان میں بھی کوئی دلیپ کمار پیدا ہو گیا ہے تو انڈیا والوں نے یہ کہا۔ ''یہ اداکار اکمل کسی اردو فلم میں کام کر کے دکھائے تو پھر مانیں گے کہ وہ دلیپ کمار ہے۔''

یہ بات جب پاکستان پہنچی تو پاکستانیوں نے یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے ''خاندان'' کے نام سے ایک اردو فلم بنائی اور لیجنڈ حبیب اور فن کے بے تاج بادشاہ اور ٹریجڈی کنگ محمد علی کے باپ کے کردار میں اکمل کو پیش کیا۔ اکمل نے اس کردار میں اداکاری کر کے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی پاکستانی دلیپ کمار ہیں۔ ''خاندان'' اکمل کے فنی کیریئر کی سب سے کامیاب، یادگار اور بڑی اردو فلم تھی۔ اکمل نے اس فلم کے کسی بھی سین میں حبیب اور محمد علی جیسے مہان فنکاروں کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا۔ جس منظر میں بھی آئے عوام نے انہیں دیکھ کر واہ وا، کا نعرہ لگایا۔

اچھی کہانی، اچھے اسکرپٹ اور اچھی ہدایت کاری کے ساتھ سونے پر سہاگا کے مصداق اس کی موسیقی بھی لاجواب تھی جس نے اس کی کامیابی کو مزید مستحکم کیا۔ کاسٹ کے دیگر فنکاروں میں نغمہ، فردوس، حنا، ریکھا اور بہار بیگم بھی شامل تھیں۔ بہار اکمل کی ہیروئن تھیں۔ اس فلم کے فلم ساز و ہدایت کار ریاض احمد موسیقار رحمٰن ورما تھے۔ یہ نغمہ بار

کلاسک فلم 23 اپریل 1967ء کو نمائش پذیر ہوئی اور سپرہٹ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس فلم کا ایک گیت بہت مقبول ہوا۔ ''حال کیسا ہے جناب کا؟''

قصہ مختصر یہ کہ اکمل خان اپنی بے پناہ فنی خوبیوں کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ ان کے بڑے بھائی اجمل خان جو بہت بڑے اداکار تھے۔ وہ ان سے بھی بڑے فنکار بن گئے۔ اجمل خان تو جہاں تھے وہیں رہے۔ کیریکٹر ایکٹروں کے صفِ اوّل میں ہی رہے مگر اکمل نے ہیرو بن کر اس دور کے تمام ہیروؤں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ ان کے انتہائی عروج کا دور تھا کہ وہ 11 جون 1967ء کو اپنے عالم شباب میں انتقال کر گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ طبعی موت نہیں مرے انہیں زہر دے کر مارا گیا۔ جب کہ کچھ افراد اس کی تردید کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ گردن توڑ بخار کی وجہ سے فوت ہوئے، اس بات کے امکانات زیادہ ہیں کہ انہیں زہر دے کر مارا گیا۔ ہماری فلم انڈسٹری میں ایسے واقعات پہلے بھی رونما ہو چکے ہیں۔ جب کسی کی شہرت اور مقبولیت سے کچھ لوگوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا تو انہیں راستے سے ہٹا دیا گیا۔ خلیل قیصر اور سلطان راہی کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ دونوں حقیقتاً کسی دہشت گردی کے شکار نہیں ہوئے، اس بات کا قوی امکان ہے کہ انہیں اپنی کامیابی کے راستے میں رکاوٹ سمجھنے والوں نے انہیں اس خوبی اور مشاقی کے ساتھ عدم آباد کا مسافر بنایا کہ آج تک ان کے قاتلوں کا سراغ نہ مل سکا۔

اکمل کو اپنے پرستاروں سے بچھڑے 51 برس بیت گئے ہیں مگر آج بھی وہ اسے بھولے نہیں ہیں۔ ہر سال 11 جون کو اس کے چاہنے والے اس کی قبر پر جا کر پھول نچھاور کرتے ہیں فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور ان کی برسی مناتے ہیں۔

☆......☆

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے بزرگوں اور بڑوں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جو کہتے تھے پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آنے لگتے ہیں۔ بزرگوں کی کہی ہوئی باتیں حقیقت کے روپ میں ہر دور میں نظر آتی ہیں۔ ان دونوں لڑکوں کی بھی یہی بات تھی کہ ان کے بڑے ان کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر حیران ہوتے اور کہتے۔ ''اللہ تمہیں لمبی عمر دے، تم لوگ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے بڑے کارنامے انجام دو گے۔ بڑے کام کرو گے۔ بڑی ناموری حاصل کرو گے۔''

ان میں سے ایک لڑکے کا نام بشیر احمد تھا اور دوسرے کا نام محمد صدیق تھا۔ دونوں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی اسکول خزانہ گیٹ لاہور کے طالب علم تھے۔ چھٹی جماعت کے اسٹوڈنٹ تھے۔ یہیں ان کی دوستی ہو گئی تھی جو ان کے بڑے ہونے تک برقرار رہی اور ان کے بزرگوں کی پیش گوئی کے مطابق دونوں نے شوبز میں بڑی شہرت حاصل کی۔

بڑے بھائی سے بڑا اداکار

اکمل کیریکٹر ایکٹر اجمل کے چھوٹے بھائی تھے۔ اس کے باوجود اکمل نے ان کی مدد کے بغیر فلم انڈسٹری میں قدم رکھا اور اپنی محنت، لگن اور صلاحیتوں سے سپر پنجابی ہیرو کے درجے پر پہنچے اور اپنے بڑے بھائی سے بڑا اداکار بن کر اپنا لوہا منوایا۔

زندگی نامہ

اصلی نام: بشیر احمد
فلمی نام: حزیں قادری
تعلیم: دنیاوی تعلیم ساتویں جماعت تک، باقی مدرسے کی دینی تعلیم
فنی کیریئر: ریڈیو لاہور کے پروگرام کے لیے نعت نگاری۔
پہلی فلم: پنجابی فلم تھہ بطور نغمہ نگار پاٹے خان بطور مصنف نغمہ نگار سجناں دور دیا بطور فلم ساز۔
شادی: دو شادیاں کیں۔
اولاد: گیارہ بیٹیاں چار بیٹے۔
عالمی ریکارڈ: سال 1969ء میں 22 فلمیں لکھیں۔ 18 مصنف و نغمہ نگار اور 4 صرف نغمہ نگار کی حیثیت سے۔
فالج کا حملہ: 2 دسمبر 1980ء کے دن ہوا۔
انتقال: 19 مارچ 1991ء کو ہوا۔

رائٹر ایسوسی ایشن کی صدارت

حزیں قادری پاکستان فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر ایک عرصہ تک رہے۔ اس دوران انہوں نے فلمی مصنفین اور نغمہ نگاروں کے مسائل کے لیے تعمیری کام کیے۔ فلم سازوں اور رائٹرز کے درمیان جو تنازعات رونما ہوتے انہیں بڑی خوش اسلوبی سے حل کراتے۔

PakiBooks.Site

بشیر احمد لاہوری نہیں تھا۔ لاہور میں پڑھنے کی غرض سے بورے والا سے آیا تھا جہاں وہ گورنمنٹ اسکول بورے والا میں پڑھتا تھا۔ یہیں سے اس نے تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ اس اسکول کے ایک استاد گرامی ماسٹر لیکھ راج کھنہ جو بڑے تجربہ کار اور انسانی نفسیات کے ماہر تھے۔ بشیر احمد کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کی ناقابل یقین سوجھ بوجھ صلاحیتوں اور ذہانت کو دیکھ کر حیران ہوتے اور کہتے۔ ''تم میری جماعت کے سب سے اہم اور سب سے لائق طالب علم ہو۔''

ایک دن انہوں نے اپنی جماعت کے تمام طالب علموں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بچو! آج سے بشیر احمد اس کلاس کا مانیٹر ہے۔ اس بات پر کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''نہیں سر!'' سب نے بیک آواز کہا۔ ''بشیر احمد ہمارا بہت اچھا ساتھی ہے۔ ہم سے بہت محبت سے پیش آتا ہے۔ جو سبق ہماری سمجھ میں نہیں آتا، ہمیں آسانی سے سمجھا دیتا ہے۔ ہر طرح سے ہماری مدد کرتا ہے۔''

ایک لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سر! یہ تو ہمارا چھوٹا ماسٹر ہے۔''

''گڈ!'' ماسٹر صاحب خوش ہو کر بولے۔ ''مگر مانیٹر بن کر وہ تم لوگوں کو تمہاری شرارتوں اور غلط بات پر روکے گا بھی اور تمہاری شکایت بھی کرے گا۔''

اور جب بشیر احمد نے بڑی کامیابی سے جماعت کی مانیٹری کا ثبوت دیا تو ماسٹر لیکھ راج کھنہ نے خوش ہو کر بشیر احمد سے کہا۔ ''میری دعا ہے کہ تم بڑے ہو کر جس شعبے میں بھی قدم رکھو کامیاب مانیٹر کی حیثیت تمہیں حاصل ہو۔''

بشیر احمد پنجاب کے کسی بڑے جاگیردار یا کھاتے پیتے ماں باپ کا چشم و چراغ نہیں تھا۔ اس کے والد غلام حسین قیام پاکستان سے قبل پی ڈبلیو ڈی (پبلک سروس ڈیپارٹمنٹ) کے محنت کش ملازم تھے۔ غریب انسان تھے اور گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں راجا تمبولی میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ بورے والا سے وہاڑی کے درمیان جب سڑک کی تعمیر شروع ہوئی تو غلام حسین بھی اپنے کنبے کے ساتھ بورے والا ہجرت کر گئے۔

غلام حسین کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بورے والا قیام کے دوران ان کے سب سے ذہین اور چھ بیٹوں میں سے پانچویں نمبر کے بیٹے بشیر احمد کو انہوں نے گورنمنٹ اسکول بورے والا میں داخل کرایا۔ بشیر احمد نے پرائمری تک تعلیم بورے والا میں ہی مکمل کی۔

بورے والا سے وہاڑی کے درمیان سڑک کی تعمیر کے بعد راجا تمبولی گاؤں کے اس خاندان نے واپسی کے لیے کمر کسی لیکن بشیر احمد لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور میں ان کی پھوپی رہتی تھیں، بشیر احمد انہی کے گھر رہنے لگے۔ لاہور میں گورنمنٹ ہائی اسکول خزانہ گیٹ میں انہیں چھٹی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ یہیں ان کی دوستی محمد صدیق سے ہوئی۔ اس زمانے سے بشیر احمد شعر و شاعری کرتا تھا اور نعتیہ کلام پڑھتا تھا۔ اس کا دوست محمد صدیق بشیر احمد کی شاعری اور نعت گوئی سے خوب لطف اندوز ہوتا تھا۔ یہاں دونوں نے ساتویں جماعت تک ساتھ تعلیم حاصل کی پھر فلک کج رفتار نے دونوں دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ ہوا یوں کہ بشیر احمد کے بڑے بھائی خادم حسین نے ان کی اسکول کی تعلیم ختم کروادی اور انہیں مولانا محمد عمر اچھروی کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ یوں ساتویں جماعت تک بشیر احمد نے دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔

وقت کا پہیا گھومتا رہا۔ دونوں بڑے ہوتے گئے پھر محمد صدیق اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر کے پریکٹیکل زندگی بسر کرنے لگے۔ انہوں نے ریڈیو اسٹیشن لاہور میں ملازمت اختیار کر لی۔

ایک دن کرنا خدا کا یوں ہوا کہ محمد صدیق کو اپنے پروگرام کے لیے نعتیہ اشعار کی ضرورت پیش آئی تو انہیں ایک دم بشیر احمد یاد آئے۔

''ارے یار! یہ ضرورت تو میرا یار ہی پوری کر سکتا ہے۔'' انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ ''وہ کہاں ہے؟ کہاں ملے گا؟'' انہوں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ ''یاد آیا...... یاد آیا وہ تو...... وہ تو مولانا محمد عمر اچھروی کے مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔''

اور پھر محمد صدیق مدرسہ جا کر محمد بشیر کو اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن لے آیا۔

''کیا بات ہے بھئی! تم اچانک اتنے دنوں بعد کیوں مدرسہ جا دھمکے اور یہاں کیوں کھینچ لائے مجھے؟''

''یار! بات یہ ہے کہ میں ریڈیو میں ملازمت کرتا ہوں۔ مجھے اپنے پروگرام کے لیے نعتیہ اشعار کی ضرورت ہے۔''

''تو...... میں کیا کروں؟''

''ارے یار! تم یہ کرو کہ مجھے نعتیہ اشعار لکھ کر دو۔''

بشیر احمد ذرا گھبرایا، قدرے پریشان ہوا۔ ''میں ٹوٹی پھوٹی شاعری ضرور کرتا ہوں مگر میں نے نعتیہ اشعار کبھی نہیں لکھے۔ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ میں دوسروں کے نعتیہ شعر پڑھتا ضرور ہوں مگر اب تک کبھی لکھا نہیں مگر یہ ایسا معاملہ ہے کہ انکار کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔''

''کیا سوچنے لگے بشیر احمد؟'' محمد صدیق نے اسے ٹوکا۔

''یار! پہلی بات تو یہ ہے کہ بہت دنوں سے یوں سمجھو مدرسے کی تعلیم کے دوران شعر و شاعری کا موقع ہی نہیں ملا۔ دوسرے یہ کہ نعتیہ شاعری کے لیے......''

''سوچو مت۔'' محمد صدیق نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''بسم اللہ کہہ کر شروع کر دو۔ مولا کریم تمہاری مدد کریں گے۔''

اور بشیر احمد نے ابتداء کی تو مولا نے واقعی اس کی رہنمائی کی، مدد کی اور ذرا دیر میں اس نے نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھ کر محمد صدیق کو تھما دی۔

اکھیاں والے رکھ دے نین پہچان محمدؐ دی
آنیاں دی بلا جانے کی شان محمدؐ دی

محمد صدیق نے نعت پڑھی تو جھوم اٹھا۔ آگے بڑھ کر اپنے یار کو چوم لیا۔ ''لے تیری شاعری کا آغاز نعت نگاری سے ہو گیا۔ سبحان اللہ! کیا پیاری نعت کہی ہے تو نے۔''

محمد صدیق کا پروگرام ہوا اور ہٹ ہو گیا۔ دوسری طرف بشیر احمد نے باضابطہ اپنی شاعری کا آغاز نعت نگاری سے کیا۔ تو اس کی شاعری اللہ کے فضل اور اس کے محبوب کے صدقے سے اسے بہت بڑا شاعر بنا دیا۔ پاکستانی فلمی صنعت و تجارت کا مہان قوی بنا دیا۔ اس نے حزیں قادری کے نام سے نغمہ نگاری اور کہانی نویسی میں دھوم مچا دی اور اس کے دوست نے بھی اپنے دوست کے ساتھ فلمی دنیا میں اپنا منفرد مقام بنایا مگر محمد صدیق کے نام سے نہیں بلکہ ظریف کے نام سے۔

بشیر احمد نے نعت نگاری سے باضابطہ اپنی شاعری کی ابتدا کی تو رب رحیم و کریم کی رحمتوں کی اس پر بارش برس گئی۔ اللہ اپنے محبوب کی تعریف و توصیف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے، اس لیے بشیر احمد کو حزیں قادری کے روپ میں شہرت دوام عطا فرمائی۔ ان کی شاعری کے حوالے سے ہی ان کو عزت، شہرت، مقبولیت اور دولت بخشی۔ اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہماری علمی اور فلمی دنیا کے ایک اور مقبول شاعر اور نغمہ نگار قتیل شفائی نے بھی اپنی شعر گوئی کا آغاز نعت لکھ کر کیا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ ان کی شہرت اور مقبولیت کی بھی یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری کی بنیاد انہوں نے نعت نویسی پر رکھی۔

یہ وہ دور تھا جب آج کی طرح میڈیا کے بے شمار ذرائع موجود نہیں تھے۔ بس ایک ریڈیو تھا جو ادب، آرٹ اور سیاست کے متوالوں کا علمبردار تھا۔ ریڈیو کے پروگراموں سے شہرت حاصل کرنے والوں کو آگے بڑھنے کا

ٹاپ 10 گیت

حزیں قادری کا ہر گیت ہر نغمہ پسندیدہ ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے کلام کا انتخاب بہت مشکل ہے۔ میرے خیال میں جو ہو سکتا ہے پیش کر رہا ہوں۔

1۔ سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا
2۔ دلدار صدقے لکھ وار صدقے
3۔ دنیا مطلب دی او یار
4۔ تانگے والا خیر منگدا تانگہ لہوردا
5۔ جی اوڈھولا
6۔ چن میرے لکھناتے اس کے اک پل ادھر تکنا
7۔ عشق نچائے گلی گلی
8۔ تیرے نال نال وے میں رہنا
9۔ تیرے جئے پت جمن ماواں
10۔ برے نصیب مرے

گولڈن پیشکش

یوں تو حزیں قادری نے بہت سے باصلاحیت لوگوں کو فلم انڈسٹری سے متعارف کرایا مگر اس سلسلے میں ان کی گولڈن پیش کش منور ظریف ہے۔ ظریف جیسے سپر پرفارمر کا بھائی ہونے کے باوجود اسے اداکاری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے باڈی بلڈنگ کا شوق تھا اور وہ اسی دھن میں مگن رہتا تھا لیکن ظریف کے انتقال کے بعد حزیں قادری نے اسے تن سازی کو چھوڑ کر اداکاری کرنے پر مجبور کیا اور پھر اس کی تربیت اس طرح کی کہ وہ کامیڈین سے ہیرو تک کے کرداروں میں بے مثال ثابت ہوا اور پاکستانی فلمی صنعت میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔

PakiBooks.Site

موقع ملتا تھا۔ حزیں قادری اور ظریف کو بھی ریڈیو کے پروگراموں میں عوامی پذیرائی حاصل ہوئی تو فلم والوں نے ان کی طرف دیکھا اور ان سے فائدہ اٹھانے کا عزم، ارادہ کیا۔

ایک دن کچھ لوگ بشیر احمد کے پاس آئے جو اب شاعری کے حوالے سے اچھے خاصے مقبول ہو گئے تھے۔

''بشیر احمد صاحب! ہم لوگ آپ سے اپنی فلم کے گیت لکھوانا چاہتے ہیں۔''

بشیر احمد نے ان لوگوں کو گھور کر دیکھا۔ پھر بولے۔

''مگر میں نے تو اب تک کسی فلم کے لیے نہیں لکھا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ شاعر ہیں، شاعری کر سکتے ہیں تو دوسرے شعبوں کی طرح فلم کے لیے بھی لکھ سکتے ہیں۔''

بشیر احمد نے ذرا سوچا پھر بولے۔ ''فلمی شاعری تو ذرا مختلف ہوتی ہے۔ بہرحال آپ لوگوں کی خواہش پر کوشش کروں گا۔''

''ہماری فلم پنجابی زبان میں بنائی جا رہی ہے۔''

''میرے لیے زبان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ پنجابی ہو یا قومی زبان۔ میں کسی بھی زبان میں لکھ پڑھ سکتا ہوں۔''

بشیر احمد راضی ہو گئے تو انہیں پنجابی فلم ''نتھ'' کی نغمہ نگاری کی ذمہ داری سونپی گئی مگر یہاں کی جانے والی شاعری کا طریقۂ کار ذرا مختلف تھا۔ موسیقار ایک دھن تیار کرتا تھا اور فلم میں کس موقع پر اسے گایا جائے گا یہ چویشن بتا کر کہتا۔

''اب اس میوزک کمپوزیشن میں گیت لکھیں۔''

ابتداء میں تو بشیر احمد کو ذرا عجیب سا لگا مگر اللہ نے ان میں شاعری کی بے پناہ صلاحیت دی تھی۔ ایک گانا انہوں نے لکھ دیا تو موسیقار نے تعریف کی۔

''بہت خوب، آپ نے تو کمال کر دیا۔ یقین نہیں آتا کہ آپ نے پہلے فلمی شاعری نہیں کی۔''

باقی گیت لکھنے میں وہ بالکل ہچکچائے نہیں۔ بڑی آسانی سے یوں لکھ دیا جیسے یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ ان کے لکھے ہوئے تمام گیت ہدایت کار کو بھی پسند آئے اور فلم ساز نے بھی تعریف کی۔ ''یہ تو کسی منجھے ہوئے شاعر کی شاعری لگتی ہے۔''

''جی ہاں۔'' موسیقار نے ان کی تائید کی۔ ''یہ نوجوان بڑا ٹیلنٹیڈ ہے۔ بڑی ترقی کرے گا۔''

جب تمام گانے لکھ لیے گئے تو بشیر احمد نے کہا۔

''میری ایک درخواست ہے۔''

''جی فرمائیے۔''

''فلم میں شاعر کی حیثیت سے بشیر احمد نہ لکھا جائے۔''

''مگر...... کیوں؟''

''کیا یہ نام دیکھ کر تمہیں پولیس گرفتار کرلے گی؟'' موسیقار نے ازراہِ مذاق کہا۔

''جی ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ کچھ لوگوں کو میرا فلمی شاعری کرنا اچھا نہیں لگے گا...... اور......''

''ارے بھئی! یہ تمہارا نجی معاملہ ہے مگر کچھ لوگوں کو کیوں اعتراض ہوگا؟''

''وہ جی...... بات دراصل یہ ہے کہ میرا گھرانا بڑا مذہبی ہے جب کہ میں نے ایک دینی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ میرے استادوں کو بھی افسوس ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ میرے گھر والے......''

موسیقار، ہدایت کار اور فلم ساز جو اس گفتگو میں شریک تھے۔ بشیر احمد کی اس بات سے متفق ہوئے کہ واقعی اس کے استادوں کو تو بس افسوس ہوگا مگر ان کے خاندان والے انہیں ہاؤس اریسٹ کر دیں گے اور فلمی دنیا کی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیں گے۔

''ٹھیک ہے۔'' ہدایت کار بولے۔ ''ہم تمہارے پرابلم کو سمجھ گئے ہیں۔ تم اپنا کوئی قلمی نام سوچ لو۔ ہم وہی نام لکھ دیں گے۔''

''حزیں قادری۔'' یہ نام میں نے پہلے سے سوچ رکھا ہے۔

''نتھ'' ریلیز ہوئی جس کے شاعر کا نام حزیں قادری پر شاید کسی نے توجہ نہیں دی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا کہ یہ حزیں قادری دراصل بشیر احمد ہی ہے۔ ایک مذہبی گھرانے کا فرد ہے۔ دینی مدرسے کا ایک طالب علم ہے۔

دوسری طرف نتھ کے گانوں نے فلم والوں کو بہت متاثر کیا۔ بالکل نیا نغمہ نگار ہونے کے باوجود اتنے پُراثر گیتوں کا مطلب ہے، ان کا تخلیق کار باصلاحیت ہے۔ انور کمال پاشا جو اس دور کے سپر فلم ساز و ہدایت کار تھے اور ان کی دوربین نگاہیں باصلاحیت افراد کو ڈھونڈ نکالنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ انہوں نے حزیں قادری کو اپنے دفتر میں بلایا۔

''میں چاہتا ہوں آپ میری فلم میں بھی نغمہ نگاری کریں۔'' اس سے پہلے کہ حزیں قادری ہاں یا ناں میں کچھ جواب دیتے وہی بول پڑے۔ ''مگر میری فلم اردو زبان میں بنائی جا رہی ہے اور اس کا نام ''دو آنسو'' ہے۔

''پنجابی یا اردو کا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ دونوں اپنی زبانیں ہیں۔''

''آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ دونوں اپنی زبانیں ہیں۔''

اور پھر حزیں قادری نے اپنے کیریئر کی دوسری فلم ''دو آنسو'' کے گانے لکھنا شروع کر دیے۔ اس فلم میں ان کے یہ گیت پسند کیے گئے۔

☆اس غم کے سوا اس دنیا میں

☆او جانے والے کیوں محبت کا ٹھکانا بھول گئے

☆اک لیلیٰ تے مجنوں سارے کرماوالے

اس فلم میں حزیں قادری کے علاوہ قتیل شفائی اور طالب بندھیانی نے بھی گیت لکھے لیکن ان کے مقابلے میں اس نئے نویلے شاعر کی شاعری زیادہ پسند کی گئی، سراہی گئی۔

''دو آنسو'' 7 اپریل 1950ء کے دن ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے ذریعے حزیں قادری نے اپنی شناخت کرانی شروع کر دی۔ اس زمانے میں انور کمال پاشا کی فلم کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور ان کے فنکاروں اور ہنرمندوں کی کارکردگی پر سب توجہ دیتے تھے۔ حزیں قادری کو بھی اس کا خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔

یہ پاکستانی فلمی صنعت کا ابتدائی دور تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جو فسادات پھوٹ پڑے تھے اس سے لاہور کی فلم انڈسٹری مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ 1948ء سے کچھ سرپھروں نے اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ چھوٹے موٹے سرمائے سے چھوٹی چھوٹی فلمیں بنانا شروع کی گئیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فلموں کے معیار اور کاروبار میں اضافہ ہوتا گیا۔

18 نومبر 1955ء کو ایک فلم ''پاٹے خان'' ریلیز ہوئی جس نے اب تک کی نمائش پذیر ہونے والی اردو اور پنجابی فلموں کی کامیابیوں کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ ایک بڑی اور سپرہٹ فلم کی حیثیت سے اس فلم نے فلم انڈسٹری میں دھوم مچا دی۔ یہ پنجابی فلم تھی۔ اس کے مصنف اور نغمہ نگار حزیں قادری تھے۔ جب کہ ظریف نے اپنی سپر کلاس مزاحیہ اداکاری سے فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

کامیاب ترین فلمیں

مشہور ہے کہ حزیں قادری فلم سازوں کی ڈیمانڈ کے مطابق فلموں کی کہانیاں اور گیت لکھتے تھے۔ فلم ساز کا بجٹ اور ان کے معاوضے کو سامنے رکھ کر جس معیار کی فلم کی فرمائش کرتے تھے وہ اس معیار کی فلم اور گیت لکھ دیتے تھے۔ اس طرح باکس آفس پر ان کی بہت سی فلمیں خاطر خواہ کامیابی نہیں حاصل کرسکتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی کامیاب فلموں کی تعداد بھی کم نہیں۔ ہمارے جائزے کے مطابق ان کی مندرجہ ذیل فلمیں سپرڈپر کامیاب رہیں۔ پاٹے خان، مستانہ ماہی، ملنگی، ہتھ جوڑی، ڈاچی، بہروپیا، جیرا بلیڈ، پنگاں، چن مکھنان، ضدی، اوکھا جٹ، رانی خان اور مفت بر۔

اردو فلمیں

حزیں قادری نے اردو فلمیں بھی لکھیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے کیونکہ انہوں نے جس انداز میں پنجاب کے کلچر اور اس کی تہذیب کی سچی عکاسی کی اس کے پیشِ نظر فلم والوں نے انہیں پنجابی فلموں کے لیے کامیابی کی ضمانت سمجھ کر ان سے پنجابی فلمیں ہی لکھوائیں۔ ان کی جو چند اردو فلمیں مجھے مل سکیں وہ یہ ہیں دو آنسو، پاسبان، توحید اور لختِ جگر۔

جدید پنجابی فلموں کا مؤجد

پنجابی فلمیں قیامِ پاکستان سے پہلے بھی لاہور میں بنتی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی بنیں اور اب تک بنائی جا رہی ہیں مگر حزیں قادری نے پنجابی فلموں کی تعمیر و ترقی میں جو خوشگوار مثبت اضافہ کیا اور جس طرح پنجاب کی اصل تہذیب و تمدن کی پنجابی فلموں میں عکاسی کی اس نے انہیں جدید پنجابی فلموں کا مؤجد قرار دیا انہوں نے فلموں کے ذریعے پنجابی ادب کے فروغ میں جو خدمات انجام دی ہیں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

PakiBooks.Site

جو جیت گیا وہی سکندر کے مصداق ''پاٹے خان'' کی فقید المثال کامیابی نے حزیں قادری اور ظریف کو فلموں کی کامیابی کی ضمانت بنا دیا۔ دونوں پاکستانی فلموں کے اہم ستون سمجھے جانے لگے۔ دونوں کی انفرادی حیثیت بہت مستحکم اور مضبوط ہوگئی۔ حزیں قادری پاکستانی فلمی صنعت کے معروف ترین مصنف و نغمہ نگار بن گئے۔ اس فلم کے گیتوں نے بھی دھوم مچادی۔

☆ آجا میری پھڑ لے ہاتھ
☆ ہوکا میں دواں گلی گلی
☆ کلی کلی جان تے دکھ لکھ تے کروڑ نیں
☆ دورا ہی رستہ بھل گئے
☆ مینوں کیندی اے جوانی اکھاں چار کرلے
☆ بجن دشمن سانوں اٹھدے بیندے پاٹے خان
☆ یاد بجن دی رکھ سرانے

اس فلم کے یہ گیت آج بھی کانوں میں شہد ٹپکاتے ہیں۔ جب کہ ''پاٹے خان'' کو آج بھی خوب صورت اور لائٹ تفریحی فلموں میں خصوصی اہمیت کی حامل شمار کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ظریف نے اس فلم میں پاٹے خان کے کردار میں جو پرفارمنس دی اس نے اس فلم کی پسندیدگی کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ بطور مصنف بھی حزیں قادری نے ایسی کہانی لکھی تھی کہ عوامی تفریح کے معیار پر پوری اتری۔ فلم کی بنیادی چیز اس کی کہانی ہوتی ہے۔ اچھی کہانی کو اچھے طریقے پر فلمایا جائے اور اس کے فنکار اور ہنرمند اگر اپنے حصے کا کام کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق کریں تو فلم کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ ''پاٹے خان'' سے حزیں قادری نغمہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب کہانی نویس کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے لگے۔

اگلے سال یعنی 1956ء میں حزیں قادری کی ایک اردو فلم ''لختِ جگر'' نمائش پذیر ہوئی مگر اس فلم میں جو ایور نیو پکچر کے بینر تلے بنائی گئی تھی، حزیں قادری نغمہ نگار کی حیثیت سے ہی پیش ہوئے تھے اور ان کے چند ہی گیت اس میں شامل تھے۔ باقی سارے گانے سیف الدین سیف نے تحریر کیے تھے۔ حزیں قادری سے چند گیت شاید اس لیے لکھوائے گئے تھے کہ ان دنوں وہ اردو اور پنجابی فلموں کی ضرورت سمجھے جانے لگے تھے۔ ''لختِ جگر'' اچھی فلم تھی مگر باکس آفس پر کامیابی حاصل نہ کرسکی جس کی وجہ یہ تھی کہ بالکل ایسی کہانی پر حمیدہ کے نام سے ایک فلم انہی دنوں ریلیز ہو چکی تھی اور کامیاب بھی ہو چکی تھی۔

اسی سال حزیں قادری کی ایک پنجابی فلم ''چن ماہی'' بھی ریلیز ہوئی جس نے ملک گیر کامیابی حاصل کی۔ 12 مئی 1956ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے مصنف اور نغمہ نگار حزیں قادری تھے۔ ''پاٹے خان'' کے بعد بطور نغمہ نگار اور مصنف یہ حزیں قادری کی دوسری پنجابی فلم تھی جس نے باکس آفس پر دھوم مچا دی تھی اور حزیں قادری کو فلم انڈسٹری کا کامیاب رائٹر بنا دیا تھا۔ فلم والے یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ یہ شخص ہماری فلموں کی کامیابی کی کنجی ہے۔ اس فلم کے یہ گیت بہت پسند کیے گئے۔

☆ گوری گوری دھوپ چناں کالی کالی چھاں دی
☆ چنی لے کے ستاریاں والی تے میلہ لٹ دی

پھراں

☆ چناں چنک والوگ میرے تک دا
☆ مینوں دس کھاں خدایا تیرا کی گوایا

اگلے سال یعنی 1957ء میں حزیں قادری نے اردو فلم ''پاسبان'' کے کچھ گیت لکھے۔ اس فلم میں ان کے شریک نغمہ نگار طفیل ہوشیار پوری اور تنویر نقوی تھے۔

''پاسبان'' 27 دسمبر 1957ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی جب کہ اسی سال پنجابی فلم ''پھولے خان'' 2 مئی کو ریلیز ہوئی جس کی کہانی اور گیت حزیں قادری نے تحریر کیے تھے۔ یہ فلم بھی خاطر خواہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ حزیں قادری کو نغمہ نگاری کے ساتھ ساتھ کہانی نویسی کی دعوت ملتی رہی۔ جن میں اردو فلمیں بھی ہوتیں اور پنجابی فلمیں بھی لیکن پنجابی فلموں کی کہانیاں انہوں نے اس انداز میں لکھیں کہ ان میں پنجاب کے حسن اور اس کے کلچر اور تمدن کی حقیقی عکاسی کی۔ انہوں نے پنجاب کو اس قدر خوب صورت اور رومانوی انداز میں پیش کیا کہ یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ پنجابی کس قدر عشق کی مٹی میں رچے بسے ہیں۔ کس قدر من کے سچے ہیں۔ کس قدر عقیدت مند اور کتنے غیرت مند ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ فلموں میں پنجاب کے کلچر کو حزیں قادری سے بہتر کسی مصنف نے پیش نہیں کیا۔

سوچنے اور غور وفکر کرنے کا مقام ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے دنیاوی تعلیم صرف ساتویں جماعت تک حاصل کی، باقی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی، جو دین اور مذہب تک محدود ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس کی معلومات اس کی دور بینی، اس کی سوچ اور فکر کی وسعت اور اس کا وژن کس قدر تھا کہ اس نے پنجاب کو جسے اس نے اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھا تھا اس کی عکاسی اتنے پُر اثر انداز میں کی۔ یہ جوان کے جہاں دیدہ بزرگوں نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ ذہن اور فطین لڑکا بڑا ہو کر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بنے گا۔ وہ کس قدر سچ ثابت ہوئی۔ وہ بورن جینیس تھے۔ محدود تعلیم کے باوجود ان میں بلا کی صلاحیت تھی جس کا انہوں نے ثبوت دیا۔

1957ء میں اردو فلم ''پاسبان'' اور پنجابی فلم ''پھولے خان'' کی کامیابی کا یہ سلسلہ 1958ء میں بھی جاری رہا۔ پنجابی فلم ''کچیاں کلیاں'' کے دلفریب گیت لکھے جو پسند کیے گئے۔ یہ ہدایت کار امین ملک کی فلم تھی جو 28 فروری کے دن ریلیز ہوئی۔ اسی سال 29 جون کو ریلیز ہونے والی اسلامی، اصلاحی اور ہماری تہذیب و تمدن کی عکاس فلم ''توحید'' اردو فلم تھی۔ اس کے گیت بھی مقبول ہوئے۔ فلم ''توحید'' کی کامیابی کے ساتھ ساتھ 1958ء میں ہی مجروح سلطان پوری کے ساتھ مل کر فلم ''نیا زمانہ'' کے نغمات تحریر کرکے ثابت کیا کہ وہ (حزیں قادری) پنجابی زبان کے ساتھ اردو زبان کے بھی مقبول نغمہ نگار ہیں۔ ''نیا زمانہ'' میں بھی ان کے لکھے ہوئے گانے ان کے پنجابی گیتوں کی طرح پسند کیے گئے تھے۔ یہ سلسلہ 1959ء میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا اور ہدایت کار اسلم ایرانی کی پنجابی فلم ''بچہ جمورا'' کی کہانی اور گیت لکھ کر پاکستان فلم انڈسٹری کو ایک کامیاب فلم دی۔ 29 مئی 1959ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے گیت

☆ دل چیر کے بنالیا چھاب
☆ ہائے پیاریا اوئے میری جگنی

زبان زد عام ہوئے۔ اسی سال ان کی ایک فلم ''پردیس'' کے گیت بھی شاہکار ثابت ہوئے اور فلم ''سچے موتی'' کے مقبول گیت بھی لکھے۔

اب شروع ہوتی ہے ساٹھ کی دہائی۔ اس دہائی کو اگر مکمل طور پر مصنف و نغمہ نگار حزیں قادری کی دہائی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس دہائی کے آغاز میں ہی ہدایت کار اسلم ایرانی کی فلم ''بہروپیا'' نے 12 فروری 1960ء کے دن ریلیز ہو کر چار سو کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ گورنمنٹ اسلامیہ ہائی اسکول خزانہ گیٹ لاہور کے دو ہم جماعتوں نے پاکستان فلم انڈسٹری میں دھوم مچائی ہوئی تھی کیونکہ ایک طرف فلم ''بہروپیا'' کے مصنف و نغمہ نگار حزیں

حیران کن بات

یہ بات حیران کن ہے کہ کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل طالب علم نے ایک کامیاب ترین فلمی کہانی نویس اور نغمہ نگار کا درجہ کیسے حاصل کیا۔ ایسا شخص جو طبیعتاً صوفی منش بھی رہا ہو، جس نے تمام عمر صاف ستھری زندگی بسر کی ہو، فلمی ماحول میں رہ کر بھی فلم والوں کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ پنجابی ادب و ثقافت کی ترویج و اشاعت کا کام ان کے ذریعے کروانا چاہتے تھے اس لیے ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے اور مدرسے کے طالب علم کو پاکستانی فلم انڈسٹری کا ایک اہم جزو بنایا۔ جس نے یہ ثابت کیا کہ اچھے لوگ جہاں بھی ہوں اچھا کام کرکے بندگانِ خدا کو اچھائی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔

قادری نے شہرت کے نئے زینے طے کیے تو دوسری طرف اسی فلم کے اداکار ظریف نے صدارتی ایوارڈ حاصل کرکے اپنے آپ کو ورسٹائل اداکار ثابت کیا۔

''بہروپیا'' کی بلاک بسٹرڈ کامیابی کے بعد 4 نومبر 1960ء کو ریلیز ہونے والی ایور نیو پکچرز اور ہدایت کار ایم جے رانا کی فلم ''رانی خان'' کے مصنف نغمہ نگار بھی حزیں قادری تھے۔ اس فلم نے بھی اس سال کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ پنجاب کے ساتھ ساتھ کراچی اور سندھ سرکٹ میں بھی شاندار کامیابی حاصل کی لیکن اس فلم کی نمائش سے چند روز پہلے 30 اکتوبر 1960ء کے دن صاحب طرز فنکار ظریف کی اچانک موت نے حزیں قادری کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کا اس قدر دل گرفتہ ہونا بڑا فطری تھا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ شوبز میں قدم رکھا اور ساتھ ہی اپنی صلاحیتوں سے شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ حزیں قادری کا یار عدم آباد کا باسی ہو گیا تو حزیں قادری بھی حزن و ملال سے نڈھال ہو گئے۔

ظریف کے انتقال پُر ملال کے چند روز بعد ظریف کے والد حزیں قادری کے پاس آئے تو دونوں ایک بار پھر لپٹ کر رونے لگے۔ جب ان کا جی رو کر ذرا ہلکا ہوا تو ظریف کے والد بولے۔ ''بیٹے بشیر احمد! میں تو جیتے جی مر

PakiBooks.site

گیا۔“

”نہیں چاچا جی! ایسا نہ کہیں۔ آپ کو جینا ہوگا۔ حوصلے سے کام لیجیے۔“

”کیسا حوصلہ اور کہاں کی ہمت؟ اب میرے بال بچوں کا کیا بنے گا۔ اس نے (ظریف۔۔نے) تو میری ریلوے کی ملازمت بھی چھڑوادی تھی اب......“

”چاچا جی! پریشان نہ ہوں۔ آپ کا ایک اور بیٹا ہے ناں۔“

”ارے پتر! اس کو تو بس تن سازی ہی کی دھن ہے۔ کھانے کمانے کی کوئی فکر نہیں۔“

”میں اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔“

اور حزیں قادری نے ایسا ہی کیا۔ دونوں دوستوں کی دوستی نے ان کے خاندانوں کے تعلقات بھی مثالی بنادیے تھے۔ حزیں قادری ظریف کے چھوٹے بھائی منور سے بولے اور کہا۔ ”پیارے بھائی! یہ باڈی بلڈنگ نہ تمہارے کام آئے گی نہ تمہارے گھر والوں کے۔“

”تو......تو پھر میں کیا کروں؟“

”جس طرح تمہارا بھائی تمہارے پورے گھر کی کفالت کرتا تھا اسی طرح اب تم یہ ذمہ داری پوری کرو۔“

”مگر......میں تو......“ منور نے اپنے آپ کو دیکھ کر عجیب انداز میں کہا۔

”اپنے جسم کو لچکدار بناؤ، باڈی بلڈنگ کے شوق کو پس پشت ڈالو اور اداکاری کے میدان میں کود پڑو۔“

”اداکاری اور میں......!! نہیں بھائی جان! یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”ہر کام، ہر آدمی کرسکتا ہے۔“ حزیں قادری بولے۔ ”بشرطیکہ لگن سے، دلچسپی سے محنت سے کرے۔ مجھے دیکھو میں مدرسے کا ایک مولوی، جب تمہارے بھائی کے کہنے پر فلم انڈسٹری کا حصہ بن سکتا ہوں تو تم کیوں نہیں؟“

قصہ مختصر یہ کہ حزیں قادری نے ظریف مرحوم کے چھوٹے بھائی منور کو سمجھا بجھا کر ظریف کے نقش قدم پر چلنے پر مجبور کردیا۔ یوں پاکستان فلم انڈسٹری کو منور ظریف جیسا نگینہ ملا جس کی چمک آج تک پاکستانی فلم بینوں کے دل و دماغ پر ماند نہیں پڑی ہے۔ اس کے دنیائے فانی کو چھوڑ کر جانے کے باوجود وہ آج بھی لاکھوں دلوں پر راج کررہا ہے۔

”چوہدری“ منور ظریف کی پہلی فلم تھی جس میں منور ظریف کے ساتھ نغمہ بیگم کو بھی متعارف کرایا گیا تھا جب کہ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم میں حزیں قادری نے بھی اداکاری کرکے اپنی ایک اور خوبی کا مظاہرہ کیا تھا۔

سلطان کھوسٹ جنہیں اسٹار میکر کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا جو صبیحہ خانم کے بھی استاد تھے اور دیگر لوگوں کو بھی ان کی جوہر شناس نگاہوں نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اکثر حزیں قادری سے کہتے۔ ”پتر! تو اداکاری کیوں نہیں کرتا؟“

”تایا جی! میں اب کیا اداکاری کروں؟“

”ارے پتر! تجھ میں یہ صلاحیت ہے تو اس کا مظاہرہ کرنا چاہیے ناں۔“

اور جب فلم ”چوہدری“ میں حزیں قادری کو ایک کردار کرنے پر مجبور کیا گیا تو انہوں نے پنجاب کی روایتی پگ باندھ کر سلطان کھوسٹ کو اپنا استاد بنایا تب اداکاری کی۔ یہ تھی اس دور کے لوگوں کی رسم و رواج اور بڑوں کی محبت اور تکریم۔ جسے اب لوگ فراموش کرچکے ہیں۔

”چوہدری“ ہدایت کار حیدر چوہدری کی پنجابی فلم تھی جو 15 مئی 1962ء کو عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہوئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی لیکن اس فلم سے پہلے 27 دسمبر 1961ء کو ہدایت کار اسلم ایرانی کی شہرۂ آفاق فلم ”مفت بر“ کے سپرہٹ نغمات لکھ کر حزیں قادری نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اس فلم کے مشہور گیت

☆ میں تے منگدی شالا تیری خیر

☆ وے ناداناں گلی چھڈ کے نہ جائیں

☆ اج میں نچنا ساری رات

☆ میرا پیار کرن نوں جی کردا

آج بھی مقبول ہیں۔

1963ء میں مصنف و نغمہ نگار کی حیثیت سے حزیں قادری کی جو فلمیں پیش کی گئیں ان میں ہدایت کار اسلم ایرانی کی فلم ”موج میلہ“ اور ”چاچا خوامخواہ“ شامل ہیں۔

”موج میلہ“ کے گیت

☆ دس میارے ماہی کیا جیا ہووے

☆ کلی میں دی کچ نیں کلاتوں دی کچ نین

☆ تیراں ناں اسیں باں تے لکھ لیا

☆ تیرے دل وچ چناں میری تھاں

☆ رہا کی سوچ کے بنایا ای دل ماں دا

پاکستانی فلم انڈسٹری کی موسیقی میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

1964ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”ہتھ جوڑی“ اور ”ڈاچی“ نے باکس آفس پر دھوم مچادی جب کہ 1965ء میں چوہدری فلمز کی ”ملنگی“ نے پاکستان فلم انڈسٹری میں کلاسک کا درجہ حاصل کیا۔ 1965ء ہی میں حزیں قادری کے استاد اور ان کے غم خوار سلطان کھوسٹ بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کرگئے۔ حزیں قادری اس سانحے پر بھی بہت غم زدہ ہوئے۔

نئی نسل کے قارئین کو یہ بتانا ضروری ہے کہ سلطان کھوسٹ آخر تھے کون؟

تو اطلاعاً عرض ہے کہ ابھی کچھ روز پہلے ہمارے ہاں ایک فلم بنی تھی جس میں اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا کردار ایک اداکار سرمد کھوسٹ۔ نے ادا کیا تھا۔ یہ سرمد کھوسٹ ورسٹائل فنکار عرفان کھوسٹ کے فرزند ارجمند ہیں۔ وہی عرفان کھوسٹ جنہوں نے ڈراما سیریل ”اندھیرا اجالا“ میں ڈائرکٹ حوالدار کا مشہور کردار ادا کر کے اپنی منفرد شناخت بنائی تھی۔ ہمارے یہ ڈائرکٹ حوالدار یعنی عرفان کھوسٹ صاحب سلطان کھوسٹ کے صاحبزادے ہیں۔ یعنی سرمد کھوسٹ کے دادا، ابو...... تین نسلوں سے یہ خاندان فن اداکاری کی آبیاری کررہا ہے۔

ہاں ذکر ”ملنگی“ اور ”ڈاچی“ کا ہو رہا تھا۔ ”ڈاچی“ کے گیتوں کی ایک جھلک دیکھیے۔

☆ اوہ بلے بلے وی چور ساڈے ویہڑے پے گیا

☆ تانگے والا خیر منگدا

☆ پانہہ پھڑ لے توڑ دے گجرا

☆ تینوں کہندی ساں کہ ناں

یہ گیت بہت مقبول ہوئے۔ جو آج بھی شوق سے سنے جاتے ہیں۔

دوسری طرف چوہدری فلمز کی دوسری فلم ”ملنگی“ نے بھی حزیں قادری کی شہرت میں چار چاند لگائے۔

☆ ماہی وے سانوں بھل نہ جاویں

☆ جی اوڈھولا نت کی انجواں دی اج مالا

آج تک تروتازہ ہیں۔ حزیں قادری کے یہ ”ایسے دیگر گیتوں نے پنجابی فلموں کی آن بان اور شان میں جو اضافہ کیا اسے پنجابی فلموں کی تاریخ بھی فراموش نہیں کرے گی۔ حزیں قادری کا نام ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ انہیں پنجابی نغموں کی شہرت اور مقبولیت کو آسمان تک لے جانے والے مؤجد کے نام سے پکارا جائے گا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے کہ حزیں قادری کے پائے کا فلمی نغمہ نگار جس نے پنجابی گیتوں کو ایک نیا ایک دلفریب رنگ دیا اور سماعت کے راستے دل میں اتر جانے والا بنایا۔ ان کی خوبیاں اور کامیابیاں بے شمار ہیں۔ فلم ”پیدا گیر“ کا حوالہ دوں یا فلم ”بھریا میلہ“ کا تذکرہ کروں، فلم ابا جی، گوانڈی اور بانکی نار کے بارے میں لکھوں یا ”ان پڑھ“ اور فلم ”گونگا“ کو زیر بحث لاؤں۔

1968ء میں اس عہد ساز شخصیت نے مصنف و نغمہ نگار کی حیثیت سے جو فلمیں پیش کیں ان میں اک سی ماں، پاؤ جی، میدان، جوانی مستانی، جگ بیتی، چالباز، روٹی اور چن مکھناں شامل ہیں فلم پاؤ جی کے یہ گیت

☆ دل دیاں لگیاں جانے نہ

☆ اے دربار نجی دا

☆ پیار نالوں پیارے سجناں

☆ شالا وسیں دلاں دے کول

اس قدر مقبول ہوئے کہ فلم بین آج بھی ان کو فراموش نہیں کرسکے۔ اس دور میں حزیں قادری کی بدولت پنجابی فلموں اور پنجابی رومانوی گیتوں کا جادو ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ ایم اکرم ایورنیو پکچرز اور اسلم ایرانی کے ساتھ ساتھ بھٹی برادران کے لیے بھی حزیں قادری کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ وہ انہیں اپنی فلموں کی پکی کامیابی کی ضمانت سمجھتے تھے۔ بھٹی پکچرز کی فلم ”چن مکھناں“ کے گیت

☆ چن میرے مکھناں تے ہس کے اک پل ادھر تکنا

☆ بندہ جے کر پیار کرے تے

☆ تیرے جئے پت جمن ماواں

☆ بھل گئی میں بھل گئی ہو

آج بھی موسیقی میں حسن ظن رکھنے والوں کے دلوں کو مسرور کرتے ہیں۔ اس فلم نے 9 فروری 1968ء کے دن ریلیز ہوکر کامیابی کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔

1969ء وہ سال ہے جس میں پیش کی جانے والی مصنف و نغمہ نگار حزیں قادری کی 22 فلموں نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔ ان کی اس سال کی کارکردگی کی بنا پر بلاشبہ ان کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں لکھے جانے کے قابل ہے کیونکہ برصغیر ہی نہیں دنیائے فلم میں آج تک کسی مصنف و نغمہ نگار نے ایک سال میں 22 فلمیں تخلیق نہیں کیں جو سپرڈپرہٹ بھی ثابت ہوئی ہوں۔ دور دور تک پنجاب کے اس محسن کا کوئی مقابل نہیں۔

PakiBooks.site

پاکستان کی شان اور فلم انڈسٹری کی آن حزیں قادری کی اس سال ان 22 فلموں میں سے 18 فلمیں بحیثیت مصنف و نغمہ نگار جب کہ 4 فلموں کے نغمہ نگار تھے۔

1969ء میں حزیں قادری کی 22 فلموں میں سب سے پہلی فلم ''اوکھا جٹ'' تھی جس میں مرکزی کردار ساون نے ادا کیا تھا۔ 14 فروری 1969ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کا ایک گیت

☆ تینوں تکدی نہ رجاں
☆ اے گل کوئی جھوٹ تے نہیں
☆ تیرا وال وِنگا نہ ہووے
☆ تیری آئی میں مر جاواں

بھی بے مثال رہے۔ ''اوکھا جٹ'' کے علاوہ ان فلموں میں سودن چوردا، چن ویر، بھائیاں دی جوڑی، چند جان، عشق نہ پچھے ذات، تیرے عشق نچایا، کوچوان، زن مرید، سجن پیارا، گجر دا ایت اور پہلا جٹ شامل ہیں۔ جب کہ فلم جگو، پیار دا پلہ، وریام، پھمی، قول قرار، ویر پیارا، کونج وچھڑ گئی، شیراں دی جوڑی اور مکھڑا چن ورگا کے گیت لکھے ساٹھ کی دہائی میں مکمل طور پر راج کرنے والے حزیں قادری ستر کی دہائی میں بھی بھرپور طور پر چھائے رہے برصغیر میں پاکستانی پنجابی فلموں کا ڈنکا بجانے والے حزیں قادری برصغیر کے کامیاب ترین مصنف و نغمہ نگار بن چکے تھے۔

یہ بات شاید کچھ لوگوں کو معلوم نہیں کہ اپنی طرز کے اس انمول رائٹر نے فلموں سے کمائی ہوئی دولت سے فلم بھی بنائی۔ یعنی فلم سے کمایا ہوا پیسا فلم سازی میں لگا دی۔ ''سجناں دور دیا'' کے نام سے انہوں نے ذاتی فلم بنائی۔ یہ فلم 17 فروری 1970ء کو ریلیز ہوئی اور اس نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی جب کہ اس کے تمام گیتوں نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس فلم کے مقبول گیت

☆ گھڑی پل کول بہہ کے
☆ سجناں دور دیا اج توں نہیں دیس دا
☆ لاموڑے نال موڑا پانی لگنے آں
☆ ہائے نی ماں زورا زوری دا اپنا
☆ تیرے سکھ توں دکھ وفا کے

آج بھی سماعت میں شہد ٹپکاتے ہیں۔

1970ء ہی کے مئی کے مہینے میں ''چن سجناں'' اور دسمبر میں چڑھدا سورج، دنیا مطلب دی ریلیز ہوئیں۔ بھٹی برادران کی فلم ''دنیا مطلب دی'' کے گیت

☆ دنیا مطلب دی او یار
☆ اج دی رات نہیں مڑ کے آنی
☆ توں اج نہیں کول میرے

بے حد مقبول ہوئے اور آج تک کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

1971ء میں ''مستانہ ماہی'' جیسی شاہکار فلم بھی حزیں قادری کے زورِ قلم کا ثبوت ہے۔ یہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید مراد کی ذاتی پروڈکشن کی پنجابی فلم تھی۔ وحید مراد نے پنجابی فلموں کی کامیابی کو دیکھ کر خود بھی پنجابی فلم بنانے کا ارادہ کیا تو اس کام کے لیے نامور ہدایت کار افتخار خان کو سائن کیا۔

''اب بتائیے اس کی کہانی اور گانے وغیرہ آپ کس سے لکھوائیں گے؟'' فلم ساز وحید مراد نے ہدایت کار افتخار خان سے پوچھا۔

''حزیں قادری سے۔''

''تو پھر چلیے ان سے بات کرتے ہیں۔''

اور دونوں حزیں قادری کے پاس پہنچ گئے۔ ''قادری صاحب! یہ وحید مراد ہیں۔''

''ارے بھئی! انہیں کون نہیں جانتا۔''

''شکریہ!'' وحید مراد نے کہا۔ ''میں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ میں ایک پنجابی فلم بنانا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ سے اس کی کہانی اور گیت لکھواؤں۔''

''لکھ دوں گا۔'' حزیں قادری بولے۔ ''مگر یہ تو بتائیے، آپ کو کتنے ہفتوں والی فلم چاہیے؟''

وحید مراد جو اچھے اداکار ہی نہیں تجربہ کار فلم ساز بھی تھے۔ حزیں قادری کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے حیرانگی سے اپنے ہدایت کار کو دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ گارنٹی کوئی کیسے دے سکتا ہے؟''

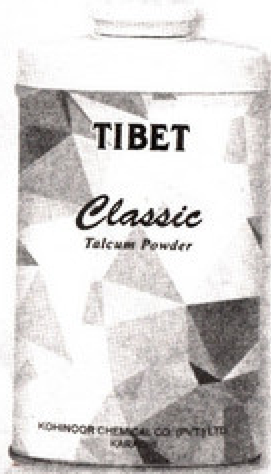
ہدایت کار افتخار خان نے ان سے کہا۔ ''وحید صاحب! اس معاملے میں یہ جادوگر ہیں۔ آپ اپنا ارادہ اور بجٹ بتائیں۔''

''آپ کے معاوضے کے حساب سے بجٹ تو میرے پاس سلور جوبلی کا ہے لیکن آپ گولڈن جوبلی فلم لکھیں بقیہ ادائیگی آپ کو بعد میں کردی جائے گی۔''

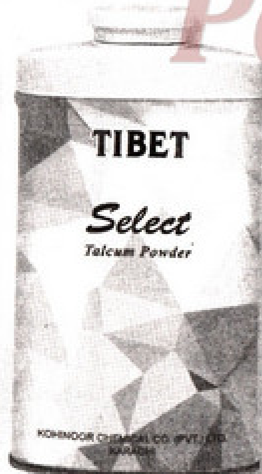


تِبت
ٹالکم پاؤڈر

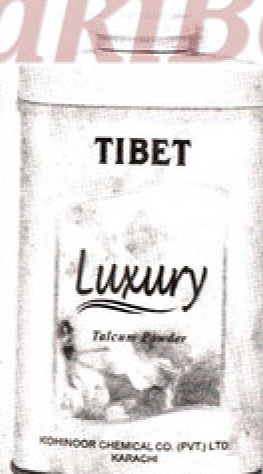
اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسک



سلیکٹ



لگژری

تِبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام مہکے مہکائے

TTP/20/2K1

PakiBooks.Site

حزیں قادری نے گولڈن جوبلی فلم لکھنے والا قلم اٹھایا اور بیٹھ گئے مستانہ ماہی لکھنے۔ یہ فلم بنی اور 24 نومبر 1971ء کو نمائش پذیر ہوئی اور اس نے ثابت کردیا کہ اللہ رب العزت نے حزیں قادری کو یہ اہمیت عطا کی ہے کہ وہ فلم سازوں کی ڈیمانڈ کے مطابق ان کی فلم کی کہانی اور گیت لکھتے ہیں۔

اللہ انہیں غریق رحمت کرے ایسے نابغۂ روزگار رائٹر صدیوں بعد، کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیائے فلم کے واحد مصنف ہیں جو فلم لکھنے سے پہلے بتا سکتے تھے کہ یہ فلم کامیاب ہوگی یا ناکام، یہ سلور جوبلی ہوگی یا گولڈن جوبلی۔ تین رنگ کے قلم حزیں قادری اپنے پاس رکھتے تھے۔ ایک عام فلم کے لیے، ایک سلور جوبلی کے لیے اور ایک گولڈ جوبلی یا اس سے زیادہ ہفتوں کے لیے۔ وہ پہلے پوچھتے۔ ''کس معیار کی فلم لکھوانی ہے؟''

اور پھر فلم ساز جس معیار کی فلم بتاتا اس کے حساب سے اپنا معاوضہ بتاتے اور پھر اسی کے حساب سے اپنا مخصوص قلم اٹھا کر لکھنا شروع کردیتے۔

''مستانہ ماہی'' کا نام سنتے ہی ذہن میں اس کا شہرۂ آفاق نغمہ ''سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آگیا'' گونجنے لگتا ہے۔ اس گیت کا طلسماتی حسن آج بھی روزِ اوّل کی طرح قائم و دائم ہے۔ اس کے دیگر گیتوں کی بھی جھلک دیکھیے

☆ اناں پھل کلیاں دی محفل وچ

☆ ہوگئی محبت ضروری

☆ بولن لگ پئی اے تصویر

نے بھی سننے والوں کو اپنے سحر میں گرفتار کیا۔

وحید مراد کی اس پنجابی فلم نے ان کی کامیاب اردو فلموں جیسی کامیابی حاصل کی۔ وحید مراد کہتے تھے۔

''کاش کہ ایسے جادوگر رائٹر سے میں پہلے ملا ہوتا اور ان کے عظیم فن سے فیض یاب ہوا ہوتا۔''

''مستانہ ماہی'' کے بعد حزیں قادری نے جن فلموں کی کہانی ، گانے اور اسکرین پلے تحریر کیے ان میں مشرقی ماں، بدنالوں بدنام برا، سورج، پیار دے پلیکھے ، رب راکھا، بابا دینا، ہرفن مولا، عشق دیوانا، تجن دشمن، خون پسینا، تجن بے پروا ،سلطان، سردھڑ دی بازی، خون دا دریا، چار خون دے پیاسے، جھلی، غیرت، خبردار، اج دا مہینوال اور چن تارے کے علاوہ پاکستان فلم انڈسٹری کی کلاسک پنجابی فلم ''جیرا بلیڈ'' اور ''ضدی'' شامل ہیں۔ فلم ''سلطان'' کا نغمہ ''دلدار صدقے لکھ وار صدقے'' کوئی کیسے بھلا سکتا ہے۔ تاریخ ساز شخصیت کے مالک حزیں قادری کی یہ دو فلمیں تاریخ کے اوراق پر سنہری حروف میں جگمگا رہی ہیں۔

شہرۂ آفاق فلم جیرا بلیڈ میں حزیں قادری نے منور ظریف کے لیے ہلکے پھلکے مزاج سے بھرپور مکالمے تحریر کیے۔

بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ منور ظریف کو زیرو سے ہیرو بنانے والوں میں سرفہرست حزیں قادری کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن کے دوست محمد صدیق (ظریف) کے بعد اس کے چھوٹے بھائی کو نہ صرف اپنے بل بوتے پر فلم انڈسٹری میں انٹر کروایا بلکہ اسے تراش خراش کر کے کوہِ نور بنا دیا۔

حزیں قادری نے جیرا بلیڈ کے علاوہ بھی کئی فلموں میں ایسے برجستہ مکالمے لکھے جو زبان زد عام ہوئے۔ ان میں کچھ نمونتاً پیش خدمت ہیں۔

☆ جھوٹا عکس

☆ لکھ گئیں ریا مرا

☆ میں تیر کھا جاں تے ڈکار نہ ماراں

☆ میں جتھے پیر رکھاں اوتھے بھونچال آجائے

☆ میں کشت کٹ کے آیا واں تے نشٹ ماردیاں گا

☆ آفرین ہے

☆ اساں دے گل کیتی اے کلیئر کٹ

ہدایت کار اقبال کشمیری کی فلم ''ضدی'' اور اس کے گیتوں نے بھی بے مثال کامیابی حاصل کی اور تماشائیوں کے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ اس فلم کے گیت

☆ تیرے نال نال وے میں رہنا

☆ وے چھڈ میری ونی نہ مروڑ

نے فلم بینوں کے دل جیت لیے۔ ان گیتوں کی بدولت یہ فلم بار بار دیکھی گئی۔

ستر کی دہائی میں کامیابیوں کی یہ داستان یار مستانے، عشق میرا ناں، طوطا چشم، ماں دا لال، ہاشم خان، تجن کملا، اصلی تے نقلی، پلیکھا، شریف بدمعاش، جانو کپتی، ماں صدقے، حکم دا غلام، غیرت، کل کل میرا ناں، سہرے آؤ سہرے لے جاؤ، دلدادہ صدقے، کون شریف کون بدمعاش، رنگا ڈاکو، غازی علم دین شہید، دوستی تے دشمنی، بہت دا کھڑاک، خانہ جنگی، قسم خون دی، غیر حاضر، لوٹاں نوں سلام، سنگین جرم، وقت دا بادشاہ، دادا پوتا، گل دے منڈے، انجام، اکھ لڑی بد ویدی، بدتمیز، شیراں تے ہیرا، یارانہ، ٹرک ڈرائیور، قاتل تے اسمگلر، کرفیو آرڈر، سنتری بادشاہ، عزت دی موت، تخت یا تختہ اور وحشی گجر کی شکل میں جگمگا رہی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ حزیں قادری نے اس قدر کثرت کے ساتھ فلموں کی کہانیاں اور نغمات لکھنے کے باوجود معیار کا خیال رکھا۔ کہیں بھی اور کسی صورت میں بھی اپنے معیار سے کمتر چیز پیش نہیں کی۔ ہمارے ہاں ابتداء ہی سے چربہ فلمیں لکھائی گئیں۔ بنائی گئیں اور دانستہ یا نادانستہ چند ایک کے علاوہ سب نے ہی اپنے ہاتھ رنگے مگر آفرین ہے حزیں قادری پر کہ انہوں نے ایک لفظ بھی کبھی چربہ نہیں لکھا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ چربہ سازی سے آشنا ہی نہیں تھے جب کہ کہانی اور گیت لکھنے کے معاملے میں مقدار اور معیار کی ایسی مثال برصغیر ہی میں نہیں دنیائے فلم میں نہیں مل سکتی۔

2 دسمبر 1980ء کے دن حزیں قادری پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس علالت کے باوجود 80ء کی دہائی میں انہوں نے حیران کن طور پر شاہکار گیت لکھے۔ وہ کہتے تھے۔ ''مجھے اسٹوڈیو جانے سے نہ روکا جائے ورنہ میں جیتے جی مرجاؤں گا۔'' 80ء کی دہائی میں حزیں قادری نے زیادہ تر فلموں کے گیت لکھے۔ ایسی فلموں میں چٹان، طوفان، دہشت خان، مرزا، جٹون اور رانجھا اور سرکاری آرڈر قابل ذکر ہیں۔

قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ''مولا جٹ'' کی فقید المثال کامیابی کے باوجود اس کے فلم ساز محمد سرور بھٹی اس فلم کے گیتوں سے مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی اگلی فلم ''چن وریام'' کے گیت حزیں قادری سے لکھوائے۔ اس فلم کے ایک گیت نے بڑی شہرت حاصل کی۔

☆ وے سونے دیا کنگنا

اس گیت کی بھی ایک کہانی ہے جو سننے کے قابل ہے۔ موسیقار وجاہت عطرے جو ''چن وریام'' کی موسیقی ترتیب دے رہے تھے۔ ان کے گھر بیٹا پیدا ہوا تو خوشی کے عالم میں حزیں قادری کو بتانے لگے۔

''قادری صاحب! آپ کی دعاؤں سے ہمارے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔''

''مبارک ہو۔ اللہ نصیب اچھا کرے۔''

''قادری صاحب! منے کے بال بالکل سونے جیسے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



ماہِ ستمبر

کے شمارے

کی ایک جھلک

سیلون کا سورج

شہر خوف و دہشت کے ہاتھوں یرغمال بن چکا تھا۔ سنسنی، دہشت اور خون میں ڈوبی داستان......

امجد رئیس کے قلم کا جادو......

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا

طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہردم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت......

عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

ازدواجی زندگی کی الجھنوں میں گھرے جوڑے کی تیکھی کہانی

زندگی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر گرتے پڑتے جو تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہوسکتا......اسی تجربے کا دلچسپ نچوڑ......

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں...

شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

PakiBooks.Site

ہیں۔“

یہ سن کر قادری صاحب بھی موڈ میں آگئے اور وجاہت عطرے سے بولے۔ ”تو پھر چھیڑو سر اور ساتھ دو میرا۔“ اور شعر گویا سانچے میں ڈھل کر سامنے آنے لگے۔

وے سونے دیا کنگنا سودا اکو جیا اور یوں ایک شاہکار گیت چند لمحوں میں وجود میں آگیا۔ ”چن وریام“ کے دیگر گیتوں نے بھی فلم بینوں کو مسرور کیا جن میں

☆ سن سن بھالی ڈھول پیا وچھدا
☆ رلی وے رلی پھدی اے کملی

شامل ہیں۔ 80 کی دہائی میں ان کی لکھی ہوئی ایک اور فلم ”بالا گاڈی“ بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس کے علاوہ تیری میری اک مرضی، ففٹی ففٹی اور عشق نچائے گلی گلی جیسی شاہکار فلم کے گیت لکھے۔ ”عشق نچائے گلی گلی“ میں چند گیت کمال احمد کے بھی لکھے ہوئے ہیں لیکن فلم کا ٹائٹل سونگ کے علاوہ

☆ عشق نچائے گلی گلی
☆ ساڈے ٹٹ گئے پیار پرانے
☆ تینوں لکھاں ہون مبارکاں
☆ یار منگیا سی رباتیتھوں رو کے

حزیں قادری کے افکار ہیں۔

اس فلم کے علاوہ ان دنوں حزیں قادری نے ماما سارے شہر دا، پتر شیراں دے، سلسلہ، دو قیدی، دلاور خان، پتر شاہے دا اور لالو کے تمام گیت اور ظلم دا سورج کے چند گیت لکھے۔

1990ء میں ”قدرت دا انتقام“ اور ”مکھن گجر“ کے چند گیت لکھے۔ اس برس حزیں قادری کو بہت مشکل حالات سے گزرنا پڑا وہ شدید علالت کے کرب سے گزرے، بیماری کی حالت میں ہی 1990ء تمام ہوا۔ ان دنوں وہ خود کلامی کے عالم میں اکثر اپنے بچپن کے دوست محمد صدیق اور اپنے استاد گرامی سلطان کھوسٹ کو مخاطب کر کے کہتے۔ ”میں آرہا ہوں تم لوگوں سے ملنے، تم لوگوں کے پاس۔“

اور ایک دن وہ واقعی ان کے پاس چلے گئے۔ یہ دن 19 مارچ 1991ء کا تھا۔ اس روز پاکستان فلم انڈسٹری کا آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا۔ ایک ایسا فلم نویس اور نغمہ نگار جس نے اپنی خداداد فنی صلاحیتوں سے پاکستانی فلموں کو ایک نیا رنگ ایک نیا آہنگ دیا۔ فلمی تاریخ میں اپنی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ برصغیر پاک و ہند کے رائٹرز کی صف اوّل میں اپنے لیے ممتاز مقام بنایا۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے

”بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا“

پاکستانی فلمی صنعت کے وہ ایسے دیدہ ور تھے جنہوں نے پنجابی ادب اور آرٹ کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا۔ پنجابی فلموں اور پنجابی گیتوں کو شہرت اور مقبولیت کے بام عروج تک لے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمتیں اور مہربانیاں ہمیشہ ان پر سایہ فگن رہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ وہ ایک بہت معمولی پڑھے لکھے انسان تھے مگر رب العزت نے انہیں زبردست فنی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں۔ زود نویسی ہو یا بدیہہ گوئی ہو، اس فن میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔

موسیقار نذیر علی اور ہدایت کار افتخار خان کے ساتھ ہوائی جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ منزل سہون شریف تھی۔ لال قلندرؒ کا خیال آیا تو وہیں بیٹھے بیٹھے لکھا۔

☆ شہباز کرے پرواز تے جانیں حال دلاں دے۔ جیوندے رہے لال قلندر تے آن ملاں گے

اس طرح ایک بار ٹرین میں سہون شریف جاتے ہوئے لکھا۔

☆ اسیں آن قلندر دیوانے لجپال دے۔ علی دے گھرانے تے محمدؐ دی آل دے۔

پاکپتن شریف گئے تو لکھا۔

☆ پاک پتن تے آن کھلوتی بیڑی میری بنے لا

جب امام بری سرکار گئے تو لکھا

☆ بری بری امام بری

باہو سرکار گئے تو لکھا

☆ حق باہو بے شک باہو اک نظر کرم دی

بزرگان دین سے ان کی یہ محبت اور عقیدت بہت گہری تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت ایک دینی مدرسے میں ہوئی تھی۔

حزیں قادری ایک اچھے قلم کار ہی نہیں تھے بہت اچھے انسان بھی تھے۔ سب سے محبت کرنے والے۔ سب کے دکھ سکھ میں کام آنے والے۔ نامور نغمہ نگار تنویر نقوی کے انتقال پُرملال کے فوری بعد وہ ان فلم سازوں کے پاس گئے جن پر تنویر نقوی کے واجبات تھے لیکن دنیا کے دستور نرالے دیکھ کر وہ بہت دلبرداشتہ ہوئے اور یہ شعر لکھا

فاقیاں داز ہر شاعر کدوں تک کھان گے
کدوں تک سانوں چندے نال دفنان گے

حزیں قادری نے دو شادیاں کی تھیں۔ جن سے ان کے 15 بچے ہیں۔ جن میں گیارہ بیٹیاں ہیں۔ ان سب سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ سب کو یہی لگتا تھا جیسے وہ سب سے زیادہ اسے ہی پیار کرتے ہیں۔

☆ دھیان تے تن پرایا وے بابلا

بھی شاید انہوں نے اپنی بیٹیوں کی محبت ہی میں لکھا تھا۔

ان کی بیٹیوں میں ایک بیٹی عاصمہ قادری اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر چل رہی ہیں اور فلم ”جگ بیتی“ کاری میک بنانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ عاصمہ نے نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ اپنے والد مرحوم کے مشن کو آگے بڑھانے کا عزم و ارادہ رکھتی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے ادارہ ”پنجابی پرچار“ نے عاصمہ قادری کو ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔ یہ ایوارڈ انہیں جناب عرفان کھوسٹ کے ہاتھوں سے دلوایا گیا تھا۔

حزیں قادری مرحوم کے بچے بھی ان کی طرح سچے، کھرے اور خوددار ہیں اور اصل پنجاب کی پہچان ہیں۔

گزشتہ دنوں عاصمہ قادری اور ان کے بھائی انعام قادری نے اپنے والد گرامی کی یاد میں ان کی برسی کی ایک یادگار تقریب منعقد کی جس میں عرفان کھوسٹ، سرمد سلطان کھوسٹ، محمد پرویز کلیم، نغمہ بیگم، بہار بیگم، عارف لوہار، رابعہ حسن، چوہدری کامران اور فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے فنکاروں اور ہنرمندوں نے بھرپور شرکت کی۔

میری یہ تحریر میرے چاہنے والے ان قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے جن کی فرمائش تھی کہ میں فلم رائٹرز کے بارے میں بھی لکھوں۔ لیجیے حزیں قادری جیسے نابغۂ روزگار مصنف و نغمہ نگار کے بارے میں یہ تفصیلی تحریر حاضر خدمت ہے۔ حزیں قادری ان فلمی شخصیات میں تھے جو زندگی بھر اپنی نمود و نمائش سے گریزاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ان پر بہت کم لکھا گیا۔ اگرچہ وہ ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ ان پر جتنا لکھا جاتا کم تھا۔ انہیں اپنے بارے میں اخبارات میں چھپوانے سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی جس کا ایک منفی پہلو ان کے بعد یہ سامنے آیا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے گیت آج دوسروں کے نام سے پیش کیے جانے لگے ہیں۔ یہ انتہائی افسوسناک بات ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے جس کی روک تھام کے لیے مرحوم کے صاحبزادے انعام قادری اپنے والد گرامی کے تمام گیتوں اور فلموں کے اسکرپٹس کو ایک جگہ جمع کر کے محفوظ کرنا چاہتے ہیں جو ایک دستاویز کی شکل میں دستیاب ہوں گے اور جس کے حوالے سے پنجابی زبان اور فلم کے طالب علم فائدہ اٹھا سکیں گے۔ ان کے لیے یہ ایک گراں قدر دستاویزی نعمت قرار دیا جائے گا۔

وہ بات جس سے اس تحریر کی ابتداء کی تھی کہ اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ اس کا ثبوت اس تحریر کے مطالعے سے آپ کو بخوبی ہوگیا ہوگا۔ ایک ایسے شخص جس کی دنیاوی تعلیم ساتویں جماعت تک محدود تھی جس نے ایک مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کا فلم انڈسٹری ... قدم رکھنا کچھ کم حیران کن بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے کسی استاد یا کسی رہنما کی سرپرستی کے بغیر دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف فلمی نغمہ نگاری میں اپنا لوہا منوا لیا بلکہ فلمی کہانی نویس کی حیثیت سے بھی بے مثال کامیابی حاصل کی۔ اس موقع پر ان کے بزرگوں اور استاد کی دور اندیشی کی بھی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی جنہوں نے ایک چھٹی جماعت کے طالب علم کو دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ تم ایک دن بڑی ترقی کرو گے۔ بڑے آدمی بنو گے۔

حزیں قادری نے جس دور میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا تھا، اس وقت بھی وہاں بڑے اور جید قسم کے فلمی کہانی نویس اور گیت نگار تھے اور ان کے عروج کے زمانے میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جب کہ ان کے جانے کے بعد بھی اچھے مصنفوں اور نغمہ نگاروں کی کمی نہیں ہے مگر اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ حزیں قادری نے جو فلمی کہانیاں لکھیں، جو فلمی گیت تخلیق کیے کسی دور میں بھی ان سے بڑھ کر کسی نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ وہ کل بھی اپنی مثال آپ تھے اور آج بھی ان کی برابری کرنے والا کوئی نہیں۔ انہوں نے اپنی فلموں کے ذریعے جو پنجابی زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ انہیں تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گی۔ اس دنیا کی طرح اس دنیا میں بھی رب رحیم و کریم انہیں سربلند رکھے، آمین!

PakiBooks.Site

بے چین روح

وسیم بن اشرف

اس کی زندگی مد و جزر بھری تھی۔ اس کے والد کا سایہ اس کے بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا تھا اور ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ اس کے بھائی بہن تو تھے ہی، سوتیلے باپ کے بچے بھی گھر میں آگئے، سگے اور سوتیلے بھائی بہنوں کے درمیان وہ پل بڑھ رہی تھی۔ شاید اسی لیے اس کے ذہن و دل میں ایک کشمکش ہمہ وقت جاری رہتی۔ اسی ذہنی الجھاؤ سے آزادی کی خاطر اس نے قلم سے دوستی کرلی۔ اس کی تحریریں قارئین کے سامنے آئیں تو لوگ چونک اٹھے۔ عالمی طور پر اس کی اک پہچان بن گئی۔

ایک برطانوی ادیبہ کی کانٹوں بھری زندگی کا احوال

25 جنوری 1882ء کو لندن میں ہونے والا دھماکا اس قدر زوردار تھا کہ متعدد افراد ہلاک وزخمی ہوئے، قرب و جوار کی عمارتوں کے شیشے چکنا چور ہوگئے، متعدد گھروں کے شیڈ گر گئے۔

ہر طرف آہ وبکا، چیخ وپکار سے فضاء افسردہ تھی، قیامت صغریٰ کا منظر تھا، لوگوں نے کہا کہ لندن کو موت کے فرشتے نے گھیر رکھا ہے۔

آگ اور بارود سے بوجھل ان لمحات میں ایک ایسے وقت میں جب لندن کی گلیوں سے جنازے اٹھ رہے تھے۔ آہ وبکا سے ماحول نمناک تھا۔ اس نے جنم لیا۔

وہ پیدا ہوئی تب امریکا کے شہرۂ آفاق شاعر جیمز رسل لندن میں بطور سفیر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، بچی کے والد اور جیمز رسل میں گہرا یارانہ تھا۔ بچی کی پیدائش پر رسل نے چند اشعار لکھے، ان اشعار میں اس نے اس اُمید کا اظہار کیا تھا کہ دھماکے کے وقت پیدا ہونے والی یہ بچی اپنے باپ کی ذہانت اور ماں کی خوبصورتی ورثے میں پائے گی، شاید یہ اس عظیم شاعر کی محبت کا اظہار تھا یا کہ پیش گوئی یا پھر اسے الہام ہوا تھا کہ بچی بالکل ویسی ہی نکلی جس کا اظہار اس نے اپنے اشعار میں کیا تھا۔

اس کی تعلیم وتربیت کے لیے گھر کو ہی درس گاہ بنا دیا گیا، وہ بچپن سے ہی ذہین وفطین تھی، کسی مدبر کی طرح دکھائی دیتی تھی، اس کا خاندان انگریزی ادب میں ایک مقام رکھتا تھا، اس احساس کا شعور اور غرور اس ننھی بچی کے چہرے پر بچپن سے ہی نظر آنے لگا تھا۔ اس کے سوتیلے دادا ولیم تھیکرے کا نام انگلش ناول نگاری کے آسمان پر اپنی الگ ہی چمک دمک رکھتا تھا، علم وادب اس کے گھرانے کی پہچان تھی، ڈاروِن اس کے رشتہ دار تھے، والد "کارل مل" میگزین اور قومی سوانح عمری کی ڈکشنری کے ایڈیٹر تھے، ان کے علم وادب کی بلند وبالا شخصیات رسکن، میرڈتھ، ہارڈی اور اولیور سے نہایت قریبی مراسم تھے۔

گھر میں اس کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا تو اسے یونانی ادب سے روشناس کرانے پر خصوصی توجہ مبذول کی گئی۔ اس کا بچپن یادگار تھا، گھر میں دولت کی فراوانی تھی، ذہنی تربیت کے بہترین مواقع میسر تھے، دھیرے دھیرے ان عوامل نے اس بچی میں علمی تکبر کا احساس پیدا کردیا۔

وقت کی گاڑی رواں دواں تھی اور وہ بھی زندگی کی پٹڑی پر ماہ وسال کا سفر طے کرتی جوانی کی چوکھٹ پر قدم رکھ رہی تھی۔ اپنی ماں جولیا اسٹیفن سے خوبصورتی کا تحفہ اسے ورثے میں ملا، وہ غیر معمولی طور پر دلکش تھی، گہری سبز آنکھیں، لمبی سیدھی ناک، اونچی پیشانی، پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اس کے حسن کو دوآتشہ کردیتے، کھلم کھلا خدا کے وجود کو جھٹلانے والے اس کے مغرور اور بدمزاج باپ نے اس کے گرد ایک ایسا خول بنا دیا تھا جس سے باہر نکلنے کی اسے اجازت نہ تھی، اگرچہ ہر کام میں اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی لیکن اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہ تھی کہ وہ بیرونی دنیا سے زیادہ روابط رکھے، اس امر کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ذہنی تجسس اور تنہائی پسند ہونا اس کی شخصیت کا خاصا بنتا گیا۔

☆......☆

اس کے والدین اسٹیفن اور جولیا پہلے ہی سے شادی شدہ تھے، اسٹیفن کی شادی ولیم تھیکرے کی بیٹی سے ہوئی تھی اور جولیا کا خاوند ایک وکیل تھا، اسٹیفن کی بیوی اور جولیا کا شوہر راہیٔ عدم ہوئے تو دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے، صورتِ حال دلچسپ تھی، جولیا تین بچوں کی ماں اور اسٹیفن چار بچوں کا باپ تھا۔ بچوں میں عمروں کا فرق خاصا زیادہ تھا۔ جولیا کے شوہر ڈک ورتھ کے بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے اور اسٹیفن کے بچے ابھی کم عمر تھے۔ ورجینیا ان سب سے چھوٹی تھی۔ جہاں وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی وہاں



اسے یہ نقصان بھی اٹھانا پڑا کہ ہر کوئی اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا، اس نازک اندام نے اس بات کا خاصا اثر لیا۔

ورجینیا کی عمر اس وقت دس برس تھی جب اس کے کزن پر دماغی بیماری کا حملہ ہوا، اس کے کزن نے ورجینیا کی سوتیلی بہن اسٹیلا پر حملے کی کوششیں کیں تو اسے ذہنی امراض کے ایک ادارے میں داخل کرا دیا گیا، ورجینیا کے انکل اپنے جوان بیٹے کی حالت سے دلبرداشتہ ہوگئے، اس صدمے نے ایسا کاری وار کیا کہ وہ موت کی وادی میں جا پہنچے۔

ایڈلین ورجینیا وولف کو ابھی کئی سانحے دیکھنا تھے، ایک عام انسان کی طرح نارمل زندگی گزارنا شاید اس کے مقدر میں نہ تھا، پاگل پن اور موت کا یہ خوفناک نظارہ ابھی وہ بھلا بھی نہ پائی تھی کہ 1895ء میں اس کی ماں جولیا اسٹیفن اس فانی دنیا سے کوچ کرگئی، ورجینیا اس وقت بمشکل 13 برس کی تھی۔ زندگی اس قدر بھیانک روپ دھار لے گی یہ تو اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا، ماں کی اچانک موت نے اسے ایک مستقل صدمے سے دوچار کردیا تھا۔

ماں کی موت کا ذہنی دھچکا اس معروف مصنفہ نے وقتی طور پر سہہ ہی لیا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنے اندر موجود ماں کی موت کے خلاء کو کبھی پُر نہ کرسکی، وقت گزرتا ہے، ورجینیا زندگی کی ڈور کو کھینچے چلے جارہی تھی، مسز اسٹیفن کے گزرنے کے بعد اسٹیلا نے گھر کا نظم ونسق سنبھالا، اس نے اپنی شادی کو بھی التوا میں ڈال دیا، جب نیز اتنی بڑی ہوگئی کہ معاملات سنبھال سکے تب اسٹیلا ڈک ورتھ کی شادی کی تیاریاں شروع کردی گئیں لیکن اس گھرانے کے افراد بے خبر تھے کہ موت اسٹیفن فیملی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے، موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسٹیلا ڈک ورتھ کو اس وقت اُچک لیا جب وہ بچے کی پیدائش کے عمل سے گزر رہی تھی۔

ورجینیا پھر سے خود کو عدم تحفظ کا شکار محسوس کرنے لگی، وہ بے بسی کے عالم میں اپنی بہن کو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے دیکھ رہی تھی، اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔

کچھ عرصہ تک ونیزا خوش اسلوبی سے گھر کے معاملات چلاتی رہی، اسٹیفن فیملی کے گھریلو حالات معمول پر آنے لگے، تو بے کیمبرج میں اپنے نئے دوستوں کے ساتھ مصروف ہوگیا، اب گھر میں صرف بوڑھا اسٹیفن تھا یا پھر سب خواتین، جیسے جیسے بڑھاپا آتا گیا اسٹیفن بھی بدلتا چلا گیا، اسے لوگوں سے میل ملاپ تو پسند تھا لیکن معمولی معمولی باتوں پر تنقید معمول بن چکی تھی۔ ونیزا کو اس نے گھر کی ذمہ داری تو سونپ دی تھی لیکن ہر معاملے میں اس کی فضول خرچیوں اور غفلت پر تنقید کرتا، اسٹیفن کو لڑکیوں کی تنہائی کا بھی احساس تھا اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ گھر میں عزیز رشتہ داروں کی محفلیں جمائے رکھتا، ورجینیا اور ونیزا قدرے شرمیلی تھیں چنانچہ وہ گھر میں ہونے والی سماجی تقریبات سے الگ تھلگ رہتیں، ساحل کے قریب اسٹیفن فیملی کا جو گھر تھا اسے فروخت کردیا گیا۔ اس گھر میں وہ سب گرمیوں کے کچھ مہینے گزارتے تھے۔

موت کا رقص جاری تھا۔ اس فیملی کو ابھی ایک اور سانحہ کا سامنا کرنا تھا۔ 1902ء میں اسٹیفن کو سر کا خطاب ملا، 1904ء میں جب ورجینیا شباب کی جولانیوں پر تھی تب سر اسٹیفن کو کینسر نے موت کی وادی میں پہنچا دیا، اس وقت ورجینیا کی عمر 22 سال تھی۔ ورجینیا اپنے باپ کو اکثر یاد کرتی، گو کہ وہ اپنی ماں سے بھی متاثر تھی لیکن اس سے زیادہ وہ باپ

PakiBooks.site

کو پسند کرتی تھی، جیسے تیسے اس نے باپ کی موت کا صدمہ بھی سہہ لیا، باپ کے انتقال کے بعد وہ لندن میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بلومز برے میں رہنے لگی، اسٹیفن کے بچوں نے عین اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے گھر کو اسی کے انداز و اطوار کے مطابق چلانا شروع کردیا۔ وہ گھر ایک بار پھر بڑی ادبی شخصیات کا مرکز بن گیا۔ وقت نے اسٹیفن کی موت سے جو خلا پیدا کیا تھا وہ ٹوبے نے پُر کر دیا تھا۔ ہائیڈ پارک والے گھر کی طرح یہ گھر بھی وسیع اور کشادہ تھا، اور ادبی شخصیات کے لیے مرکز کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہاں ادبی محافل کا انعقاد کیا جاتا، مختلف موضوعات پر اظہار خیال ہوتا، فلسفے پر بحث ہوتی، دعوتیں ہوتیں، ہر طرف قہقہے گونجتے، رات گئے تک بحث و مباحثہ ہوتا۔ مہمانوں میں معروف ادبی شخصیات کے علاوہ ہمسائے اور ٹوبے کے کیمبرج کے دوست بھی شامل ہوتے، یہ سب آزاد خیال اور تخلیقی ذہن رکھنے والے افراد تھے۔ ٹوبے نے ورجینیا کی حوصلہ افزائی کی، ورجینیا کا اعتماد لوٹ آیا، وہ خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگی، ٹوبے اپنے باپ اسٹیفن سے ایک مختلف شخص تھا وہ باپ کی طرح ایک مشکل آدمی نہیں تھا جیسا کہ اسٹیفن ورجینیا کے لیے ثابت ہوا تھا، اسی لیے وہ خود کو آزاد پنچھی کی طرح فضاؤں میں اڑتا محسوس کرتی، وہ جو کہتی پُراعتماد لہجے میں کہتی اور جو کہتی تھی اسے نہ صرف سنا جاتا بلکہ سراہا بھی جاتا، وہ آہستہ آہستہ محسوس کررہی تھی کہ اس کے پاس لوگوں سے کہنے کے لیے کچھ ہے، اس کی شخصیت میں مکمل اعتماد آ چکا تھا اور ظاہر میں وہ بہت ذہین، تیز، ہوشیار اور خوش مزاج خاتون نظر آتی تھی لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی، وہ بیشتر اوقات ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی۔

1905ء میں ایک اور آفت نازل ہوگئی، ورجینیا کو جسمانی اور ذہنی بیماریوں نے جکڑ لیا۔ جب ان بیماریوں سے پیچھا چھوٹا تو اسٹیفن فیملی نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ تھا لندن چھوڑنے اور یونان جانے کا، ورجینیا کی بھی شدید خواہش تھی کہ یونان کی تہذیب اور قدیم کھنڈرات دیکھے، ٹوبے بھی اس کا ہم خیال تھا۔

تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا، ایک بار پھر ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی، ہنستے بستے گھر میں غم نے بسیرا کرلیا، اس بار موت کا ٹارگٹ ٹوبے تھا، ورجینیا کا سب سے عزیز بھائی، جب وہ لوگ یونان کی سیر و سیاحت سے لوٹے تو ٹوبے پر ٹائیفائیڈ کا جان لیوا حملہ ہوا، ورجینیا کے لیے ٹوبے کی موت شدید جھٹکا ثابت ہوئی، وہ ذہنی طور پر منتشر ہوتی چلی گئی۔

گزرتے وقت نے دھیرے دھیرے اسے غموں کے بے آب و گیاہ صحرا سے نکالا اور چمکتی دمکتی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ ایڈرن ہر لمحے ورجینیا کی دلجوئی میں لگا رہتا، ورجینیا نے اپنی ادبی مصروفیات بڑھالیں، اس نے ایک ناول لکھنا شروع کیا، جو 7 برس میں مکمل ہوا، اسی دوران اس نے ”لندن ٹائمز“ کے ادبی صفحات پر تنقیدی تجزیے لکھنا شروع کر دیے۔ یہ پہلی جنگ عظیم سے دو سال قبل کی بات ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرلیا۔ مشہور صحافی اور نقاد لیونارڈ وولف سائیلون سے 7 سال بعد اپنی نوکری ختم کر کے واپس پہنچا تھا۔ ورجینیا نے اسے اپنا ہم سفر چن لیا اور دونوں شادی کے حسین بندھن میں بندھ گئے، لیونارڈ وولف نے "The Village In The Jungle" میں اپنے تجربات لکھے، وولف جسمانی اور ذہنی مشقت کے تجربات میں بہت دلچسپی رکھتا تھا، اس نے صنعت اور معیشت پر منڈلانے والے خطرات کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔

ورجینیا جب وولف کی دلہن بنی تب وہ 30 برس کی تھی۔ صحافی اور نقاد وولف اس کے لیے مثالی شوہر ثابت ہوا۔ وہ ہر مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر رکھنے اور لکھنے میں دلچسپی لینے والا انسان تھا۔ اس نے سائیلون میں زندگی کی بے بسی کا گہرا مشاہدہ کیا تھا، وہ لکھنے میں ورجینیا کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

دماغی لحاظ سے چست و چالاک، دبلا پتلا، دراز قد لیونارڈ وولف ورجینیا کو شمالی انگلینڈ کے صنعتی علاقوں کے دورے پر لے گیا، ورجینیا کے لیے یہ سب نیا اور انوکھا تھا۔ اس نے صنعتی شعبے میں کام کرنے والی خواتین میں خاصی دلچسپی لی۔ اس نئے تجربے نے اس کو ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا۔ معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی دانشور خاتون نے کم پڑھی لکھی محنت کش خواتین سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے تلخ شب و روز سے آگاہی حاصل کی، وہ ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی، ان خواتین سے کرید کرید کر ان کے حالات زندگی معلوم کرتی، وہ سوچتی کہ اونچے اور نیچے طبقے کے حالاتِ زندگی میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ ان خواتین کے مشکل حالاتِ زندگی نے اسے پہلی بار انسانی ہمدردی کے جذبات سے آشنا کیا۔ اس میں انسان کو سمجھنے کا شعور بڑھا لیکن ساتھ ساتھ اس کی فرسٹریشن میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا یہ سوچیں اس کے دماغ کی چولیں ہلا دیتیں کہ کچھ لوگوں کے لیے پیٹ کا جہنم سرد کرنا یا پیٹ بھر کر کھانا اور روزانہ کی بنیاد پر اپنے بقاء کی جنگ لڑنا کس قدر دشوار ہے۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ورجینیا ایک بار پھر نفسیاتی مسائل سے دوچار ہونے لگی، زندگی کی تلخیوں نے اسے ذہنی طور پر منتشر کر کے رکھ دیا، اسے نفسیاتی مسائل سے بچانے کے لیے وولف اسے لندن کے مضافات میں لے گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی بہن اور بلومز برے گروپ کی دوسری ادبی شخصیات کے ساتھ مصروف رہے۔ 1912ء میں ورجینیا کا پہلا ناول "The Voyage Out" منظر عام پر آیا، یہ ناول اس کے روایتی ناولوں میں سے ہے، ناول میں ای ایم فارسٹر کا اثر نمایاں نظر آیا۔ اس ناول میں ہیروئن کی اچانک موت سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ چاہنے کے باوجود ورجینیا کے تصور سے کبھی موت محو نہ ہو سکی، اس ناول کو عوام میں پذیرائی تو ملی لیکن کوئی بڑا دھماکا نہ ہوا، ورجینیا کی امیدوں پر اوس پڑ گئی، وہ جس شہرت کا تصور کیے بیٹھی تھی وہ اسے نہ ملی، اس کی بڑی وجہ جنگ تھی کیوں کہ ناول میں نوجوان خاتون کی سمندری سفر کے دوران موت کی کہانی ان لوگوں کے لیے قطعاً دلچسپی کا عنصر نہیں رکھتی تھی جس کے دوست رشتہ دار ہر روز جنگ کی تباہ کاریوں کی بھینٹ چڑھ رہے تھے یا وہ لوگ جو اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اس ناول پر اس نے بہت محنت کی تھی اور اسے منظر عام پر آنے میں 7 برس لگے تھے لیکن ناول کی اشاعت کے لیے جنگ کا ماحول ہرگز مناسب نہ تھا۔

1917ء میں ورجینیا اور وولف نے مشغلے کے طور پر خود کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کردیا، دھیرے دھیرے یہ کام سنجیدگی سے ہونے لگا، ان کے گھر کا ڈرائنگ اب ”ہو گارتھ پریس“ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ دونوں نے مل کر کام کیا اور دو کہانیاں شائع کیں۔ ان کی دوسری شائع ہونے والی کتاب ”کیتھرائن مینسفیلڈ“ کی "The Prelude" نے بہت سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، کام میں دل لگا تو وولف نے مزید مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شعبہ میں مزید توسیع کردی، جلد ہی ان کے پریس سے ٹی ایس ایلیٹ، رابرٹ گریو، وکٹوریہ ویسٹ، گوگول، ٹالسٹائی اور رالکیک کی کتابیں شائع ہونے لگیں، ہوگارتھ پریس جو آغاز میں ایک مشغلہ تھا جلد ہی ان کی کمرشل کامیابی بن گیا۔

اس نئی مہم نے ورجینیا پر اچھے اثرات مرتب کیے۔ وہ اس قدر مصروف ہوگئی کہ فضول سوچنے کا اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ 1919ء میں میاں بیوی نے دریائے اوز سے پرے گھر میں رہائش اختیار کرلی، لکھنے لکھانے کے لیے وہ

”ورجینیا وولف“

پیدائش: 25 جنوری 1882ء

انتقال: 28 مارچ 1941ء

شادی: 1913ء میں ادبی نقاد لیونارڈ وولف سے کی

پہلا ناول: 1912ء میں شائع ہوا۔

وجہ شہرت: انگریز ادیبہ

حقوق نسواں: مغربی دنیا میں حقوق نسواں تحریک کی بانی میں شمار ہوتی ہے

آئیڈیل ماحول تھا۔ ورجینیا نے گھر کے پچھلے کمرے کو تخلیقی صلاحیتوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے پسند کرلیا، وہ اسی کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کا دوسرا ناول ”نائٹ اینڈ ڈے“ بھی اسی برس اشاعت پذیر ہوا لیکن یہ ناول بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ ایک سادہ سی کامیڈی تھی، ناول کی ہیروئن اپنے لیے کسی مناسب شخص کی تلاش میں نظر آتی ہے۔

جنگ کے دنوں میں بے کار رہنے والے بلومز برے گروپ نے ایک بار پھر سے خود کو منظم کرنا شروع کیا، ورجینیا اور وولف نے بھی اپنے پریس کو بہتر بنانے کی تگ و دو شروع کردی، پریس کے قریب ورجینیا نے چھوٹا سا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا جہاں دوستوں کی مشترکہ دعوتیں ہوتیں، بقول ای ایم فارسٹر ایسی فضاء ہوتی جو انگریزی تہذیب، 30 نسلوں کے مزاج اور خیالات سے بھری ہوتی تھیں۔

ہوگارتھ پریس سے ورجینیا کی "Jacob's Room" ایک ایسی کاوش تھی جس میں اس کا ٹیلنٹ ابھر کر سامنے آیا، ناقدین یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اس خاتون نے انگریزی ادب پر اپنا ایک نشان چھوڑا ہے اور اب اس کی ایک پہچان ہے۔ یہ انہی شب و روز کا ذکر ہے کہ ورجینیا کی ملاقات ویٹا سیک ویل ویسٹ سے ہوئی، دونوں میں گہری دوستی ہو گئی، ورجینیا کا شاہکار ناول "Orlando" ان دونوں خواتین کی ملاقات کے 8 برس بعد شائع ہوا، اس ناول کی اشاعت سے قبل اس نے "Mrs Dalloway" اور "To The Light House" لکھے، جب ورجینیا "To The Light House" لکھ رہی تھی کہ شدید درد کا شکار ہو گئی، رات بھر وہ ڈراؤنے خواب دیکھتی، اس ناول کو ختم کرنے میں ایک برس لگا، یہ سارا عرصہ اس نے شدید

PakiBooks.Site

''ورجینیا کا فنی سفر''

جن عورتوں نے اپنی ذہانت اور اپنی تحریروں سے مظلوم عورتوں کو اپنے حقوق کے حصول کی جنگ جاری رکھنے کی ہمت دی اور منزل کی طرف پہنچنے کا راستہ دکھایا، ان میں ایک نام ورجینیا وولف کا بھی ہے۔ ورجینیا وولف نے بہت کام کیا۔ باوجود اعصابی بیماری کے جس نے اسے کئی بار خودکشی پر مجبور کیا۔ ورجینیا نے بہت کچھ لکھا، اس کے ناولوں میں (The Voyage Out)، (Night and Day)، (Mrs Dolloway)، (To the Light House)، (Orlando)، (The Waves) اور (The Years) اس کے مشہور ناول ہیں۔ اس نے عورتوں کے بارے میں بہت مضامین لکھے، جو Nonfiction میں شمار ہوتے ہیں۔ مضامین کے کئی مجموعے چھپے۔ ان میں A room of his own بہت مشہور ہے۔ جس کی شہرت نے اسے Feminist icon بنا دیا۔ ورجینیا نے مختصر کہانیاں بھی لکھیں جن کا ایک مجموعہ بھی چھپا، جس کا نام The Complete Shorter ہے۔ اس کا آخری ناول Between the Acts ہے۔ اس نے اس کا مسودہ مکمل کیا اور پھر موت کی طرف روانہ ہوگئی۔ ورجینیا کے ناول ''ٹو دی لائٹ ہاؤس'' کو جدید ناولوں کی تاریخ کا سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ ''دی ٹائم میگزین'' نے اسے انگریزی زبان کے 100 بہترین ناولوں میں شمار کیا ہے۔ یہ ناول تین حصوں میں منقسم ہے۔ جن کے نام (Window)، (Time Pass)، (To the Light House) ہیں۔ ناول Time Pass کو نقاد آٹو بائیگرافی طرز کا ناول قرار دیتے ہیں کیونکہ واقعات، ماحول اور کرداروں کی مناسبت سے یہ ورجینیا کے ذاتی اور نجی حالات کے بہت قریب ہے۔ 1917ء میں ''ٹو اسٹوریز'' کتاب چھپی جس میں ورجینیا کا افسانہ دی مارک آن وال اور لیونارڈ و کی لکھی کہانی "تھری جیوز" شامل تھیں۔ انہوں نے کیتھرین میٹیفیلڈ کی ''پریلیوڈ'' اور ٹی ایس ایلیٹ کی نظمیں ''پوئمس'' اور ''دی ویسٹ لینڈ'' بھی شائع کیں۔

ورجینیا نے لندن سے متعلق ایک حقیقت پسندانہ ناول ''نائٹ اینڈ ڈے'' کے نام سے لکھا جس میں دو دوستوں کیتھرین جو ایک مشہور علمی خاندان کی لڑکی تھی اور میری جو پارلیمنٹ میں عورتوں کے حق رائے دہندگی کی تحریک کی رکن تھی کی زندگیوں کا موازنہ کیا گیا تھا۔ ان کا دوسرا ناول "جیکبس روم" ان کے بھائی کی زندگی اور موت کے حالات پر مبنی تھا۔ 1928ء میں انہوں نے ایک عجیب وغریب انداز کی سوانح عمری" آرلینڈو " کے نام سے لکھی جس میں چار سو سال کی تاریخ کھنگالی گئی مگر ان کے ناولوں کے خلاف تجارتی لحاظ سے یہ کتاب خاصی کامیاب رہی۔ اس کو مصنفہ نے اپنی گہری دوست ویٹا سیکولیوسٹ کے نام منسوب کیا۔ دوسری سوانح عمری ''فلش'' کے نام سے انہوں نے 1933ء میں لکھی۔

''دی ایریں'' کے بعد ''بیٹوین دی ایکٹس'' ان کا آخری ناول تھا جو ان کے مرنے کے بعد شائع ہوا۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے معروف تخیل پسند ناول نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل پر ''اے روم آف ونس اون'' اور اس سے زیادہ آزاد خیالی پر مبنی ''تھری گینز'' لکھیں جن کو معتبر مانا جاتا ہے۔ وہ ٹائم لٹریری سپلیمنٹ کی تبصرہ نویس 1905ء سے اپنی موت تک رہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے ''کامن ریڈر'' اور ''کولیکٹڈ ایسیز آف ورجینیا وولف'' جو چار جلدوں میں 1966/67ء میں شائع ہوئے۔ ان کے خطوط کی چھ جلدوں کو نائجل نکلسن اور جے ٹراؤٹ مین نے ایڈٹ کر کے 1975ء اور 1980ء کے درمیان شائع کیا۔ ان خطوط میں بلومسبری گروپ کے ہر رکن کے نام خطوط موجود ہیں۔ این، لیوربیل اور اے میکنیلی نے ان کو پانچ جلدوں میں شائع کیا جن سے ان کی تخلیقی قوت متخیلہ کا پتا چلتا ہے۔

☆☆☆

اعصابی اذیت میں گزارا۔ ناول تین حصوں میں لکھا گیا۔ جب 1927ء میں یہ ناول منظر عام پر آیا تب تک ورجینیا ادبی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت بن چکی تھی۔ یہ ناول بھی ہوگارتھ پریس سے شائع ہوا اور خاصا مقبول بھی ہوا۔

نئے ناول کی مقبولیت کے بعد لیونارڈ نے سوچا ماحول کی تبدیلی کے لیے ورجینیا کو یورپ کی سیر کیوں نہ کرائے، اس طرح وہ ذہنی طور پر خود کو بہتر محسوس کرے گی، چنانچہ شوہر اسے یورپ کی سیر کرانے لے گیا۔ یورپ سے واپسی ہوئی تو ورجینیا ویٹا سیک ویل ویسٹ کے ہمراہ انگلینڈ کے مقامی مقامات کی سیر کرتی رہی، اس دوران اس کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہو گیا، وہ ادبی محافل میں لیکچر دیتی اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی نظر آتی تھی۔

بوریت نے اس کا تعاقب ختم کر دیا تھا، اداس، کمزور، ڈیپریس اور مایوس نظر آنے والی یہ مصنفہ اب پرندوں کی طرح چہکتی اور خوشی سے سرشار دکھائی دینے لگی، طریقے سلیقے سے میزبانی کے فرائض سرانجام دیتی لیکن اس دوران اس کے کان ان تبصروں پر بھی لگے رہتے تھے جو اس کے ناولوں پر کیے جاتے، تاہم زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ خود پسندی کا شکار ورجینیا میں پھر ایک نمایاں تبدیلی نے جنم لیا۔ دبلی، پتلی، دراز قد ورجینیا معمولی باتوں پر اداس، پریشان نظر آنے لگی، نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ کبھی وہ صرف اس لیے پریشانی کا لبادہ اوڑھ لیتی کہ اس نے صحیح لباس زیب تن نہیں کر رکھا، تلون مزاجی اس کی شخصیت میں رچنے بسنے لگی، کبھی وہ اعتماد سے بھرپور اور کبھی بہت فکرمند دکھائی دیتی۔

ان تمام کیفیات کے باوجود خیالات کے ریلے میں بہتی رہی اور قلم کاری کو فل اسٹاپ نہ لگایا، 1931ء میں اس کی اگلی اہم کتاب "The Waves" چھپ کر آ گئی، اس کتاب کا خوب پوسٹ مارٹم کیا گیا، بعض ناقدین نے اسے ناول ہی تصور نہ کیا تو کچھ کا کہنا تھا کہ اس ناول کا کوئی پلاٹ ہے نہ اسٹرکچر، کہنے والوں نے کہا یہ ناول ایسے ہی ہیں جیسے کسی نے اپنے خواب بیان کر دیے ہوں، بے ترتیب ناول میں اس چیز کی پرواہ نہیں کی گئی کہ لکھا کیا جا رہا ہے۔

ناول کے کرداروں میں ایک پرسول ہے جو سامنے ہی نہیں آتا بلکہ ہندوستان میں گھوڑے سے گر کر موت کی وادی میں پہنچ گیا، روہا دا اسپین میں خودکشی کر لیتی ہے، نوائل بہت تنہا نظر آتی ہے، کہانی کو بیان کرنے والا برنرڈ ہے، سوسن ہے جس کی شادی کسان سے ہوتی ہے اور بھی عجیب وغریب کردار ناول کا حصہ ہیں۔

''دی ویوز'' کی اصل ہیرو موت ہے، تمام کردار سامنے معلوم پڑتے ہیں، زندگی کی تکلیفوں سے اکتائے ہوئے، چمکتی روشنی موت کی علامت بنے۔ کچھ ناقدین نے اسے ورجینیا کی شاہکار تخلیق بھی قرار دیا جبکہ زیادہ تر کی رائے یہی تھی کہ یہ ناول مصنفہ کے اندر موت کے خوف اور اس کی کشش کو بیان کرتا ہے۔

ورجینیا کے ساتھ یہ المیہ رہا کہ اس نے جب بھی خوش و خرم رہنے کی کوشش کی کسی نہ کسی دکھ، غم، مصیبت نے اس کی خوشیوں کو چاٹ لیا، اس کے قریبی دوستوں لٹن اسٹراچی، سبل گیرانکس، راجر فرائے کی موت نے اس کو دکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں لا پھینکا، موت کی حقیقت سے انکار کون کر سکتا ہے لیکن ورجینیا کے اردگرد تو بچپن سے موت نے منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تب سے اپنے پیاروں کا ماتم کرتی آئی تھی جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ موت نہ صرف اس کے اردگرد رہی بلکہ اس کی کتابوں کے اوراق میں چھائی رہی، جب اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس کا بھانجا (وینزا کا بیٹا جو اسے ہمیشہ ٹوبے کی یاد دلاتا تھا) ایمبولینس ڈرائیور کی ڈیوٹی کر رہا تھا کہ موت کے پنجے اسے جھپٹ کر لے گئے۔

اگست 1939ء میں وولف فیملی میکلن برگ سدھار گئی، ورجینیا نے وہاں پہنچ کر پھر لکھنا شروع کیا، اس نے وہاں جو ناول لکھا وہ اس کے اس دنیا سے جانے کے بعد شائع ہوا۔ جب وہ یہ ناول لکھنے میں مگن تھی تب جنگ کے خطرات پھر منڈلانے لگے تھے۔ ستمبر 1940ء میں بمباری اور جنگ کی تباہ کاریوں میں ان کا گھر بھی بری طرح متاثر ہوا، دوسرے ہی مہینے اسٹیوی اسٹاک والا گھر بھی خس وخاشاک کا ڈھیر بن گیا، جنگ دھیرے دھیرے ورجینیا کے اعصاب کو جکڑنے لگی تھی۔

باہر گولہ باری ہوتی تو خاموشی سے سوچوں کے سمندر میں غرق ہو جاتی، ماحول سے لاتعلقی اختیار کر لیتی، ایسے محسوس ہوتا تھا کہ موت اور غم کے یہ نظارے اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، لیکن ذہنی طور پر وہ مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی، حالات کا نادیدہ شکنجہ اسے جکڑ رہا تھا۔ تنہائی میں ماضی کے کچھ دلچسپ واقعات کو یاد کر کے قہقہے لگانا شروع کر دیتی، ہر قسم کے حالات سے بے پروا ہو کر گھر سے نکل جاتی، دور تک پیدل چلتی، اس دوران اس پر یہ سوچ حاوی ہو جاتی کہ کیا یہ اس کی زندگی کی آخری واک ہوگی، کبھی خوشی، کبھی غم، کبھی مطمئن کبھی گھبرائی گھبرائی، اس کے مزاج میں تلون مزاجی بتدریج زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر مکمل ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور کسی آخری فیصلے پر پہنچ چکی تھی، حالات اسے اس نہج پر لے آئے تھے کہ زندگی اس کے قریب بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

1931 میں ورجینیا وولف نے عورتوں کی ایک انجمن کی دعوت پر تقریر کی۔

PakiBooks.Site

"یہ بات بجا کہ میں ایک عورت ہوں اور میرا ایک پیشہ بھی ہے لیکن اس پیشے کے تجربات کیا ہیں؟ یہ ایک مشکل سوال ہے۔ میرا پیشہ ادب ہے اور اس پیشے میں ایسے تجربات بہت کم ہیں جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ قلم سے چند لکیریں کھینچنے سے خاندان کا امن وسکون خطرے میں نہ پڑتا تھا۔ خاندان کی مالی حالت بھی متاثر نہ ہوتی تھی۔ چند سکوں سے اتنے کاغذ خریدے جاسکتے تھے کہ شیکسپیر کے سارے ڈرامے لکھے جاسکیں اگر کوئی لکھنا چاہے تو۔

اگر میں آپ کو اپنی ذاتی کہانی سنانا چاہوں تو وہ بہت سیدھی سادی ہے۔ آپ ایک لڑکی کا تصور کریں جو اپنی خوابگاہ میں قلم لیے بیٹھی ہے۔ وہ دن کے دس بجے سے ایک بجے تک اس کاغذ پر بائیں سے دائیں قلم چلاتی ہے پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس نے جو چند صفحے کالے کیے ہیں انہیں ایک لفافے میں ڈال کر کونے کے لیٹر بکس میں ڈال دے۔ اس طرح میں ایک جرنلسٹ بن گئی اور مہینے کی پہلی تاریخ کو مجھے ایک ایڈیٹر کا خط اور ساتھ ہی ایک پاؤنڈ دس شلنگ اور چھ پنس کا ایک چیک ملا جو میری مزدوری تھی۔ میں خوشی سے بے حال تھی۔ مجھے اپنی محنت کا پہلا معاوضہ ملا تھا لیکن میں سوچتی ہوں کہ کیا میں اپنے آپ کو پروفیشنل عورت کہہ سکتی ہوں؟ مجھے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے کتنا تعلق ہے؟ میں نے اپنی پہلی تنخواہ سے نہ تو کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، نہ گھر کا کرایہ ادا کیا نہ جوتے خریدے اور نہ ہی قسائی کا بل ادا کیا بلکہ بازار جا کر ایک خوبصورت بلی خرید لائی۔ ایک پرشین بلی۔ جس نے جلد ہی میرے تعلقات میرے ہمسایوں سے کشیدہ کردیئے۔

مجھے یاد ہے کہ میرا پہلا مضمون ایک مشہور آدمی کے ناول کے بارے میں تھا۔ جب میں اس ناول پر تبصرہ لکھ رہی تھی تو مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھے تبصرے لکھنے ہیں تو مجھے ایک آسیب سے نبرد آزما ہونا پڑے گا اور وہ آسیب ایک عورت تھی اور جب میں نے اس آسیب زدہ عورت کو قریب سے دیکھا تو اسے ایک مشہور نظم کی ہیروئن کی یاد میں 'گھریلو فرشتہ' کے نام سے پکارنا شروع کردیا۔ وہ آسیب زدہ عورت میرے اور میری تحریروں کے درمیان حائل رہتی۔ وہ میرے کام میں مزاحمت پیدا کرتی۔ میں اس سے اتنی تنگ آئی کہ بالآخر میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ عورتیں جو مجھ سے ایک نسل بعد پیدا ہوئی ہیں شاید اس کردار سے واقف نہ ہوں۔

آئیں میں آپ کا اس کردار سے مختصر سا تعارف کرواتی ہوں۔ اس کردار میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ بہت ہمدرد دلچسپ اور بے غرض تھی۔ وہ قربانی کی بہت دلدادہ تھی۔ وہ ہمیشہ اوروں کا خیال رکھنے میں مصروف رہتی۔ اس کی اپنی نہ کوئی خواہش تھی اور نہ نظریہ۔ مختصر یہ کہ وہ بہت پاکباز اور مقدس تھی اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبصورتی سمجھی جاتی تھی۔ ملکہ وکٹوریا کے آخری دنوں میں یہ آسیب، یہ گھریلو فرشتہ، یہ عورت ہر گھر میں بستی تھی۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو بہت جلد میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ مجھے کاغذ پر اس کے پروں کی پرچھائیاں نظر آتیں اور کمرے میں اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتیں۔ جب میں نے ایک مشہور مرد ناول نگار کے ناول پر تبصرہ لکھنا شروع کیا تو اس نے سرگوشی کی 'میری پیاری! تم ایک نوجوان عورت ہو۔ تم ایک ایسی کتاب پر قلم اٹھا رہی ہو جو ایک مرد کی تحریر کردہ ہے۔ احتیاط سے کام لینا۔ تھوڑی سی تعریف، تھوڑی سی غلط بیانی اور اپنی جنس کا بہت سا عشوہ و انداز و ادا استعمال کرنا۔ کبھی کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تمہارا اپنا ایک نظریۂ حیات ہے اور سب سے مقدم یہ کہ طہارت کا لبادہ اوڑھے رکھنا۔ اس نے میری قلم کی رہنمائی کرنی چاہی۔ اس مرحلے پر میں ایک لحاظ سے خوش قسمت تھی۔

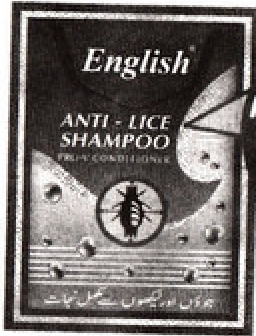
میرے آباؤ اجداد نے میرے لیے اتنی رقم چھوڑی تھی کہ مجھے سال کے پانچ سو پاؤنڈ مل جاتے تھے اس لیے میری زندگی کا دارومدار میری تحریروں اور عشوہ و انداز و ادا پر نہ تھا۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے سے دبوچ لیا اور اسے جان سے مارنے کی پوری کوشش کی۔ اگر کوئی مجھے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا تو میں کہتی کہ وہ اقدامات میں نے اپنی ذات کے دفاع کے لیے کیے۔ اگر میں اسے قتل نہ کرتی تو وہ مجھے قتل کردیتی۔ وہ میری تحریروں سے ان کا دل نوچ لیتی۔ ان کی روح چھین لیتی۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ کسی کے ناول پر بھی رائے دینا اتنا آسان نہیں۔ جب تک انسان کا اپنا کوئی نظریہ نہ ہو انسانی تعلقات، اخلاقیات، جنسی روابط کے بارے میں رائے نہ ہو وہ چھوٹی سی تحریر بھی ٹھیک سے نہیں لکھ سکتا۔ "گھریلو فرشتے" کی نظر میں عورتیں یہ کام نہیں کرسکتیں۔ اس کے خیال میں اگر عورتوں کو ترقی کرنی ہے تو انہیں تصنع اور جھوٹ کی زندگی گزارنی ہوگی اس لیے جب بھی مجھے کاغذ پر اس کے پروں کا عکس یا پرچھائیاں نظر آئیں میں نے وہیں سیاہی کی دوات الٹ دی۔ اس نے سسک سسک کر جان دے دی۔ ایک آسیب کا قتل ایک حقیقت کے قتل سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ وہ چھپ چھپ کر میری تحریروں میں رینگ آتی ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ بالآخر میں اسے ختم کرنے میں کامیاب رہی لیکن

PakiBooks.Site

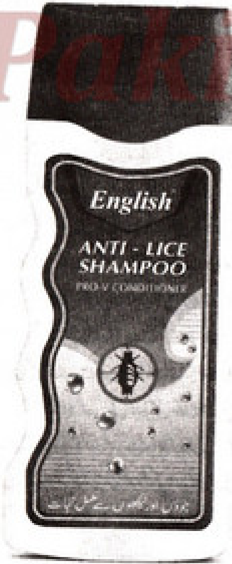
English

سر نہ کھجائیں..
Healthy ہو جائیں!









HOLOGRAPHIC PRINT اصل کی پہچان

5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات

Sarwana & Sohzsihm

antilice @SnScare

مقابلہ بہت سخت تھا۔ میں نے جو وقت اس کے ساتھ نبرد آزما ہونے میں صرف کیا وہ میں کہیں بہتر کاموں میں صرف کر سکتی تھی۔ میں یونانی سیکھ سکتی تھی۔ میں زندگی کے کئی اور معرکے سر کر سکتی تھی لیکن مجھے اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ تھا اور صرف مجھے ہی نہیں اس دور کی ہر مصنفہ کو اس "گھریلو فرشتے" سے مقابلہ کرنا ضروری تھا بلکہ اسے قتل کرنا مصنفہ بننے کے پیشے کے لیے اہم تھا۔

وہ "فرشتہ" مرگئی تو پھر باقی کیا بچا؟ خوابگاہ میں کاغذ اور دوات کے سامنے بیٹھی ہوئی جوان عورت۔ جس نے جھوٹ سے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے۔ وہ اب اپنے دل کی حقیقت اور ذات کی سچائی لکھ سکتی ہے لیکن اس کے دل کی "حقیقت" کیا ہے۔ ات کا "سچ" کیا ہے؟ میرا مطلب ہے عورت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا سچ کیا ہے؟ میں نہیں جانتی اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی نہیں جانتیں اور میرا ایمان ہے کہ وہ حقیقت اس وقت تک نہیں جانی جاسکتی جب تک اس کے سب رنگ ان تمام فنون اور پیشوں میں نہ بکھیر دیے جائیں جو انسان نے آج تک سیکھے ہیں اسی لیے میں آج آپ سب کے سامنے حاضر ہوئی ہوں۔ احترام کے ساتھ۔ آپ وہ عورتیں ہیں جو اپنے تجربات اور اپنی ناکامیوں اور اپنی کامیابیوں کے ساتھ اس خاکے میں رنگ بھریں گی جس سے عورت کی حقیقت اور تشخص اجاگر ہوگا۔ خاموشی کی فضا نہ ٹوٹے۔ اس کے ذہن میں چہروں، کتابوں اور واقعات کی جو فلم چل رہی ہے اس میں خلل نہ پڑے۔ اس کے تصور کے تہہ خانوں سے جو ہیرے اور موتی سطح پر آنے والے ہیں اور سمندر کی گہرائیوں سے جو چیزیں نکل کر ساحل پر بکھرنے والی ہیں اس عمل میں فرق نہ آئے۔ یہ عمل مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہے۔

ناول لکھنا ایک خواب کی حالت میں زندہ رہنے کی طرح ہے۔ ایک ایسی لڑکی کا تصور کریں جو اپنے کمرے کی میز پر کاغذ اور قلم لے کر منٹوں کیا گھنٹوں بیٹھی رہتی ہے اور قلم کو دوات میں نہیں ڈبوتی۔ اس لڑکی کے تصور سے بھرے ذہن میں اس مچھیرے کا خیال آتا ہے جو اپنے خوابوں کی جھیل میں کانٹا ڈالے ساحلِ زیست پر مدتوں بیٹھا ہے اور اپنے تصور سے پانی کی گہرائیوں کو چھونا چاہتا ہے۔ اس موقع پر ایک ایسا تجربہ ظہور پذیر ہوتا ہے جو مردوں کی نسبت عورتوں کو زیادہ میسر آتا ہے۔ لڑکیوں کی انگلیوں سے قلم نکل جاتا ہے۔ اس کا تصور بھاگنے لگتا ہے۔ وہ لاشعور کی گہرائیوں میں پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا ہے جھاگ ابھرتی ہے ہر چیز تتر بتر ہو جاتی ہے۔ تصور نے کسی سخت چیز سے ٹکر کھائی ہے۔ لڑکی خواب سے بیدار ہو جاتی ہے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس کا اپنے جذبات، جسمانی جذبات سے سامنا ہے۔ اگر اس نے ان جذبات کا اظہار کردیا تو مرد غش کھا جائیں گے۔ اسے اس بات کا شعور ہو جاتا ہے کہ مرد اس کے جذبات کے سچے اور کھرے اظہار سے ناخوش ہیں۔ یہ خیال اس کے قلم کی زنجیر بن جاتا ہے اور وہ قلم رکھ دیتی ہے۔ وہ اب کچھ نہیں لکھ سکتی۔ یہ تجربہ بہت سی ادیب عورتوں کا المیہ ہے۔ وہ مردوں کی روایات کی مسحور ہیں۔ مرد اپنے لیے نئے تجربات کی آزادی کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن جب عورتوں کی آزادیٔ اظہار کی بات آتی ہے تو پیمانے بدل جاتے ہیں۔ یہ میری زندگی کے اہم تجربات تھے۔ میری پیشہ وارانہ زندگی کے اہم معرکے۔ پہلا مرحلہ "گھریلو فرشتے" کو قتل کرنا تھا۔ وہ مرحلہ تو میں نے خوش اسلوبی سے عبور کیا۔ دوسرا مرحلہ اپنی ذات اور اپنے جسم کے تجربات کو سچائی سے قلم بند کرنا تھا۔ میں اس معرکے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ میرا نہیں خیال کہ کسی عورت نے آج تک اس مرحلے سے انصاف کیا ہے۔ اس کی راہ میں جو دشواریاں ہیں وہ بہت طاقتور ہیں اور ابھی تک غیر واضح ہیں بظاہر کتابیں لکھنے میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی لیکن درپردہ مسئلہ بہت سنگین ہے۔

عورتوں نے ابھی کئی اور آسیب دیکھنے ہیں اور کئی اور تعصبات سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ابھی عورتوں کو کافی انتظار کرنا ہے اس سے پیشتر کہ وہ کسی آسیب یا خوف سے متاثر ہوئے بغیر حالِ دل تحریر کرسکیں۔ اگر ادب کا یہ حال ہے جس میں آزادی زیادہ ہے تو ایسے پیشوں کا کیا ذکر جو ہمارے معاشرے میں ابھی کم ہیں۔ بظاہر بہت سے دروازے کھل چکے ہیں۔ عورتیں ڈاکٹر بن سکتی ہیں، وکیل بھی اور سول سرونٹ بھی بن سکتی ہیں لیکن بہت سی مشکلات ابھی بھی راہ کی دیوار بنی ہوئی ہیں۔ ان سب پر تبادلۂ خیال کرنا بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ان مشکلات کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے مقاصد اور منازل پر بھی تبادلۂ خیال کرنا چاہیے۔ میرے چاروں طرف عورتیں ہیں۔ آج کا ہال مختلف پیشوں کی عورتوں سے بھرا پڑا ہے۔ آپ لوگوں نے اس گھر میں جو مردوں کی ملکیت ہے اپنے لیے ایک کمرا حاصل کرلیا ہے۔ آپ اب کرایہ دینے کے بھی قابل ہوگئی ہیں۔ سال میں پانچ سو پاؤنڈ بھی کما لیتی ہیں لیکن یہ آزادی ہماری پہلی منزل ہے۔ آپ کو کمرا تو مل گیا ہے لیکن وہ کمرا ابھی خالی ہے۔ اسے آپ نے ترتیب دینا ہے۔

اس کے لیے فرنیچر خریدنا ہے اسے سجانا ہے اور پھر فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کسے اس کمرے کا شریک بنائیں اور کن شرائط پر۔

"دی ویوز" میں اس نے لکھا تھا۔ "میں پانی کی لہروں پر چلوں گی، اور یوں ڈوبوں گی کہ کوئی بچانے والا نہ ہوگا" یہ ایسی تحریر تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے موت کے خطرناک کھیل پر نظر رکھے ہوئے تھی، لٹن اسٹراچی کو ایک خط میں اس نے لکھا تھا کہ "اب باقی کیا رہ جائے گا۔ گرینڈ کینال پر خودکشی کے سوا۔" ان سطور سے پانی کے ساتھ اس کی مسلسل اور گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے، یہ اظہار اس نے اپنے ناولوں میں علامتی طور پر بھی کیا، ورجینیا کبھی بھی موت کے تصور سے لاتعلق نہیں رہی، یہ تصور ایک مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچتا تھا اور اسے ابدی سکون کی کیفیت میں لے جاتا تھا، وہ موت کو شدت سے چاہتی تھی۔ اگر اس کی تحریروں سے موت کو نکال دیا جائے تو "وقت" اس کی محبت ہے جو موت کا بہترین دوست ہے، موت کے ساتھ ورجینیا کی محبت کا چکر ساری عمر چلتا رہا، اتنی شدید اور والہانہ محبت کہ اب محبوب کے ساتھ وصال کی حرص ہونے لگی تھی، وہ ایسی شہزادی تھی جس پر کسی نے جادو کردیا ہو۔

یہ جنوری اور فروری 1941ء کا دن تھا جب اس دکھیاری لکھاری نے اپنی ڈائری میں ڈیپریشن کے خلاف جنگ کا ذکر کیا، وہ ڈیپریشن کے خلاف مسلسل لڑتی رہی۔ رومن ذرائع کے مطابق 1912ء میں پہلی بار شادی کے چند ماہ بعد ہی اس نے خودکشی کی پہلی کوشش کی تھی۔ اپنے عزیزوں کو اس بارے میں انہوں نے کہا کہ پانی میں گرنے سے ان کے کپڑے گیلے ہوگئے تھے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس حوالے سے انہیں کوئی بزدل کہے، یا اس فعل کو گناہ کا نام دے۔ لندن کی ادبی زندگی کے مرکز اس عظیم رائٹر نے ایک دن خود کو دریائی لہروں کے سپرد کردیا لیکن اسے بچا لیا گیا، اس نے پھر سے جینے کی تمنا کی لیکن بے سود، موت سے عشق کرنے والی کو موت پھر اپنی طرف بلا رہی تھی، اس نے اپنی بہن اور شوہر کے نام ایک خط لکھا۔ "وہ بھی اس جنگ میں جان دینے والوں میں سے ہے، جو لڑائی اس کے اعصاب میں لڑی جارہی ہے وہ یہ لڑائی ہار گئی ہے۔"

وہ ٹھنڈے مزاج کے ساتھ سوچتی اور تفکر کرتی رہی، اس نے جو تحریر اپنے شوہر کے نام چھوڑی اس میں اس نے اپنے شوہر کے لیے اچھے الفاظ استعمال کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی بیماری اور ڈیپریشن کا بھی اظہار کیا، ورجینیا نے لکھا "اسے اپنے چاروں جانب عجیب و غریب آوازیں آتی ہیں اور اس کی توجہ کسی ایک نکتے پر مرکوز نہیں رہ سکتی، وہ بے سکون ہے، میں زندگی سے مزید نہیں لڑ سکتی۔"

یہ تحریر لکھنے کے بعد اس نے گھر چھوڑ دیا، 28 مارچ 1941ء کو 11 بجکر 30 منٹ ہوئے تھے، ہاتھ میں واکنگ اسٹک لے کر اس نے آہستہ آہستہ دریا عبور کرنا شروع کردیا اور ساتھ ہی ساتھ بھاری پتھروں سے اپنے کوٹ کی جیبیں بھرتی چلی گئی۔ وہ پانی میں چلتی ہوئی دریا میں داخل ہوگئی، چلتی رہی اور بالآخر بھاری پتھروں کے سنگ پُرسکون انداز میں غرقِ آب ہوگئی، دریا کے قریب کھیلتے بچوں نے ایک خاتون کی لاش دیکھ کر ہر طرف خبر پھیلا دی، 18 اپریل 1941ء کو اس کی لاش ورثاء نے تحویل میں لے کر Monk House کے باغ میں سپردِ خاک کردیا اور اس بے چین روح کو قرار آگیا۔



اردو میں جدید مرثیہ نگاری کی روایت کو تاب و توانائی عطا کرنے میں سید آلِ رضا کی خدمات قابلِ قدر اور لائقِ منزلت ہیں۔ جبھی تو اردو کے عظیم شاعر اور جدید مرثیہ نگاروں کے سرخیل جوش ملیح آبادی نے آلِ رضا کی خدماتِ جلیلہ کا اس انداز میں اعتراف کیا ہے: مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسینؑ کے کردار کو پیش کرکے مومنین کو یہ سبق دے کہ دیکھو اگر تم حسینی ہو تو خبردار، باطل کی طاقت کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا اور فرمان روایانِ دہر کو خاطر میں نہ لانا۔ یہ تاجِ فخر قدرت نے سید آلِ رضا کے واسطے عطا کر رکھا تھا۔ جو حضرات یہ اعلان کرتے ہیں کہ میر انیس کے بعد صنفِ مرثیہ روبہ زوال ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرثیہ نگاری پوری قوت کے ساتھ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کا ارتقائی سفر بھی جاری ہے۔ سید آلِ رضا نے 1939ء میں نجم آفندی کی نظم، اشاراتِ غم سے متاثر ہوکر اپنا پہلا مرثیہ تصنیف کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر نجم آفندی کے انقلابی اشعار نہ ہوتے تو میں جدید مرثیہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

اقتباس: پاکستانی ادب کے معمار
از: ڈاکٹر سید محسنہ نقوی

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس نے سفر ناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ سفر نامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کردیا جو خشک تھے۔ سفر نامہ پر کہانی کا گمان ہو اس جانب مکمل توجہ رکھی۔ سفر نامے میں تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات بھی ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھا۔ ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوقِ مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفر نامہ

میں نے گھبرا کر ری ڈائل کیا اور رابطہ ہوتے ہی پوچھا۔ ”یہ آواز کیسی تھی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”شیشے کی صفائی کے لیے کھڑکی کھول رکھی تھی۔ باہر ہوا کی رفتار تیز ہوئی تو پردہ اڑا اور کارنر میں رکھا بھاری گلدان گر گیا۔“

آواز میں وہی روکھا پن تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”لگتا ہے آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟“

”ہاں ہلکا سا زکام ہے ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کچھ بوری لگ رہی ہو۔ میں تو بار نہیں آرہا ہوں۔“ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اسٹور کی جاب چھوڑی ہے تو پورا دن گھر میں گزرتا ہے۔ گھر پڑے پڑے تھک جاتی ہوں۔“

”تو کہیں باہر نکل جایا کرو۔ ایسے تو تمہیں زنگ لگ جائے گا۔“

”یہی سوچ رہی ہوں۔ سعد کو اسکول چھوڑ کر جم چلی جایا کروں۔“

وہ تھکے اور سرد لہجے میں اس طرح کی باتیں کرتی رہی۔ میں نے جیسے ہی اجازت مانگی تو اس نے فوراً خدا حافظ کہہ کر فون خود ہی بند کردیا۔ اس کے ایسے لہجے کا میں عادی نہ تھا اس لیے فکر نے گھیر لیا کہ ایسی کون سی بات ہوئی ہے جس نے اسے مجھ سے اس قسم کے رویئے پر آمادہ کردیا ہے۔ ایسی کون سی بات ہوئی، کہیں اس کے بھائی اسے واپس ایران لے جانے کے لیے کینیڈا تو نہیں آگئے ہیں! لاتعداد واہموں نے ذہن میں سر اٹھانا شروع کردیا پھر خیال آیا کہ جا کر دیکھوں تو معاملہ کیا ہے۔ یقیناً کوئی ایسی بات ہے جس نے اسے بے حال کر رکھا۔

میں فیکٹری سے نکلا اور کیلنگ سب وے کی بس لے لی۔ وہاں سے دوسری بس لے کر اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے جا پہنچا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اتنی دیر میں وہ سعد کو اسکول سے لے آئی ہوگی۔

اس دن گرمی پڑ رہی تھی۔ درجہ حرارت 29 درجے تک پہنچ گیا تھا۔ سب لوگ یہی کہتے تھے کہ آج Killing day ہے۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ موسم بے کیف سا تھا۔

میں نے ڈور بیل بجائی تو دروازہ سعد نے کھولا۔ مجھے دیکھا تو انکل انکل کا شور مچا دیا۔ دروازہ کھلا تھا میں سعد کو اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ سامنے صوفے پر لیٹی تھی۔ سعد کی آواز سن کر اٹھ ہی رہی تھی کہ میں سامنے پہنچ گیا۔

مجھے اپنے سامنے پا کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک چمک آئی اور پھر معدوم ہوگئی۔ اس کی خوب صورت پتلی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ شاید بیمار تھی۔ ایک نمی اس کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ آنکھیں ایسی جیسے آنسوؤں کے تالاب بھرے ہوں۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ بمشکل کھڑی ہوئی تھی۔ لاغر نظر آرہی تھی۔ پوچھا تو میری مخصوص سیٹ صوفے پر چھوڑ دی۔ مجھے بیٹھنے کا کہا مگر میں اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ چہرے پر تھکن کے آثار الجھے الجھے بے ترتیب بال۔ آنکھوں میں یاسیت۔

اس کے جواب نہ دینے پر میں نے دوبارہ پوچھا کہ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ پھر بھی اس نے کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ زکام کے ساتھ سر میں درد ہے۔ تبھی سعد بولا۔

”مما بہت دنوں سے بیمار ہیں۔“

میں جیسے نقاہت سے ریزہ ریزہ ہو کر صوفے میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی ساتھ نڈھال سی بیٹھ گئی۔ کوئی بڑا بھی بیمار پڑے تو بچہ بن جاتا ہے۔ ہر وقت کسی کی توجہ چاہتا ہے۔ اکیلا ہو تو اپنے آپ کو مفلس محسوس کرتا ہے۔ اکیلا بخار میں پڑا تپ رہا ہو تو بھولی بچھڑی اداسیاں اور مدفون محرومیاں بھی آ کر جکڑ لیتی ہیں۔

میں صوفے پر بیٹھا یہی سوچتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لرزتی شاخ کی طرح کپکپا رہی تھی۔ میں نے صرف اس سے یہی پوچھا۔ ”مجھے فون کر کے بتایا کیوں نہیں؟“

میں منتظر و مضطرب بیٹھا تھا اور وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے دنیا تیاگ کر کے کوئی جوگ لیے بیٹھی ہو۔ دوبارہ سوال کیا تو بولی۔ ”تم مصروف رہتے ہو، جو وقت آرام کے لیے ملتا ہے ہمیں دے دیتے ہو، تمہیں پریشان کرتی بے آرام کرتی کہ مجھے بخار ہے؟ میں ٹھیک نہیں ہو رہی؟ میری وجہ سے سعد علیحدہ پریشان ہے۔“

وہ چار دن سے بیمار تھی۔ گلے میں انفیکشن کی وجہ سے بخار چڑھ آیا تھا۔ ساتھ میں سائنس (Sinns) بھی تھا۔ ایسی حالت میں سب سے ضروری چیز آرام کرنا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے بچے کی موجودگی میں گھر بھی سنبھالنا ہو تو آرام کہاں ملتا ہے۔

اس نے سعد کو کھانا دے دیا تھا۔ گرمی تھی تو وہ پنکھا چلا کر اندر کمرے میں جا لیٹا تھا۔

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اب بھی تپ رہا تھا۔ کرب سے میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ رونے لگی۔ میں نے ہاتھ پکڑا تو لپٹ گئی۔ وہ بخار میں دہک رہی تھی۔ کہنے لگی کہ پچھلے دو دنوں سے شدید بخار ہے۔ اچھا کیا تم آگئے۔ مجھے تو لگتا تھا کہ مر جاؤں گی۔ وہ لپٹی اپنی گرفت مضبوط کرتی جاتی تھی۔ اتنی مضبوط جیسے شرط جیت کر ہی چھوڑے گی۔

میں نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا تو وہ شاید جیت چکی تھی۔ اس نے گرفت نرم کی تو اسے صوفے پر لٹایا۔ اندر سے چادر لا کر اس پر ڈالی۔ میڈیسن چیک کیں تو وہ ٹھیک تھیں انفیکشن سے زیادہ ڈپریشن تھا اسے، دوبارہ پوچھا۔ ”تم فون کر کے بتا تو سکتی تھیں؟“

”آپ کون سا فون کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ بھی معلوم کیا کہ ہم کیسے پڑے ہیں۔ دو بول تسلی کے ہی مجھے خوش کر دیتے۔“ اس نے رندھے گلے سے شکوہ کیا۔

انسان جب بیمار پڑتا ہے تو بہت حساس ہو جاتا ہے۔ چاہتا ہے کہ کوئی آ کر اس کے تپتے ماتھے پر ہاتھ رکھے۔ تشویش سے دیکھ کر تسلی دے۔ پوچھے کچھ چاہیے تو ابھی لا دیتا ہوں۔ یہ بولے کہ پریشان نہ ہو میں ہوں ناں۔

میں چھوٹا تھا تو ماں کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ وہ کھانے کے لیے، سلانے کے لیے ہمیشہ میرے پیچھے دوڑتی رہتی مگر جب



PakiBooks.Site

کبھی بخار آگھیرتا اور بستر سے لگتا تو یہی چاہتا کہ وہ آس پاس مجھے نظر آتی رہیں۔ کچھ دیر کے لیے اوجھل ہوتیں تو رونے لگتا۔ نسرین کا بھی یہی حال تھا۔ بخار نے لاغر کیا تو مجھ سے لگی امیدیں بڑھ گئیں۔ بخار میں چلتی رہی مگر مجھے بتایا نہیں کہ میں خود محسوس کر کے چلا آؤں گا۔ اب اس کو کیا کہتا۔

جا کر فریج دیکھا۔ دودھ، انڈے وغیرہ ختم تھے۔ سعد کے لیے Cereal بھی نہ تھا۔ اسے لیٹے رہنے کی تاکید کر کے خود باہر نکل گیا۔ شاپر ڈرگ مارٹ سے کچھ اور میڈیسن لیں۔ نوفرل سپر مارکیٹ سے گروسری کی۔ سوپ کے پیکٹ لیے۔ وہاں حلال گوشت نہ تھا تو مچھلی خرید لی۔ تھیلے بھر کر واپس آیا تو اب اس کی آنکھوں میں محبتوں کی مشعلیں روشن تھیں۔

کچھ لوگوں کو باتیں دیر سے سمجھ آتی ہیں، کچھ لوگ جلد سمجھ جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ دیر سے سمجھتا ہوں۔ اتنی دیر کے بعد میں اب یہ جان پایا کہ جب ہم کسی کو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اکثر غلطی کر جاتے ہیں۔ ہم صرف اپنے بارے میں جانتے ہیں اور کسی شخص، واقعہ یا بات کو اپنی نظر یا دماغ سے سمجھ کر یہ غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ ساری دنیا اسی طرح سوچتی ہے اور پھر کوئی اس زاویے سے کسی چیز کو دیکھتا ہے جیسا میں دیکھتا ہوں۔

اگر میں نے کسی کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھنے ہیں یا اسے میں اپنا دشمن سمجھتا ہوں تو مجھے اپنی ذات کو اپنی روح کو اس کے اندر مجازی طور پر حلول کرنا پڑے گا۔ مجھے اس طرح سوچنا ہوگا جو وہ اپنی موجودہ ذہنی حالت میں سوچ رہا ہے۔ دو بچے ایک بازار سے گزر رہے ہیں، ایک امیر اور دوسرا بھوکا ہے۔ سامنے بیکری کے شوکیس میں کیک رکھے ہیں۔ بھوکا بچہ کیک کو کھڑا للچائی نظروں سے دیکھے گا اور دوسرا بن دیکھے گزر جائے گا۔ جو بھوکا کھڑا کیک کو دیکھ رہا ہے تو میں کیا یہ سمجھوں کہ اس میں ندیدہ پن ہے؟ میں جب تک اس کے اندر اتر کر نہیں دیکھوں گا مجھے بھوک اور فاقوں کی اذیت کا ادراک کیسے ہوگا؟

میں نسرین کے ذہن میں بیٹھ کر یہ محسوس کر سکتا تھا کہ ایک مشرقی لڑکی بالکل تنہا اور ایک چھوٹے بچے کے ساتھ غریب الوطنی کی زندگی گزار رہی ہے۔ نہ کوئی دوست اور نہ کوئی رشتہ دار موجود ہے۔ اس کی زندگی کا محور، گھر اور بچہ ہے، ہزاروں مشکلات ہیں اور سامنے ایک طویل راستہ ہے۔ بھائیوں نے گھر سے نکال دیا اور کس طرح سے جان بچا کر کینیڈا آ گئی ہے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ زندگی تو یہاں زیادہ دشوار ہے۔ اسی ذہنی کیفیت میں میرا اس سے ٹکرانا اور ہمدردی کے چند بول کہنا پھر ایسی نظروں سے دیکھنا جن میں کوئی ہوس نہیں تو لامحالہ طور پر وہ میرا... سہارا پانے کی جستجو کرنے لگی۔ وہ اس بچے کی طرح تھی جس میں کوئی ندیدہ پن نہ تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ میں اپنی بیوی بچوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں اور یہ بات اس کے سامنے چھپاتا بھی نہیں تو وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے ساری امیدیں لگا بیٹھی۔ اسے اس حالت میں چھوڑنا میرے لیے کوئی مشکل نہ تھا مگر لرز جاتا کہ پھر اس کی اور سعد کی کیا حالت ہو جاتی۔ ایسا کر لیتا تو...... اتنا میں اپنے بارے میں جانتا ہوں کہ پھر ٹھیک سے مر بھی نہ سکتا۔ وہ مجبور تھی، ضرورت مند تھی اور سہارے کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ ادھر میں اس کی مجبوریوں کو سمجھ رہا تھا۔ وہ قریب آئی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ اب میری ذرا سی لغزش مجھے اپنی نظروں میں گرا دیتی۔ اگر نسرین کی جگہ کوئی اور لڑکی مختلف حالات میں ہوتی تو بھی میں اس کو چھوڑ سکتا تھا یا وہ مجھے چھوڑ سکتی تھی۔ ادھر اس نے اپنی آنکھوں میں پیار بسا لیا تھا اور یہی بات مجھے الجھائے دے رہی تھی۔ اکثر میں اپنے آپ سے الجھ جاتا، بڑبڑاتا کہ نسرین بڑے امتحان میں مجھے ڈال دیا ہے مجھ سے میری جنگ تم نے کرا دی ہے۔ ان سب وجوہات کے علاوہ یہ بھی ناقابل تردید حقیقت تھی کہ اس کے قرب میں بے پناہ کشش تھی۔ میں عام انسان ہوں اور انہی راہوں کا مسافر تھا جس پر نسرین لے آئی تھی۔ لہٰذا یہ راستے میرے لیے اجنبی بھی نہ تھے۔

میں نے نسرین کے لیے گرم سوپ بنایا۔ مچھلی اس کے لیے اوون میں بیک (Bake) کی۔ اپنے لیے چائے بنائی۔ اسے بٹھا کر کھانا کھلایا اور جو میڈیسن میں لے آیا تھا وہ بھی اسے دیں۔ اس کے لیے وٹامن بھی لے آیا تھا۔

پروٹین لینے سے اس میں طاقت آئی تو بخار بھی اترنے لگا۔

اس کے اور سعد کے لیے مزید مچھلی کے کئی ٹکڑے بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دیے۔

وہ اب صوفے پر بہتر حالت میں بیٹھی تھی۔ اپنی ہاتھوں کی لکیروں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میری جانب دیکھا تو چونک کر بولی۔ ''مسکرا کیوں رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میری تین باتیں مانو گی؟''

بولی۔ ''سب مانوں گی۔''

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''شکریہ ادا نہیں کرنا، رونا نہیں اور کھانا بھی وقت پر کھانا ہے۔''

وہ اس طرح بولی کہ لہجہ محبت میں مہکنے لگا۔ ''دو باتیں مانوں گی ایک نہیں۔''

''کون سی؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''میرے آنسو نہیں رکیں گے آج...... آج انہیں بہنے دو۔'' پھر وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر اتنا روئی کہ آنسوؤں کے تالاب خالی کر دیے۔ وہ بمشکل تھمی اور تھم تھم کر بولی۔

''میں بیمار پڑی تو تم بہت یاد آئے۔ فون نہ کیا کیونکہ چاہتی تھی کہ تم خود محسوس کر کے آجاؤ۔ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھو، ان آنکھوں میں اپنی آنکھیں رکھ کر تسلیاں دو۔ میں بھی محسوس کروں کہ میں اکیلی نہیں، تنہا نہیں بلکہ میرا بھی کوئی خیال رکھتا ہے۔ میں اسی صوفے پر پڑی رہتی جہاں تم بیٹھتے ہو۔ بار بار نظریں فون کی جانب جاتیں۔ صبح سے شام اور پھر شام سے رات ہو جاتی مگر تم نے فون نہ کیا۔''

یہ کہہ کر کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب میرا رخ موڑ کر پوچھا۔ ''تمہیں میں یاد آتی بھی ہوں یا نہیں؟''

اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ اس کے جذبات سے بھرا کوئی گہرا کنواں لگ رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''یاد آتی ہو، کیوں نہیں آتی۔ بس مجھے تمہاری طرح اظہار کرنا نہیں آتا۔''

''پھر کیوں بھول گئے تھے۔ پچھلے سنڈے تمہارے کہنے پر میں اور سعد تیار بیٹھے تھے کہ سینٹرل آئی لینڈ چلیں گے۔ نہ تم آئے اور نہ فون کیا۔ سعد کہتا رہا کہ انکل کو فون کرتے ہیں۔ میں نے اس سے جھوٹ بولا کہ ان کا فون آیا تھا۔ کوئی ضروری کام انہیں پڑ گیا ہے۔''

یہ سن کر میرے اندر شرمندگی بھرا کوئی گلاس ٹوٹا اور جسم لہولہان ہو گیا۔ میں واقعی بھول گیا تھا۔ یاد تب آیا جب وقت گزر چکا تھا۔ معذرت کا فون اس لیے نہ کیا کیونکہ میری دانست میں وہ میری مصروفیت جانتی تھی مگر مجھے فون تو کرنا چاہیے تھا۔ اس کے ہاتھ پکڑ کر دل کی گہرائیوں سے کہا۔

''آئی ایم سوری، غلطی بڑی ہے اور سوری کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔'' میں نے ملتجی انداز میں کہا۔ ''ایک بار معاف کر دو، آئندہ کبھی نہیں بھولوں گا، وعدہ رہا۔''

اپنے زرد بیمار چہرے پر مسکراہٹ لا کر بولی۔ ''نہیں، وعدہ یہ کرو کہ آئندہ بھی بھولو گے؟''

حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

''تم بھولو گے، میں روٹھ جاؤں گی اور پھر مجھے اسی طرح سے منایا کرو گے۔''

ہم اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے بیٹھے رہے۔ سعد بھی اٹھ کر آ گیا تھا۔ نسرین نے کچن میں جا کر سعد کے لیے کچھ بنایا۔ میں کہتا رہا کہ تم آرام کرو میں بنا دیتا ہوں مگر وہ یہی کہتی رہی کہ اب ٹھیک ہو گئی ہوں۔ اس کا بخار واقعی اتر چکا تھا۔

میں نے اپنے لیے انڈے فرائی کیے۔ مچھلی تو پہلے ہی میں نے پکالی تھی۔ مل کر کھانا کھایا۔ کہنے لگی کہ رات یہیں رک جاؤ مگر مجھے صبح جاب پر جانا تھا، اس لیے التماس ٹھکرا دیا۔ مجھے جاتے دیکھ اس نے پوچھا۔ ''پھر کب ملو گے؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اگلے اتوار سینٹر آئی لینڈ چلیں گے۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''او کے تو پھر منانے کب آؤ گے؟''

میں نے سعد کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ منانا وغیرہ بھی مجھے نہیں آتا۔ سمیعہ کو بھی یہی گلہ رہتا ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اب کی بار سنڈے کو بھول نہ جاؤں اسی لیے میں ہفتے کی شام میں آجاؤں گا۔''

میں جب اس رات اپنے اپارٹمنٹ جانے کے لیے بس میں بیٹھا واپس آ رہا تھا تو سارے راستہ اسی کے بارے میں سوچ کر مسکراتا رہا۔

میں اس کے داخلے کے فارم لینے گیا تھا مگر اسے بیمار دیکھا تو فارمز کا کچھ نہ پوچھا۔ مجھے جلدی بھی نہ تھی اور ابھی اس کے داخلے میں بہت وقت تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ سب سو رہے تھے مگر سرجی کچن میں فریج کے قریب بیٹھے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو چونک گئے۔ میں حیران رہ گیا جب یہ دیکھا کہ وہ پیالے کو منہ سے لگائے دودھ پی رہے ہیں۔ دودھ میں جلیبیاں بھی ڈالی ہوئی ہیں۔ خلاف توقع مفتی بھی جلدی سو گیا تھا اور سرجی نے موقع غنیمت جانا اور کام دکھانے لگے۔

میرا ابھی سونے کا موڈ نہ تھا۔ رات کی خنکی میں پورا چاند نکلا تھا۔ میں باہر لان میں چیڑ کے درختوں تلے بینچ پر

PakiBooks.Site

بیٹھنا چاہتا تھا۔ میں نے سرجی سے کہا کہ اتنی دیر میں، میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں، آپ کوئی جیکٹ پہن لیں۔ ہم باہر بیٹھنے جا رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ بولے۔ ''جو ابھی کھایا پیا ہے اس کے بعد تو پہنی قمیص اتار پھینکنے کو جی کر رہا ہے اور آپ جیکٹ پہننے کا کہہ رہے ہیں۔''

پھر کچھ ہی دیر کے بعد میں اور سرجی باہر لان میں رکھی بینچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور سرجی نے اپنی بات رکھتے ہوئے جیکٹ تو نہ پہنی مگر سردی محسوس کر کے گرم چادر اوڑھے بیٹھے تھے۔ چیڑ کے درخت کے اوپر آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور کہیں کہیں بادل تیر رہے تھے۔ چاندنی چھن چھن کر درختوں سے ہوتی زمین کی نرم و دبیز گھاس پر پڑ رہی تھی۔ ایک روح پرور منظر تھا جس میں بیٹھ کر خاموشی دل و دماغ کو منور کر رہی تھی۔ مگر سرجی خاموش بیٹھنے نہیں آئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''نسرین کے پاس گئے تھے؟''

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر اثبات میں سر ہلایا تو بولے۔ ''چپ چپ ہو، سب ٹھیک ہے ناں۔''

یہ سن کر میں نے کہا۔ ''یار! وہ بیمار تھی۔ خفا تھی کہ میں نے اتنے دنوں سے فون بھی نہیں کیا۔''

''فون تو تم کو کرنا چاہیے تھا۔ جب تعلق بنا ہی لیا ہے تو نبھانے کا فن بھی آنا چاہیے۔'' وہ مسکرا کر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کیوں نہ سرجی کو سینٹر پارک لے چلوں۔ کچھ لمحے سوچتا رہا، پھر پوچھا۔ ''سرجی، سینٹر پارک کا نام سنا ہے؟''

مجھ سے سگریٹ لے کر ایک کش لگایا اور مسکرا کر بولے۔ ''نسرین کے ساتھ جا رہے ہو؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں۔''

وہ بولے۔ ''میرا سنڈے تو آف ہے مگر دیکھ لو کہیں رنگ میں بھنگ نہ پڑے۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے کون سی رنگ بازیاں کرنی ہیں جنہیں چھپاتا پھروں۔''

وہ تیار ہو گئے۔ ان سے کہا کہ میں خود تو ہفتے کے دن ان کے پاس چلا جاؤں گا اور وہ اتوار کو مجھے گیارہ بجے وہاں ملیں جہاں لیک او نٹاریو پر یونگ اسٹریٹ شروع ہوتی ہے یا پھر ختم ہوتی ہے۔

سرجی کو میں نے اندر سونے کے لیے بھیج دیا۔ میں اکیلا بیٹھنا چاہتا تھا۔

گو مجھے صبح جاب پر جانا تھا مگر میں اس ماحول سے بندھ چکا تھا۔ ایک نامعلوم سی اداسی روح پر چھائی ہوئی تھی۔ میں بہت بہادر بنتا ہوں کہ کبھی نہیں رویا مگر آج آنسو آنکھوں میں بھرے تھے۔ ان کی کوئی وجہ نہ تھی مگر رونے کو دل کر رہا تھا۔ وطن سے دوری، دوستوں اور رشتہ داروں سے دوری اکثر تڑپاتی ہے۔ کتنا بڑا فاصلہ بیچ میں تھا اور یہ فاصلے کبھی سمٹ بھی سکیں گے؟ یہ سوال دل چیر کر رکھ دیتا۔ ننھا سا پودا تو اکھاڑ کر دوسری زمین پر جڑیں پکڑ سکتا ہے مگر پرائی زمین پر تناور درخت کیسے لگ پائے گا؟ میری بھی کیا سوچیں تھیں کہ اپنی کچی گرد اڑاتی گلیاں اور ان میں کھڑے پانی، ابلتی دوپہر میں، تپتے دن، جھلستی ہوائیں اور کھولتی شامیں یاد آ رہی تھیں جب میں خنک ہواؤں میں بیٹھا تھا۔ مجھے اپنا گرد آلود آسمان یاد آتا تھا۔ میں شفاف آسمان پر چمکتا چاند دیکھ رہا تھا۔ دھواں بھرا ماحول یاد آ رہا جب میں اجلی فضا میں بیٹھا تھا۔ سڑک کنارے ریڑھیوں پر پھل بیچتے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس لوگ یاد آتے جب یہاں سپر مارکیٹ کو پھلوں سے بھرا دیکھتا۔

جب بھی میں پاکستان آتا ہوں اور جہاز افغانستان کی فضا سے ہندوکش پہاڑوں کو پار کرتا پاکستان میں داخل ہوتا ہے تو جسم کے روئیں روئیں میں خوشی بھر جاتی ہے۔ طیارہ جب اسلام آباد یا لاہور ایئرپورٹ پر نیچے ہوتا ہے تو میں کھڑکی کے باہر کے مناظر اپنی آنکھوں میں جذب کرتا جاتا ہوں۔ لاہور ایئرپورٹ پر ایک بار طیارہ نیچے ہوا تو جابجا میں نے نیلے دھبے بکھرے دیکھے۔ حیران تھا کہ یہ کیا ہیں۔ طیارہ اور نیچے آیا تو معلوم ہوا کہ وہ پلاسٹک کے نیلے ڈرم ہیں جو گھروں کی چھتوں پر پانی کی ٹنکی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ گو ایئرپورٹ پر پورٹر چالاکی دکھا کر کھال ادھیڑ رہے ہوتے ہیں مگر میرا ذہن کبھی پراگندا نہ ہوا۔ ایک بار پورٹر نے اندر بیلٹ سے باہر گاڑی تک سامان لے جانے کے کچھ پیسے طے کیے۔ ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی وہ بولا کہ میرا دوست باہر گاڑی تک آپ کو پہنچا دے گا۔ میں نے اسے معاوضے سے زیادہ ہی دے دیا۔ اس کا دوست یعنی دوسرا پورٹر میرا سامان گاڑی تک لایا تو مجھے لینے کے لیے آنے والے رشتے دار بھی ساتھ تھے۔ گاڑی میں سامان رکھا تو دوسرا پورٹر اپنا معاوضہ مانگنے لگا۔ میں بولا کہ پہلے ہی میں نے ادائیگی کر دی ہے تو وہ اکڑ گیا کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے تو اپنی مزدوری چاہیے، پہلے تو میں بہت حیران ہوا اور پھر ہنسنے لگا۔ پورٹر حیرانگی سے میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں نے اسے مزدوری دے دی۔ سب رشتے دار کہنے لگے کہ یہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ فراڈ کر رہا ہے۔ میں بولا۔ ''کبھی کبھی اپنوں سے دھوکا کھانا بھی اچھا لگتا ہے۔''

وہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے اس نے بے وقوف بنایا ہے مگر ہم وطن سے دور رہنے والے جب شام کے پرندوں کی طرح اپنے ٹھکانوں کو لوٹتے ہیں تو کون جانے ہمارے کیا جذبات ہوتے ہیں۔

ایک بار میرا جہاز لاہور ایئرپورٹ پر شام کے بعد اترا۔ میں نے رشتے داروں کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ میں ٹیکسی لے کر خود آ جاؤں گا، وہ تکلیف نہ کریں۔ میں کاؤنٹر پر کیب کے لیے گیا تو ان سے کہا کہ جتنے دن میں شہر میں ہوں مجھے ہر روز صبح سے شام تک کیب چاہیے ہوگی۔ ان کے ساتھ سب معاملات طے کر لیے۔ اگلے دن باوردی ڈرائیور کوئی نئی چمکتی ہوئی گاڑی لے آیا۔ میں نے کرتہ شلوار اور پاؤں میں چپل پہنی تھی۔ پاکستان کرنسی کے علاوہ قیمتی چیز میرا کیمرا تھا جو ایک شولڈر بیگ میں رکھا تھا۔ میں ہر بار لاہور آتا ہوں تو بابا بلھے شاہ اور میاں میر کے مزار پر جاتا ہوں۔ ڈرائیور کو میں نے بابا بلھے شاہ کے مزار چلنے کا کہا۔ سارا دن وہیں میں نے گزارا۔ درخت تلے بیٹھا ایک شخص بلھے شاہ کا کلام گا رہا تھا میں آنکھیں بند کر کے سنتا رہا۔ پھر میاں میر کے مزار کے کبوتروں کے ساتھ میں بھی لگا کبوتر بن کر وہیں کٹ کٹ کرتا بیٹھا رہا۔ جہانگیر کے مقبرے میں وہ درخت دیکھنے گیا جو جہانگیر کے دور میں لگے تھے۔ ان سارے دنوں میں، میں ڈرائیور کو کہاں سے کہاں لیے پھرتا رہا۔ ان مسجدوں میں جا کر سجدے کیے جہاں اب بھی دیئے جلتے تھے۔ پرانی گلیوں اور کوچوں میں پھرتا رہا کیونکہ اپنے وطن کا ایک ایک کونا مجھے پیارا ہے۔ جہلم میں قلعہ روہتاس کی پُرہیبت تنہائیوں پر بیٹھا رہا۔ جھاڑیوں کی دکانوں پر پرانی کتابیں کھنگال ڈالیں۔ لنڈے بازار کی دکانوں پر پرانی بوریوں میں بند کپڑے نکال نکال کر دیکھتا تھا۔ میں اپنی زندگی کے بہترین دن گزار رہا تھا جب میں اور ڈرائیور فٹ پاتھ پر لگے ٹھیلوں سے کھانا پلیٹوں میں لے کر کھڑے ہو کر کھاتے تھے۔ مجھے لاہور سے اگلے دن کسی اور مقام پر کوچ کرنا تھا۔ ڈرائیور مجھ سے بولا۔ ''صاحب! جھوٹ نہ بولنا کیا آپ واقعی امریکا سے آئے ہیں؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''تمہیں نہیں لگتا؟''

وہ بولا۔ ''امریکا سے آئے لوگ تو کہاں کہاں جاتے ہیں آپ تو مسجدوں، مزاروں اور لنڈے بازاروں میں گھوم رہے ہیں۔''

میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ کہاں جاتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''شہر کے گیسٹ ہاؤس میں اور بھی کئی مقامات ہیں کہیں تو آپ کو بھی لے چلتا ہوں۔''

کھوج تو میری زندگی میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ زندگی کے ہر کونے کھدرے کو ہمیشہ اپنی نظر سے دیکھنا چاہا ہے۔ جب صاحب حیثیت نہ بھی تھا تو اسی طرح گھوما پھرا کرتا تھا جیسے آج ڈرائیور کے ہمراہ آوارہ گردی کر رہا تھا۔ حیثیت بدل گئی مگر ذہن وہی تھا۔ میں نے ڈرائیور سے ہامی بھر لی۔ دل میں سوچا کہ یہ بھی دیکھوں کہ اس دنیا میں کیا کیا ہوتا چلا آیا ہے۔

ڈرائیور مجھے ایک صاحب ثروت علاقے میں لے آیا۔ ایک نیم تاریک گیسٹ ہاؤس جو بہت بڑے بنگلے میں بنا تھا، اس میں لے آیا۔ مجھے ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ خاصا سجا سجایا کمرا تھا مگر ایک وحشت برس رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ایسی چیز ہے جس کی یہاں کمی ہے۔ دل میں کوئی پھانس تھی جو متواتر چبھ رہی تھی۔ ڈرائیور ایک دو لوگوں کے ساتھ رازدارانہ انداز میں محو گفتگو تھا۔ مجھے ڈر خوف بالکل نہ تھا بس بے چینی تھی۔ میں کمرے کے در و دیوار کو دیکھتا کہ یہاں کسی کا خون ہوا ہے اور یہی محسوس کرتا تھا۔ مجھے وہ بیڈ گندگی کا ڈھیر لگتا تھا۔

پھر گیسٹ ہاؤس کا کارندہ میرے پاس آیا۔ اپنے موبائل فون پر لڑکیوں کی تصویریں دکھانے لگا۔ اس سے فون میں نے لے لیا اور خود وہ تصویریں دیکھنے لگا۔ کچھ کے بارے میں یہ کہتا کہ یہ ماڈل ہے، یہ اس ڈرامے میں آئی تھی۔ یہ اب فلموں میں آ رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان لڑکیوں کی آنکھیں کہ جیسے چراغ۔ ایسی تصویریں جوان ملزموں کی ہوتی ہیں جن کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا جاتا ہے۔ میں بغور ہر چہرے کو پڑھ رہا تھا۔ کچھ کی لکھائی مٹ رہی تھی، کچھ کی دھندلی پڑ چکی تھی اور بہت سوں کی پڑھی بھی نہیں جا رہی تھی۔ چہرے کا ایک ایک نقش فریادی تھا۔ تاثرات ایسے کہ ''آنکھوں میں نمی ہنسی لبوں پر۔ کیا حال ہے کیا دکھا رہی ہو۔''

PakiBooks.Site

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈرائیور سے کہا۔ ’’چلو......فوراً یہاں سے نکلو۔‘‘

ڈرائیو بولا۔ ’’صاحب انہوں نے ٹائم دیا ہے کوک پلائی ہے۔ عزت دی ہے یہ کیا سوچیں گے؟‘‘

میں نے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے نہایت سختی سے کہا۔ ’’میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں جو حساب کتاب کرنا ہے ان سے کرلو اور فوراً یہاں سے چلو۔‘‘

قصور ڈرائیور کا تو نہ تھا۔ وہ مجھے زبردستی تو نہ لایا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے وحشت ہو رہی تھی۔

قحبہ خانے تو ہر ملک کے ہر بڑے شہر میں ہیں مگر اپنے ملک میں یہ سب مجھے کھائے جا رہا تھا۔ میں اپنے جذبات کی روانی میں کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔

میں ٹورنٹو میں اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے لان میں بیٹھا سوچوں میں گم سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ذہن میں ماضی کے ورق بدل رہے تھے۔ اچھا لگتا ہے جب ماضی مجھے اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ تم ماضی میں زندہ رہتے ہو مگر ایسا نہیں ہے۔ میں تو دراصل ماضی میں رہتا ہوں۔ حال میں جیتا ہوں اور مستقبل کا زیادہ نہیں سوچتا۔

میں وہاں سے اٹھا تو خنکی بڑھ چکی تھی، شجر میری کہانیاں سن رہے تھے، چاند ساکن تھا اور رات کے تین بج رہے تھے۔

مجھے ہفتے کے روز نسرین کے پاس جانا تھا۔ جمعہ کے دن ہیمو سال سے تین بجے دوپہر مجھے چھٹی ہوئی۔ اس رات کو بارہ بجے شب میں سیکورٹی کی جاب پر گیا جو اگلے دن ہفتے کو دن بارہ بجے ختم ہوتی تھی۔

اکثر میں دن کی شفٹ کرتا تھا جو دن بارہ بجے سے رات بارہ بجے تک تھی لیکن کبھی کبھار رات کی شفٹ بھی کرلیتا تھا جو ایک عذاب مسلسل تھی۔ جب سونے کا وقت ہوتا ہے تو شفٹ شروع ہوتی ہے۔ صبح چار بجے نیند اڑ جاتی ہے، چھ بجے حواس کھو جاتے ہیں، آٹھ بجے دماغ کام کرنا بند کردیتا ہے اور دس بجے صبح اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ جب بارہ بجے دوپہر کی شفٹ تمام ہوتی ہے تو آپ گھر اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے پہنچتے ہیں۔

اس رات بھی ایسا تھا۔ سب قیدی اپنے کمروں میں محو خواب تھے اور ہم برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے جھوم رہے تھے۔ نیند کو بھگانے کے لیے میں ہر تھوڑی دیر بعد لنچ روم میں شیشے کی بڑی کھڑکیوں سے ایئرپورٹ روڈ پر چلتی ٹریفک کو دیکھتا۔ سامنے ایئرپورٹ پر لینڈ کیے طیارے کھڑے تھے۔ ان کو دیکھتا تھا۔ ایئرپورٹ کے ٹرمنل روشنیوں میں نہائے کھڑے تھے۔

رات کو بھی ایک سردار جی ہیڈ گارڈ تھے۔ اس کے ساتھ میری زیادہ ملاقات نہ تھی اور صرف سر کے اشارے سے بات ہوتی تھی۔ کاریڈور میں خاموشی تھی۔ قیدی کمروں میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور سیکیورٹی گارڈز کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کاہلی سے اٹھتا اور نیچے جاکر کافی یا چائے بنا لاتا۔ مجھے کرسی پر نیند کبھی نہیں آتی اور نہ ہی میں نے سونے کی کوشش کی۔

صبح کے چار بجے تھے کہ ہیڈ گارڈ نے پر فون کرکے کہا کہ میں بریک لے لوں۔

صبح کی نماز ساڑھے پانچ بجے ہوتی تھی اور جب بھی میں نے رات کی شفٹ کی تو نماز کے وقت پر ہی بریک لیتا تھا۔ نماز پڑھ کر چائے پی لی اور ساتھ ڈبل روٹی کے مزے تڑے چند سلائس کھائے۔

میں نے ہیڈ گارڈ سے یہی کہا کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد بریک لوں گا۔ سردار تھا، اڑ گیا، بولا۔ ’’تم کو ابھی بریک پر جانا ہوگا۔‘‘

مجھے اس کی ضد بلا جواز لگی۔ میں نے فون رکھا اور اس کے پاس چل کر گیا۔ اس سے پنجابی میں کہا۔ ’’آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان کے لیے نماز کتنی اہم ہوتی ہے۔ میں بعد میں چلا جاؤں گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ سب قیدی ویسے بھی سو رہے ہیں۔‘‘

انگلش میں وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ’’یہ کینیڈا ہے اور تم جاب پر ہو۔ جاب پر تم صرف انگریزی یا فرنچ بول سکتے ہو جو یہاں کی سرکاری زبانیں ہیں۔‘‘

میں نے اپنی بات انگریزی میں دہرائی اور اس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ’’بریک پر جانا ہے تو ابھی جاؤ......ورنہ بعد میں بریک نہیں ملے گی۔‘‘

میں نے لجاجت سے کہا۔ ’’سردار جی! آپ مجھے رعایت ہی دے دیں۔ نوازش ہوگی۔‘‘

مگر وہ تو ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اپنی سفید داڑھی کو سلجھاتے ہوئے میری آنکھوں میں اپنی سرخ آنکھیں ڈال کر بولا۔ ’’آج رعایت مانگ کر نماز پڑھنا چاہتے ہو، کل کہو گے میرے لیے مسجد بھی ہو اور......‘‘

اس نے مجھے مکمل طور پر بھڑکا دیا۔ طیش میں میری آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ میں اس کی ٹیبل پر دونوں بازو ٹکائے اور آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں اپنی نظریں گاڑھ لیں اور انتہائی غضب ناک لہجے میں پنجابی میں بولا۔

’’پہلا سردار دیکھا ہے جو مسلمانوں سے نفرت رکھتا ہے۔ میں تو تم سے درخواست کررہا تھا مگر تم نے تو اپنی مت مار دی۔ اب تو نہ میں سردار دیکھوں گا اور نہ تمہاری سرداری۔ اگر آج تو مجھے نماز سے نہ روک سکا تو پھر اپنے خون پر شک کرنا۔‘‘

میں بول تو زیادہ گیا تھا مگر جب اس کے چہرے پر جھکا یہ سب کہہ رہا تھا تو اس کی سانسوں سے مجھے الکوحل کی بو آئی تھی۔ سردار پیے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس نے جاب پر چڑھا رکھی تھی جس کی سزا جیل تھی۔ اب وہ میری گرفت میں آگیا تھا۔

میں نے زور سے کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے آبیٹھا۔ وہ خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔

میں بولا۔ ’’ابھی میں نیچے سپروائزر سے کہتا ہوں کہ تم نے چڑھائی ہوئی ہے اور مجھے نشے میں مذہبی عداوت دکھا رہے ہو پھر میں دیکھتا ہوں کہ تم یہاں کیسے بیٹھے ہو۔‘‘

میں جھٹکے سے اٹھا تو اس نے ایسا پینترا بدلا کہ میں خود حیران ہوگیا۔ اپنی کرسی سے اٹھا اور ہاتھ باندھ لیے۔ پنجابی میں بولا۔ ’’باؤ ندیم جانے دو یار، تیرے باپ کی عمر کا ہوں بس معاف کردے۔‘‘

میں تادیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا جہاں التجا تھی۔ میرے اعصاب ڈھیلے پڑے اور خود کو کرسی پر گرا دیا، اس کے تھرماس کی جانب اشارہ کرکے بولا۔ ’’اس میں ادرک والی چائے ہے؟‘‘

اس نے فوراً کاغذ کا گلاس بھر کر مجھے پکڑا دیا اور بولا۔ ’’باہر جاکر نمازیں کیا تہجد بھی پڑھ لے۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ سردار جب چڑھا لے تو ماں بیٹی بھی نہیں دیکھتا۔ جانے دے باؤ، چائے پی اور موجیں کر۔‘‘

بلیک میل کرکے تہجد پڑھنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے اپنی پوسٹ پر بیٹھ کر ادرک والی گرم گرم چائے پینے لگا۔ فجر کی نماز کا وقت ہوا تو بریک لے کر خاموشی سے نماز پڑھی اور دوبارہ پوسٹ پر آبیٹھا۔

جاب ختم کرکے دوپہر ایک بجے لاغر سا گھر پہنچا۔ شام کو نسرین کی طرف جانا تھا۔ اس سے وعدہ کر بیٹھا تھا۔ میں وعدہ نہ کرتا اگر مجھے اس کے داخلے کے فارم وغیرہ چیک نہ کرنے ہوتے۔ اس دن وہ بیمار تھی تو میں کاغذات نہ دے سکا تھا۔ میں نے شام اس کے گھر جانے کا اس لیے کہا تھا کہ سب فارم فائل کرکے اسے دے دوں گا تاکہ وہ بذریعہ ڈاک انہیں کالج کو میل کرسکے۔

یہ کام بھی کرنا ضروری تھا۔ اس کو زیادہ لیٹ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپارٹمنٹ خالی پڑا تھا۔ سیکیورٹی والا یونیفارم پہنے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ پوری رات کا جاگا ہوا تھا اور اب نیند بھی غائب تھی۔ کسی طرح سے بمشکل آنکھ لگی اور پھر مطیع اللہ نے آکر اٹھا دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی سویا ہوں مگر وقت دیکھا تو شام کے چھ بجے تھے۔ سر بھاری تھا اور جسم ٹوٹ رہا تھا۔ گو چار گھنٹے سوتا رہا تھا مگر محسوس ہوتا تھا کہ پانچ منٹ بھی نہیں سویا۔

مطیع اللہ خود ہی بولنے لگا۔ ’’زندگی کیا سے کیا ہوگئی۔ اچھے بھلے اپنے ملک میں عزت سے زندگی گزار رہے تھے۔ تنخواہ اتنی تو تھی کہ گزارہ ہو رہا تھا۔ بڑا شوق چڑھا تم کو بھی اور مجھے بھی کہ کینیڈا جانا ہے۔ سوچا یہ تھا کہ زندگی آرام اور آسائشوں میں گزرے گی۔ دور کے ڈھول اچھے لگتے ہیں۔ اب ہم کسی کو پاکستان میں بولیں کہ وہاں ٹھیک ہو جہاں ابھی ہو تو سمجھتے ہیں کہ خود تو چلے گئے اور ہمیں روک رہے ہیں۔ وطن اور گھر چھوڑا، رشتے دار اور دوست چھوڑ آئے اور یہاں آکر سب بدل گیا۔ نہ یہاں رہ سکتے ہیں اور نہ واپس جاسکتے ہیں۔‘‘

وہ بولتا جا رہا تھا اور میں آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ پھر میں اس سے بولا۔ ’’یار دماغ مت کھاؤ۔ ذرا کپڑے تبدیل کرکے چائے بنا دو۔ پہلے ہی سر بھاری ہو رہا ہے۔‘‘

وہ حیرت سے بولا۔ ’’میں تو سمجھا تھا ایسی باتیں تم کو اچھی لگتی ہیں مگر آج تو تمہاری کیسٹ بھی الٹی چل رہی ہے۔‘‘ وہ کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا اور میں کمرے کی ڈور سے باہر ان جھاڑیوں کو دیکھنے لگا جو سردیوں میں سوکھی اور مردہ ٹہنیاں تھیں اور آج انہی ٹہنیوں نے سبز پتوں اور سفید پھولوں کے ہار پہنے تھے۔ میں تادیر ان پھولوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر شاور لیا تو تروتازہ ہوگیا۔ اچھے کپڑے پہنے، خوشبو لگائی، بال بنائے اور لیونگ روم میں آبیٹھا۔

مطیع اللہ نے میری چائے کمپیوٹر ٹیبل پر رکھی تھی۔ سر جی بھی آچکے تھے۔ ہم تینوں چائے پینے لگے۔ اتنے میں شہباز بھی آگیا۔ مفتی بہن کے گھر گیا تھا۔ وہ جب بھی بہن

PakiBooks.Site

کے گھر جاتا تو مطیع اس کے میٹریس پر قبضہ کر لیتا۔ وہیں سوتا جاگتا اٹھتا بیٹھتا تھا۔ مفتی کے آنے سے پہلے اسے پہلے کی طرح صاف کرتا اور پھر انجان بن کر مفتی کے کان بھرنے شروع کر دیتا۔

میں چائے پی رہا تھا کہ شہباز میری جانب بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ اتنا بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہیں۔ لگتا تو ایسا ہے کہ رات چاند کے روبرو گزاریں گے۔“

میں خاموش بیٹھا بے پروائی سے چائے پیتا رہا مگر سر جی کہاں چوکنے والے تھے، بولے۔ ”کچھ لوگوں کی نظر دوسروں کی کمائی پر ہوتی ہے اور اپنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مطیع اللہ ٹھیک کہتا ہے کہ ہونٹ چاٹنے سے پیاس نہیں بجھتی۔“

سر جی نے شہباز کے ساتھ ساتھ مطیع کو بھی بھڑکا دیا تھا۔ پہلے شہباز بولا۔ ”میں نے آج تک کسی کی تنخواہ تک نہیں پوچھی۔ ندیم بھائی سامنے بیٹھے ہیں پوچھ لیں ان سے، کبھی ان سے نہیں پوچھا کتنے ڈالر بنا رہے ہیں۔ میں خود اچھی جاب کرتا ہوں کوئی گھر پر نہیں پڑا رہتا۔“ پھر وہ مطیع کی جانب دیکھتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”تم نے بھی میرے خلاف پیچھے پیچھے باتیں کرنا شروع کر دیں۔“

مطیع اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”تم تو پوری شیطان کی پوچھل ہو۔ قرآن اٹھاؤ کب کہا تھا کہ شہباز کو ہر وقت ترے (پیاس) لگی رہتی ہے۔“

سر جی کے کہنے کا مقصد تو یہ تھا کہ تم بھی باہر جا کر کسی سے ملو اور یہ گھر بیٹھے ندیدہ پن نہ دکھاؤ۔ مگر یہاں جھگڑا شروع ہو گیا۔

”لوگوں کو (یعنی شہباز) کو پیاس کہاں لگتی ہے۔ ہمیشہ بھوک ہی لگتی ہے۔ ایک تو مایا بے چاری کے ہر روز کین سینٹر میں برگر کھا جاتا تھا، لوگوں کا تو کچھ نہیں بگڑا پر نری بدنامی ہمارے حصے میں آئی۔“ سر جی بے حد خفا ہو کر بول رہے تھے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس سے قسم اٹھوا کر پوچھو۔ اس دن یہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ کوئی لڑکی مجھ سے دوستی نہیں کرتی۔ یہ جوانی اور مانجھا ڈھیلا!“

میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ جوانی اور مانجھے کا کیا مطلب ہے۔“

”سستی اور کاہلی سے دماغ بھی جسم کی طرح موٹا ہو جاتا ہے۔ جوانی میں لوگ اسمارٹ رہتے ہیں اور یہ میرا منہ بھی کالا کراتا پھرتا ہے۔“

پھر جو جھگڑا شروع ہوا کہ اللہ امان، میں نے بوٹوں کے تسمے کسے اور باہر نکل آیا۔ آج بھی سر جی ایک طرح سے میرے کام آ گئے تھے ورنہ شام کے وقت مجھے تیار ہو کر باہر جاتے دیکھ کر سب کوئی نہ کوئی سوال ضرور کرتے۔ جھوٹ میں تو سننا نہیں چاہتا تھا اور اس طرح ان کے سوالوں سے صاف بچ کر نکل آیا۔ سر جی کو پہلے ہی سے بتایا تھا کہ کل گیارہ بجے لیک فرنٹ پر ملیں گے جہاں ینگ اسٹریٹ ختم ہوتی ہے۔

ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ کہیں کہیں بادل چھائے تھے۔ بلند اپارٹمنٹ بلڈنگز خاموش اور پُرسکون تھیں۔ جہاں کہیں بادلوں سے ہٹ کر آسمان دکھتا تو وہ نیلا اور چمکدار تھا۔

جب نسرین کے گھر پہنچا تو رات اتر آئی تھی اور سڑکوں پر روشنیوں کا سیلاب رواں تھا۔

مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کہاں سے آ رہے ہو؟ اتنی دیر کیوں کر دی؟“

سوالات اس کے الفاظ میں کم مگر آنکھوں میں زیادہ تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”دیر تو کبھی کبھی ہو ہی جایا کرتی ہے۔ یہ بھی تو دیکھو کہ پہنچ تو جاتا ہوں۔“

”اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ آج بن ٹھن کر آئے ہو۔ سوچا کہیں راستے میں رکتے ہوئے تو نہیں آئے؟“

”تمہاری طرف آتے ہوئے راستے میں کوئی پڑاؤ نہیں پڑتا جہاں رک جاؤں۔ بڑا سیدھا راستہ ہے آتا ہوں تو بھٹک نہیں سکتا۔“ میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ میرے قریب آ بیٹھی۔ اتنے میں سعد دوڑتا ہوا کمرے سے نکلا اور میرے گلے میں جھول گیا۔ یہ بچہ مجھے بھانے لگا تھا۔ اس سے مجھے اپنے بچوں کی خوشبو آتی تھی۔ اسے خوش اور ہنستا دیکھ کر میں نہال ہو جاتا تھا۔ نسرین کے ساتھ رہنے کی ایک بڑی وجہ وہ بھی بن گیا تھا۔ اس کا مستقبل سنوارنا مجھے اپنی ذمہ داری محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ چائے بنا لائی۔ میں گرم چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا کہ اتنے میں بادل اپارٹمنٹ کی کھڑکی پر آ کر برسنے لگے اور وہ گرم سموسے بھی تل لائی۔ میں نے سموسہ پلیٹ میں ڈالا اور مگ اس پر رکھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہوائیں پانی کے قطرے لیے مجھ سے کھیلنے لگیں۔ وہ سامنے پارک کے درختوں اور پودوں پر لگے پھولوں سے خوشبو چرا کر بارش کے پانیوں کو ساتھ جھومتی آ رہی تھیں۔ میں بھی سوچتا کہ نہ جانے پانیوں میں خوشبوؤں کا عرق کس نے ملایا ہے۔ وہ پیچھے رہ گئی تو چل کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی، بولی۔ ”تم رومانٹک ہو زیادہ کہ بارش؟“

”نہ میں اور نہ بارش۔ بلکہ تم ہو تمہاری موجودگی میں بارش بھی سروں میں گرتی ہے۔“

وہ سرشار ہو گئی۔ ستارے اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔ لڑکی تھی جبھی اظہار اسے اچھا لگا، بولی ”ذرا پھر سے بولو۔ میں نے سنی نہیں۔“

میں چائے کا گھونٹ بھر کر بولا۔ ”تم میں یہ بڑی خوبی ہے کہ میرے دل کو حدود سے لامحدود کر دیا۔ اس کے اندر تم نے کسی سے جگہ چھینی نہیں بلکہ اپنی جگہ خود بنالی۔ بلکہ بہت کھلی جگہ بنالی۔“

”تو پھر رومانٹک میں کس طرح سے ہوئی؟“ وہ بولی۔

”زبردستی تو کوئی کسی کے دل میں نہیں گھس سکتا۔ ہر راستہ تو بڑے قرینے سلیقے سے بنایا جاتا ہے۔ یہ در ٹھوکر سے نہیں بلکہ پیار کے لمس سے کھلتے ہیں۔ دلوں کی زمین تو مسجد کا صحن ہوتی ہے جہاں پاک ہو کر قدم رکھے جاتے ہیں اور پاکیزگی صرف پیار میں ڈھل کر حاصل ہوتی ہے۔“

”تم بے باک نہیں شرمیلے ہو، یہ بھی نہیں جتا سکتے کہ مجھ سے پیار اگر کرتے ہو تو کتنا کرتے ہو، اسی لیے تم سے زیادہ پوچھتی بھی نہیں۔ تمہارے اظہار میں بھی میں نہیں ہوتی بلکہ تم آس پاس کے ماحول کا سہارا لے کر بات کرتے ہو۔“ پھر وہ بے خود ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی، بولی ”تم جب کہتے ہو کہ بادلوں کے رنگ کتنے خوب صورت ہیں تو میں بادل بن جاتی ہوں۔ جب کہتے ہو کہ چاند کتنا چمک رہا ہے تو چاند کی چاندنی بن جاتی ہوں۔ جب سورج ڈھلنے کے تمام رنگ تمہارے چہرے پر دیکھتی ہوں تو میں اس کے ہر رنگ میں ڈھل جاتی ہوں۔ جب پرندے فضا میں زقندیں بھرتے ہیں تو پر مجھے لگ جاتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم بھی نہیں کہ میں وہاں ہر جگہ ہوتی ہوں جہاں تمہاری نظر لگی ہوتی ہے۔“

میں نے پلیٹ میز پر رکھی اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”نسرین! کتنا بولنے لگی ہو اور......اور کتنا اچھا بولنے لگی ہو۔ کبھی تو ایک سے دوسری بات بھی نہیں کر سکتی تھی مگر آج بولی تو کمال کر گئی۔ پتا نہیں تمہاری باتوں میں اتنا سوز کیسے آ گیا۔ میں ساری رات جاب کرتا رہا۔ واپس دوپہر کو گھر پہنچا تو چند گھنٹے بھی نہ سو سکا۔ یہاں آیا تو تھکاوٹ سے ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ کہ مرد گھر آئے تو عورت کے چند میٹھے بول اس کی تھکاوٹ بہا کر لے جاتے ہیں۔ تم پیار میں گندھ کر بنی ہو اور آج میں بے حد شرمندہ ہو رہا ہوں کہ تمہیں وہ سب نہیں دے سکتا جس کی تم مستحق ہو مجھے معاف کر دو۔“

یہ کہہ کر میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمکتے تاروں کی دمک بڑھ کر اس کے چہرے پر پھیلی تھی۔ اس کی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی ٹھہر گئی تھی۔

میں پھر بھاری قدم اٹھاتا صوفے پر گر گیا جہاں سعد اپنا اسکول ورک کر رہا تھا۔ اس سے اس کی نوٹ بک لے کر سامنے کافی ٹیبل پر رکھی اور اسے گلے لگا لیا۔ میری آنکھیں نم تھیں۔ دل سے کہا یا اللہ میری مدد کرنا اور اس ماں بیٹے کی حفاظت کرنا۔ میں اسے سینے سے لپٹائے صوفے پر آنکھیں بند کیے لیٹ گیا۔ وہ بھی مجھ سے چمٹا خاموش پڑا رہا۔

اسے معلوم تھا کہ میرا سعد کو پیار کرنا صرف سعد کے لیے نہیں اس کے لیے بھی ہے۔ میں اس کے پیار سے، اس کے بے پناہ قرب سے ڈرتا تھا۔ اس کی قربت میں جھلسنا مجھے گوارا تھا مگر جل کر خاک ہونے سے ڈرتا تھا۔ سعد کو میں ویسے بھی اپنے ساتھ لگائے رکھتا تھا مگر جب بھی نسرین کے پیار میں جلنے لگتا تو سعد کو اپنے ساتھ بھینچ لیتا۔ وہ بھی میری اس عادت کو سمجھنے لگی تھی اور اسی پر راضی اور خوش ہو جاتی تھی۔ اس کے سر پر کوئی سائبان نہ تھا تو میرے سائے میں بھی مطمئن ہونا چاہتی تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح کرسی پر پاؤں ٹکائے، ہم دونوں کو لپٹے دیکھ رہی تھی۔ سعد میری بانہوں کے نرغے میں میرے سینے پر لیٹا تھا۔ میں نے اس کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا تو مسکرائی، بولی۔ ”اتنے تھکے ہوئے تھے تو کل صبح آ جاتے۔ آج رات آرام کر لیتے۔ میری خاطر چلے آئے۔ کیوں اتنی تکلیف میرے لیے اٹھاتے ہو؟“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”تمہارے لیے کہاں آیا ہوں۔ اپنے مطلب کے لیے آج آیا ہوں۔“

”اپنے مطلب کے لیے؟“ مسکرا کر گھورتے ہوئے پوچھا۔

میں نے آنکھ مارتے ہوئے اسے کہا۔ ”اپنے داخلے کے فارم اور دوسرے کاغذات تو ذرا لے آؤ۔ میں بھی دیکھوں کہ میری اس موم کی گڑیا نے کتنی غلطیاں کی ہیں۔“

PakiBooks.Site

اٹھتے ہوئے وہ بڑی اپنائیت سے بولی۔ ”تمہارے پیار کا یہی انداز مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرے داخلے کے لیے پریشان تم ہو۔ مجھے بیمار دیکھ کر خود مہینوں کے بیمار دکھائی دینے لگے تھے۔ چند گھنٹوں میں میرا اتنا خیال کیا کہ میں ٹھیک ہوگئی پھر بھی روز فون کر کے پوچھتے رہے۔ ڈانٹتے رہے تاکیدیں کرتے رہے۔ یہی تو پیار ہوتا ہے جسے تم چھپا کر رکھتے ہو مگر یہ تم سے دب نہیں سکتا۔ تمہاری باتوں، لہجے اور آنکھوں سے چھلکنے لگتا ہے۔“

وہ اٹھ کر چلی گئی اور سعد پر میری بانہوں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

وہ اپنے فارمز اور سرٹیفکیٹ، ڈگری اور دوسرے کاغذات لے آئی۔ میں نے سعد کو ساتھ صوفے پر بٹھا دیا۔

میں اس کے لیے بزنس اسکول آف ہمبر (لیک شور کیس) کی پراسپکٹس لایا تھا۔ اسے دینے سے پہلے میں اس کو بغور دیکھ چکا تھا۔ اس کو کچھ نہیں سمجھایا تھا کہ یہ کیا کورس ہے۔ کتنے سالوں کا ہے، ڈگری ہوگی یا ڈپلوما اور فیس کتنی ہو گی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود یہ سب دیکھے اور خود ہی سمجھے۔

میں اس کے پُر کیے فارمز دیکھتا رہا۔ فارم دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لڑکیاں اپنی عمر چھپاتی ہیں مگر تم نے تو فارم پر خود لکھ کر مجھے بتا دی ہے۔“

مجھے کہنی مار کر بولی۔ ”تم سے تو پھر بھی چھوٹی ہوں بلکہ بہت چھوٹی ہوں۔“

پھر ہنستے ہنستے بولی۔ ”تم اپنی عمر کے کبھی نہیں لگے۔ کبھی عمر سے چھوٹے لگے اور کبھی بڑے۔“

”وہ کیسے؟“

”جب ڈانٹتے ہو تو بڑے لگتے ہو اور جب شرماتے ہو تو چھوٹے لگتے ہو۔“

یہ سن کر مجھے خود ہنسی آگئی۔

پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ دو سال کا ڈپلوما ہوگا یہ تو چار سال کی ڈگری ہے۔“

میں صرف ”ہوں“ کہہ کر اس کے دوسرے کاغذات دیکھنے لگا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے یونیورسٹی آف ٹورنٹو سے اپنی ڈگری کی تصدیق بھی کرائی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر زیادہ تھی کہ اس نے کینیڈا آنے سے پہلے ہی یہ کام کروا لیا تھا۔ اس کا ٹرانسکرپٹ دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے انگلش اور میتھ پڑھا تھا اور دونوں میں بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں داخلے کے لیے ان دو مضامین میں اچھے نمبروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تک سب ٹھیک تھا۔

یہ آٹھ سمسٹرز کا پروگرام تھا۔ یعنی چار سال کی ڈگری تھی۔ ہر دو سمسٹرز کی فیس کینیڈین کے لیے کم تھی مگر غیر ملکیوں کے لیے بہت زیادہ، بزنس اسکول آف ہمبر میں ہر اسٹوڈنٹ کو کونسلر ملتا ہے جو آپ کے لیے کورس کی مناسبت سے مدد کرتا ہے۔ ہمبر کالج خود بھی گرانٹ دیتی تھی اور ساتھ اونٹاریو گورنمنٹ کے علاوہ فیڈرل گورنمنٹ بھی قرض دیتی تھی۔ نسرین کا اسٹیٹس سنگل مدر کا تھا تو صوبائی حکومت اس کو رہائش کے علاوہ بچے کے لیے ڈے کیئر کا خرچا اور گھر کی ضروریات کے ساتھ اور بھی فنڈنگ کرتی۔ جب یہ ڈگری لے کر جاب پر آجاتی تو آسان اقساط پر قرض لوٹا دیتی۔ مرکزی حکومت تو عموماً اپنا قرض معاف بھی کر دیتی تھی اور صوبائی حکومت پر کام بڑے طریقے سے کروایا جا سکتا تھا۔ سنگل مدر کی حیثیت سے نسرین کو بہت مراعات مل سکتی تھیں جس سے وہ لاعلم تھی۔ مجھے بھی تب معلوم ہو سکا تھا جب مائیکرو اسکل سینٹر جا کر میں نے کھوج لگایا تھا۔

میں نے نسرین کو سمجھایا کہ تم نے ڈگری تو بہر حال لینی ہی تھی۔ دو سالہ ڈپلوما سے بہتر ہے کہ چار سال کی ڈگری ہی لے لو۔ چار سال گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم کو تیسرے سال کے بعد بمعہ تنخواہ کے انٹرشپ کسی کمپنی میں مل جائے گی اور عام طور پر وہ کمپنی جاب بھی آفر کر دیتی ہے۔

اس کو بتایا کہ کون سے کاغذات فارم کے ساتھ بھیجنے ہیں اور جب انٹرویو کی کال آئی تو وہاں کونسلر سے مل کر قرض حسنہ کے لیے درخواست دے دینا۔ جب داخلہ ہو جائے تو ہیومن ریسورس کینیڈا میں جا کر سعد کے لیے بے بی سٹنگ، رہائش اور دوسرے خرچ کے لیے فارمز بھر کر دے دینا، بلکہ میں خود تمہارے ہمراہ جاؤں گا، جب تمہارا انٹرویو ہوگا اور ہر جگہ جہاں تم کو جانا ہوگا میں بھی تمہارے ہمراہ رہوں گا۔

کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی۔ ”یہ سب تو ٹھیک ہے......مگر......“

میں نے پوچھا۔ ”مگر کیا؟“

وہ بولی۔ ”مگر یہ کہ کھانا نہیں کھانا؟ تمہیں بھوک نہیں لگی؟“ یہ کہہ کر ہنس پڑی۔

مجھے واقعی بھوک لگی تھی۔ اس سے بولا کہ جلدی سے کھانا لگا دو۔ خود واش روم میں جا کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔

یہاں کے موسم بھی عجیب ہیں۔ ابھی مینہ برس رہا تھا اور ابھی دیکھا کہ بادل لوٹ چکے ہیں۔ بدلیوں سے چاند کبھی نظر آتا اور کبھی چھپ جاتا۔ باہر ہر چیز دھلی دھلی لگ رہی تھی۔ ہم نے کھانا کھا لیا تھا۔ وہ اپنے اور سعد کے لیے بغیر مرچوں کے سالن بناتی اور میرے لیے مصالحے دار کھانا تیار کرتی۔ اب آہستہ آہستہ مرچوں والا کھانا کھانے لگی تھی۔

اس نے سعد کو سلا دیا تھا کہ کل سینٹر پارک جانا ہے تو وہ اچھی نیند لے لے۔ بچہ تھا تو لیٹتے ہی سو گیا تھا۔

اس سے پوچھا۔ ”سعد نیند میں جاگتا تو نہیں؟“

”اس نے جواب دیا کہ نہیں وہ اب صبح ہی اٹھے گا۔“

میں نے کھڑکی سے اسے سڑک کے دوسری جانب پارک دکھاتے ہوئے کہا۔ ”کتنا خوب صورت نظر آرہا ہے یہ پارک، اگر ممکن ہو تو میرے ساتھ واک پر چلو ورنہ مجھے اکیلے جانے کی اجازت دے دو۔“

لگاوٹ سے بولی۔ ”میں تو ساتھ چلوں گی۔ کبھی کبھار تو ملتے ہو اور اس میں بھی اپنے آپ کو تنہا کر لوں۔ مجھے اگر سعد کے اٹھ جانے کا خدشہ ہوتا تو ہرگز نہ جاتی مگر تم کو بھی نہ جانے دیتی۔“

میں اس کے کاغذات سمیٹ رہا تھا۔ کاغذات میرے ہاتھ سے لے لیے اور سوچ کر بولی۔ ”اگر تم کو روک لیتی تو شاید رک جاتے مگر بیٹھے یہاں ہوتے اور دل پارک میں اٹکا رہتا۔“

”تو چل رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں کیونکہ سعد نہیں اٹھے گا اور یہ جگہ محفوظ بھی ہے۔ اکثر وہ سوتے سوتے جب اٹھتا ہے تو میں گروسری پر ہوتی ہوں۔ وہ عادی بھی ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

وہ ٹراؤزر پر شرٹ پہنے اندر کمرے سے نکلی۔ سیاہ رنگ کی ہلکی جیکٹ ڈال کر اس نے بال باندھ لیے تھے۔ میں شوز چڑھا چکا تھا۔ اس نے اپنے کینوس کے شوز پہنے اور ہم باہر کا دروازہ لاک کر کے نیچے اتر آئے۔ خاصا بڑا پارک تھا۔ پختہ اینٹوں سے بنی خوب صورت بل کھاتی روشیں تھیں۔ ان کے کناروں پر پھولوں بھرے درخت تھے۔ بیچ میں کھلی گھاس کے قطعے جہاں کئی درخت کھڑے تھے۔ روشوں کے کنارے درختوں تلے پھولوں بھری جھاڑیاں کئی رنگ کے پھول اٹھائے خوشبوئیں بکھیر رہی تھیں۔ روشوں کے ساتھ اور گھاس کے ٹکڑوں میں درختوں تلے اور کہیں ذرا ہٹ کر لکڑی کے بینچ پڑے تھے ملگجا اندھیرا تھا اور پارک میں کہیں کہیں ہلکی روشنی پھینکتے لیمپ پوسٹ تھے۔

بارش کے بعد پھولوں اور درختوں کے پتوں کے رنگ اور زیادہ نمایاں ہوگئے تھے۔ ہر چیز نومولود لگ رہی تھی۔ پتے اور ٹہنیاں چلتی ہواؤں سے سرگوشیاں کرتی تھیں۔

فضا میں پھیلی خوشبو کی مہک اتنی تیز تھی کہ مجھ پر جذب وکیف کی کیفیت طاری ہوگئی۔

میں نے نسرین سے پوچھا۔ ”تم تو یہاں آتی رہتی ہو گی۔ دل کرتا ہے تمہارے گھر کے سامنے یہیں اپنا ٹینٹ لگا لوں۔“

”سعد کو لے کر میں اکثر آجاتی ہوں مگر کبھی شام کے بعد نہیں آئی۔ اس وقت تو اس کی خوب صورتی ہی کچھ اور ہے۔“ پھر ہنس کر بولی۔ ”جی کرتا ہے کہ میں بھی کیمپنگ کروں۔ یاد ہے جب کیئن سینٹر میں تم الزبتھ کو اپنا Resume دکھا رہے تھے اور وہ تمہیں کیمپنگ کی جگہیں بتا رہی تھی پھر میں نے یہی کہا تھا کہ مجھے بھی ساتھ لے جانا اور تم نے ہامی بھر لی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے۔“

”تم ان دنوں مجھ سے مکمل بے پروا تھے۔ یہ میرا یقین کروانہی دنوں میں تمہارے قریب آگئی تھی۔“

”وہ مارک یاد ہے، پولینڈ والا۔ ہر وقت میرے کان میں یہی کہتا رہتا تھا کہ اس لڑکی سے دوستی کرنا تمہارے لیے مشکل نہیں۔ تمہیں دیکھتی رہتی ہے۔ پر میں یہ سمجھتا کہ مذاق کر رہا ہے۔ اتنی پیاری لڑکی مجھ پر مہربان کیوں ہوگی۔“

”جی ہاں! میں دیکھتی رہتی تھی۔ وہ ہر بار تمہارے کان میں کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہوتا اور تم ہنس پڑتے تھے۔“

ہم ایسی ہی باتیں کرتے پھولوں سے لدے پھندے درختوں تلے پختہ راستے پر چلتے جا رہے تھے۔ ارد گرد لوگ تھے مگر کم تھے۔ اکثر جوڑوں کی شکل میں یا تو گھوم پھر رہے تھے یا پھر کسی بینچ پر بیٹھے بغل گیر تھے۔ آسمان پر بڑا چمکتا چاند کبھی کالی بدلیوں کو چیر کر باہر نکل آتا اور کبھی بدلیاں اٹکھیلیاں کرتیں اسے اپنی آغوش میں چھپا لیتیں۔ چاند تھا اس لیے چھپ کر بھی بادلوں کے کنارے منور کر جاتا تھا۔

”ہوا میں کتنی زیادہ خوشبو ہے۔ حیران ہوں کہ فضا بھی ایسی معطر ہو سکتی ہے۔“

اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں حیران نہیں، ہوائیں مہکتے سندیسے تب لاتی ہیں جب تمہارے جیسی نازک اور خوب صورت لڑکی ساتھ ہو۔“ میں کہہ کر چپ ہوگیا۔

PakiBooks.Site

بے خود ہو کر کہنے لگی۔ ''خاموش کیوں ہو گئے۔ اپنے اوپر بولنے کی پابندیاں تو مت لگاؤ۔ مجھ سے جھوٹ بھی بولو، فلرٹ کرو یا پھر دھوکا دے دو۔ اپنی باتیں اپنے اندر دبا کر کیوں رکھتے ہو۔ کیا میں اتنی حقدار بھی نہیں کہ تمہارے منہ سے اپنے لیے پیار کے بول بھی سن سکوں۔''

''ہائیڈ پارک کی بینچ پر اور پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی کی جھیل کے ریتیلے کنارے پر بیٹھے ہوئے میں نے تمہارے پیار کا اقرار کیا تھا۔ مرد اقرار کر کے عملی طور پر اسے ثابت کرتا ہے۔ میرے لہجے یا لمس میں کبھی اکتاہٹ محسوس ہو تو بتانا ورنہ یہی سمجھنا، یہ ہاتھ میں نے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میں کوئی نوخیز لڑکی نہیں کہ ہر قدم پر تم سے پیار بھری باتوں کی توقع کروں۔ اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ اپنے لیے تمہارے چہرے پر پریشانی کی سلوٹیں دیکھ کر اسی میں تمہاری ان کہی سب باتیں آسانی سے پڑھ لیتی ہوں۔''

میں نے لان میں درختوں تلے رکھے بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

گھاس پر قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ یہ زمین بھی میری طرح ہے، کتنا مینہ برسا مگر سارا پانی جذب کر گئی۔

ہم گھاس کے فرش پر موتیوں کے قطروں کو روندتے چیڑ اور میپل کے درختوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس کی چال میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ وہ کسی شہزادی کی طرح چلتی تھی۔ کمر کمان کی طرح سیدھی اور سر اٹھا ہوا۔ وہ بینچ پر بیٹھی اور میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بیٹھی ایسے دکھتی تھی جیسے چودھویں شب کی چاندنی میں سنگ مرمر کا کوئی مجسمہ۔ مجھے سب کچھ کوئی خواب لگ رہا تھا جیسے ذرا سا بھی کھڑکا ہوا تو یہ ٹوٹ جائے گا۔ چیڑ کے نوکیلے پتے ہوا سے سرسراتے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں سے چاندنی چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ نرم و دبیز گھاس پر کہیں چاندنی کی روشنی تھی اور کہیں ٹہنیوں اور پتوں کے سائے، شاخوں سے لگے معطر پھول ہوا سے جھومتے تھے۔ یہ خوشگوار لمحے ہم دونوں کے لیے یکساں تھے۔

میں نے جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ لائٹر کے شعلے نے سگریٹ کو سلگا دیا۔ میں سعد کے سامنے یا اس کے گھر سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ یہ میری عادت سے واقف تھی تبھی مجھے ٹوکتی نہ تھی۔ اس کے قریب میں سگریٹ کا دھواں نہیں چھوڑتا تھا۔ ایک بار اس نے پوچھا کہ جب بھی سگریٹ پیتے ہو تو ایک فاصلہ کیوں رکھ لیتے ہو۔

میں نے جواب دیا۔ ''سنا ہے تاج محل دھوئیں سے آلودہ ہو رہا ہے۔ تمہیں تو سگریٹ کیا سارے زمانے کے دھوئیں سے بچانا ہے۔''

وہ میری بات سمجھ کر بھی انجان بن گئی تھی۔ میں گو اس سے اقرار نہ کرتا تھا مگر بات جب اس کی خوب صورتی کی آتی تو اختصار سے کام بھی نہ لیتا تھا۔ بلا جھجک دل کی بات کہہ ڈالتا تھا۔ ایک بار اس کے خوب صورت نازک ہاتھ پکڑے قدرت کی کاریگری دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک بار زور سے پکڑا تھا تو میری انگلیوں کے نشانات اس کی جلد پر ثبت ہو گئے تھے پھر اس کے ہاتھوں کو کبھی زور سے نہیں پکڑا۔ اس نے پوچھا کہ میری گرفت مضبوط کیوں نہیں؟ اسے سمجھانا پڑا۔ ''تمہارے ہاتھ اتنے نازک ہیں جیسے کانچ کے بنے ہوں۔ زور سے پکڑوں تو ڈر رہتا ہے کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ کیا ایران میں سب لڑکیوں کے ہاتھ کانچ کے بنے ہوتے ہیں؟''

میں نے سگریٹ ختم کی اور اس کے ساتھ بینچ پر آ بیٹھا۔

اس کی نگاہوں میں جادو اور مسکراہٹوں میں دلآویزی تھی۔ ٹورنٹو کا سارا حسن ہمارے اردگرد پھیل گیا تھا۔

وہ بولی۔ ''تم میرے ساتھ ہو تو میں نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔ پھر تم کیوں بضد ہو کہ میں چار سال کلاسوں کے دھکے کھا کر ڈگری لوں۔''

''زندگی یہ نہیں کہ اپنے آپ کو پالو۔ زندگی اپنے آپ کو پانے کا نام نہیں بلکہ اپنے آپ کو سنوارنے کا نام ہے۔ جس کلاس میں جانے کو تم دھکے کھانا سمجھ رہی ہو یہ دھکے نہیں تمہارے سنورنے کی تکمیل کے مراحل ہیں۔ سمندر میں تلاطم نہ ہو تو کوئی جہاز راں مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔

"Smooth Seas do not make skill fal sailors."

میں نے اسے علامہ اقبال کے شعر کا انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

''زندگی لڑ کر جیو، کوئی نہ کوئی چیلنج ہر وقت لیتی رہو۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی حدف ہر وقت بنائے رکھو۔ دوسروں کو ایسا لگے کہ اپنے آپ کو تھکا رہی ہو مگر تھکو نہیں۔ چلتے چلتے گرنے لگو تو ذرا رک جاؤ۔ رک جاؤ تو چلنے لگو۔ تھم کر چلو مگر بیٹھو نہیں۔ اُمید کی لو بجھنے نہ دو۔ یہ چراغ ہر وقت جلائے رکھو۔ بجھنے لگے تو اعتماد کا تیل اس میں ڈالتی رہو۔ جھکو تو صرف اللہ کے سامنے، سجدے سے طاقت حاصل کرو۔ سہارے تلاش مت کرنا بلکہ اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ دوسروں کو سہارا دے سکو۔ زندگی کے بارے میں جیسا گمان کرو گی وہ تمہیں ویسی ہی ملے گی۔ شرط صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے ثابت قدمی۔''

وہ اپنے دونوں ہاتھ میرے دائیں کندھے پر رکھے اور اپنا سر اس پر ٹکائے مجھے سنتی رہی۔ اتنی خاموش کہ اس کی سانسیں بھی میں گن سکتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا تھا مگر اس نے اپنا سر نہ اٹھایا۔ میں نے بھی اسے اسی حالت میں بیٹھے رہنے دیا۔ ایک تو مجھے اچھا بھی بہت لگ رہا تھا۔ اس کی دل کی دھڑکن کے ساتھ زندگی کی دھڑکن بھی تیز تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ کوئی میری ایک بات بھی وہ سمجھ کر دل میں بٹھا لے۔

اس نے سر کچھ دیر بعد اٹھایا تو اس کی کالی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ جذباتی تو بہت تھی اسی لیے کہتی تھی۔

''میں کتنی ناسمجھ ہوں کہ تمہارا اقرار اپنے لیے ہر وقت چاہتی ہوں۔ دنیا میں کوئی کسی کو اتنا پیار بھی دے سکتا ہے جتنا تم دیتے ہو۔ کوئی کسی کا اتنا خیال بھی کر سکتا ہے جتنا تم میرا کرتے ہو۔ میرے تو نصیب بھی جاگ گئے جب تم میرے ساتھ ہو۔ میں نے تو پہلے بھی کہہ دیا تھا کہ جو تم کہو گے وہی کروں گی۔ آج کہتی ہوں جو تم سوچو گے اسی میں ڈھل جاؤں گی۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے تم کبھی مجھے تنہا نہیں کرو گے۔''

''یقین آ گیا تو اب گھر چلو۔ سعد بھی اکیلا ہے، کل رات میں نہیں سویا اور کل کا دن سینٹر پارک میں گزارنا ہے۔ آرام کروں گا تو تم لوگوں کو اچھی طرح سے گھما پھرا سکوں گا۔''

پھر اچانک یاد آیا تو اس سے کہا۔ ''کل سرجی بھی سینٹر پارک آ رہے ہیں۔ ان سے میں نے کہا ہے۔''

''اچھا کیا وہ اچھے آدمی ہیں۔ تم سے تو بہت مخلص ہیں۔''

ہم واپس اپارٹمنٹ آئے۔ چائے پی کر باتیں کرتے رہے۔ وہ کہتی رہی کہ میں اس کے بیڈ پر سعد کے ساتھ سو جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس نے ضد کی تو ڈانٹ دیا۔ پھر وہ میرے لیے تکیہ اور کمبل لائی۔ میں صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں سوچتا رہا۔ پھر نہ جانے کب جاگ کے ساحل پر چلتے چلتے گہری نیند کے سمندر میں اتر گیا۔

☆......☆

صبح میں نماز کے لیے بیدار ہوا۔ وہ ہمیشہ جاء نماز کافی ٹیبل پر رکھ دیتی تھی لیکن آج نہیں تھی۔ کچن سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں جا کر دیکھا تو وہ آستینیں چڑھائے اور سر پر دوپٹا باندھے دیگچیوں میں جھانک رہی تھی۔ اسے میں نے پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ ساتھ پکا کر کچھ نہیں لے جانا۔ ڈے ٹرپ کے لیے وہاں ریسٹورنٹ ہیں اور بھوکے نہیں مریں گے۔ وہ اس وقت خاموش ہو گئی تھی۔

جب صبح دیکھا تو وہ مصروف تھی۔ مجھے دیکھا تو سلام کیا اور بولی۔ ''نماز پڑھ کر اندر کمرے میں سو جاؤ۔ ابھی بہت وقت ہے۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں کہا تو تھا کہ کچھ نہیں بنانا۔''

ہاتھ میں چمچ لیے میرے سامنے کھڑی تھی، بولی۔ ''کوفتے بنانا سیکھے ہیں۔ سرجی بھی تو آ رہے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا خالی ہاتھ جانا۔''

میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''اس کے علاوہ کچھ نہیں بنانا اور مجھے جاء نماز لا دو۔''

میں نے وضو کیا۔ جاء نماز اس نے بچھا دی تھی۔

میں نے نماز ادا کی اور صوفے پر آ بیٹھا۔ آ کر بولی۔

''تم سو جاؤ بعد میں اٹھ کر چائے پی لینا۔''

میں خوب گہری نیند سویا تھا۔ اب دوبارہ سونے کا موڈ نہیں بن رہا تھا مگر اس کے لہجے میں بیویوں والا تحکم تھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اندر کمرے میں اس کی جگہ سعد کو اپنے سے لپٹائے لیٹ گیا۔ نہ جانے کیا قرار تھا اس بچے کے لمس میں کہ دوبارہ غنودگی میں چلا گیا۔

☆......☆

ہم تینوں یونگ (Yong) اسٹریٹ کے اس مقام پر کھڑے تھے جہاں سے یہ شروع ہوتی ہے یا کہ اس کا اختتام ہوتا ہے۔ میرے سامنے ڈاؤن ٹاؤن کے اونچے

PakiBooks.Site

اونچے مینار کھڑے تھے۔ سر بہ فلک عمارتوں کو سعد بڑی حیرت سے دیکھتا رہا۔ یہاں جتنی بار بھی آئیں ہر بار آپ بار بار ان آسمان کی نیلاہٹ کو چھوتی عمارتوں کو دیکھتے رہے۔ مطلع صاف تھا مگر کہیں کہیں بھورے بادل ٹھہر گئے تھے۔ ہوا میں ہلکی خنکی تھی جو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔

ہمارے پیچھے لیک اونٹاریو تھی۔ کنارے پر بڑی بڑی دو منزلہ فیریز لنگر انداز تھیں جنہوں نے سینٹر آئی لینڈ کے علاوہ وارڈز آئی لینڈ اور ہینس آئی لینڈ کی جانب سیاحوں کو لے جانا تھا۔ زیادہ تر تفریح سینٹر آئی لینڈ میں تھی لہٰذا اس کی فیری ہر پندرہ منٹ بعد چلتی ہے۔ ان کے ساتھ لوگوں کی پرائیویٹ بوٹس بھی لنگر انداز تھیں۔ یہ پرائیویٹ بوٹس خاصی بڑی تھیں اور ان پر بہت سے لوگ سوار تھے۔ ان بوٹس نے ابھی کہیں نہیں جانا تھا۔ ان پر خاندان جمع تھے۔ کہیں کوئی سالگرہ پارٹی تھی اور کسی پر کوئی شادی کی پارٹی دے رہا تھا۔ ان پر مختلف ایونٹس ہو رہے تھے۔ بے پناہ شور شرابا تھا۔ لوگ اپنے ایونٹ کے لیے بڑی بوٹ بک کرا لیتے ہیں۔ فنکشن بھی ہوتا رہتا ہے اور ان کا پینا پلانا اور کھانا بھی ساتھ چلتا رہتا ہے۔ جب مرضی آئی تو بوٹس کو ڈیپ لیک میں لے گئے۔ وہاں مچھلی کا شکار کریں یا کچھ بھی مگر اچھا وقت اپنے حساب سے گزار لیتے ہیں۔

ہم سب وے سے یونین اسٹیشن اترے تھے۔ وہاں سے لیک اونٹاریو زیادہ دور نہ تھی۔ ہم پیدل بھی آ سکتے تھے مگر مجھے کیب اس وجہ سے کرنا پڑی کہ ہمارے پاس پھر ایک عدد بھاری بیگ تھا۔

نسرین کو میں نے پہلے بھی کہا تھا اور آج صبح تاکید... کی تھی کہ زیادہ سامان نہیں اٹھانا۔ میں تو سو گیا تھا اور پھر اس نے معلوم نہیں کیا کیا بیگ میں بھر لیا تھا۔ میں نے جب پوچھا کہ اس میں کیا ڈالا ہوا ہے تو بولی۔ ’’ضروری سامان ہے جو دن بھر کام آتا رہے گا۔‘‘

یہ سن کر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’تم کو جتنا بھی بولو، تم اپنی مرضی کرتی ہو۔‘‘

مجھے زیادہ غصہ تب آیا جب وہ یہ بولی۔ ’’تم کو کیا معلوم کس کس چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ پورا دن ہے اور مجھے اور سعد کو کس کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسے تم کیا جانتے ہو؟‘‘ راستے میں وہ بیگ میں ہی اٹھا رہا تھا۔ کئی بار اس نے مجھ سے لینا چاہا مگر میرا خراب موڈ دیکھ کر سعد کو لپٹائے کھڑی رہی تھی۔

اب ادھر سرجی لیٹ ہو رہے تھے۔ میں غصے میں کھڑا سوچتا تھا کہ سرجی کو ساتھ لگا کر میں نے اور زیادہ برا کیا۔ میں نے سوچا اپنے اس لوڈ کو خراب کر کے ایک تناؤ سب کے درمیان پیدا کر دوں گا۔ نسرین خیالوں میں گم مجھ سے ذرا ہٹ کے سعد کو لیے کھڑی تھی۔ ابتداء غصے کی میں نے کی تھی تو اب سلجھانا بھی مجھے ہی تھا۔ پہلے میں اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو تادیر سمجھاتا رہا۔ اپنے دماغ کو سعد کے واسطے دیتا رہا، تب کہیں جا کر تھوڑا سا انسان بنا۔ نسرین کے پاس چل کر گیا تو وہ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں زبردستی مسکرایا تو وہ ہرگز نہیں مسکرائی۔ یہ دیکھ کر میں سچ مچ مسکرا دیا اور بولا۔ ’’اب اپنا موڈ ٹھیک کر و ورنہ مجھے پھر سے غصہ آ جائے گا۔‘‘

وہ روٹھے انداز میں بولی۔ ’’مجھے کوئی پروا نہیں۔ ایک نہیں ہزار بار غصہ کرو، اب آپ سے نہیں ڈروں گی۔‘‘

’’تو پھر اپنا یہ بیگ خود سنبھالو، میں نہیں اٹھاتا اور سعد کو مجھے دے دو۔‘‘

میں نے سعد کو اپنے پاس کر لیا اور بیگ اسے تھما دیا۔ اب وہ بوجھل ہو کر کھڑی تھی کہ اتنے میں سرجی پیدل آتے دکھائی دیے۔ آتے ہی ادب سے سلام کیا۔ نسرین سے اس کا احوال پوچھا۔ نسرین نے حسب موقع رواداری سے اور خوشگوار موڈ میں ان کا احوال پوچھا اور مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

سرجی نے سڑک پر نیچے بڑا بڑا لکھا ہوا زور سے پڑھا۔ ’’یونگ اسٹریٹ 1896KM۔‘‘

پھر مجھ سے پوچھا۔ ’’یونگ اسٹریٹ تو یہ سامنے ہے مگر کیوں لکھا ہے کہ 1896 کلومیٹر دور ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ایک تو اردو میں نہیں یہ انگلش میں بات کرو کیونکہ محترمہ فارسی کے علاوہ صرف انگلش جانتی ہیں اور دوسرا یہ کہ اس کو مجھ سے بہت زیادہ ہر چیز کے بارے میں معلوم ہے۔‘‘

سرجی نے یہی سوال نسرین سے پوچھا تو اس کی ہنسی کی جلترنگ بج اٹھی۔ سرجی تو سمجھنے کو تیار نہ تھے مگر اس نے بڑی مشکل سے سرجی کو سمجھایا کہ یونگ اسٹریٹ یہاں سے شروع ہو کر 1896 کلومیٹر لمبی ہے۔ کئی حوالوں سے دنیا کی سب سے بڑی اسٹریٹ کہلائی جاتی ہے۔

سرجی حیرت سے بولے۔ ’’ماشاء اللہ، اتنی بڑی یعنی لاہور سے تہران تک؟‘‘

نسرین ہنستے ہوئے بولی۔ ’’یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کہاں سے کہاں تک مگر یہاں پر 1896 کلومیٹر طویل ہے۔‘‘

سرجی یہ سب سن کر سعد سے ہاتھ ملانے اس کی جانب بڑھے تو سعد میرے پیچھے چھپ گیا۔

یہاں قارئین کو یونگ اسٹریٹ کے بارے میں کچھ بتاتا چلوں۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ بڑے عرصے تک اسے دنیا کی سب سے بڑی اسٹریٹ کہتا رہا۔ میرے حساب سے یہ سب سے بڑی اسٹریٹ ہے بھی مگر بعد میں ایک تنازعہ کھڑا ہوا کیونکہ تقریباً 85 کلومیٹر بعد اس کا نام ہائی وے 11 ہو جاتا ہے۔ کسی نے یہ تنازعہ اٹھا دیا تھا کہ یہ تو صرف 85 کلو میٹر لمبی ہے بقیہ حصہ تو ہائی وے 11 کا ہے۔ خیر جو بھی ہے یہ اسٹریٹ نارتھ میں شیطان کی آنت کی طرح چلی جاتی ہے اور سمکو لیک پر اس کا اختتام ہوتا ہے اور یہیں سے Upper Great لیکس شروع ہوتی ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن سے جب گزرتی ہے تو اس کے دونوں جانب بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ ایٹن سینٹر بھی ایک حساب سے اسی اسٹریٹ پر ہے۔ اس سڑک کو دفاعی اور تجارتی نقطۂ نظر سے بنایا گیا تھا مگر جب کینیڈا پیسفک ریلوے نے اپنا تاریخی روٹ مشرق سے مغرب تک بچھایا تو یونگ اسٹریٹ پر ٹریفک کم ہو گئی اور یہ اپنی اہمیت بھی کھو بیٹھی۔ ڈاؤن ٹاؤن میں تو ہجوم ہی رہتا ہے مگر آگے تنہا ہو جاتی ہے۔ ہم فیری کے لیے وہاں سے چلے تو نسرین نے بھاری بیگ بمشکل اٹھایا ہوا تھا۔ چند قدم بعد اسے ٹھوکر لگی تو گرتے گرتے بچی۔ میں اس کی جانب لپکا اور اسے تھام لیا۔ اس نے شکوہ بھری نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے آہستگی سے کہا۔ ’’میرے ہوتے تم کبھی کوئی بوجھ نہیں اٹھاؤ گی۔‘‘ یہ کہہ کر اس سے میں نے بیگ لے لیا۔

اس کی گرفت بیگ پر مضبوط تھی مگر میرے اٹل لہجے کے سامنے اپنی ضد پر نہ ٹھہر سکی۔ سرجی کہتے رہے کہ بیگ میں اٹھاتا ہوں مگر میں نے اس بیگ پر اب اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔

میں کھڑکی سے فیری کے ٹکٹ لے کر باہر نکلا تو میرے سامنے دو منزلہ بڑی بڑی بوٹس کھڑی تھیں۔ اوپر کی چھت کھلی نظر آ رہی تھی۔ لیک اونٹاریو کھڑی فیری کے پیچھے جھیل کا نیلا پانی تھا اور دور پرے فیری کی پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر سرسبز درختوں کی لائنیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ درخت ان جزائر کے تھے جنہیں ٹورنٹوں آئی لینڈز کہا جاتا ہے۔ یہ ایک جزیرہ نہیں بلکہ کئی جزائر ہیں جو آپس میں پلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔

نام کی مناسبت سے سینٹر آئی لینڈ بیچ میں ہے۔ دائیں ہاتھ مغربی سمت ہینلین اور بائیں ہاتھ مشرقی سمت میں وارڈز آئی لینڈ ہے۔

تینوں جانب فیری چلتی ہیں مگر رش زیادہ سینٹر آئی لینڈ کی جانب رہتا ہے۔ یہاں پکنک پوائنٹ، جھیل کے بیچ، جھولے، لان، باربی کیو، ایسی تفریحات ہیں اس کے علاوہ باغ اور بچوں کے لیے Amusemeant Park بھی ہے۔

جزیرہ بھلے سمندر میں ہو یا جھیل میں اور یا پھر کسی دریا میں۔ نام جزیرہ خود اتنا مسحور کن ہے کہ ہر ایک کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ سرائیکی بیلٹ اور پھر سندھ میں شیر دریا کے کنارے رہنے والے کچے کے علاقوں سے خوب واقف ہیں۔ یہ بھی جزائر ہی ہیں۔ سندھ کے کئی علاقوں میں تو وہاں جرائم پیشہ لوگ قابض ہیں مگر ہمارے ہاں ڈیرہ اسماعیل خان میں ان کچے کے علاقوں میں سردیوں میں ہم مرغابیوں کا شکار کرنے جاتے تھے۔

پاکستان میں جھیلیں کم ہیں، پانی نایاب ہے تو جزیرے بھی ناپید ہیں۔ یہاں سب سے بڑے تفریحی اور رہائشی مقامات دریاؤں اور جھیلوں کے کناروں سے زیادہ ان جزائر پر ہوتے ہیں۔ کینیڈا کے دارالحکومت اوٹاوہ کے قریب سینٹ لارنس دریا میں ایک مقام پر ایک ہزار چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں۔ کئی ایک تو صرف اتنے بڑے ہیں کہ کسی نے جزیرہ خرید کر اپنا گھر بنا لیا اور باقی چلنے پھرنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں بچی۔

وہیں کئی اتنے بڑے ہیں اور پروفیشنل پارک کا درجہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

جزائر اور ان پر گزرے میرے دن رات علیحدہ ایک داستان رکھتے ہیں۔ مہلت ملی تو انشاء اللہ ان کا ذکر بھی کروں گا۔

اب تو میں ٹکٹ لے کر باہر کھڑا سرجی کو دیکھ رہا تھا، وہ نسرین سے کہہ رہے تھے۔ ’’ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ سر پہ دوپٹا کس کر باندھ لو۔‘‘

اور سعد سر اٹھا کر سرجی کو متعجب نظروں سے دیکھتا تھا کہ یہ کون ہیں جو میری ماں سے باتیں کر رہا ہے۔

میں قریب پہنچا اور نسرین سے کہا۔ ’’چھتری بھی لے لو کیونکہ آسمان پر کہیں کہیں بادل بھی نظر آرہے ہیں۔‘‘

نسرین مجھ سے بولی۔ ’’آپ کو کیا پڑی ہے۔ بیچ میں بولنے کی ٹھیک تو کہہ رہے ہیں، سر جی۔‘‘

میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’چلو ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر کین سینٹر میں تو کبھی نہیں کہا کہ سر ڈھانپ کر رکھو۔‘‘

سر جی بے خود ہو کر بولے۔ ’’تب ہمارا کون سا رشتہ تھا جو کہتے، رشتہ داری اب بنی ہے تو یہ کہنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ کب سر آدھا ڈھانپنا ہے اور کب پورا۔‘‘ نسرین ہنسنے لگی۔

’’سر جی! کون سی رشتہ داری آپ کی بن گئی ہے جو ملکیت جتلا رہے ہیں؟‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔

’’آپ کے حوالے سے جو بنی ہے اسی کی بات کر رہا ہوں۔‘‘ سر جی نے گولا داغا۔

پھر انہوں نے باقاعدہ سے نسرین کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔ ’’اب تو یہ میری بہن ہے۔‘‘ پھر میری جانب دیکھ کر بولے۔ ’’کسی کو میلی نظر بھی نہ ڈالنے دوں گا ان پر۔‘‘

نسرین جو ابھی تک مجھ سے خفا تھی۔ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ’’بھائی کے ناطے تو آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ سب کی غصے بھری آنکھوں اور ڈانٹتی زبان سے بھی مجھے محفوظ رکھیں۔‘‘

سر جی ہنس کر نسرین سے بولے۔ ’’اگر آپ کی مراد ندیم بھائی سے ہے تو پھر اس معاملے میں ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔‘‘

نسرین ہنستے ہوئے سر جی کو کہنے لگی۔ ’’تو آپ بھی مظلوموں کی لسٹ میں شامل ہیں۔‘‘

یہ باتیں ہو رہی تھیں اور سعد فیری کی جانب ماں کا ہاتھ کھینچ رہا تھا۔

ہم فیری کی جانب بڑھے تو ایک جم غفیر ہمارے ہمراہ تھا۔ دھوپ نکلی تھی مگر ہوا زور سے چل رہی تھی۔ ارد گرد بچے، بڑے اور خواتین تھیں۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ تھے۔ ان کے ہمراہ کتے بھی تھے اور بہت سے لوگوں نے سائیکل بھی ساتھ لی ہوئی تھیں۔ کھسکتے کھسکتے ہم اندر داخل ہوئے۔

نیچے کی منزل شیشوں سے بند تھی۔ کھڑکیوں کے ساتھ دونوں جانب لکڑی کی بینچ پڑی تھیں اور درمیان میں جگہ کھلی تھی۔ لوگ سیڑھیاں چڑھتے اوپر کی منزل کی جانب جا رہے تھے جہاں کھڑکیوں کے بجائے لوہے کی ریلنگ لگی تھی۔

فیری اتنی بڑی تھی کہ نیچے کھڑی ہو کر بھی سینکڑوں لوگ آجا سکتے تھے۔ درمیان میں ریسٹورنٹ تھا جہاں پانی، سوڈا سے لے کر شیشے کے جاموں میں شرابیں تک پیش کی جارہی تھیں۔ پاپ کارن اور آلو گرم چپس بک رہے تھے۔ چند لوگوں نے ڈرنک پینی شروع کردی۔

’’ان کو اتنا خیال بھی نہیں کہ بچے ہمارے ہمراہ ہیں اور یہ ادھر شرابیں پیے جارہے ہیں۔‘‘ سر جی یہ کہہ کر بولے۔ ’’اوپر چلتے ہیں۔ کم از کم یہ ام الخبائث تو سامنے نہیں ہوگی۔‘‘

ہم ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل کی طرف آئے تھے اور سعد ابھی تک سر اٹھائے سر جی کو متعجب اور انتہائی تشکرانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ہم اوپر پہنچے تو وہ منزل شیشوں سے بند نہ تھی اور ہوا بے دریغ اندر گھستی چلی آرہی تھی۔ بہت سے لوگ یہاں جمع تھے۔ فیری روانہ بھی نہ ہوئی تھی۔ تیز ہوا سے سر جی کی ٹوپی اڑنے کو پر تولنے لگی تو انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور فوراً نظریں نسرین کے سر پر رکھے دوپٹے پر رکھ لیں۔

اس سے بولے۔ ’’کس کے باندھا ہوا ہے؟‘‘

نسرین نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو مجھ سے بولے۔ ’’یہاں تو بہت تیز ہوا چل رہی ہے اوپر چھت پر چلتے ہیں۔‘‘

میں نے اپنے قدم اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں چھت پر ہوا کم ہوگی۔ سکون سے تو بیٹھیں گے۔ کم از کم دوپٹے کا غم تو نہ ہوگا کہ کہیں کھسک تو نہیں گیا۔‘‘

یہ تو سعد بھی جانتا تھا کہ چھت پر ہوا یہاں سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ نسرین تو سر جی کی بات پر مسکرا پڑی تھی مگر سعد اسی طرح سر جی کو حیرت اور تشکر سے دیکھتا رہا۔

اوپر ریلنگ کے ارد گرد اور درمیان میں بینچ پڑے تھے۔ سب سیاح انہی پر سمائے بیٹھے تھے پھر بھی آدھی بینچ خالی پڑے تھے۔ ہر ایک ریلنگ کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ جھیل کے پانیوں اور لہروں کو دیکھ سکے۔ کئی لوگ فیری کے پچھلے حصے میں کھڑے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ سب کو جھاگ اڑاتی اس ایئر کو دیکھنے کا شوق ہے جو فیری چلنے پر پیچھے سے بنتی جاتی ہے۔

اوپر تو لوگوں نے جیسے چہار جانب سے ہم پر یلغار کردی تھی۔ آسمان نیلا اور چمکتا ہوا تھا۔ کہیں کہیں بھورے اور اودے بادل لہرا رہے تھے۔ کئی پرندے فضا میں اپنی پرواز بھرتے غوطہ زن تھے۔

نسرین سعد کو لے کر ایک بینچ پر جا بیٹھی پھر سر جی بھی سعد کے ساتھ بیٹھ گئے۔ وہ اب سعد کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہے تھے اور نظریں نسرین کی دائیں جانب ایک پرکشش لڑکی پر تھیں۔

نسرین، سعد اور سر جی نے کالے چشمے لگا رکھے تھے۔ نسرین نے سر پر نیلا دوپٹا ایسے باندھ رکھا تھا جیسے دوپٹے کو اڑنے سے بچانا مقصود ہو۔ میں نے بھی کالا چشمہ لگا لیا۔ نسرین اپنی جانب سے ابھی تک مجھ سے خفا تھی۔

مجھے جگہ ملی تو ان کے سامنے ایک دوسری لڑکی کے ساتھ جا بیٹھا۔

اتنے میں فیری چلنے کا اعلان ہونے لگا۔ سب کو بتایا جارہا تھا کہ حادثے کی صورت میں لائف جیکٹس کہاں پڑی ہوئی ہوں گی۔ کشتی ڈوبنے لگے تو آپ لوگوں نے کون کون سی احتیاطی تدابیر اختیار کرنی ہیں۔

سعد نے یہ اعلان سنا تو اٹھ کر میری گود میں آبیٹھا۔

سر جی نسرین سے کہہ رہے تھے ’’پندرہ منٹ کا سفر ہے اور اعلانات ایسے کررہے ہیں جیسے ٹائی ٹینک روانہ ہو رہا ہو۔‘‘ پھر نہ جانے کس کو مرعوب کرنے کی خاطر کہنے لگے۔ ’’سامنے ہی تو آئی لینڈ ہے۔ چاہوں تو تیر کر پار چلا جاؤں۔‘‘

نسرین بولی۔ ’’بہت دور ہے یہاں سے قریب لگتا ہے مگر وہاں تک تیرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔‘‘

سر جی کو اب کہنے کا موقع مل گیا۔ بولے۔ ’’میں جب ندیم بھائی کے شہر میں رہتا تھا تو ہر روز دریا پر تیراکی سیکھنے جاتا تھا۔ ہمارے محکمے کا لائن مین بہت اچھا تیراک تھا۔ اس نے مجھے اتنی تیراکی سکھائی کہ میں خود کو پانی کی مچھلی سمجھنے لگ گیا تھا۔‘‘

سر جی کے بارے میں اکثر نسرین سے باتیں ہوتی رہتی تھیں اس لیے وہ اب انہیں سن کر مسکرا رہی تھی۔

میں نے ہنس کر سر جی سے کہا۔ ’’اب اپنے آپ کو پانی کی مچھلی مت سمجھنے لگنا کیونکہ اس جھیل میں آپ سے دوگنے سائز کی مچھلیاں ہوں گی۔‘‘

نسرین اب سر جی سے کہہ رہی تھی۔ ’’ان سے کوئی بول نہیں... رہا تو ہم بہن بھائی سے یہ کیوں مخاطب ہوتے ہیں۔‘‘

سر جی چونک کر پوچھنے لگے۔ ’’میں بھی تو سوچوں کہ آپ آپس میں بات کیوں نہیں کر رہے۔ کوئی جھگڑا ہوا ہے؟‘‘

اسی دوران فیری روانہ ہونے لگی تو سر جی سفری دعائیں پڑھنے لگے۔ میں نے سر جی سے کہا۔ ’’جب تک آپ کی دعا ختم ہوگی ہم آئی لینڈ پہنچ بھی چکے ہوں گے۔‘‘ مگر وہ مصروف رہے۔

میں نے نسرین سے کہا۔ ’’تم بھی کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک دو۔‘‘ مگر وہ منہ پھیر کر خاموش بیٹھی رہی۔

میں نے سعد کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ’’کوئی ہم سے بولے نہ بولے ہم دونوں دوست آپس میں باتیں کرتے ہیں۔‘‘

سعد مجھ سے باتیں کرنے لگا تو ساتھ بیٹھی لڑکی مجھ سے بولی۔ ’’آپ کا بیٹا بہت پیارا ہے۔‘‘

میں نے اس لڑکی سے سرگوشی میں کہا۔ ’’بالکل ماں پر گیا ہے۔‘‘ وہ سن کر ہنس پڑی اور بولی۔ ’’میں سامنے اس کی ماں کو دیکھ رہی ہوں۔ واقعی ماں پر گیا ہے۔‘‘

میں نے اس سے کہا۔ ’’مگر عادتوں میں بیٹا بہت اچھا ہے۔ ملنسار اور جلدی دوست بنا لینے والا۔‘‘

وہ مسکرا کر بولی۔ ’’تو آپ اپنی تعریف کر رہے ہیں کہ آپ کی طرح فرینک ہے۔‘‘

لڑکی تھی اور شکل کی بھی خوب تھی تو نسرین کا الرٹ ہونا بنتا تھا اور وہ الرٹ ہو گئی۔ وہ اب کالے چشموں کے پیچھے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اب میں اسے نظر انداز کر کے اس لڑکی سے محو گفتگو تھا۔ فیری چلنے کا شور تھا تو ہماری آوازیں بھی اسے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

سر جی تو فیری کے چلتے ہی بھاگے بھاگے اگلے حصے کی جانب گئے تاکہ کوئی نظارہ دیکھ سکیں۔ جب بہت سے لوگ پچھلے حصے میں کھڑے دیکھے تو چند لمحوں بعد پچھلے حصے کی جانب جاتے ہوئے تیزی سے ہمارے پاس سے گزر گئے۔ میری نظریں آئی لینڈ کی جانب لگی تھیں جس کا ساحل تیزی سے قریب آرہا تھا۔ جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن کی پوری اسکائی لائن پانیوں کے پار آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ سی این ٹاور سمیت ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتوں کا شاندار منظر میرے سامنے تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ فوٹو گرافی کر رہے تھے۔ میں سعد کو ساتھ لے کر فیری کے پچھلے حصے کی جانب جانے کے لیے اٹھا تو

PakiBooks.Site

نسرین ہمیں دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ڈاؤن ٹاؤن کا خوب صورت نظارہ دیکھنا ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔“

وہ خاموش بیٹھی رہی پھر میں نے اس کے بازو سے اسے پکڑا اور بولا۔ ”بے شک بعد میں مت بولنا لیکن میرے لیے یہ نظارہ مس نہ کرو۔“ وہ نہ اٹھی تو اسے بازو سے کھینچ کر اٹھایا۔

ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن جتنا خوب صورت اور دلکش سینٹر آئی لینڈ سے نظر آتا ہے وہ اس کے اندر گھومنے سے بھی اتنا اچھا نہیں دکھتا۔ ٹورنٹو کی بیشتر تصاویر وہ ہیں جو سینٹر آئی لینڈ سے یا فیری پر جاتے ہوئے لی گئی ہیں۔

کسی بھی شہر پر آسمان جتنا خوب صورت، چمکدار اور نیلا ہوگا وہ شہر اپنے رتبے سے بھی زیادہ حسین لگے گا۔ ٹورنٹو کے اوپر کا آسمان اگر دھوئیں سے آلودہ اور گرد سے کھردرا کردیں تو یہاں آنے والے ایک دن میں اکتا جائیں گے۔

جب ڈاؤن ٹاؤن کا نظارہ ایک تصویر کی مانند لگنے لگا تو میں اپنی سیٹ پر سعد کو لے آبیٹھا۔ نسرین بھی چلی آئی۔ میرے ساتھ بیٹھی لڑکی کہنے لگی۔ ”آپ کا بیٹا تو بہت پُر جوش ہے مگر ماں اس کی خاموش خاموش نظر آرہی ہے۔“

میں لڑکی سے بولا۔ ”ذرا اسے دیکھو ناراض بیٹھی ہے مگر پھر بھی کتنی خوب صورت دکھ رہی ہے۔“

وہ لڑکی ہنس پڑی اور بولی۔ ”اتنی اچھی لگتی ہے تو منا لو۔“

میں بولا۔ ”اسے ابھی اور ستانا ہے اور پھر جی بھر کے اسے منانا ہے۔“

نسرین کی توجہ ہماری جانب تھی مگر میں سرگوشی میں مشکوک لہجے کے اندر بات کررہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اسے ستانے میں لطف آرہا تھا۔

فیری آئی لینڈ کے قریب ہونے لگی یا آئی لینڈ ہماری جانب کھنچتا چلا آیا تو سب کا رخ ان درختوں کی طرف ہوگیا جو جزیرے کے ساحل پر کھڑے ہواؤں سے جھومتے ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

صدیوں پہلے اس جزیرے کو حیاوا تا جزائر کہا جاتا تھا۔ یہ ریڈ انڈین کے مشہور قبیلے اوجیوا کا نام تھا۔ ان قبائل کا نام ونشان گوروں نے مٹا ڈالا۔ میں یہی کھڑا سوچ رہا تھا کہ جو قومیں ساکت ہوئیں، ان کا وجود ختم ہوگیا ابھی ایک چھوٹا طیارہ نچلی پرواز کرتے ہمارے دائیں جانب جھیل میں لینڈ کرنے لگا۔ اس کی وجہ سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

سعد نے شور مچا دیا۔ ”انکل انکل دیکھیں جہاز پانی میں اتر رہا ہے۔“

میں دم بخود کھڑا دیکھتا رہا کہ شاید طیارے میں کوئی خرابی ہوگئی ہے اور وہ اب جھیل میں غوطہ زن ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ طیارہ مغربی جانب کسی مقام پر لینڈ کر گیا۔ میں حیران ہی کھڑا تھا کہ فیری والوں کی جانب سے اسپیکر پر بتایا جانے لگا کہ اس جزیرے پر ایئرپورٹ بھی ہے جہاں طیارے لینڈ کرتے ہیں۔

اتنے میں سرجی دور لینڈ کرتے جہاز کو فیری سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

میں نے ان سے کہا۔ ”سرجی یقین کریں طیارے والے آپ کو نہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ ہاتھ ہلانا بند کریں۔“

وہ بولے۔ ”وہ نہیں پر میں تو طیارے کو صاف دیکھ رہا ہوں۔“

فیری اب ڈاک سے قریب تر ہورہی تھی۔ دائیں جانب تھوڑی سی بلندی پر شیشے کی کھڑکیوں والا ایک ریسٹورنٹ نظر آرہا تھا۔ جزیرے کے کنارے درخت دور دور تک چلے گئے تھے اور پیچھے دور لیک اونٹاریو کے پار ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتوں والی تصویر پورے افق پر چھائی ہوئی تھی۔

ہم فیری سے اتر کر جزیرے پر قدم رکھ چکے تھے۔ ایک پختہ راستہ ہمارے سامنے بچھا تھا۔ خوب صورت اینٹوں سے بنے اس راستے کے اردگرد جھنڈے لہرا رہے تھے۔ رنگ برنگے جھنڈے دور سے ہی ہم کو نظر آرہے تھے۔ راستے کے بیچ فوارے تھے، سامنے پل تھا اور کئی ایک بڑی بڑی بطخیں شاید ہمارے انتظار میں گردنیں اٹھائے کھڑی تھیں۔ میں دور دور تک پھیلے لش گرین گھاس کے لان اور ان کے بیچ کھڑے قدیم درخت دیکھ رہا تھا۔ وہاں بینچ پڑے تھے اور باربی کیو کے لیے انگیٹھیاں زمین میں گڑی تھیں۔ ابھی دن کا ایک طرح سے آغاز ہوا تھا تو لہٰذا سارا جزیرہ ہم لوگوں کے لیے خالی پڑا تھا۔

میں نے بیگ اٹھا رکھا تھا۔ سرجی چپس پکڑ لائے تھے۔ وہ اور سعد چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے اور ساتھ چپس بھی کھاتے جا رہے تھے۔ سرجی اور سعد دونوں ہم سے آگے تھے۔ میرے پیچھے نسرین اداس سی چلی آرہی تھی۔

اتنے میں سرجی نے سینہ تانے اور سر اٹھائے ایک

بڑی سفید بطخ کو پہلے پچکارا اور پھر اس کی جانب چپس کا ٹکڑا بڑھایا تو اس نے جھپٹ کر چپس ایسے چھینا جیسے جراسک پارک میں ڈائنا سارز کسی انسان پر جھپٹ کر اسے اچک لیتا ہے۔ پھر اس بطخ نے کاں کاں کا بگل بجا کر بطخوں کی ساری فوج کے لیے طبلِ جنگ بجا دیا۔ بطخوں کا تازہ دم دستہ آناً فاناً کہیں سے نمودار ہوا اور سرجی کے علاوہ سعد کو بھی چاروں جانب سے گھیر کر کھڑا ہوگیا۔ بطخیں طیش میں نظر آرہی تھیں کیونکہ ان کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ سرجی اور سعد کے ہاتھوں میں چپس کے بڑے لفافے تھے اور دشمن کی نظریں اسی مالِ غنیمت پر تھیں۔

پھر معلوم نہیں کہ کہیں سے اشارہ ہوا تو یہ سب خونخوار بطخیں نعرہ کاں کاں بلند کرتیں ایک ساتھ دونوں پر حملہ آور ہوئیں۔ اب ہمارے سپاہی چپس کے لفافے سے اپنا دفاع بھی کر رہے تھے اور بطخوں کی فوج پر حملہ آور بھی ہو رہے تھے۔ کوئی ہیروں کے ہار سے تو چور کو نہیں ڈراتا، لہٰذا بطخیں لہراتے لفافے سامنے پا کر اور زیادہ مستعدی سے پینترے بدل بدل کر حملے کرنے لگیں، اردگرد کے ٹورسٹ رک گئے اور اپنے کیمرے میدان کارزار پر فوکس کیے کلک کلک کرنے لگے۔ سرجی نے دیکھا کہ لفافوں سے دشمن فوجوں کو شہ مل رہی ہے تو انہوں نے اپنی ٹانگیں بھی چلانا شروع کردیں۔

ادھر نسرین اپنے بیٹے کو نرغے میں دیکھ کر ہراساں ہورہی تھی۔ مجھ سے اس طرح سے مخاطب ہوئی جیسے کہہ رہی ہو... کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اپنی خدمات میدان جنگ میں کیوں نہیں جھونکتے؟ میں نے بھی نسرین سے کہا کہ اگر ہماری دور کی فوج اپنے ہتھیار یعنی چپس کے لفافے زمین پر پھینک دے تو وہ اپنا حملہ روک دیں گی۔

وہ بولی۔ ”ایک تو آپ کو بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔ دیکھتے نہیں سعد کی کیا حالت ہو رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”حالت تو سرجی کی دیکھنے والی ہے۔ سعد تو پھر بھی بے جگری سے محاذ پر ڈٹا ہوا ہے۔“

دراصل سرجی نے اب سعد کو اپنی ڈھال بنایا ہوا تھا مگر پھر بھی سرجی کے چہرے پر یقینی شکست کے اثرات پھیلنے لگے تھے۔

پھر سرجی کی مدد کو پکارتی آنکھیں میری جانب لپکیں تو مجھے ہنسی آگئی۔ مجھ سے مایوس ہو کر اب وہ رتبہ شہادت پانے کے لیے مکمل تیار ہو چکے تھے۔

آباد لکھنوی

مرزا مہدی حسن خاں خلف مرزا غلام جعفر خاں۔ لکھنو کے رہنے والے تھے۔ شیخ ناسخ کے نامی شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ 1228ھ (1813ء) میں بمقام لکھنو پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ لکھنو کے عمائدین میں سمجھے جاتے تھے۔ نواب فرخ آباد کے قریبی رشتے دار تھے۔ تمام عمر لکھنو میں رہے اور اپنی عمر فراغ بالی سے بسر کی۔ اگلے لوگوں کی طرح وضع داری کے پابند اور مجالس مشاعرہ کے ازبس دلدادہ تھے۔ وضع داری جو پرانے لوگوں کا عام شیوہ تھا اس کا خاص شعار تھا۔ چنانچہ آج تک مشہور ہے کہ آپ مشاعروں میں نہایت پابندی سے شریک ہوتے اور حتی الامکان کوئی جلسہ غزل خوانی سے ناغہ نہ ہونے دیتے تھے۔ ان کی پرگوئی بھی شہرت رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک تذکرہ نویس نے تو یہاں تک غلو کو کام فرمایا ہے کہ عروض کے ہر ایک بحر میں ان کا ایک ایک دیوان ہے۔ بہرحال دو اور بقول بعض اس سے زیادہ دو دیوان اور ایک مثنوی تمن وا سوخت ان کی یادگار ہیں جن میں سے ایک دیوان موسوم بہ ”نگار عشق“ 1262ھ میں لکھنو کے مرتضوی مطبع میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ بھی کمیاب ہے مگر ان کی مستقل یادگار ”بہارستان سخن“ سے قائم ہوئی جس میں ناسخ، آتش کے بالمقابل ہم طرح غزلیں درج ہیں۔ یہ مجموعہ بے شک ملتا ہے۔ حق یہ ہے کہ گو ان کا کلام ان دونوں استادوں کے پایہ کو نہیں پہنچا مگر تاہم بجائے خود قادر الکلامی کا پتا دیتا ہے اگرچہ ان کی طبیعت بھی استعارہ پسندی سے (جو اس زمانے میں عام رواج تھا) خالی نہیں مگر اس کے سوا کہیں کہیں اخلاقی اشعار بھی لطافت طبع کی جھلک دکھا رہے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں اکثر زور فکر لائق تحسین ہے۔ واسوخت بھی اپنے رنگ میں بہت مقبول اور معاملہ بندی کا پہلو لیے ہوئے ہے مگر محاورات سے اس نے بھی پہلو تہی کی ہے۔ سعادت خاں ناصر لکھتے ہیں: صنعت تضمین میں استاد مہدی حسن خان تخلص ”آباد“ قند و چیں ناسخ کو بیچ میل مٹھائی بناتا ہے اور واہ واہ کے مزے اٹھاتا ہے۔ جن روزوں میں یہ تذکرہ تالیف ہوتا ہے اسماعیل گنج میں ان سے ملاقات ہوئی، پوچھنے لگے مجھے کیا لکھا ہے میں نے کہا شاعر خوش فکر، شاگرد ناسخ بدمزہ ہو کر کہا، اپنا ہی شاگرد لکھا ہوتا، مجھے اس کے کہنے سے تعجب ہوا، پوچھا کہ سبب انکار ناسخ کی شاگردی سے بیان فرمایئے، بے تامل ہو کر کہا کہ اب ان سے ہم اچھے ہیں اور اگر کچھ دخل و تصرف اپنے کلام میں ہے تو مرزا محسن کا ہے۔ کیا تماشا ہے کہ شیخ کا شاگرد آپ کو اس سے بہتر جانتا ہے۔ یہ فقط حق شناسی ہے۔ آباد نے اڑتیس برس کے قریب عمر پائی۔ 1266ھ مطابق 1850ء میں انتقال کیا۔ میر خلوق کے پوتے میر حسن علی آفاق لکھنوی (میر انیس کے بھتیجے) آباد لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آفاق، غزل، مرثیہ اور ریختی کے شاعر تھے۔ آباد لکھنوی نے مرثیے اور سلام بھی تصنیف کیے ہیں۔“

مرسلہ: غلام حسن۔ کراچی

نسرین کے مسلسل ٹہوکوں سے آخرکار لاچار ہوکر میں نے اپنی زبانی کمک انہیں پہنچائی کہ چپس کے لفافے کھول کر انہیں زمین پر پھینک دیں۔ سرجی تو حواس باختہ ہو چکے تھے۔ میری بات کو سمجھ نہ سکے مگر ننھا سپاہی سمجھ چکا تھا۔ اس نے پہلے اپنا لفافہ پھاڑ کر سڑک پر پھینکا اور پھر سرجی کی نجان اس طرح سے بچائی کہ ان کا چپس کا لفافہ بھی چھین کر پرزے پرزے کرکے ظالم دشمن کے حوالے کردیا۔

پھر بطخوں نے انہیں چھوڑا اور مال غنیمت لوٹنے لگیں۔

اب سرجی اپنے تھکے چہرے اور لاغر قدموں کے ساتھ ہمارے برابر آ کھڑے ہوئے اور سعد بھی چلتا ہوا وہیں آ گیا اور پھر سے سرجی کو حیرت اور تفکر سے سر اٹھائے دیکھتا رہا۔

سرجی اکھڑے سانس کے درمیان بمشکل بولے۔ ''مجھے تو شک ہے یہ بطخیں نہیں بھیڑیے ہیں۔''

میں مسکراتا کھڑا سرجی کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور نسرین نے بڑھ کر سعد کو اپنی جانب کھینچا اور غصے سے میری جانب دیکھ کر اسے اپنے سے لپٹا لیا۔

میں نے نسرین سے کہا۔ ''بیٹے کو بزدل مت بناؤ۔ کیا ہر جگہ اسے اپنے ساتھ لپٹانے کے لیے تم ساتھ ہوگی؟''

پھر سرجی کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بینچ پر بیٹھ کر اپنا سانس درست کرلیں۔ آگے شاید اس سے بھی زیادہ سخت مراحل آئیں۔''

وہ بولے۔ ''میں ڈرا نہیں تھا مگر یہ بتاتا چلوں کہ میں نے بطخوں کی آنکھوں میں خون اترا ہوا دیکھا تھا۔'' ہم ایک پختہ راستے پر چلنے لگے۔

ہم پختہ راستے پر چل رہے تھے۔ اس ماحول پر ہوا سے لہراتے پتوں کا شور، درخت ٹھکانے بدلتے پرندے، مخمل کی طرح بچھی گھاس کے دور دور تک پھیلے میدان اور نیلا آسمان، سب حاوی تھے۔

میں نے مشورہ دیا کہ ادھر ادھر کہیں گھومنے سے پہلے بیٹھ کر کچھ کھا پی لیتے ہیں۔ سستا کر کوئی فیصلہ کریں گے کہ کدھر کا رخ کیا جائے اور کیوں کیا جائے۔ میرے مشورے پر دونوں خاموش تھے۔ نسرین سے جواب مانگا تو اس نے ہوں کہہ کر بات ختم کردی۔

ہم قدم بڑھاتے گھاس پر چلتے ہوئے ایک وسیع لان کے بیچ درختوں کے جھنڈ تلے رکھے بینچوں پر جا بیٹھے۔

میں نے کہا۔ ''آپ لوگ یہاں بیٹھیں میں ریسٹورنٹ سے پانی اور کچھ کھانے کا لاتا ہوں۔''

نسرین اپنا منہ دوسری جانب کرکے بولی۔ ''اگر آپ نے ویسے ہی کوئی چیز خریدنی ہے تو اور بات ہے ورنہ پانی کے علاوہ کھانے کے لیے میں کچھ نہ کچھ لے آئی ہوں۔''

میں خاموش ہوگیا، پھر بولا۔ ''چادر بھی گھاس پر بچھانے کے لیے لائی ہوں گی؟''

اپنا سر اثبات میں ہلا کر وہ اٹھی۔ میرے پاس پڑا بیگ لے کر دوسرے بینچ پر جا بیٹھی اور اندر سے پلاسٹک کی ایک بڑی شیٹ نکال کر گھاس پر بچھادی۔

سرجی معترف ہوکر بولے۔ ''لڑکیوں کا یہی قرینہ ان کی بڑائی ہوتی ہے کہ ضرورت کے ہر سامان کا ہر وقت خیال رکھتی ہیں۔''

نسرین نے یہ سن کر میری جانب شکوے اور ستائش دونوں نظروں سے دیکھا اور میں خاموش رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ چادر نہ لاتی تو ہم بینچوں پر اکڑوں بیٹھے ہوتے۔

چادر بچھی اور سب سے پہلے میں جوتے اتار کر اپنے دونوں ہاتھ گردن کے نیچے رکھے لیٹ گیا۔ سرجی اور سعد سے بھی کہا تو وہ بھی چلے آئے۔ نسرین چادر کے دوسرے کونے پر جا بیٹھی۔ سرجی اور سعد چادر پر ایک دوسرے کے سامنے ایسے بیٹھے تھے جیسے تاش کھیل رہے ہوں مگر وہ کچھ بھی نہیں کررہے تھے۔ اتنے میں نسرین چائے کا مگ بھر کر میرے پاس لائی۔ مجھے ویسے ہی اس کی طلب ہورہی تھی۔ ساتھ وہ انڈے اور کباب کا سینڈوچ بھی لائی۔ اس کے بعد پانی کی ٹھنڈی بوتل مجھے پکڑا دی۔ اس کے بعد سرجی اور سعد کو بھی کچھ دیا۔ میں حیران بیٹھا تھا کہ وہ کیا کیا بھر کر اس بیگ میں لے آئی ہے۔ ریسٹورنٹ کے سینڈوچ سے مجھے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے بنا کر لائی تھی تو اس کا ذائقہ ہی کچھ اور تھا۔

وہ بنا کر تو یہ سب چیزیں میرے لیے لائی تھی۔ خود تو وہ میکرونی کھا رہی تھی جو اس نے سعد کو بھی دی تھی۔ وہ میری جانب بیٹھ کے کچھ کھا رہی تھی۔ میں پچھتا رہا تھا کہ کیوں اسے اتنی بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔

سرجی اپنے بیگ میں ایک ٹینس بال اور شیشہ لے آئے تھے۔ بال سے تو کھیلا جاسکتا ہے مگر شیشے سے کیا کام لینا چاہتے تھے وہ مجھے معلوم نہ تھا۔ انہوں نے بیگ کھول کر پہلے بال نکالی، پھر شیشہ نکالا۔ شیشہ دوبارہ واپس بیگ میں

رکھا اور بال رکھنے سے پہلے سوچنے لگے۔ پھر سوچ کر سعد سے بولے۔ ''بال کھیلو گے؟''

اس نے ماں کی جانب دیکھا اور ماں نے سعد سے کہا۔ ''انکل سے پوچھو۔''

میں نے ہاں کرتے ہوئے سرجی سے پوچھا۔ ''یہ شیشہ کیوں اٹھا لائے ہیں؟''

وہ بولے۔ ''سورج کی کرنوں کا عکس اگر آئینے سے پرندوں پر ڈالیں تو وہ بہت اونچا اڑتے ہیں۔''

وہ دونوں جا رہے تھے اور سعد سرجی سے اکتا گیا تھا۔ ''خیال سے ادھر جانا۔ وہاں بھی بطخیں ہیں۔''

وہ ہم سے دور ہوکر وسیع لان کے درمیان کھیل رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جزیرے کے پچھلے ساحل کے پار دوبارہ سے لیک اونٹاریو پھیلتی ہوئی افق سے مل رہی ہے۔ ہمارے اوپر درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے اپنی موجودگی کا احساس تب دلاتے جب ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی کی طرف پرواز کرتے۔ یہ کالے پرندے تھے جن کی دمیں سنہری تھیں۔ پروں پر بھی کچھ کشیدہ کاری ہوئی تھی۔ سائز ان کا بلبل سے کچھ بڑا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام اسٹارلنگ ہے پھر اسے میں نے امریکا اور کینیڈا کے مختلف مقامات پر دیکھا۔

میں عجیب بے چینی کا شکار تھا۔ وجہ نسرین تھی جو ساتھ روٹھی بیٹھی تھی۔ منانا مجھے آتا نہ تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایک بات تو مجھ سے کرے پھر اسے منالوں گا۔

مگر شاید اسے کوئی چوٹ لگی تھی جبھی تو اتنی ناراض بیٹھی تھی۔ وہ پہلے تو کبھی اتنا ناراض نہ ہوئی تھی۔ میں نے بھی تو پہلے کبھی اتنا غصہ نہ کیا تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ منانے پر میری انا مجروح ہوتی تھی بلکہ میں قدرتی طور پر اظہار کرنے میں شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اسی لیے بہت کم دل کی بات کسی سے کرسکا اور دل میں شرمندہ ہونے کے باوجود معافی بہت سے لوگوں سے نہ مانگ سکا۔

پھر بھی اسے آہستگی سے آواز دی۔ ''پیٹھ تو کرکے مت بیٹھو۔ میری جانب کیوں نہیں دیکھتی؟''

وہ ضد کیے بیٹھی رہی۔ میں نے دوبارہ بلایا تو اس نے سر اپنے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

عورت کی ضد تو لاڈ کا دوسرا روپ ہوتی ہے۔

میں نے اس کے ساتھ رکھا بیگ اپنی جانب کھینچنا چاہا تو اس نے مضبوطی سے مٹھی بند کرکے اسے پکڑ لیا۔ میں نے اس کی مٹھی کھولنا چاہی مگر وہ ایسے کس کر بیٹھی تھی جس طرح نئی نویلی دلہن نکاح کی رسموں میں اپنے دولہا کے آگے مٹھی بند کرلیتی ہے۔ دولہا زور لگا کر نہیں بلکہ اپنے پیار کے لمس سے اسے کھولتا ہے۔ وہ ہاتھ اس محبت سے پکڑتا ہے کہ وہ بے اختیار ہوکر اپنی زندگی کی مٹھی اس کے سامنے کھول دیتی ہے۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے اپنی خوب صورت انگلیوں کی گرفت بیگ پر ڈھیلی کردی۔ میں نے بیگ کو اپنی جانب سرکایا تو دیکھا کہ وہ بھرا ہوا تھا۔ کوفتوں کا سالن، بریانی اور فرائی گوشت کے علاوہ روٹیاں، چائے، پانی اور سعد کے لیے صرف میکرونی اور جوس۔ وہ یہ سب میرے لیے بنا کر لائی تھی۔ اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں۔ میں نے اسے اس لیے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اتنا بھر کر بیگ کیوں لائی ہے۔ وہ ایثار کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ آنسوؤں کے دو قطرے میری آنکھوں سے نکلے جو میں نے جلدی سے صاف کردیے۔ میں تو اسے اسی کے لیے منع کررہا تھا کہ ہر بار اتنا پکا لیتی ہے تو تھک جاتی ہوگی مگر وہ باز کبھی نہیں آتی تھی۔

''تم یہ سب بنا کر تھک جاتی ہوگی اسی لیے تم سے کہتا رہتا ہوں کہ کسی ریسٹورنٹ پر کھا لیا کریں گے۔'' میں نے اس طرح آہستگی سے اسے کہا تھا جیسے کوئی تازہ پھول سونگھ رہا ہوں۔

وہ اپنے گیلے گلے سے آواز کھینچ کر نکالتے ہوئے کہنے لگی۔ ''آپ کو ریسٹورنٹ کے کھانے کہاں پسند آتے ہیں۔ بھوکے رہ جاتے ہیں مگر کھاتے نہیں۔ میرے ہاتھ سے بنے جب شوق سے کھاتے ہیں تو مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے، اس کا اندازہ آپ کو کبھی نہیں ہوسکتا۔'' اس کی دھیمی دھیمی بوجھل اور بھیگی بھیگی آواز میں فنا کردینے والی محبت چھپی تھی۔ وہ خفا بھی تھی اور اس کی خفگی کے اندر پیار کا کوئی دیا بھی جل رہا تھا۔

میں اب ٹھہر ٹھہر کر اسے آہستگی سے کہنے لگا۔ ''مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب تم میرے لیے کھانے بناتی ہو۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ سعد پر نظر پڑی اور میں اچھل کر کھڑا ہوگیا پھر دوڑنے کے انداز میں اس کی جانب بھاگا، مجھے امید نہیں تھی کہ سرجی ایسی بے وقوفی کریں گے۔

(جاری ہے)

آبی قبر

امجد رئیس

حادثات انسانی زندگی کے لیے لازم و ملزوم ہیں، کب کسے کس طرح کا حادثہ پیش آجائے کہا نہیں جاسکتا۔ وہ دونوں بچیاں کب جانتی تھیں کہ اپنے گھر کے قریب رہتے ہوئے بھی انہیں حادثے کا سامنا کرنا پڑ جائے گا اور حادثہ بھی اتنا عجیب کہ خشک علاقوں میں رہنے والے اس قسم کے حادثوں سے کبھی نہیں گزرے ہوں گے۔ یہ تو مقام شکر ہے کہ انہیں بروقت دیکھ لیا گیا اور امدادی کارکنوں نے بھی جان کی بازی لگا لی تھی ورنہ وہ بچے زندگی ہار گئی تھی۔

برفیلے سمندر میں پھنس جانے کی خوف ناک روداد

کونیکٹی کٹ، ریاست ہائے متحدہ کی ایک ریاست کا نام ہے جو ایک جانب نیویارک سے ملحق ہے تو دوسری جانب میاچوسٹس کے ساتھ طویل سرحد ملتی ہے۔

یہاں ویسٹ بروک کے علاقے میں ایک جگہ کا نام لانگ آئی لینڈ ساؤنڈ ہے۔ جہاں کی ایک چھوٹی سی مقامی آبادی شہری علاقے سے ہٹ کر مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ لوگ آپس میں کافی گھل مل کر رہتے ہیں۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ 20 فروری 1987ء۔ موسم صاف لیکن سرد تھا۔ تارا نو برس اور بریٹنی کی عمر چھ سال تھی۔ دونوں بچیاں ایک چھوٹی دکان سے چاکلیٹس خرید کر گھر کی جانب رواں دواں تھیں۔ وہ دونوں سیکڑوں مرتبہ اس جانب پہلے بھی آتی رہی تھیں۔

سالٹ آئی لینڈ پونڈ، جمے ہوئے پانی کا ایک ٹکڑا تھا۔ برف کے اس چھوٹے سے میدان پر قریبی اسکول کے بچے آئس ہاکی کھیلتے تھے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے دونوں کی نگاہ ایک سفید گیند پر پڑی، گیند کو برف کی پرت نے ڈھانپا ہوا تھا۔ دونوں بچیاں ٹھہر گئیں۔

اینٹوں کی چھوٹی سی دیوار اور دھاتی جالی دار گرل سڑک اور میدان کے درمیان حائل تھی۔ دونوں گرل اور دیوار کے مابین ایک درز سے اندر گھس کر گیند کی جانب لپکیں۔

بریٹنی ابھی دور تھی کہ تارا جمے ہوئے تالاب پر پہنچ گئی۔ اس کا رخ سفید گیند کی طرف تھا۔

دفعتاً بریٹنی کو تارا کی چیخ سنائی دی۔ ”میری مدد کرو۔“

بریٹنی دوڑتی ہوئی اپنی دوست کی جانب گئی جو برف کی سطح ٹوٹنے سے یخ بستہ پانی میں جا پڑی تھی۔ چھ سالہ بریٹنی بروقت تارا کی جیکٹ پکڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ شومئی قسمت اسی وقت بریٹنی کے قدموں تلے برف تڑخی اور وہ خود بھی سرد پانی میں جا گری۔ اب دونوں مل کر چیخ چلا رہی تھیں۔ ہاتھ ہلا رہی تھیں۔

معاً تارا کی آواز معدوم ہوگئی۔ وہ پانی کے اندر تھی۔ بریٹنی کو اس کے بال نظر آرہے تھے۔ ”تارا میری بہترین سہیلی ہے۔“ اس کے معصوم ذہن میں خیال آیا۔ بریٹنی نے تارا کے بال پکڑ کر کھینچے لیکن یہ ایک سعی لاحاصل تھی۔ اسے اپنا سر بھی پانی کی سطح سے اوپر رکھنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ برفانی میدان، زیر برف زیادہ گہرا نہیں ہے۔ تاہم ان دونوں کو ڈبونے کے لیے کافی تھا بلکہ پانی کی ٹھنڈک ہی دونوں کو برف میں تبدیل کر دیتی ہے۔

معاً تارا کے بال اس کی گرفت سے نکل گئے۔ وہ اپنا سر پانی کی سطح سے اوپر رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ برف کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اس کے ہاتھوں اور جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ جان لیوا صورت حال سے نمٹنا بچیوں کے بس سے باہر تھا۔ بریٹنی کا سر پانی کے اندر چلا گیا۔ جلد ہی زیر آب تہہ سے اس کے پیر ٹکرائے، اس نے خود کو اوپر کی جانب دھکیلا۔ اس کا سر پھر باہر آگیا لیکن یہ وقفہ ایک منٹ سے بھی کم تھا اور وہ دوبارہ زیر آب چلی گئی۔ بالآخر یخ بستہ پانی اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوگیا۔ وہ تارا کو بھول چکی تھی۔ دونوں کی طاقت اور عمر ہی کتنی تھی۔ برفیلے پانی نے منٹوں میں دونوں کو بے بس کر دیا۔

تارا چھ فٹ نیچے تالاب کی کیچڑ زدہ تہہ پر بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ وہ جہاں سے گری تھی وہاں سے آگے چلی گئی تھی۔ دونوں کی سانس اور حرکت قلب بند ہوگئی تھی۔ بریٹنی کی اودے رنگ کی نائیلون کی بند جیکٹ میں کچھ ہوا پھنس گئی تھی، جس نے اسے تہہ میں جانے سے روک دیا۔ وہ سطح آب سے چند انچ نیچے ساکن حالت میں تیر رہی تھی۔

☆......☆

وہ صاف ستھرا زردی مائل مکان برفانی تالاب سے زیادہ دور نہیں تھا جس کی دوسری منزل پر 78 سالہ جیوار تکس لیونگ روم موجود تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کوئی آواز سنی ہے۔ تاہم کسی نامعلوم حس کے ذریعے اسے بے کلی محسوس ہوئی اور کام روک کر وہ کچن میں آگئی۔ کچن کی کھڑکی سے اسے جو کچھ نظر آیا وہ اس کے ضعیف اعصاب کو توڑنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے برف کے تالاب پر چند ہاتھ ہلتے دیکھے اور مدد کے لیے بچگانہ چیخیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ دہشت اور کمزور اعصاب نے چند لمحوں کے لیے اسے مفلوج کر دیا۔ ”میں کیا کر سکتی ہوں؟“ اس نے تیزی سے سوچا۔ حادثے کی سنگین نوعیت کا اسے احساس ہوگیا تھا۔

911...... اس نے دعا مانگتے ہوئے 911 ڈائل کیا۔

دوسری جانب سے آواز سن کر جی... نے سکون کا سانس لیا۔

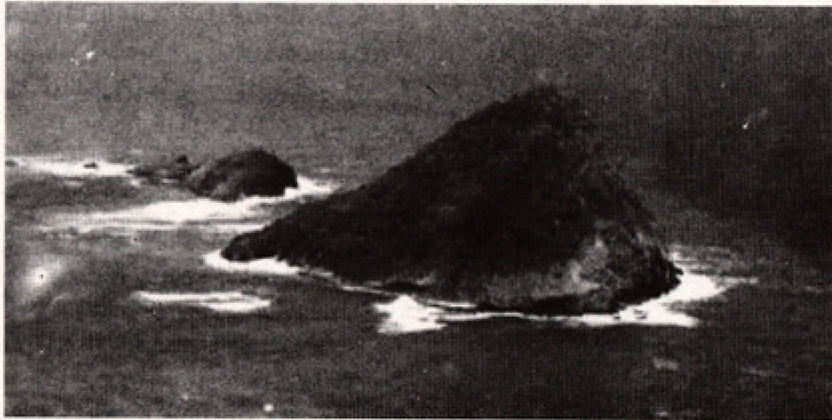
”یہ ایک ایمرجنسی ہے۔“ وہ فون پر چلائی۔ ”سالٹ آئی لینڈ روڈ!“

دوسری جانب کارل بک تھا۔ اس نے جلد ہی بوڑھی اور بوکھلاہٹ زدہ آواز سے پیغام اخذ کرلیا کہ ”دو بچیاں برفانی تالاب میں گر گئی ہیں۔“

اس وقت شام کے تین بج کر چون منٹ ہوئے تھے۔ کارل نے پھرتی سے تین اداروں سے مدد طلب کی۔ اسٹیٹ پولیس، فائر ڈپارٹمنٹ اور ایمبولینس سروس۔

جیوار تکس فون بند کرتے ہی ہانپتی کانپتی کچن کی کھڑکی تک پہنچی۔ اسے ٹوٹی ہوئی برف کے سوراخ میں گلابی رنگ کی ٹوپی نظر آئی اور اودے رنگ کی جیکٹ بھی جھلک رہی تھی۔ جیوا باہر کی جانب بھاگی۔ جب وہ جائے حادثے پر پہنچی تو چند بلبلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر غور کیا تو سطح آب سے ذرا نیچا اسے اودے رنگ کی جھلک نظر آئی۔

☆......☆



اس روز اسٹیٹ ٹروپر 37 سالہ رچ وارڈل اپنے معمول ...... کے روٹ سے ہٹ کر ٹاؤن روڈ سے ہوتا ہوا ہیڈ کوارٹر جا رہا تھا، جس کے باعث اس کا فاصلہ سالٹ آئی لینڈ روڈ سے فقط نصف میل رہ گیا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا۔ چنانچہ اس کے ریڈیو پر جب ایمرجنسی کال موصول ہوئی تو وہ جائے حادثہ سے سب سے زیادہ قریب تھا۔ اس نے فوراً ایمرجنسی لائٹ اور سائرن آن کردیا۔ گاڑی تیزی سے گھمائی۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سالٹ آئی لینڈ روڈ پر جائے حادثے سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ برف کا سوراخ پہلے سے چوڑا ہوگیا تھا اور سطح آب سے ذرا نیچے وہ اودے رنگ کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔

گاڑی پھسلتی ہوئی ایک جھٹکے سے رکی۔ رکتے رکتے وہ گاڑی سے باہر تھا۔ ایک ہی جست میں اس نے کھمبے گرل کی رکاوٹ کو عبور کیا اور اڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔

چند سیکنڈ قبل سڑک کی دوسری جانب والینٹئر فائر کیپٹن پیٹ مرفی نے سائرن کی چیختی ہوئی آواز سنی، اس نے چیخ کر اپنے بیٹے کو کار ٹرنک (ڈگی) سے رسی لانے کو کہا اور خود پولیس کار کی طرف بھاگا۔ رکاوٹ پر سے چھلانگ لگا کر وہ فوراً ہی رک وارڈل کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا بیٹا اس قسم کے مختلف حادثات میں باپ کا ہاتھ بٹاتا رہا تھا، اسے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر نہایت تیزی سے رسی لے کر باپ سے جا ملا۔ مرفی نے بیٹے کے ہاتھ سے رسی جھپٹی اور ایک سرا قریب ترین درخت سے باندھ آیا۔

بوڑھی جیوا کی کال کے بعد امدادی واقعات نہایت تیزی سے وقوع پذیر ہوئے تھے۔

وارڈل سینے تک یخ پانی میں تھا اور گھونسوں سے برفیلی

PakiBooks.Site

پرت کو توڑتا ہوا اودے رنگ کی فلوٹ کرتی ہوئی جیکٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جلد ہی اس کے مضبوط ہاتھوں نے بچی کو اٹھا لیا جو قطعی بے حس و حرکت تھی۔

اسی دوران اس کا ساتھی اسکاٹ مارٹن بھی جائے حادثہ تک پہنچ گیا تھا۔ مارٹن نے دونوں ہاتھ کے پنجے ملا کر بریٹنی کے سینے پر رکھے اور CPR کا عمل شروع کر دیا۔ بریٹنی کا نظامِ تنفس اور حرکتِ قلب رکی ہوئی تھی۔ طبی زبان میں یہ کلینکل ڈیتھ تھی۔ کوئی وائٹل سائن نہیں تھا۔ مارٹن نہ صرف قانون کا رکھوالا تھا بلکہ سند یافتہ ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن تھا۔ اس کی عمر 29 سال تھی۔ وہ اس حقیقت سے آنکھیں چرا رہا تھا کہ وہ ننھی سی جان کو بچانے میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ تاہم وہ CPR کے عمل سے دستبردار نہیں ہوا۔ اس کی استقامت اور رجائیت نے کرشماتی رنگ دکھایا اور تین سے چار منٹ میں بریٹنی نے کھانسی کے ساتھ پانی اگلا اور رونے لگی۔

''او خدایا شکریہ، ایک تو زندہ ہے۔'' وارڈل نے چھ سالہ بریٹنی کی آواز سن لی تھی۔ وہ خود متواتر برفیلے پانی میں دوسری بچی کی تلاش میں غوطہ زن تھا۔ پانی گدلا ہو گیا تھا۔ ہر نئے غوطے کے بعد وارڈل کی تھکن اور مایوسی میں اضافہ ہو جاتا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ دو بچے تھے؟'' وہ چلایا۔ ''مجھے ابھی تک کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے۔''

دس منٹ بعد برفیلے پانی نے اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ پانی سے باہر آ کر چیختا تو اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ شامل ہوتی۔ اس کی سوچ بھی گدلانے لگی۔ اس نے زیرِ آب تلاش کا جو حسابی پیٹرن کا منصوبہ بنایا تھا شاید ذہن بار بار اس حساب کو بھول رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور بائیاں شانہ برف کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کے آبدار کناروں سے زخمی ہو چکے تھے۔ تاہم اس کے دماغ میں یہ سوچ اپنی جگہ پر ایستادہ تھی کہ اسے ہر حال میں دوسرے بچے کو ڈھونڈنا ہے۔

اسی دوران چند میل دور پیشہ ور اسکوبا انسٹرکٹر اور والنٹیر فائر فائٹر مارک ہوبرمین گھر پر فلو میں پڑا تھا جب اس کے پیجر پر پیغام آیا۔ وہ اپنی علالت کو بھول کر اچھلا اور تیزی سے غوطہ خوری کا سوٹ اور دیگر سامان جو تیاری کی حالت میں رہتا تھا گاڑی میں رکھا تھا لے کر گھر سے نکل گیا۔ وہ ہر ممکن تیز رفتاری سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ مارک جس وقت جائے وقوعہ پر پہنچا اس وقت وارڈل ہائپوتھرمیا کا شکار ہو چکا تھا اور ساتھیوں نے اسے کنارے پر گھسیٹ لیا تھا۔

وہاں اب کافی افراد نظر آ رہے تھے۔ مارک نے پیروں کے پنجوں میں ربر کے پنکھ لگائے، ماسک اور سوٹ چڑھایا، وہ انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا تاہم وہاں موجود افراد اسے مزید عجلت کے لیے چلا رہے تھے۔ فلو کا احساس مٹ گیا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ یخ بستہ پانی میں اتر گیا۔

پہلے ہی غوطے میں اس نے کوئی چیز محسوس کی لیکن یہ ایک اینٹ تھی۔ دوسری ڈائیو میں واپس آتے ہوئے اس کے سر پر برف کی چھت آ گئی۔ اس نے گھونسے بازی کے ذریعے اسے توڑ کر نکلنا چاہا لیکن بغیر کسی سہارے یا اوزار کے پانی کے اندر رہتے ہوئے اسے نیچے سے توڑنا ممکن نہیں تھا۔

اس نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے اطراف میں نگاہ دوڑائی تو مذکورہ سوراخ سے اندر آتی ہوئی روشنی اسے نظر آ گئی۔ وہ اس جانب تیرنے لگا۔ پانی سے سر نکالتے ہی اس کی سانس ٹوٹ گئی۔ وہاں موجود افراد اسے آس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے تاہم اس کی توجہ زیرِ آب تھی۔ مارک نے گہرے گہرے سانس لیے اور ایک بار پھر پانی میں غائب ہو گیا۔ وہ حادثے والے سوراخ سے کافی دور آ گیا۔ اسی دوران وہ متواتر تہہ کے قریب رہتے ہوئے حتی الامکان ہاتھوں اور آنکھوں کا استعمال کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے پھیپھڑوں میں جلن شروع ہو گئی۔ اس کی برداشت جواب دے رہی تھی۔ مارک نے واپسی کا ارادہ کیا اور دفعتاً اس کا ہاتھ کسی چٹان نما چیز سے ٹکرایا۔ ربر سوٹ کی موجودگی کے باوجود اس کے ہاتھ سن ہو رہے تھے۔ وہ تارا کا بازو تھا۔ اس کی سن انگلیاں بازو سے لپٹ گئیں۔ مارک کے پھیپھڑوں میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔ وہ تارا کو لے کر روشنی کی طرف پلٹا اسے لگا کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ دماغ میں ستارے ناچ رہے تھے۔ ''اب یا کبھی نہیں۔'' اس نے اضافی قوتِ ارادی کو دل ہی دل میں آواز دی۔

جب وہ پانی سے نکلا تو وہاں شور مچ گیا۔ مارک ہوبرمین بری طرح ہانپ رہا تھا۔ نظامِ تنفس کو نئی زندگی مل رہی تھی۔ مارک نے خود کو سنبھالنے میں دیر نہیں لگائی، ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔

اس نے بچی کی ناک چٹکی میں دبائی اور منہ پر منہ رکھ کر مصنوعی تنفس کی کوشش کرنے لگا۔ اسی حالت میں وہ پوری طرح پانی سے باہر آ گیا۔ ایک اور پولیس افسر نے بڑھ کر ''مردہ'' بچی کو لے لیا۔ وہ جو سڈول تھا۔ وہ تارا کی ناک پکڑے اور منہ پر منہ لگائے سڑک کی طرف جا رہا تھا۔

''وہ تارا ہے۔'' کسی کی چیخ سنائی دی۔ ''کیا وہ زندہ ہے؟'' سڈول نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لڑکی پندرہ منٹ تک سرد جہنم میں پڑی رہی تھی۔ اس کی کھال برف لگ رہی تھی۔ آنکھیں گھوم کر اوپر چڑھ گئی تھیں۔ ''یہ نہیں بچ سکتی۔'' سڈول نے سوچا۔

بریٹنی اس وقت خود سے سانس لے رہی تھی لیکن تارا میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دونوں کو ایمبولینس کے ذریعے چار میل دور اپسکس کے شورلائن کلینک پہنچایا گیا۔

☆......☆

کلینک میں عام طور پر چار بجے ایک ڈاکٹر موجود ہوتا تھا لیکن اس دن ڈاکٹر مائیکل سائکس جلدی آ گیا۔ ڈاکٹر ہیرٹ بری کو مائیکل کے آنے کے بعد ہی رخصت ملتی۔ دوسری صورت میں اسے رات کی بھی ڈیوٹی دینی پڑتی۔ نرسوں کی شفٹ بھی تبدیلی کے مراحل میں تھی کہ ایمرجنسی پیغام پہنچ گیا۔ یوں جب بچیاں وہاں پہنچیں تو میڈیکل کیئر کے لیے اسٹاف کی تعداد دوگنی تھی۔

ڈاکٹر ہیرٹ نے بریٹنی کو سنبھالا اور ڈاکٹر مائیکل، تارا کی جانب متوجہ ہوا۔ بریٹنی کا ٹمپریچر 90 ڈگری پر تھا جب کہ تارا کا جسمانی درجہ حرارت خوفناک حد تک گر کر 80 ڈگری پر آ گیا تھا۔ تارا کے سینے کو کارڈیک مونیٹر سے منسلک کیا گیا اور دیگر ضروری اقدامات کیے گئے۔ اسکرین پر دھڑکن کی لکیر بالکل سیدھی تھی۔ اس کی کلینکل ڈیتھ کو 25 منٹ ہو گئے تھے۔

مائیکل کے نزدیک اس کے بچنے کا ایک فی صد امکان تھا کیونکہ اس نے ڈوب کر موت کو چھو جانے والے متعدد مریضوں کو حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہوتے دیکھا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس نے گرم آکسیجن پہنچانے کے لیے پلاسٹک کی ایک ٹیوب سانس کے راستے تارا کے پھیپھڑوں تک پہنچائی، نسوں میں کئی سوئیاں داخل کر کے انہیں ٹیوبس کے ساتھ منسلک کیا اور نسوں کے ذریعے براہ راست خون میں ضروری گرم سیال پہنچانا شروع کیا۔ اس کے لیے بھی اسے خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔ دل کو شاک دینے کے لیے اس نے الیکٹرک پیڈل دونوں ہاتھ میں لیے نرسیں بھی اس کی مدد کر رہی تھیں۔

اب تک اتنے قلیل عرصے میں جو کچھ ہوا تھا وہ کسی کرشمہ کی مانند تھا۔ اتنی سی دیر میں دو آدمی مرتے مرتے بچے تھے۔ ایک وارڈل جو آخری وقت تک تارا کی تلاش میں سرد ترین پانی میں غوطہ زنی کرتا رہا اور بالآخر ہائپوتھرمیا کا شکار ہو گیا۔ دوسرا بیمار مارک تھا جو کرشماتی طور پر تارا تک پہنچ تو گیا تھا لیکن خود اس کا تارا کو لے کر سرد پانی کی قبر سے باہر آنا محال ہو گیا تھا۔ مزید یہ کہ بریٹنی اور سارا موت کے منہ میں تھیں۔ تارا تو مردہ ہی تھی۔ اولین شخص سے لے کر کلینک تک ہر ایک نے اپنا کردار انتہائی بلکہ خطرناک حد تک ادا کیا تھا کہ کسی طرح ڈوبنے والی بچیوں کو بچا لیا جائے۔

ڈاکٹروں کا امتحان اب شروع ہوا تھا۔ یہ بھی ایک کڑا امتحان تھا۔

ڈاکٹر اور نرسیں پورے 20 منٹ تک تارا کو موت کی وادی سے واپس کھینچنے کی شدید کوشش میں جٹے رہے۔ تاہم نتیجہ صفر تھا۔

ڈاکٹر مائیکل کی پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں اور اس نے آخری داؤ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔

مائیکل نے ایک لمبی سوئی براہ راست تارا کے سینے سے داخل کر کے دل کے چیمبر تک پہنچائی اور اس میں ایپن فرائن انجیکٹ کر دیا۔ ایپن فرائن ایک طاقت ور اشتعال انگیز دوا ہے۔ سب کی سانسیں رک گئیں۔

پہلی کمزور سی دھڑکن آئی اور ڈاکٹر کی چیخ نکل گئی۔ پانچ بج رہے تھے۔ ڈاکٹر نے پیشانی کا پسینا صاف کیا۔ تارا کی نبض اور خون کا دباؤ واپس آ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر ہیلی کاپٹر کے ذریعے پل نیو ہیون اسپتال پہنچایا گیا۔ اس ترسیل میں پندرہ منٹ خرچ ہوئے۔ بریٹنی کی حالت بہتر تھی تاہم ایڈوانس میڈیکل کیئر پھر بھی ضروری تھی چنانچہ ایمبولینس میں اسے بھی نیو ہیون پہنچایا گیا۔

ڈاکٹر مائیکل کی وضاحت کے مطابق انسانی جسم میں ایک میکنزم پایا جاتا ہے جسے میمالین ڈائیونگ ریفلکس کہتے ہیں۔ یہ شیر خوار اور بچوں میں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ اسی MDR نے دونوں بچیوں کی مدد کی اور مختلف افراد اور اداروں کی باہمی کاوش نے انہیں موت کے غار سے نکال لیا۔

MDR ٹھنڈے پانی میں کام کرنے لگتا ہے اور جسم بالکل نچلے گیئر میں چلا جاتا ہے۔ خون کی روانی تمام اعضاء کے لیے بند ہو جاتی ہے۔ سوائے دل، گردے اور دماغ کو خون ملتا ہے۔ خون ٹھنڈا ہو کر اعضائے رئیسہ کے لیے ریفریجریٹر کا کام کرتا ہے۔ اس طرح آکسیجن کی طلب کم ہو جاتی ہے، ڈاکٹر نے اختصار سے اس تفصیل کو یوں بیان کیا۔

''تارا اور بریٹنی میٹابولک آئس باکس میں تبدیل ہو گئی تھیں۔'' نیز اگر یہ حادثہ موسمِ گرما میں پیش آتا تو شاید کہانی یکسر بدلی ہوئی ہوتی۔

PakiBooks.Site

کسی فلمی کہانی کی طرح تیزی سے نئے نئے موڑ لیتی روداد

ملمع چہرہ

سید احتشام

جرم کرنا بہت آسان ہے مگر جرم پر پردہ ڈالنا اتنا ہی مشکل، اس بداطوار نوجوان نے بھی بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ قانون اگر جاگ رہا ہو تو مجرم بچ نہیں سکتا۔ممبئی میں رونما ایک پرت در پرت جرم کی روداد کہ جب مجرم سامنے آیا تو محکمۂ پولیس بھی حیران رہ گیا۔کیونکہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ جو ہمہ وقت سامنے رہا وہی مجرم تھا۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا۔ پونا کے نارائن پیٹھ علاقے میں سناٹے کا راج تھا۔ ایسے میں ایک سیاہ کار پبلک ٹیلی فون بوتھ کے پاس آکر رکی اور اس میں سے ایک شخص نے اتر کر تیزی سے کچھ نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ قائم ہونے پر وہ بولا۔ ”صاحب! میں......“

”ہاں ہاں بولو......“ دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”صاحب اس نے تو راستے ہی میں دم توڑ دیا۔“

”اوہ گاڈ، اب کیا ہوگا؟“

”صاحب! آپ گھبرائیں نہیں، اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں ہے۔ میں نے اسے اس کے گھر میں بستر پر لٹا دیا ہے۔ ویسے بھی نشے میں دھت تھا۔ صبح لوگ سمجھیں گے کہ زیادہ شراب پینے کے سبب مر گیا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کی بیوی کا کیا کرو گے؟“

”یہی جاننے کے لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ ویسے کچھ دن تک ہم اسے شہر کے باہر والے حصے میں رکھ سکتے ہیں۔“

”تمہیں جو مناسب لگے، وہی کرو۔“

فون پر گفتگو کرنے کے بعد وہ شخص ٹیلی فون بوتھ سے باہر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس کے برابر میں خوف سے لرزتی ہوئی ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ کار رات کا سکوت توڑتے ہوئے جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے لوٹ گئی۔

☆......☆

اس واقعے کے تقریباً چھ گھنٹے کے بعد یعنی صبح کے آٹھ بجے وشواس کیمیکلز کا پارٹنر سورج مل، پونا کے نانا پیٹھ کے علاقے میں واقع سات نمبر فلیٹ کے سامنے پہنچا۔ یہ فلیٹ وشواس کیمیکلز کے مالک مدھو کلکرانی کا تھا۔ سورج مل نے دروازہ کھٹ کھٹا کر تھوڑی دیر تک انتظار کیا۔ جب دروازہ نہیں کھلا تو اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ سورج مل اندر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ بستر پر مدھو کلکرنی پڑا ہوا تھا۔ سورج مل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ارے مدھو یار، رات کا خمار ابھی تک نہیں اترا ہے کیا؟ اٹھو بھائی آٹھ بج گئے ہیں۔“

ایسا لگا جیسے مدھو نے سنا ہی نہ ہو۔ تب سورج مل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ کے سرد لمس سے سورج مل کو پسینا آگیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مدھو کلکرانی موت کی نیند سو رہا ہے۔ اس نے ایک نظر مدھو کلکرانی کے بے جان جسم پر ڈالی۔ اس کی نگاہ مدھو کی قمیص کے کالر میں اٹکی ایک شے پر پڑی اور وہیں اٹک گئی پھر سورج مل نے بے جھجک وہ چیز اپنے ہاتھ میں لی اور اپنی جیب میں ڈال لی۔ اس کے بعد وہ ”بھائی صاحب...... بھائی صاحب!“ کی پکار کرتا ہوا فلیٹ کے باہر آیا۔

سورج مل کی آواز سنتے ہی اڑوس پڑوس کے کرائے دار جمع ہو گئے۔ پولیس کو واردات کی خبر دے دی گئی۔

اسی دن شام کے پانچ بجے انسپکٹر پردھان، تھانے میں بیٹھے روزمرہ کی جرائم ڈائری دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہ ایک رپورٹ پر پڑی اور انہوں نے سب انسپکٹر پاٹل سے پوچھا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی یا نہیں؟“

”نہیں سر...... لیکن مقتول کی گردن پر انگلیوں کے نشان تھے۔“

”قتل کا سبب پتا چلا؟“

”نہیں سر لیکن اتنا یقین ہے کہ چوری کے سبب یہ قتل



نہیں ہوا، کیونکہ گھر کا سارا سامان جوں کا توں موجود ہے لیکن مدھو کلکرانی کی بیوی کا کہیں اتا پتا نہیں ہے۔ اس بات کا امکان کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کا گلا گھونٹ کر فرار ہو گئی۔ ہاں! ہو سکتا ہے کہ اسے بھگا لے جانے کے لیے یہ قتل کیا گیا ہو کیونکہ پڑوسیوں کا بیان ہے کہ وہ بے حد خوب صورت ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو نجن کا سراغ لگانا اول کام ہے۔ تم نے اس کا فوٹو اور اس کے متعلق ساری معلومات تو جمع کر لی ہوں گی؟“

”جی سر لیکن اس کے فوٹو کی بھی عجیب داستان ہے۔ یوں تو مدھو کلکرانی کا کیمیکلز کا کاروبار تھا لیکن اسے فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا، اس کے گھر میں ایک کیمرا بھی ملا ہے۔ اس نے فوٹو ڈیولپ کرنے کے لیے گھر میں ڈارک روم بھی بنا رکھا تھا۔ ویسے بھی وہ جو فوٹو اتارتا تھا ان کے پرنٹ باہر سے نکلوانا آسان نہیں تھا۔“

”کیا مطلب؟“ انسپکٹر پردھان نے حیرت سے پوچھا۔

”جناب والا وہ اپنی بیوی نجن کی عریاں تصویریں کھینچا کرتا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے سب انسپکٹر پاٹل نے عریاں تصویریں میز پر رکھ دیں۔

تصویروں پر نگاہ ڈالتے ہوئے انسپکٹر پردھان مسکرا کر بولے۔ ”پاٹل! اب تو تم اسے کسی بھی حالت میں آسانی سے شناخت کر سکتے ہو۔“

انسپکٹر پردھان مزید کچھ کہنے والے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ”پردھان صاحب! میں بول رہی ہوں، سیدھانی مل کے منیجر واجی صاحب مہندلے کی بیوی، آپ مہربانی کر کے بنگلے پر فوراً آجائیں۔ مجھے آپ سے بے حد ضروری کام ہے۔“

”ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔“ انسپکٹر پردھان نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ادھر مسز مہندلے، انسپکٹر پردھان کی راہ تک رہی تھیں۔ بنگلا ان کی امارت کی علامت تھا۔ مسز مہندلے کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ انسپکٹر پردھان کو دیکھتے ہی انہوں نے اس کا استقبال کیا اور مخاطب ہوئیں۔ ”پردھان صاحب! معاف کیجیے گا، مجبور ہو کر آپ کو تکلیف دی ہے۔“

”اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر ارد گرد نظریں دوڑا کر پوچھا۔ ”واجی صاحب گھر میں نہیں ہیں کیا؟“

”وہ روٹری کلب کی میٹنگ میں گئے ہوئے ہیں۔ میں سخت مصیبت میں ہوں اور ان کی غیر موجودگی میں ہی بات کرنا چاہتی ہوں۔“ مسز مہندلے بولیں اور ایک لفافہ نکال کر پردھان کو تھماتے ہوئے گویا ہوئیں۔ ”یہ خط انہیں آج صبح ملا

PakiBooks.Site

ہے۔ خط ملتے ہی وہ بے چین ہو گئے تھے۔''

انسپکٹر پردھان نے اس لفافے کو غور سے دیکھا۔ لفافے پر پونا ہی کے ڈاکخانے کی مہر تھی۔ انسپکٹر پردھان نے لفافے میں سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ نکال لیا۔ اس پر سبز روشنائی سے موٹے الفاظ میں لکھا تھا۔ ''بتائی گئی رقم تیار رکھو اور اگلے پیغام کے لیے فون کا انتظار کرو۔''

اس خط پر نہ تو دستخط تھے اور نہ ہی بھیجنے والے کا پتا، مسز مہندلیے بولیں۔ ''یہ خط ملتے ہی میں سمجھ گئی کہ میرے شوہر مصیبت میں ہیں۔ اب آپ ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں۔''

انسپکٹر پردھان نے بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ ساری حقیقت بیان کر دیں تو مناسب رہے گا۔''

''مجھے کچھ زیادہ تو معلوم نہیں ہے۔'' وہ بولیں۔ ''روزانہ صبح کارخانے جانے سے پہلے میں اور میرے شوہر ایک ساتھ ناشتا کرتے ہیں۔ اس وقت ہم دونوں اطمینان سے بات چیت بھی کرتے ہیں۔ ناشتا کرنے کے دوران وہ ڈاک سے آئے ہوئے خطوط بھی دیکھتے ہیں۔ آج صبح ناشتے کے وقت ملازم نے لیٹر بکس سے خط نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔ جب انہوں نے ایک لفافہ چاک کیا تو چونک گئے اور خط پڑھتے ہی چپ چاپ اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں یہ دیکھ کر یوں انجان بن گئی جیسے میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ انہوں نے رشتے داروں کے خط مجھے پڑھنے کے لیے دے دیے، مجھ سے باتیں بھی کیں مگر وہ سب رسمی باتیں تھیں۔ میں ان پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ مل جانے سے قبل انہوں نے بیڈروم کی الماری میں یہ خط چھپا کر رکھ دیا۔ ان کے جاتے ہی میں نے یہ خط پڑھا اور آپ کو فون کر دیا۔''

انسپکٹر پردھان، مسز مہندلیے کی باتیں نہایت غور سے سن رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''اس بارے میں آپ نے اپنے شوہر سے کیوں نہیں پوچھا؟''

مسز مہندلیے نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''پچھلے چھ ماہ سے ہمارے گھریلو امن اور سکون کو گہن لگ گیا ہے، اسی لیے مجھے خود ان سے پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ پردھان صاحب میرے شوہر سیدھے سادے شریف آدمی ہیں لیکن پچھلے چھ مہینوں میں بالکل بدل گئے۔ شام کو گھر لوٹنے کے بعد وہ کبھی باہر نہیں جاتے تھے اور بلا ضرورت ایک پیسا بھی خرچ نہیں کرتے تھے لیکن اب وہ گھر سے باہر جاتے ہیں تو ہزاروں روپے ان کی جیب میں ہوتے ہیں جس کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔''

''مسز مہندلیے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے شوہر کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ کوئی شخص انہیں بلیک میل کر رہا ہے۔''

''لیکن ایسی کیا بات ہے کہ وہ مجھ سے بھی چھپا رہے ہیں؟ مجھے پیسے کی فکر نہیں ہے لیکن انہیں کچھ ہو گیا تو؟''

انسپکٹر پردھان انہیں تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''فکر نہ کریں، آپ کے شوہر کو کچھ نہیں ہوگا، آپ اپنے شوہر پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ آپ کو کچھ پتا چل گیا ہے۔ انہیں میرے یہاں آنے کا بھی نہ بتایئے گا اور جیسے ہی کوئی خاص بات نظر آئے آپ فوراً مجھے مطلع کریں۔''

☆......☆

دو دن کے بعد ہی رات کے آٹھ بجے کے قریب انسپکٹر پردھان کو مسز مہندلیے کا فون آیا۔ ''پردھان صاحب! واجی صاحب کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ پہلے کسی کا فون آیا تھا۔ میں نے واجی صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ بندوبست ہو گیا ہے۔''

انسپکٹر پردھان نے فون رکھ کر تیزی سے پرائیویٹ گاڑی نکالنے کا حکم دیا، جس کا استعمال وہ خاص موقعوں پر ہی کیا کرتے تھے۔ حوالدار اور انسپکٹر پردھان، واجی صاحب کے بنگلے کے سامنے والی سڑک پر جا پہنچے۔ ڈرائیور نے گاڑی خراب ہونے کے بہانے سے اس کا بونٹ کھول دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی واجی صاحب کی گاڑی بنگلے سے باہر نکلی۔ مسٹر مہندلیے خود گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور وہ تنہا تھے۔ انسپکٹر پردھان نے اپنے ڈرائیور کو مسٹر مہندلیے کی گاڑی کا تعاقب کرنے کو کہا۔ سنبھاجی پارک کے پاس پہنچ کر مسٹر مہندلیے نے اپنی کار روکی۔ قریب ہی ایک پوسٹ بکس تھا، جہاں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا اور وہ اخبار پڑھنے کا دکھاوا کر رہا تھا۔ مسٹر مہندلیے نے اس شخص کے پاس پہنچ کر ہاتھ میں ایک پیکٹ تھما دیا اور فوراً اپنی کار میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔ انسپکٹر پردھان کے ڈرائیور نے پوچھا۔ ''سر، گاڑی کا تعاقب کرنا ہے کیا؟''

انسپکٹر پردھان نے نفی میں گردن ہلا کر منع کر دیا۔ ان کا سارا دھیان نیلی قمیص والے اس شخص پر تھا جسے مسٹر مہندلیے نے لفافہ دیا تھا۔ وہ شخص تھوڑے فاصلے پر ہی پہلے سے تیار کھڑی ایک ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر پردھان نے اپنے

ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

ٹیکسی جنگلی مہاراج روڈ سے ہوتی ہوئی، گورے گاؤں پارک علاقے کی تیسری گلی میں گھوم کر ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے جا کر رک گئی۔ انسپکٹر نے بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر اپنی گاڑی رکوائی اور نیچے اتر کر دبے قدموں سے آگے بڑھے۔ اس دوران وہ شخص ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے بنگلے میں داخل ہو گیا تھا۔

☆......☆

رات کا وقت ہونے کے سبب گلی میں سناٹا تھا۔ انسپکٹر پردھان اور حوالدار جامو خاموشی سے اس بنگلے کے گیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور سیدھے بنگلے کے عقب میں پہنچ گئے۔ بنگلے میں عقب کی جانب اور کوئی دروازہ نہیں تھا۔ لوٹ کر انسپکٹر پردھان نے سامنے کے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی۔

''دروازہ کھولو۔ میں انسپکٹر پردھان ہوں۔''

اس شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ انسپکٹر پردھان نے پوچھا۔ ''آپ کا نام؟''

''سورج مل۔''

''مدھو کلکرانی کے قتل کی خبر پولیس کو تم نے ہی دی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''سورج مل، میں واجی صاحب مہندلیے کو بلیک میل کر کے ان سے پیسے اینٹھنے کے جرم میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔''

''تو یہ بات ہے۔'' سورج مل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''مہندلیے سیٹھ نے دغا بازی کی ہے۔ ٹھیک ہے دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پیسے والے کے جرائم پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور ہتھکڑی غریبوں کو لگتی ہے۔''

''سورج مل، میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں مسٹر مہندلیے سے پیسے لیتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''جناب! بغیر مطلب کے کوئی کسی کو پیسے نہیں دیتا۔ پھر بھی کیا مسٹر مہندلیے نے میرے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے؟''

''شکایت کسی نے بھی درج کرائی ہو، اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہے۔''

''اگر یہ شکایت ان کی بیوی نے کی ہے تو انہیں اسے واپس لینا ہوگا ورنہ وہ پونا شہر میں عزت کے ساتھ نہیں رہ پائیں گی۔ میں چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ مسٹر مہندلیے نے ہی مدھو کلکرانی کی بیوی کو اغوا کیا ہے۔''

یہ سنتے ہی انسپکٹر پردھان ایکدم سے چونکے۔ ''سورج مل، ہوش میں تو ہو؟'' انہوں نے سختی سے پوچھا۔

''جناب، کوئی میری گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنا چاہے گا تو مجھے سچائی بیان کرنا ہی پڑے گی اور سچائی کا ثبوت میں ابھی آپ کو دیتا ہوں۔ کلکرانی بستر پر مردہ پڑا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ہی اسے دیکھا تھا۔ اس کے پاس سے مجھے ایک چیز ملی تھی۔ آپ اسے دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ کون قصوروار ہے اور کون بے گناہ۔''

سورج مل نے اپنے کمرے میں موجود ایک صندوق کا

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم پاکستان میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور ہماری مادری زبان اردو کہلاتی ہے مگر پھر بھی ہم اپنی اس اردو زبان سے ناآشنا ہوتے جا رہے ہیں اور دن بدن ہمیں... یہ احساس مارے ڈال رہا ہے کہ ہمیں ابھی اردو زبان سیکھنے کی اشد ضرورت ہے، نیز یہ انکشاف بھی ہوتا جا رہا ہے کہ ہم اپنی زبان میں اگر بالکل نہیں تو بھی کافی حد تک کورے واقع ہوئے ہیں کیونکہ بعض الفاظ کا الٹ پھیر ہماری باتوں کو نہ صرف مضحکہ خیز بنا دیتا ہے بلکہ بعض اوقات نوبت لڑائی جھگڑے تک بھی جا پہنچتی ہے اور ہم اپنی اس ٹوٹی پھوٹی اردو میں نادانی کے باعث کئی دفعہ ایسی سنگین غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ سامنے والا شخص ہمارے جملے سن کر آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آج کل کی اردو سے ہم کو کماحقہ واقفیت کا ہونا لازمی عنصر بن چکا ہے۔ مثلاً حال ہی میں ایک صاحب نے دورانِ ملاقات کچھ اس طرح کی گفتگو کی جو نہ صرف ہمارے چھوٹے سے ذہن کے اوپر سے گزر گئی بلکہ ہم کو سچ مچ اپنی زبان دانی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یار آج کل میں نے بڑی کھٹ راکیں پال رکھی ہیں اور پھر اوپر سے لوگ مجھے الگ مفت کی پھبتیاں بھی بلاوجہ دے جاتے ہیں۔ لہٰذا مجھے اپنی اس اردو دانی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔

مرسلہ: زرتاج بتول۔ لاہور

PakiBooks.Site

ٹوانہ

شاہ پور کوہستان نمک کے دامنی علاقہ میں ٹوانہ آباد ہیں اور انہوں نے پنجاب کی تاریخ میں اس سے کہیں زیادہ نمایاں کردار ادا کیا جو محض ان کی تعداد دیکھتے ہوئے مشکل نظر آتا ہے۔ انہیں پنوار راجپوت اور سیال وگھیا والے مورث اعلیٰ کی نسل سے ہی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ پنجاب میں غالباً سیالوں کے ساتھ ہی آئے اور یقیناً پندرھویں صدی ختم ہونے سے پہلے۔ وہ سب سے پہلے دریائے سندھ پر جہانگیر کے مقام پر آباد ہوئے لیکن انجام کار شاہ پور تھل میں اپنے موجودہ مسکن کو چلے گئے جہاں مٹھا ٹوانہ میں اپنا مرکزی قصبہ تعمیر کیا۔ اس سے بعد کی تاریخ ''دی چیفس آف پنجاب'' کے صفحات 519 تا 534 اور کرنل ڈیویز کی شاہ پور رپورٹ کے صفحہ 40 سے آگے بیان کی گئی ہے۔ باقی کا ضلع سکھوں کا مطیع ہوجانے کے لیے کافی عرصہ بعد تک ٹوانوں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اب وہ ایک نیم گلہ بان، نیم کاشتکار قبیلہ، سپاہی پیدا کرنے والے مضبوط آدمیوں کی نسل سے ہیں۔ تاہم ان کے اوصاف افسوس ناک طور پر ان کی انتہائی جھگڑالو افتاد سے داغدار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندرون خانہ اور جس کسی کے ساتھ بھی واسطہ پڑا ان کی غیر مختتم شورش جاری ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں / از: سرڈینزل ایبٹسن
مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

تالا کھولا اور وہ چیز انسپکٹر پردھان کو تھما دی۔ انسپکٹر پردھان نے اس چیز کو غور سے دیکھا اور اسے سنبھال کر رکھ لیا۔ سارا معاملہ ان کی سمجھ میں آگیا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن مل کے گیٹ کے سامنے کھڑی اپنی کار کا دروازہ مسٹر مہندلے نے تیزی سے کھولا اور کار اسٹارٹ کی۔ گھبراہٹ میں انہیں یہ بھی علم نہ ہوسکا کہ ان کی کار کی پچھلی سیٹ پر پہلے ہی سے کوئی موجود تھا۔ کار کے روانہ ہوتے ہی اس شخص نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مسٹر مہندلے، آپ کہاں جارہے ہیں؟''

آواز سن کر مہندلے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے لیکن چند ہی لمحوں میں انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دھیمی رفتار سے کار چلاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟ اور اس طرح میری کار میں چھپ کر بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟''

''میں پولیس انسپکٹر پردھان ہوں اور اس طرح آپ کی کار میں بیٹھنے پر معافی چاہتا ہوں۔ معاملہ کیا ہے، یہ میں آپ کو بعد میں ہی بتاؤں گا مگر آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''میں کہیں بھی جاؤں، اس سے آپ کا کیا لینا دینا ہے؟''

''لینا دینا ہے مسٹر مہندلے۔ جانے کے لیے آپ کے پاس دو ہی جگہیں ہیں۔ ایک تو وہ جہاں آپ نے مدھو کلکرانی کی بیوی کو چھپا کر رکھا ہے، یا پھر پولیس اسٹیشن۔''

مہندلے نے غور سے انسپکٹر پردھان کی بات سنی اور پھر کہا۔ ''آپ تو سیدھے حوالات کی بات کررہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو میں ایک سگریٹ پی لوں؟''

''بالکل! لیکن یاد رکھنا کہ سگریٹ کے بہانے جیب میں اگر ریوالور وغیرہ ہو تو اسے نکالنے کی غلطی مت کرنا کیونکہ میں اپنا ریوالور ہاتھ میں ہی لیے بیٹھا ہوں۔''

مہندلے پھیکی ہنسی ہنس..... کر بولے۔ ''انسپکٹر آپ کو مجھ پر ذرا بھی اعتبار نہیں؟''

''مجھے پیسے والوں پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔''

مہندلے نے اطمینان سے سگریٹ پینا شروع کیا۔ ان کی کار اسٹیشن سے ہوتی ہوئی شہر کے باہر آگئی تھی۔ ''ہم کہاں جارہے ہیں مسٹر مہندلے؟''

''بنگارڈن پولیس اسٹیشن تو بالکل نہیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد کار اہم شاہراہ سے موڑ کاٹ کر کچی سڑک پر آگئی۔ راستے کے دونوں جانب کھیت لہلہا رہے تھے۔ انسپکٹر پردھان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ مسٹر مہندلے کا فارم ہاؤس ہے۔ کار کو سائیڈ میں کھڑی کرکے مہندلے مخاطب ہوئے۔ ''انسپکٹر پردھان اگر آپ کو کنچن سے ملنا ہے تو یہی اترنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔''

انسپکٹر پردھان اور مہندلے کار سے اتر کر ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک چھوٹے سے بنگلے پر پہنچے۔ مہندلے کے دروازے پر دستک دیتے ہی اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''کنچن! میں واجی صاحب مہندلے ہوں، دروازہ کھولو۔''

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی پہنے کنچن کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ دکھ اور فکر سے مرجھایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس کے حسن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے انسپکٹر پردھان کو دیکھا۔ انسپکٹر پردھان سادہ لباس میں تھے۔ بنگلے کے پہلے کمرے میں تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مہندلے اور پردھان بیٹھ گئے۔ کنچن سر جھکائے وہیں کھڑی رہی۔

''کنچن! یہ پولیس انسپکٹر پردھان ہیں اور انہیں یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ میں نے تمہیں یہاں تمہاری مرضی کے خلاف قید کررکھا ہے۔'' واجی بولے۔

''نہیں، نہیں۔'' کنچن نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں خود ہی واجی صاحب کی پناہ میں آئی ہوں۔''

''اچھا، تمہیں واجی صاحب کے سوا اور کوئی سہارا نہیں ملا، مسز کلکرانی؟''

اس سے پہلے کہ کنچن جواب دیتی، مہندلے درمیان میں بول پڑے۔ ''میرا خیال ہے اس سوال کا جواب اگر میں دوں تو بہتر ہوگا۔ کنچن کے شوہر سے میرا تعلق تھا۔ مسٹر کلکرنی میری مل کے لیے کچھ کیمیکلز سپلائی کرتے تھے۔ میں ان کے گھر پر بھی کئی بار گیا ہوں۔ پچھلے منگل کو کنچن نے مجھے فون پر بتایا کہ وہ مصیبت میں ہے۔ تب میں نے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر کنچن کو یہاں بلالیا۔ تب سے وہ یہیں رہ رہی ہے۔ بدقسمتی سے جس رات کنچن نے گھر چھوڑا، اسی رات کسی نامعلوم شخص نے مسٹر کلکرانی کا قتل کردیا۔ دوسرے دن اپنے شوہر کے قتل کی خبر سنتے ہی یہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ ویسے ساری حقیقت بیان کرنے کے لیے یہ پولیس کے پاس جانے ہی والی تھی۔''

''ایسی کیا مصیبت پیش آگئی تھی کہ کنچن کو راتوں رات گھر چھوڑنا پڑا؟'' انسپکٹر پردھان نے پوچھا۔

''شوہر ہی ان کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھا۔ کلکرانی پکا شرابی تھا۔ شراب پینے کے بعد وہ کنچن کو بڑی بے رحمی سے مارتا پیٹتا تھا۔ پچھلے منگل کو وہ ہاتھ میں چاقو لیے کنچن پر وار کرنے دوڑا تھا۔ کنچن نے بڑی مشکل سے پچھلے دروازے سے بھاگ کر اپنی جان بچائی تھی۔''

''کنچن، تم نے اس رات کتنے بجے واجی صاحب کو فون کیا تھا؟'' انسپکٹر پردھان نے سوال کیا۔

''نو بجے کے آس پاس۔'' کنچن نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''مسٹر مہندلے، آپ کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ اور کنچن جو کچھ بیان کررہے ہیں وہ کسی نامی وکیل کے دیئے گئے مشورے کے تحت ہے نا؟ لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں کہ ہوشیاری برتنے سے سچائی چھپ نہیں جاتی ہے۔ شریمتی کنچن کا کہنا ہے کہ اس نے آپ کو رات کے تقریباً نو بجے فون کیا تھا جب کہ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ رات دس بجے تک ان کے گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ ایک بات اور مسٹر مہندلے، اگر کلکرانی نے واقعی چاقو سے کنچن پر وار کرنے کی کوشش کی تھی تو شور ضرور مچتا اور پڑوسیوں سے یہ بات چھپ نہیں پاتی۔ مدھو کلکرانی کو بستر پر مردہ حالت میں پایا گیا اور بستر پر ایک شکن بھی نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا قتل کہیں اور کیا گیا اور قتل کے بعد اسے لاکر گھر میں ڈال دیا گیا۔''

مہندلے کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ان کا چہرہ اتر گیا تھا۔

''مسٹر مہندلے، اب سوال یہ ہے کہ مدھو کلکرانی کا قتل کہاں کب ہوا اور کس نے کیا؟ جہاں تک قتل کا تعلق ہے، مجھے معلوم ہے اور اس بات کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔'' انسپکٹر پردھان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اومیگا میک کی رسٹ واچ نکال کر دوبارہ مخاطب ہوئے۔ ''مسٹر مہندلے، اس گھڑی کو تو آپ پہچانتے ہوں گے؟ اس گھڑی کے ذریعے ایک شخص نے آپ سے دس ہزار روپے اینٹھے کیونکہ جس شخص نے مدھو کلکرانی پر حملہ کیا تھا، یہ اسی کی گھڑی ہے۔ یہ گھڑی مدھو کلکرانی کے کپڑوں میں اٹک کر رک گئی اور نو بج کر پچاس منٹ پر بند ہوگئی۔ اس گھڑی پر ایک جگہ اس کے مالک کا نام بھی کندہ ہے، مسٹر مہندلے آپ ہی بتایئے یہ کیا ہے؟''

''پردھان صاحب! آپ نے جو کہا سچ ہے مگر آپ نے اس سچ کا ایک ہی پہلو دیکھا ہے۔ اب اس کا دوسرا پہلو

شمارہ اگست 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں
ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب
☆اول: قربانی..... نسرین منصور (کراچی)
☆دوم: تاوان..... محمد لطیف (لاہور)
☆سوم: بدمعاش..... آصف علی (لاہور)
پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

PakiBooks.Site

بھی ذرا سنیے۔ مدھو کلکرانی سے میری پہلی ملاقات آفس میں ہوئی تھی۔ ہماری مل میں کیمیکلز استعمال کیے جاتے ہیں۔ مدھو کلکرانی وشواس کیمیکلز کمپنی کا مالک تھا اور کچھ کیمیکلز کے نمونے لے کر وہ میرے پاس آیا تھا۔ اس کے نمونے گھٹیا درجے کے تھے اس لیے میں نے صاف انکار کر دیا۔

اس ملاقات کے دو تین دن بعد ہی جب میں گھر سے مل... آرہا تھا تب مدھو کلکرانی مجھے راستے ہی میں مل گیا۔ اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ قریب آکر اس نے بے حد قابل رحم لہجے میں کہا۔ ''صاحب! پرسوں آپ نے میرے کیمیکلز کے نمونے کینسل کر دیے تھے۔ میں نیا مال لے کر آیا ہوں۔ میرا گھر اور گودام قریب ہی ہے۔ مہربانی کر کے آپ انہیں ذرا دیکھ لیجیے۔''

''دراصل اس کی یہ حرکت مجھے پسند نہیں آئی تھی لیکن اس کی آواز میں جو التجا تھی اس سے میں نرم پڑ گیا۔ ڈرائیور کو کار سائیڈ میں لگانے کا کہہ کر میں کلکرانی کے فلیٹ میں چلا گیا۔''

''میں دو منٹ میں نمونے لے کر آتا ہوں، تب تک آپ یہاں بیٹھیے اور ہاں آپ کو کم سے کم چائے تو پینی ہی پڑے گی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ چار پانچ منٹ کے بعد ہی اس کی بیوی کنچن چائے لے کر آگئی۔ کنچن کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کالے کلوٹے کلکرانی کی بیوی اتنی خوب صورت ہوگی۔ میں نے چائے پینی شروع کر دی۔ چائے ختم ہوتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی مگر...... یہ ممکن نہ ہو سکا پھر جب مجھے ہوش آیا تب میں کلکرانی کے فلیٹ کے ایک کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کلکرانی میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ میرے کپڑے بے ترتیب سے ہو رہے تھے۔ کلکرانی نے مجھ سے کہا۔ ''جناب آپ کو چکر آگیا تھا اس لیے میں نے آپ کو یہاں لا کر سلا دیا۔ ڈرائیور کو میں نے واپس بھیج دیا ہے۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے؟'' کلکرانی نے بتایا کہ پانچ بج رہے ہوں گے۔ اس کا مطلب تھا میں چار پانچ گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ میں نے کلکرانی سے کہہ کر ٹیکسی منگوائی گھر پہنچا۔ میں نے اپنی بیوی کو اس بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

''دوسرے دن صبح ملازم نے آکر بتایا کہ مدھو کلکرانی نام کا ایک شخص آیا ہے۔ میں نے چڑ کر کہا کہ اس سے کہو میرے آفس میں آکر ملے اس پر ملازم نے بتایا کہ وہ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے اسے بھیج دو۔ میں گھر ہی میں آفس کے کام کے لیے بنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں کلکرانی کمرے میں آیا اور آتے ہی دروازہ بند کر کے بولا۔ ''جناب! میں بڑے اعتماد کے ساتھ آپ کو اپنے گھر لے گیا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری غیر موجودگی میں آپ میری بیوی کے ساتھ اس طرح کی گندی حرکت کریں گے۔''

''یہ سنتے ہی میں اپنے ہوش کھو بیٹھا اور کلکرانی کی گردن پکڑ کر اسے دروازے کی طرف دھکا دیا۔ کلکرانی نے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے اپنی جیب میں رکھے لفافے میں سے کچھ فوٹو نکال کر پھینک دیے۔ ان پر نظر پڑتے ہی میں سنانے میں رہ گیا۔ وہ میری ہی تصویریں تھیں۔ کلکرانی کی بیوی کے ساتھ الگ الگ انداز میں وہ بھی عریاں حالت میں کھینچی گئی تصویروں میں میرا چہرہ ایک شرابی شخص جیسا لگ رہا تھا۔ اس کمینے نے مجھے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر پلا دی تھی اور اپنی بیوی کے ساتھ مل کر مجھے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ میں نے نیم مردہ حالت میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، یہ سراسر فریب اور بلیک میلنگ ہے۔''

کلکرانی بڑی بے حیائی سے بولا۔ ''تو ٹھیک ہے یہ ساری تصویریں میں مسز مہندلیے اور آپ کے سارے رشتے داروں کو دکھا دوں گا۔''

''مسٹر پردھان، میں بے قصور تھا۔ اس کے باوجود میں بے بس تھا۔ میرا سر شرم سے جھک گیا۔ میں ان تصاویر سے ہی لرز اٹھا کہ یہ تصاویر اگر میری بیوی یا رشتے داروں نے دیکھ لیں تو پھر میں انہیں کیا منہ دکھاؤں گا۔ میں نے تھوڑی ہمت کر کے اس سے کہا۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ میرے گھر میں ہی بیٹھے ہو اور میں چاہوں تو ایک پل میں یہ تصویریں چھین کر تمہیں دھکے دے کر نکال سکتا ہوں۔''

اس پر اس نے بے شرمی سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے، میرے پاس صرف یہی تصویریں ہیں؟ آپ کہیں تو میں اور کئی تصویریں لا کر آپ کو دے سکتا ہوں۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں اگر مجھے مار دو تو بھی فوٹو آپ کے رشتے داروں کے پاس پہنچا دیے جائیں گے۔ یہ سارا بندوبست کر کے ہی میں یہاں آیا ہوں۔''

آخر شکست تسلیم کر کے میں نے پوچھا۔ ''تم چاہتے کیا ہو؟''

اس نے ہنس کر کہا۔ ''اب آپ عقل مندی کی بات کر رہے ہیں مسٹر مہندلیے۔ مجھے صرف تین ہزار روپے چاہئیں۔ اس کے بعد میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔''

یہ سن کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ صرف تین ہزار روپے میں میری عزت بچ رہی تھی۔ میں نے اسے تین ہزار روپے دے دیے۔ روپے لے کر وہ میز پر پڑی تصویریں اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''گھبرایئے مت، میں انہیں سنبھال کر رکھوں گا۔ کوئی دیکھ نہیں پائے گا۔''

کلکرانی تصاویر لے کر چلا گیا۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میری پریشانیوں کی ابتداء ہے۔ چار پانچ دن کے بعد کلکرانی سیدھا میرے آفس میں آیا اور بولا۔ ''میں اپنی کمپنی کے نمونے لایا ہوں۔ انہیں پاس کر دو اور اکاؤنٹینٹ کو چیک بنانے کے لیے کہہ دو۔''

اس کے بعد تو کلکرانی کو جب بھی روپوں کی ضرورت ہوتی، سیدھا میرے پاس چلا آتا اور میں بے بس ہو کر اسے روپے دے دیتا۔ وہ میری کار اور گورے گاؤں پارک میں میرے دوسرے بنگلے کا استعمال اپنے دوستوں کو پارٹیاں دینے اور عیاشی کے لیے استعمال کرنے لگا۔''

اتنا سن کر مسٹر پردھان نے کہا۔ ''مسٹر مہندلیے! آپ نے پولیس کی مدد کیوں نہیں لی؟''

''پردھان صاحب، جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے، میں جس حالت میں پھنسا تھا، اس حالت میں پولیس کے پاس جانے میں شرم ہی نہیں خوف بھی دامن گیر تھا۔ پھر کیا میری بیوی مجھ پر یقین کر لیتی؟''

انسپکٹر پردھان خاموش ہو گئے۔ مہندلیے نے اپنی داستان بیان کرنی شروع کی۔ ''میری بیوی کو میرے اس برتاؤ سے شک ہونے لگا تھا۔ ایک دن اچانک آفس میں مسز کلکرانی کا فون آیا۔ اس کی آواز سنتے ہی میں خوف سے لرز اٹھا کیونکہ سارے فساد کی جڑ یہی عورت تھی، وہ بولی۔ ''جناب! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ بہت ہی ضروری ..... کام ہے۔ کلکرانی دو دن کے لیے بمبئی گیا ہوا۔ آپ شام کو میرے گھر تشریف لا سکتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں، کبھی نہیں۔ تم کام بتاؤ۔''

وہ بولی۔ ''میں فون پر نہیں بتا سکتی لیکن مجھے آپ ہی کی مدد کرنی ہے۔ مجھ پر یقین کیجیے۔ ایسا موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ اگر آپ نہیں آسکتے تو میں گورے گاؤں میں آپ کے بنگلے پر آسکتی ہوں۔ آپ بلیس رام ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیج

ستمبر 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
مرزا امجد بیگ کے دلائل
محفلِ شعر و سخن
اور خطوط کی پرفریب محفل

ایک کھانی بڑی پرانی
زندگی کے کسی بھی حوالے سے جہدِ مسلسل بالآخر نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی مقام تھا مگر افسوس......''
آخری صفحات پر زویا اعجاز کی جلوہ گری

معتوب وقت
ماضی کے پوشیدہ گوشوں کی فسوں گری اور بند دریچوں میں پنہاں راز و نیاز...... تاریخی صفحات پر الیاس سیتا پوری کا منفرد انداز

رنگ آسماں
زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا سنگم...... اے آر راجپوت کے خیالات کی پرواز

وقت
خوشگوار مستقبل کی آس اور کربناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ حسام بٹ کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ
اسماء قادری، منظر امام، تنویر ریاض، شاہ زین رضوان، طاہر عمیر اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی خوبصورت کہانیاں

دیجیے۔"

اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں گورے گاؤں پارک کے بنگلے پر تمہارا انتظار کروں گا۔ تلسی رام تمہیں لینے آئے گا۔"

تلسی رام بھروسے کا ڈرائیور تھا۔ کئی بار وہ گلگرانی کے گھر جا چکا تھا۔ شام کو تلسی رام کنچن کو لے کر آیا۔ میں لان ہی میں بیٹھا تھا کیونکہ اسے بنگلے کے اندر لے جانا ایک اور مصیبت کا پیش خیمہ ہوسکتا تھا۔ کنچن کے چہرے پر دکھ کا سایہ تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہوئے کہا۔ "واجی صاحب، میری وجہ سے آپ کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ اس واقعے کے بعد بھی میں آپ کے سامنے بے شرم کی مانند کھڑی ہوں۔ یہ صرف اس لیے کہ مجھے بھی اس نیچ شخص سے چھٹکارا چاہیے۔ میں مسز گلگرانی نہیں ہوں۔ میں بیل گاؤں کی ایک پیشہ ور عورت کی بیٹی ہوں۔ ایک دن مدھو میری ماں سے ملنے گیا اور مجھے دیکھنے کے بعد وہ روز میرے گھر آنے لگا۔ میں اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں آکر اس پر فریفتہ ہوگئی اور ایک دن میں گھر سے بھاگ کر اس کے پاس پونا آگئی۔ پونا میں اس کی کوئی ایجنسی تھی لیکن اسے ہمیشہ گھاٹا ہی ہوتا رہا۔ فوٹو گرافی میں اسے شروع ہی سے دلچسپی تھی اور اس کے پاس ایک قیمتی کیمرا بھی تھا۔ ڈارک روم اس نے گھر ہی میں بنوا رکھا تھا۔ پیسے کی لالچ میں اس نے مجھے استعمال کرنا شروع کردیا۔ پہلے پہل اس نے عریاں حالت میں میری تصویریں کھینچ کر عیاش لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنی شروع کیں لیکن جو پیسا ملتا تھا، اسے شراب میں ہی اڑا دیتا تھا۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ دولت مند لوگوں کو پھنسا کر گھر لانے لگا اور چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر ان کی اور میری تصاویر عریاں اور شرمناک حالت میں کھینچ کر انہیں بلیک میل کرنے لگا۔ آپ سوچیں گے میں اتنے گندے کام کے لیے تیار کیسے ہو جاتی ہوں۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھیے۔" یہ کہہ کر کنچن نے اپنی پشت میری جانب کردی۔ بلاؤز تھوڑا سا اوپر کیا۔ اس کی پیٹھ پر جلائے جانے کے کالے کالے داغ تھے۔ میں نے اپنی نظریں ہٹالیں۔ اس کے بعد کنچن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ خاموشی سے برداشت کررہی تھی لیکن جب اس نے آپ جیسے شریف آدمی کو بھی بلیک میل کرنا شروع کردیا تو میری روح مجھے دھتکارنے لگی۔ میں خود بھی اس جرم سے نکلنا چاہتی ہوں لیکن اس سے قبل میں ان تصویروں کے نیگیٹو آپ کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔ دو دن بعد جب وہ بمبئی سے لوٹے گا تو موقع دیکھ کر میں چابیاں ہتھیا کر نیگیٹو آپ کو دے دوں گی لیکن اس کے بعد مجھے کچھ دن آپ کی پناہ میں رہنا ہوگا کیونکہ جب اسے پتا چلے گا کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں اور کنچن دونوں ہی اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور نجات پانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور یہ طے پایا کہ نیگیٹو ہاتھ لگتے ہی وہ ٹیکسی لے کر یہاں آجائے اور اس بنگلے میں کچھ دن رہے۔ اس کے بعد کنچن تلسی رام کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گئی لیکن ہمارا یہ منصوبہ اتنی آسانی سے مکمل نہیں ہوا۔ جو کچھ بھی ہوا ہماری بدقسمتی سے ہوا۔ وہ سب بیان کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے وہ سب کنچن ہی بتائے گی۔"

کنچن نے ایک بار پھر مہندلے کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے بتانے لگی۔ "مدھو کر بمبئی سے لوٹ آیا۔ لوٹتے ہی اس نے واجی صاحب سے پانچ ہزار روپے لیے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ آج بے حساب پیے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ شراب پی کر ہوش وحواس سے بے گانہ ہوگیا۔ میں نے اس کی جیب سے چابی نکالی اور الماری کھول کر نیگیٹو اور تصویریں لے کر ٹیکسی سے سیدھی یہاں آگئی پھر واجی صاحب کو فون کیا۔ بیس منٹ کے بعد ہی تلسی رام انہیں لے کر آگیا۔ میرے ہاتھ سے نیگیٹو اور تصویریں لیتے وقت واجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے، مجھ سے پوچھا۔ "تمہیں روپے چاہئیں؟ بولو بیٹی۔"

میں نے ان سے کہا۔ "اس بدمعاش کو پتا چل گیا تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ اس لیے آپ کچھ دن مجھے یہیں رہنے دیں۔"

واجی صاحب بولے۔ "بیٹی! تم نے مجھے بہت بڑی مصیبت سے بچایا ہے۔ زندگی بھر میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔ تمہیں جب بھی میری مدد کی ضرورت پیش آئے میرے پاس چلی آنا۔"

ابھی یہی بات ہورہی تھی کہ اچانک گیٹ کے سامنے ایک ٹیکسی آکر رکی۔ اس میں مدھوکر ہی تھا۔ کنچن نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ اس کا نشہ تو اتر گیا تھا مگر آنکھوں میں اب خون اتر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے چیخ کر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ بے حیا؟ مجھے نشے میں دھت پاکر سارے فوٹو لے کر بھاگ آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اسی بنگلے میں ملے گی۔"

میں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ واجی صاحب جو

PakiBooks.Site

اب تک خاموش تھے۔ یہ باتیں سن کر طیش میں آگئے۔ انہوں نے یکا یک اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کا گلا دباتے ہوئے بولے۔ "تو زندہ رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔" واجی صاحب اتنے غصے میں تھے کہ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کررہے تھے۔ مدھوکر نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر واجی صاحب اس کا گلا دباتے چلے گئے اور اس کے حلق سے گھرر، گھرر کی آواز آنے لگی۔ میں نے واجی صاحب کو کھینچ کر الگ کیا۔ مدھوکر نیچے گر پڑا۔ مدھوکر کی حالت دیکھ کر واجی صاحب گھبرا گئے اور تلسی رام کو آواز پر آواز دینے لگے۔ تلسی رام نے آکر مدھوکر کو دیکھا اور کہا۔

"جناب! اگر یہ یہیں مرگیا تو آپ پھنس جائیں گے اس لیے آپ ٹیکسی سے فوراً گھر چلے جائیں۔ میں اسے کار میں ڈال کر اسے اس کے گھر پہنچائے دیتا ہوں۔ شاید صبح تک ہوش میں آجائے۔"

واجی صاحب بولے۔ "کنچن اب تم کیا کروگی؟"

میں نے کہا۔ "میں بھی تلسی رام کے ساتھ جاؤں گی لیکن اس کے ہوش میں آتے ہی مجھے گھر چھوڑنا پڑے گا۔ تب تک تلسی رام کو بھی میرے ساتھ رہنے دیجیے۔ واجی صاحب نے ہامی بھرلی اور ٹیکسی سے گھر لوٹ گئے۔"

مہندلے، کنچن کی باتیں غور سے سن رہے تھے، کنچن کے خاموش ہوتے ہی وہ بول پڑے۔ "میں گھر تو چلا گیا مگر میرا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ میں ہال میں چہل قدمی کررہا تھا کہ تلسی رام نے فون پر مدھو کی موت کی خبر دی اور بتایا کہ اس نے اسے اس کے گھر میں بستر پر لٹا دیا ہے۔ میں یہ سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ میں مدھوکر گلگرانی کا قاتل بن گیا تھا۔ انسپکٹر پردھان مجرم آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ یہ میری ہی گھڑی ہے۔ گلگرانی سے ہاتھا پائی کے دوران یہ اس کے کالر میں اٹک کر رہ گئی تھی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ اس گھڑی کے سبب ہی سورج مل نے مجھے بلیک میل کیا۔ میں اس اذیت سے تنگ آچکا ہوں، مسٹر پردھان، مجھے گرفتار کرلیجیے اب مجھے وہیں سکون ملے گا...... شاید۔"

"مسٹر مہندلے مجرموں کو گرفتار کرنا ہی میرا کام ہے۔" انسپکٹر پردھان گویا ہوئے۔ "اس گھڑی کے ذریعے ہی ہمیں پتا چلا کہ آپ نے گلگرانی پر نو بج کر پچاس منٹ پر حملہ کیا تھا لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گلگرانی کی موت رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی گردن پر انگلیوں کے نشان تو ملے تھے مگر اس کی موت دم گھٹنے سے واقع نہیں ہوئی۔"

"تو پھر کیسے؟"

"دماغ پر کاری ضرب لگنے کی وجہ سے۔" انسپکٹر پردھان نے انکشاف کیا۔ "اس کے سر پر چوٹ کا نشان نہیں تھا۔ کسی وزنی چیز کو کپڑے میں اچھی طرح لپیٹ کر زبردست وار کرنے سے ہی یہ ممکن ہوسکتا ہے۔ گلگرانی کے سر پر کپڑے کے دو چار دھاگے چپکے ہوئے تھے۔" انسپکٹر پردھان مزید بتانے لگے۔ "مسٹر مہندلے، مدھو گلگرانی کے ذریعے تم سے پیسے اینٹھنے، تمہارا بنگلا اور کار استعمال کرنے کے دوران ایک اور واقعہ پیش آیا تھا جس کی آپ کو بھنک بھی نہ لگ سکی۔ اتنے عرصے تک مدھو کے ظلم برداشت کرنے والی کنچن میں یکا یک اسے چھوڑنے کی ہمت کیسے پیدا ہوگئی؟ اس حوصلے کے پیچھے ایک سبب تھا۔ اسے مدھو سے نجات دلانے والا شخص مل گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ فرار ہونے والی تھی لیکن اسی رات مدھو کنچن کے پیچھے پیچھے آپ کے بنگلے پر آگیا اور یوں آپ اور کنچن کے ساتھ ساتھ اس سے نجات حاصل کرکے کنچن کے ساتھ گھر بسانے کے خواب دیکھنے والے کا پلان بھی پوری طرح فیل ہوگیا۔ یہ تو طے تھا کہ اگر گلگرانی صبح تک بھی ہوش میں آجاتا تو وہ کنچن سے بڑی بے رحمی سے انتقام لیتا۔ اس لیے ان دونوں کے پاس مدھو کو موت کے گھاٹ اتارنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے آپ کو ٹیکسی کے ذریعے گھر بھیج کر اس کا خاتمہ کردیا گیا۔"

"کیا...... کنچن اور...... تلسی......؟" مہندلے کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں مسٹر مہندلے، آپ مدھو گلگرانی کے لیے کار لے کر اپنے ڈرائیور کو بار بار اس کے گھر بھیجتے تھے۔ اسی دوران کنچن اور اس کے درمیان پیار ہوگیا اور وہ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے بن جانے کے خواب دیکھنے لگے۔ تلسی رام ہی نے موٹر کے جیک پر موٹر صاف کرنے کے کپڑے کو لپیٹ کر مدھو کے سر پر وار کرکے اس کا قتل کردیا۔ میں نے آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی کار کی ڈگی کی تلاشی لی تھی۔ ڈگی میں جو کار صاف کرنے کا کپڑا تھا اسی کے دھاگے مدھو کے سر سے چپکے ہوئے ملے تھے۔ تلسی رام اس وقت حوالات میں ہے اور میں یہاں آپ کو نہیں، کنچن کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔"

کنچن نے اپنی نظریں جھکالیں۔

فردوس بر زمیں

ابن عنقا

برسوں قبل امیر خسرو نے کشمیر کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا کہ اگر فردوس برروئے زمیں است، ہمی است و ہمی است و ہمی است، واقعی کشمیر کا ہر حصہ بلکہ کشمیر سے متصل حصے بھی جنت سے کم نہیں۔ جو چیز انسان کے دست رس میں ہو اس کی قدر و قیمت کا اسے صحیح اندازہ نہیں ہوتا اور وہ اسے بے قدری کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ مری، سوات، کاغان یہ تمام علاقے ہمارے ہیں اس لیے ہم ان کو عام نظروں سے دیکھتے ہیں۔ سرگزشت کے قارئین ابن عنقا کے نام سے نہ آشنا نہیں ہیں۔ اب تک ان کے قلم سے قارئین غیر ملکوں کا احوال سفر پڑھتے آئے ہیں۔ پہلی بار انہوں نے خطہ وطن کی لفظی تصویر کشی کی ہے، الفاظ کے خوب صورت استعمال سے ایک سماں باندھ دیا ہے۔

سیر پاکستان کے حوالے سے ایک دلچسپ تحریر

جب ہم اسکول میں زیر تعلیم تھے تو کتابوں میں شمالی علاقوں کی خوبصورتی کا ذکر پڑھ کر سوچتے تھے کہ ایک دن جب ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے تو پہلا کام یہ کریں گے کہ پاکستان کے شمالی علاقوں کی سیر کریں گے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ پانچویں جماعت کے امتحان کے لیے ہم نے ایک امتحانی گتہ خریدا تھا جس کی پشت پر وادی سوات کا ایک مسحور کن منظر چھپا ہوا تھا جسے ہم پہروں دیکھتے رہتے تھے اور سوچتے تھے کہ کیا ایسی حسین سرزمین بھی ہمارے ملک میں موجود ہے اور کیا کبھی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اس وادی کی سیر کر سکیں لیکن جب ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تو نوکری کا طوق بھی ساتھ ہی گلے میں پڑ گیا اور کشاکش غم دوراں کے چکروں میں ہم بھول ہی گئے کہ ہم نے اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا ہوا ہے جو ایفائے عہد کا متقاضی ہے۔ کبھی کبھار اگر خیال آ بھی جاتا تھا تو ہم سوچتے تھے کہ شادی کے بعد بیگم کے ساتھ جائیں گے تاکہ قدرت کی فیاضیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں پھر شادی ہو گئی اور نوکری کے طوق کے ساتھ ساتھ ایک بیڑی بھی پاؤں میں پڑ گئی۔ اب ہمیں خیال آیا کہ یہ کام ہمیں شادی سے پہلے کر لینا چاہیے تھا کیونکہ اب تو قبر ہی میں جا کر اگر سکون کی کچھ گھڑیاں میسر آئیں تو آئیں ورنہ وہاں بھی سوالات کے جوابات اگر صحیح نہ ہوئے تو بہت مشکل ہو گی۔ شادی کے بعد پھر بچوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ذمہ داریوں کا بوجھ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا۔ اب تو ہم نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ کبھی سیر کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف نکلنا ہوگا۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا اور وہی بچے جن کی وجہ سے ہم مذکورہ سیر کو ناممکن تصور کرتے تھے، اس سیر کی وجہ بن گئے۔ ایک دن ان سب بچوں نے مل کر اپنے ماں باپ کو باور کرایا کہ دنیا میں سیر و سیاحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور یہ کہ آپ کے جملہ فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری سیر و تفریح کا اہتمام کریں۔ بچوں کا یہ مطالبہ گویا برف کی سل پر پہلی چوٹ تھی۔ اندر سے تو ہم بھی یہی چاہتے تھے لیکن یہ تجویز ہم جیسے دانا و بینا شخص کی طرف سے آتا ایک حماقت تصور کی جا سکتی تھی۔ ہماری بیگم بھی ایسی کوئی تجویز پیش کر کے اپنی برسوں کی ساکھ خراب کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ جب بچوں نے یہ بچگانہ تجویز پیش کی تو تھوڑے پس و پیش کے بعد ہم دونوں نے بھی اسے مان لیا۔ اب ہمیں لائحہ عمل طے کرنا تھا کہ سیر کے لیے کس طرح جایا جائے۔

ہم نے اخبار کے اشتہارات سے مدد لیتے ہوئے دو تجاویز پر غور کرنا شروع کیا جس میں سب کے مشورے شامل تھے۔ ایک تجویز تو یہ تھی ایک بس جو کراچی سے چلتی ہے اور واپس کراچی پہنچا دیتی ہے، کے ذریعے سیر کے لیے جایا جائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ہوائی جہاز سے اسلام آباد جایا جائے اور پھر وہاں سے کرایے کی گاڑی میں ایک ہفتے کی سیر کے بعد واپس اسلام آباد آیا جائے اور پھر ہوائی جہاز سے کراچی۔ دوسری تجویز زیادہ آرام دہ اور زیادہ مہنگی تھی۔ پہلی والی تجویز میں وقت ایک مسئلہ بنتا تھا، بچوں کے اسکولوں کے نظام الاوقات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سب کی آراء اور مشوروں کے بعد دوسری تجویز پر اتفاق کیا گیا اور اس کے مطابق تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

اس سلسلے میں ہم نے ایک غیر سرکاری سیاحتی ادارے سے رابطہ قائم کیا اور پھر اس کے دفتر جا پہنچے جو ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ انہوں نے کراچی سے اسلام آباد کے ہوائی سفر، اسلام آباد سے مری، کاغان اور سوات کی ایک ہفتے کی



سیر ایک آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں جو ہمارے خاندان کے لیے مخصوص ہوگی، اور ان تمام جگہوں پر ٹھہرنے کے انتظامات کا ذمہ لینے کا عندیہ ظاہر کیا جو ہمیں پسند آیا کیونکہ ہمارے ذہن میں بھی ایک ایسی ہی سیر کا تصور تھا۔ ان تمام تفصیلات سے ہم نے اپنے بچوں کو بھی آگاہ کر دیا اور ان کی طرف سے توثیق کے بعد ہم نے اس ادارے کو ایک دستاویز تیار کرنے کا حکم دیا کہ جس میں یہ سب تفصیلات درج ہوں تاکہ سفر کے دوران کوئی ابہام پیدا نہ ہو جو ہمارے لیے خلجان کا باعث بنے اور سیر کے لطف کو کرکرا کر دے۔ دستاویز کی تیاری کے بعد اگلا مرحلہ ادائیگی کا تھا، طے یہ پایا تھا کہ سفر سے ایک ہفتہ پہلے ادائیگی ہو جانی چاہیے تاکہ وہ لوگ ہمارے لیے جہاز کی نشستیں، ہوٹل کے کمرے اور گاڑی کا انتظام کر سکیں۔ ایک مہینے بعد کا ایک عبوری نظام الاوقات طے کر کے اور اس کی دستاویز بنا کر ہم نے ان سے کہہ دیا کہ اگر سب خیریت رہی تو روانگی سے ایک ہفتہ پہلے آپ کو ادائیگی کر دی جائے گی تاکہ مجوزہ نظام الاوقات کے مطابق ہم لوگ سیر کے لیے نکل سکیں۔

یہ تفصیلات طے کرنے کے بعد ہم تین ہفتے کے لیے امریکا اپنے ایک دفتری کام کے سلسلے میں روانہ ہو گئے اور ہماری بیگم صاحبہ اپنے میکے تشریف لے گئیں جو شمالی علاقہ جات سے کچھ ہی ادھر واقع ہے۔ بچے مری، کاغان اور سوات کی سیر کی آس لگائے اپنی دادی کے ساتھ کراچی میں رہے۔ نظام الاوقات کچھ اس طرح طے تھا کہ ہمارے امریکا سے واپس کراچی پہنچنے کے دوسرے دن ہمیں سیر کے لیے نکل جانا تھا اور ہماری بیگم صاحبہ کو اسلام آباد میں ہم سے ملنا تھا۔ ادائیگی کے لیے ہم نے اپنے بڑے بیٹے عادل سے کہہ رکھا تھا کہ فلاں دن مذکورہ ادارے کے دفتر جا کر ہنڈی کے ذریعے ادائیگی کر دے اور سفر سے متعلق تمام کاغذات حاصل کر لے، لہٰذا جب ہم امریکا سے واپس کراچی پہنچے تو تمام انتظامات مکمل تھے۔

مقررہ دن ہم اپنے تین بچوں یعنی ایک لڑکی اور دو لڑکوں کو ساتھ لے کر صبح سویرے ہوائی اڈے پہنچ گئے۔ ہمارے بھائی نے ہمیں ہوائی اڈے ہماری گاڑی میں چھوڑا اور واپس چلے گئے۔ بچوں کے لیے یہ ہوائی سفر پہلا تجربہ نہیں تھا لیکن اس دفعہ ان میں ایک نئی امنگ اور ترنگ سرابھار رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ جو خواہش انہوں نے کی تھی وہ بروقت پوری ہو رہی تھی اور اس عمر میں ہر چیز کا لطف کئی گنا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہماری بھی ایک دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی لیکن وہ ترنگ جو ہمارے بچوں کے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی اس کا نام و نشان ہم اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ شاید ہماری خواہش اتنی بوڑھی ہو چکی تھی کہ اس میں اس سفر سے لطف اندوز ہونے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ بچے سفر کی ایک ایک

PakiBooks.Site

تفصیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور خوشی سے سرشار تھے۔

سامان کی اسکیننگ، بورڈنگ کارڈ کا حصول، انتظار گاہ میں جہاز کا انتظار اور انتظار کے دوران بڑی بڑی کھڑکیوں سے جہازوں کی آمدورفت کے مناظر اور اس کے علاوہ ہوائی مستقر میں موجود دکانوں سے اشیائے خورونوش خرید کر کھانا پینا، غرض ایک ایک لمحے اور ایک ایک تفصیل سے خوشی حاصل کر رہے تھے۔ جو چیزیں ہمارے لیے بے کیف معمولات تھیں وہی ان کے لیے لطف ونشاط کی اختراعات تھیں۔ جب ہم جہاز میں بیٹھ گئے تو بچوں نے نشست کے سامنے والی جیب کے اندر رکھی ہوئی ایک ایک چیز کو ٹٹولا اور ہر دستاویز کا سرسری مطالعہ کیا۔ جہاز کے دوڑنے اور دوڑ کر ہوا میں بلند ہونے کا بغور مشاہدہ کیا۔ جہاز کی نشست کے ہر زاویے سے انہوں نے استفادہ کیا اور ڈیڑھ گھنٹے کی اس پرواز میں وہ سوئے بھی اور جاگے بھی، مشروبات وناشتے سے دل بہلایا۔ مختصر یہ کہ تینوں بچے جہاز کے اترنے تک اپنے اپنے حصے کا پورا پورا کرایہ جہاز سے وصول کر چکے تھے۔

ہم لوگ ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکلے تو ڈرائیور گاڑی سمیت اور بیگم صاحبہ اپنے بھائی سمیت ہماری منتظر تھیں۔ اپنے برادر نسبتی کو رخصت کرنے کے بعد ہم نے گاڑی کا جائزہ لیا اور سامان گاڑی میں رکھا۔ وہ سارے خدشات جو گاڑی کے سلسلے میں ہمارے دل میں پل رہے تھے اس گاڑی کو دیکھ کر دور ہو گئے۔ یہ ایک معقول قسم کی ٹویاٹا ہائی ایس گاڑی تھی جو نہ زیادہ پرانی تھی اور نہ زیادہ نئی۔ رنگ اس کا سفید تھا جس پر نیچے کی طرف ایک نارنجی رنگ کی پٹی بنی ہوئی تھی۔ اس میں دس آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی جو ہم پانچ اشخاص کے خاندان کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔ سامان رکھنے کے بعد بھی تنگی محسوس نہیں ہوئی۔ ڈرائیور ایک پچیس برس کا، دبلا پتلا، سانولا، مانسہرہ کا رہنے والا نوجوان تھا جس کے ساتھ دوران سفر دوستی ہو گئی، نام اس کا فاروق تھا۔ ہم فاروق کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئے، دونوں لڑکے دوسری قطار والی نشست پر براجمان ہو گئے اور ماں بیٹی نے تیسری قطار والی نشست سنبھال لی جبکہ اس سے پچھلی نشستوں پر سامان رکھ دیا گیا۔

جب ہوائی اڈے کی حدود سے نکل کر گاڑی شاہراہ پر آئی تو ہم نے فاروق سے کہا۔ ”مری کی طرف مڑنے سے پہلے ایک چکر اسلام آباد کا لگا لو تاکہ بچے اسلام آباد بھی دیکھ لیں۔“ ہماری خواہش کے احترام میں فاروق نے گاڑی کا رخ اسلام آباد کی طرف موڑ دیا اور ہم نے چند ایک مشہور مقامات یعنی پریذیڈنٹ ہاؤس پی ایم ہاؤس سپریم کورٹ، پارلیمنٹ ہاؤس اور آخر میں خدا کا گھر (شاہ فیصل مسجد) گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ ڈالے۔

فیصل مسجد تک جا کر ہم لوگ پلٹ آئے اور مری کی طرف نکل گئے۔ سڑکیں بہت صاف ستھری اور قالین کی طرح ہموار تھیں۔ موسم بہت خوشگوار تھا، اس کے علاوہ گاڑی میں ہوا کو ٹھنڈا کرنے کا نظام نصب تھا جس کی وجہ سے سفر بہت پُرلطف ہو گیا تھا۔ اسلام آباد اور اس کے گردونواح کے مناظر بہت خوبصورت تھے۔ ہر طرف سرسبز درخت اور ان کے پیچھے بادلوں میں چھپے ہوئے پہاڑ ایک دیومالائی منظر تخلیق کر رہے تھے۔ سفر کیا تھا گویا ایک سہانا سپنا تھا جو ہم جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں ان لوگوں کی قسمت پر رشک آیا جو اس علاقے میں رہتے تھے۔ یہاں آ کر ہم نے ہمیشہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا۔ ”تم کراچی میں کیا کر رہے ہو؟ واپس اپنے علاقے میں کیوں نہیں بس جاتے؟“ لیکن جناب! کراچی سے نقل مکانی کرنا ناممکنات میں سمجھا جاتا ہے کیونکہ ہماری دانست میں کراچی ایک ایسی جادونگری ہے کہ جس میں داخل ہونے کا راستہ تو ہے لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

بہت جلد ہم اسلام آباد کے نواح سے نکل کر مری کی پہاڑیوں کے بل کھاتے راستوں پر رواں دواں تھے۔ راستے میں ہم نے چھتر کے مقام پر رک کر بچوں کو یہ مقام دکھانا چاہا جو ایک زمانے میں بہترین تفریح گاہ تھی لیکن اب وہاں الّو بول رہے تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ اس خوبصورت سیرگاہ کی دیکھ بھال نہیں کی گئی اور قوم ایک بہت اچھی سیرگاہ سے محروم ہو گئی۔ البتہ یہ دیکھ کر ہمیں اطمینان ہوا کہ پر پیچ سڑک کے ہر موڑ پر ایک آئینہ لگا ہوا ہے تاکہ دوسری طرف سے آنے والی گاڑی پہلے سے نظر آ جائے۔ فاروق کو ہم نے پہلے ہی تنبیہ کر دی تھی کہ ہم حفاظتی تدابیر پر یقین رکھنے والے انسان ہیں اس لیے گاڑی احتیاط سے چلائے۔

فاروق ایک اچھا ڈرائیور تھا اور اس نے ہماری درخواست پر حرف بحرف عمل کیا اور ہمیں شکایت کا موقع نہیں دیا حتی کہ ہماری خواہش کے احترام میں ہارن کو بھی زیادہ زحمت نہیں دی۔ ملکہ کوہسار مری کی سلطنت میں بلندیوں اور گہرائیوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہمارا قافلہ راستے میں ایک جگہ رکا جہاں ستانے کے لیے ایک باغیچہ سا بنا ہوا تھا۔ یہاں رک کر ہم لوگوں نے کچھ تصویر کشی کی، مناظر قدرت کی داد دی اور آگے بڑھ گئے۔ راستے میں ایک مشہور مقام چھترہ پانی آتا ہے جہاں ہر گاڑی والا ٹھہرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ گاڑی والے رک کر اپنی اپنی گاڑیوں میں پانی بھرتے ہیں اور مسافر حضرات اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ چونکہ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا اس لیے ہم نے یہاں رک کر کھانا کھانے کی ٹھانی۔ سامنے ایک چھپر میں تندور لگا ہوا تھا اور ایک قطار میں دیگچیاں سجی ہوئی تھیں جن میں مختلف قسم کے سالن تیار پڑے تھے، بس ختم کی ہی تھی۔ بیٹھنے کے لیے کسی حد تک معقول انتظام تھا لیکن ہمارے بچوں نے کبھی اس قسم کی جگہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے چیں بجبیں تھے۔ ان کی ماں نے انہیں سمجھایا کہ اب ہم سفر میں ہیں اور اس قسم کی بہت سی جگہیں راستے میں آئیں گی اور ہم لوگوں کو اس پر گزارہ کرنا ہوگا۔ فاروق سمیت ہم لوگوں نے روٹی، سالن، شامی کباب اور پلاؤ سے پیٹ بھرا، پہاڑوں کا ٹھنڈا پانی پیا اور دوبارہ سڑک ناپی۔

ہم لوگ جب منزل مقصود پر پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا لیکن ابر کی وجہ سے شام کا وقت لگ رہا تھا۔ جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا اس سے کچھ پہلے ایک چوکی پر ہماری گاڑی کو روک دیا گیا کہ یہاں سے آگے ’بھاری‘ گاڑیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس طرح راستے میں روک دیا جانا ہمیں بہت برا لگا اور سفر کے دوران ہمیں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم بدمزہ ہوئے اور اسی لیے ہم نے گھر سے نہیں نکلتے کیونکہ راستے میں بھانت بھانت کے لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔ پتا چلا کہ آگے راستہ تنگ ہے اور صرف چھوٹی گاڑیاں جا سکتی ہیں جبکہ ہماری گاڑی بڑی گاڑیوں کی تعریف میں آتی تھی۔ ہم نے اس چوکی پر بیٹھے کندہ ناتراش کو بہت سمجھایا کہ ہماری گاڑی اب اتنی بڑی بھی نہیں کہ راستے کی رکاوٹ بن جائے لیکن اس چکنے گھڑے پر بوند نہیں ٹھہری۔ ناچار ہم نے وہیں قریب کھڑے مزدوروں سے اپنا سامان اٹھوایا اور پیدل چل کر ہوٹل تک آئے۔ یہ ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا لیکن بالکل چوٹی پر تھا جہاں سے کشمیر کی سمت کا دور تک نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ کمرے مناسب تھے اور تمام ضروریات زندگی سے آراستہ، صاف بھی تھے اور آرائش بھی اچھی تھی لیکن معیار کچھ بودا سا تھا۔ ہمیں پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ مختلف ہوٹلوں کی درجہ بندی ستاروں کے لحاظ سے کیوں کی جاتی ہے؟

ہمارے بچوں کے لیے گھر سے باہر کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے وہ بہت خوش اور پُرجوش تھے۔ انہوں نے جہاز کی طرح اس ہوٹل سے بھی استفادہ

ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحرکار اور شیوہ دل ربائی ورعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیرو تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سائے میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جوں ہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا زین آبادی نے نہ تو شہزادے کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا نہ اس کی خالہ کا بے باکانہ اچھلی اور ایک شاخ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔ خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادے پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادے کا کام تمام کر دیا اور صبروقرار نے خدا حافظ کہا۔ بڑی منت والحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہد خشک اور خالص تقشف کے جس کے لیے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے عشق وشیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالم نشہ وسرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کر کے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگا لے۔ شہزادے نے ہر چند عجز ونیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق ودل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو لیکن اس کو رحم نہ آیا۔ ناچار شہزادے نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگا لے لیکن جوں ہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا، غرض امتحان عشق بود نہ کہ تلخ کامئے شما۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہ جہان تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کی فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ داراشکوہ نے اس حکایت کو اپنی سعایت وغمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا۔ نہیں معلوم اس قضیے کا غنچہ کیا گل کھلاتا لیکن قضا وقدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ یعنی عین عروج شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

اقتباس: غبار خاطر از ابوالکلام آزاد

مرسلہ: فصیح الدین۔ لاہور

کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اچھل کر پلنگ پر چھلانگ لگائی اور مسہری سے اپنا کرایہ وصول کرنا شروع کردیا پھر کچھ ہی دیر بعد غسل خانے میں گھس گئے اور زندگی میں پہلی بار ماں کے اصرار کے بغیر منہ ہاتھ دھونے لگے۔ باہر آکر ٹیلی فون کا جائزہ لیا اور بیرے کو بلا کر اشیائے خورونوش طلب کیں۔ اس دوران وہ کھڑکی سے دور بلا ضرورت دوڑتے رہے۔ ہمارے کمرے سے باہر کا نظارہ بہت دل فریب تھا اس لیے کچھ وقت اس کی نظر بھی ہوا، یعنی ہر کرسی اور ہر صوفے پر بیٹھ کر ہر زاویے سے باہر کا نظارہ کیا۔

مری میں ہمارا قیام ڈیڑھ دن اور دو راتوں کا تھا۔ آدھا دن تو گزر چکا تھا اس لیے ہم نے بھوربن جا کر شام وہاں گزارنے کی ٹھانی۔ معاہدے کے مطابق فاروق ہمیں کل صبح مری کی سیر کرانے کا پابند تھا اور آج کی شام آرام کی تھی اس لیے ہم نے ایک مقامی کرائے کی گاڑی حاصل کی اور بھوربن پہنچ گئے۔ آج کل بھوربن اور پرل کانٹی نینٹل یک جان دو قالب ہو گئے ہیں۔ پرل کانٹی نینٹل نے بھی اپنی نمائش کی قیمت لگادی ہے، کوئی بھی شخص پانچ سو روپے دے کر داخل ہو سکتا ہے لیکن پھر اسی مالیت کے مساوی اخراجات بھی کرسکتا ہے۔ زیادہ خرچ کرنے پر ادائیگی کرسکتا ہے اور کم خرچ کرنے پر خسارہ اٹھا کر واپس جا سکتا ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رات کا کھانا یہیں کھایا جائے لیکن افراد خانہ میں کوئی بھی کھانا کھانے پر آمادہ نہ ہوا کیونکہ ایک تو مری پہنچتے ہی بچوں نے کھانے پینے کا سلسلہ شروع کردیا تھا اور دوسرے یہاں آکر بھی چائے کے ساتھ ناشتا کرلیا تھا اس لیے کھانے کی گنجائش نہ نکل سکی، پرل کانٹی نینٹل نے ملکہ کوہسار پر بڑی عنایت کی ہے کہ یہاں آکر اس کی آغوش میں ایک گھونسلا بنالیا ہے ورنہ پہلے اس مقام پر ایک اچھی جائے قیام کی شدید کمی محسوس ہوتی تھی۔

دوسرے دن صبح ہم اپنے معمول کے مطابق سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور مری کی سڑکوں پر پیدل چل کر صبح سویرے کے کچھ دلکش نظاروں سے دل بہلایا۔ واپس آکر بچوں کو تیار کیا اور ناشتے کے لیے سب سے اوپر کی منزل پر طعام گاہ میں پہنچ گئے۔ یہ گھومتی طعام گاہ (Revolving Restaurant) تخیل کے اعتبار سے ایک انوکھی جگہ تھی لیکن کاروبار کی مندی اور گاہکوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے ویران پڑی تھی۔ یہ ایک گول چبوترے پر قائم تھی جو ایک میکانکی نظام کے چلانے سے گھوم سکتی تھی۔ چاروں طرف سے شیشوں سے بندھی تاکہ لوگ سردی سے محفوظ رہیں لیکن قدرتی حسن سے محظوظ ہوتے رہیں۔ ہمارے سوا یہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ ہم لوگوں نے پراٹھوں، انڈوں اور چائے کا ناشتا کیا اور فاروق کا انتظار کرنے لگے جس نے ہمیں آج مری کی سیر کرانی تھی۔ وہ پہلے سے نیچے موجود ہمارا انتظار کررہا تھا اور آج اپنی گاڑی کسی نہ کسی طرح اوپر لے آیا تھا۔ ہم لوگوں نے ضروری سامان جو راستے میں کام آسکتا تھا ساتھ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ آج سارا دن ہمیں مری کی سیر کرکے واپس پھر یہیں آنا تھا۔ اس پہاڑ پر کسی طرف بھی نکل جائیں، دلفریب نظارے اپنا جال بچھائے سیاحوں کے منتظر رہتے ہیں لیکن ایوبیا ایک ایسی جگہ تھی جو ہمیں یاد رہے گی اس لیے کہ یہاں پر ایوبیا سے کچھ پہلے راستے میں بادلوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے گاڑی سے اتر کر ان سے باقاعدہ ملاقات کی اور ان کے ساتھ تصویریں کھچوائیں۔ بادلوں سے ملاقات ہماری زندگی کا پہلا اتفاق نہیں تھا لیکن ہمارے بچوں کے لیے یہ پہلا اور انوکھا تجربہ تھا اس لیے وہ بہت خوش اور پُر جوش تھے اور اپنے آپ کو ایک الگ دنیا میں محسوس کررہے تھے۔ کچھ دیر یہاں رکنے کے بعد ہم ایوبیا جانے کے لیے آگے بڑھ گئے۔

ایوبیا میں گاڑی ایک طرف روکنے کے بعد ہم نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہاں ایک بازار تھا جہاں مقامی باشندے مختلف تحائف اور ضروریات زندگی کی اشیاء بیچ رہے تھے۔ اس کے علاوہ چیئر لفٹس تھیں جو کہ یہاں کا خاصا ہیں اور پاکستان میں پہلی بار یہاں نصب کی گئی تھیں اور اسی حوالے سے یہ جگہ مشہور ہے۔ اب تو یہ اور جگہوں پر بھی نصب ہو چکی ہیں اس لیے اس جگہ کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ ہم نے جب اپنے خاندان کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ پانچ میں سے تین اشخاص بازار میں خریداری کو ترجیح دیں گے جبکہ ہمارے ساتھ چیئر لفٹ پر ہمارا بڑا بیٹا عادل بیٹھے گا۔

ابھی تک ہم نے آپ سے اپنے خاندان کا تعارف نہیں کرایا لیکن اب یہ ضروری ہوگیا ہے تاکہ جب ہم تین پانچ کریں تو آپ کو معلوم ہو کہ ہم کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ ہمارا خاندان پانچ افراد پر مشتمل ہے جس میں دو افراد تو ہم میاں بیوی ہیں کیونکہ ہم نے ابھی تک ایک ہی شادی رچا رکھی ہے۔ تین بچے ہیں جن میں پہلی بیٹی اور پھر تلے اوپر دو لڑکے۔ دونوں خواتین اور چھوٹے بیٹے نے ان چیئر لفٹس پر بیٹھنے سے صاف انکار کردیا۔ خواتین خریداری میں مشغول ہوگئیں اور چھوٹے میاں کھانے پینے میں۔ ہم اپنے بڑے لڑکے کے

ساتھ ایک چیئر لفٹ پر بیٹھے اور آسمان کی طرف، بادلوں کے اس پار، ہوا میں تیرتے ہوئے جانے لگے۔ لوہے کے ایک موٹے رستے کے ساتھ بہت سی کرسیاں لٹکی ہوئی اوپر نیچے محو حرکت تھیں جن پر لوگ بیٹھے سیر کا لطف اٹھا رہے تھے۔

یہ کرسیاں بازار کے دامن سے سیاحوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتی ہیں۔ ان پہاڑوں پر جو درخت اگے ہوئے ہیں ان کی بلندی کی تعریف کے لیے آپ کو اردو شاعری کا مطالعہ کرنا ہوگا، خصوصاً جب شعراء حضرات اپنے محبوب کے قد و قامت کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں درختوں کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی سرو کے درخت ان درختوں کو دیکھ کر ہم اردو شاعری کے بہت سے مقامات سمجھ گئے۔

معلق کرسی پر بیٹھے ایک بار پھر بادلوں نے ہماری پذیرائی کی اور ہمیں اپنے جلو میں لیے پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے۔ معلق کرسیاں مسلسل چلتی رہتی ہیں اور اگر کوئی شخص ذرا تساہل سے کام لے تو واپس دامن کوہ پہنچا دیا جائے گا۔ ان کرسیوں پر اترنے اور چڑھنے کے لیے ایک خاص قسم کی پھرتی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے فقدان کی وجہ سے ہمارے خاندان کا تین بٹا پانچ حصہ نیچے رہ گیا تھا۔ ان معلق کرسیوں پر بیٹھنا تو پھر ایک توجہ طلب کام ہے لیکن ہمارے خاندان کا دو بٹا پانچ حصہ تو ہوائی اڈے پر نصب برقی زینے پر پاؤں دھرنے کو بھی خلاف شرع سمجھتا ہے اور عام زینوں سے اترنے چڑھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کرسی سے اترنے کے بعد ہم نے پہاڑ کی چوٹی کا جائزہ لیا تو ہمیں کھیل کے میدان کے برابر ایک ہموار قطعہ نظر آیا جو سبز گھاس سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک پختہ عمارت تھی جو طعام گاہ کے طور پر بنائی گئی تھی لیکن ویران پڑی تھی۔

ایک طرف ایک مقامی باشندہ بندوق اور غبارے لیے بیٹھا دعوت نشانہ دے رہا تھا اور بس۔ البتہ آسمان یہاں سے بہت نزدیک تھا اور بادل تو قدموں تلے بچھے جاتے تھے۔ ہم نے اس قطعہ سبز کا ایک چکر لگایا اور چاروں طرف کا نظارہ کیا۔ ایک طرف ہمیں ایک راستہ پہاڑ کے نیچے جاتا نظر آیا جس نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہم اپنے بیٹے کے ساتھ اس راستے پر نیچے کی طرف چل پڑے۔ یہ راستہ بل کھاتا درختوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا نیچے جارہا تھا، شاید ہمارے بچپن کی طرف۔ ہم اس راستے پر کچھ دور چل کر رک گئے اور ایک طرف ایک پتھر پر بیٹھ کر اس نظارے کو اپنے حافظے میں محفوظ کرنے لگے۔ کچی زمین، گھاس، درخت، گرد و غبار سے پاک فضا، بادل اور آسمان، یہ وہ چیزیں تھیں جس نے ہمیں مسحور کردیا تھا اور ہمیں اپنے بچپن کی یاد دلا دی تھی جب ہم ان سب چیزوں کے بہت قریب رہا کرتے تھے لیکن اب ایک زمانے سے یہ بنیادی چیزیں ہماری زندگی سے خارج ہوگئی ہیں۔ اب ہم عمارتوں، سڑکوں اور گاڑیوں کے درمیان دھوئیں کے بادلوں میں آسمان سے کٹے رہتے ہیں اور کچھ اپنا حال نہیں جانتے، مستقبل سے بے پروا لیکن ماضی پر غم زدہ۔ یہ بات ہم ماحولیات کے حوالے سے کہہ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں آسمان کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھ لیا ہے، نہ جانے آگے کیا ہوگا۔ اگر ہم نے آج اپنی روش نہ بدلی تو آئندہ نسل کو ورثے میں کیا دیں گے؟ ایک بغیر آسمان کے زمین!

کچھ دیر اپنے ماضی کو یاد کرنے اور گم کردہ اقدار کا ماتم کرنے کے بعد ہم اٹھے اور واپس چوٹی پر آگئے۔ یہاں ہم نے کچھ تصویر کشی کی تاکہ بعد میں یہاں کی یادوں کو تازہ کر سکیں۔ یہاں سے واپس جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جانا تو تھا، اس لیے ہم اپنے بیٹے کے ساتھ ایک معلق کرسی پر بیٹھے اور پہاڑ کے دامن کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہی قد آور درخت، بادلوں سے الوداعی ملاقاتیں اور آتی جاتی مسافر بردار کرسیوں کا نظارہ تھا۔ بہت جلد ہم بازار میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ موجود تھے اور واپسی کے لیے فاروق کی تلاش میں تھے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا چاہتا تھا اس لیے ہم نے فاروق سے فرمائش کی کہ ہمیں کسی اچھی جگہ کھانے پر لے جائے۔ ہم بادلوں کے دیس ایوبیا سے واپس چل پڑے اور مختلف جگہوں کی سیر کرتے ہوئے ایک بارونق جگہ رک گئے جہاں بہت سی گاڑیاں اور بھی کھڑی تھیں اور کھانے کی دکانیں بنی ہوئی تھیں جن سے کھانوں کی خوشبو آرہی تھی۔ ہم نے ایک ایسی دکان کا رخ کیا جہاں سے باہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں یہ تو یاد نہیں کہ ہم نے کیا کھایا لیکن یہ اچھی طرح سے یاد ہے کہ کیا دیکھا، وہ منظر ہمارے ذہن پر نقش ہو چکا ہے۔ وہی اونچے درخت، گہری گھاٹیاں، بل کھاتی سڑکیں اور بہت ہی خوشگوار موسم۔

کھانا کھانے کے بعد ہم پھر کوہ نوردی پر اتر آئے اور مختلف سمتوں میں گاڑی دوڑاتے رہے۔ جس جگہ اچھا منظر ہوتا وہیں گاڑی رکواتے اور کیمرے سے منظر کشی شروع کر دیتے۔ ہم ساکت اور مووی دونوں طرح کے کیمرے ساتھ لائے تھے تاکہ مناظر کے ساتھ پورا پورا انصاف کرسکیں۔ ایک جگہ بندروں سے بھی پالا پڑا۔ وہاں رک کر ہم نے بندروں کی حرکات وسکنات کا لطف اٹھایا اور مکئی کے دانے انہیں کھانے کو

PakiBooks.Site

دیئے جو وہیں بکنے کے لیے موجود تھے۔ بہت سے بندر ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو خطرناک ہو سکتے ہیں اس لیے سبھی لوگ گاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے ان کا نظارہ کررہے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا شیشہ کھول کر دیتے تھے تاکہ بندر کی جھپٹ سے محفوظ رہیں۔ یہاں پر ایک دلچسپ جھپٹ کا تذکرہ خالی از علت نہ ہوگا۔ یہ جھپٹ کسی بندر کی نہیں تھی بلکہ ایک انسانی بچے کی تھی جسے ہمارا بھتیجا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک بار ایک برأت سے واپسی پر ہمارا پورا خاندان جو 25 افراد پر مشتمل تھا، ریل گاڑی کے ذریعے فیصل آباد سے کراچی آرہا تھا۔ راستے میں ناشتے کا وقت ہوا تو ہم نے حسب عادت بسکٹوں کا ایک سربمہر پیکٹ نکالا جس میں گنتی کے تین یا چار بسکٹ ہوتے ہیں۔ ہمارے مذکورہ بھتیجے نے جب ہمیں بسکٹ کھاتے دیکھا تو مچل گیا اور بسکٹ کھانے کی ضد کرنے لگا۔ ہم نے دل لگی کی خاطر انکار کردیا۔ اس کا اصرار جاری رہا اور وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا ہمارے قریب آگیا اور یکبارگی جھپٹ کر پیکٹ ہمارے ہاتھ سے چھین لیا۔ ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ ایسا بھی کبھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایک بہت چھوٹے بچے کے ہاتھوں۔ اب صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ ہم اس سے ایک بسکٹ کی واپسی کی درخواست کررہے تھے اور وہ کسی طور راضی نہ ہوتا تھا۔ اس سے پیکٹ چھیننے کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اب ہم صرف اگلے اڈے کا انتظار کرسکتے تھے تاکہ ایک اور پیکٹ اپنے لیے خرید سکیں۔ ہمیں یہ تجربہ یاد تھا اس لیے ہم نے بندروں کے ساتھ لین دین میں انتہائی احتیاط کا دامن تھامے رکھا۔

ایک مقام پر تصویر کشی کے دوران ہمارے چھوٹے بیٹے نے ہمیں ایک ایسی اطلاع بہم پہنچائی جو لرزہ خیز تھی اور عبرت کی خاطر ہم یہاں رقم کرتے ہیں تاکہ لوگ تفریح کے دوران احتیاطی تدابیر کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذہن سے محو نہ ہونے دیں۔ ہمارے بیٹے کی اطلاع کے مطابق، اس کا ایک ہم جماعت پچھلے سال مری کی سیر کے لیے آیا اور تصویر کشی کے دوران پاؤں پھسلنے سے پہاڑ سے نیچے گر کر راہی ملک عدم ہوا۔ تصویر کشی کے دوران ایسا ہونے کے امکانات بہت ہوتے ہیں۔ تصویر کشی کے دیدبان کے ذریعے جو منظر ہم دیکھتے ہیں وہ فاصلے کے لحاظ سے اصل سے بہت مختلف ہوتا ہے اور انسان قدرتی منظر میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے اپنے قدموں کا خیال نہیں رہتا۔ اس واقعے کو سننے کے بعد ہم تصویر کشی میں بہت زیادہ احتیاط کرنے لگے اور اس عمل کے دوران چلنے پھرنے سے گریزاں رہے۔

سیر کے دوران ایک جگہ جا کر فاروق نے گاڑی روک دی اور ہمیں اطلاع دی کہ معاہدے کے مطابق ہماری سیر کی حدود اس جگہ اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ ہم نے کہا کہ بہت خوب گاڑی موڑ لو اور واپس چلو۔ اب مناظر میں یکسانیت آنے لگی تھی اور اس سیر کو ایک جگہ ضرور ختم ہونا چاہیے تھا۔ شام ہونے کو آئی تھی اور اگلے دن ہمیں ایک لمبا سفر درپیش تھا۔ واپس کمرے میں پہنچ کر ہم نے کچھ آرام کیا اور کچھ کل کی تیاری۔ رات کا کھانا ہم نے اپنے ہوٹل کے قریب ہی ایک کھلی فضا میں قائم طعام خانے میں کھایا اور سو گئے۔ اگلی صبح ہم جلد ہی بیدار ہو گئے اور اسی گھومنے والی طعام گاہ میں پہنچ گئے جو سب سے اوپر والی منزل پر بنی ہوئی تھی لیکن اس وقت ساکت و جامد تھی۔ وہی انڈوں اور پراٹھوں کا ناشتا تھا اور وہی منظر۔ ہم نے خوب جی بھر کر اس منظر کو دیکھا کیونکہ چند دقیقوں کے بعد ہمیں یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم نے سامان گاڑی میں لدوایا اور اگلی منزل کی راہ لی جس کا نام تھا شوگراں، جہاں ہمیں اس رات قیام کرنا تھا۔

شوگراں دراصل ایک درمیانی پڑاؤ تھا اور ہماری اصل منزل کاغان، ناران اور جھیل سیف الملوک تھی۔ شوگراں جانے کے لیے ہمیں ایبٹ آباد اور بالاکوٹ سے ہوتے ہوئے جانا تھا اور یہ سارا سفر ایک سفر نہیں بلکہ سیر تھی۔ ان سب جگہوں کے دیکھنے کی تمنا ہمیں ہمیشہ رہی تھی اور آج یہ خواہش پوری ہونے والی تھی اس لیے ایک خاص ولولہ ہم اپنے دل و جان میں پاتے تھے۔ مری سے روانہ ہوئے تو صبح کا وقت تھا اور موسم بہت خوشگوار تھا۔ ان علاقوں میں سیر کے دوران ایک خدشہ ہمیشہ رہتا ہے اور وہ ہے لینڈ سلائڈنگ، یعنی پہاڑ کا ایک حصہ ٹوٹ کر سڑک پر آگرتا ہے اور راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اب اس کا بہت اچھا انتظام ہو گیا ہے اور فوجی گاڑیاں ہر وقت اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے مستعد رہتی ہیں اور چند منٹوں سے چند گھنٹوں کے اندر اندر راستہ دوبارہ کھل جاتا ہے۔

مری کی سیر کرتے ہوئے ہم مانسہرہ کی طرف رواں دواں تھے کیونکہ ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے گزرنا تھا۔ مری سے ایبٹ آباد اور پھر یہاں سے مانسہرہ کا سفر خوشگوار تھا کیونکہ مناظر اچھے تھے لیکن اصل لطف بالاکوٹ سے شروع ہوا جہاں سے دریائے کنہار نے ہمارا ساتھ دیا۔ بالاکوٹ کے مقام پر

دریائے کنہار سے ہم نے باضابطہ ملاقات کی اور کچھ گھڑیاں اس کے دامن میں گزاریں۔ اس کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر ہم نے اپنی نصف بہتر کے ساتھ ایک یادگار تصویر کھنچوائی جو اس لحاظ سے ایک بہترین تصویر ہے کہ ہمارے قرب کے باوجود وہ مسکرا رہی تھیں۔ دریا کی مدھر موسیقی نے ان کے اعصاب پر ایک بہت خوشگوار اثر کیا تھا۔ یہاں ہم نے ایک تربوز دریا کے پانی کے ساتھ دھو کر اور ٹھنڈا کرکے کھایا۔ دریا کا تازہ اور زندہ پانی پیا۔ ہمارے یہاں کے لوگوں کا قول ہے کہ سرحد کا پانی زندہ پانی ہے اور یہ پنجاب کے دیسی گھی کی تاثیر رکھتا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کے بارے میں یہ لوگ اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس قول کے پیچھے کیا حکمت ہے اس سے تو ہم آشنا نہیں لیکن ایک ذاتی تجربہ بیان کیے دیتے ہیں جو اس قول کی کسی حد تک توثیق کرتا ہے۔

چند سال پہلے ہمیں حلق میں خراش کا عارضہ لاحق ہو گیا جو کسی طرح ٹھیک ہونے میں نہیں آتا تھا اور کبھی کبھی ہم سوچ میں پڑ جاتے کہ کہیں یہ وہ خبیث مرض نہ ہو کہ جس کا جز مرگ کوئی علاج نہیں۔ کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس اس ڈر سے نہیں جاتے تھے کہ جتنا بڑا ڈاکٹر ہوگا اتنا ہی بڑا مرض بتادے گا۔ دو تین سال یہ سلسلہ چلتا رہا اور ہم نے اس مرض کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر پال لیا۔ ٹھنڈا پانی اور ترش چیزیں تو دور کی بات ان چیزوں کا سایہ بھی جن چیزوں پر پڑ جاتا تھا اس سے بھی ہم پرہیز کرنے لگے تھے پھر ایک دفعہ ہمیں پشاور کے نواح میں اپنے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا جہاں ہمارا قیام ایک ہفتہ رہا۔ تیسرے دن ہم نے محسوس کیا کہ اب ہمیں ٹھنڈی اور ترش چیزوں سے پرہیز کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ ایک دن تجربے کے طور پر ہم نے آئس کریم پر بھی طبع آزمائی کرڈالی اور سرخ رو ٹھہرے۔ بہت جلد ہم پر یہ انکشاف ہو گیا کہ ہم بالکل تندرست ہیں اور ہمیں کسی قسم کا عارضہ لاحق نہیں ہے۔ اب ہم نے باقاعدہ "بدپرہیزی" شروع کردی تاکہ کھرے کھوٹے کا بروقت پتا چل جائے۔ ایک ہفتہ گاؤں میں رہنے کے بعد ہم نے کراچی آکر ڈرتے ڈرتے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے اور ممنوعہ غذاؤں کا استعمال سنبھل سنبھل کر شروع کیا اور بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ حلق کی خراش ایک وہم تھا جو زندہ پانی پینے کی کرامت سے اب ہمارے دماغ سے محو ہو گیا ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم پھر آپ کو دریائے کنہار کے کنارے اس زندہ پانی کے بہتے ہوئے منبع پر لیے چلتے ہیں۔

ہمیں اپنے رہبر اور ڈرائیور فاروق، جس نے ایک عمر اس دریا کے دامن میں گزاری تھی، بتایا کہ اس دریا کی سست خرامی کے فریب میں ہمیں نہیں آنا چاہیے۔ بظاہر یہ دریا اس مقام پر بہت آہستہ بہتا ہے اور اس کے بہاؤ میں وہ شدت نہیں جو ایک دریا کی موجوں میں ہونی چاہیے لیکن اس کی لہروں میں اچانک تندی آسکتی ہے جو پلک جھپکتے میں انسان کو دریا برد کردیتی ہے۔ اس کی اس تنبیہ کا ہم نے خیال رکھا اور پتھروں کی آڑ میں رہ کر دریا کے پانی سے استفادہ کیا۔ جب بچے جی بھر کے پانی سے کھیل چکے تو ہم نے دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف دوبارہ سفر شروع کردیا، یعنی دریا کے منبع کی طرف۔ اب ہم بالاکوٹ کے نواح میں تھے اور جلد ہی بالاکوٹ کے بازار میں پہنچ گئے۔ یہاں رک کر ہم نے ضروریات زندگی کی کچھ چیزیں خریدیں اور اپنی راہ لی۔

یوں تو ہم سارا دن پہاڑی علاقے میں سفر کرتے رہے تھے لیکن بالاکوٹ کے بعد صحیح معنوں میں پہاڑ کا سفر شروع ہوا جس نے ہمیں دن میں تارے دکھا دیئے۔ شوگراں کی چڑھائی سے ذرا پہلے ایک مقام پر ہم نے رک کر شام کی چائے پی اور کچھ کھانا کھایا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے پہاڑوں کی گولائیوں اور چڑھائیوں نے اپنے اثرات ہمارے اعصاب پر ڈالنا شروع کردیئے تھے اور ہمارے ذہن سے بھوک پیاس اور وقت کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ یہاں سے ایک راستہ کاغان کو چلا گیا تھا اور دوسرا شوگراں کی بلندیوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ ہمارا قیام چونکہ شوگراں کے ایک ہوٹل میں تھا اس لیے ہم نے شوگراں کی بلندیوں کا رخ کیا۔ شوگراں ہمارے اندازے سے کچھ زیادہ ہی بلندی پر واقع تھا اور گاڑی کو تقریباً عمودی رخ پر سفر درپیش تھا۔ اس سفر نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور جب ہم شوگراں کے دلفریب مقام پر پہنچے تو دل گداز و سرگراں ہو چکے تھے۔

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے، فضا میں آکسیجن کی مقدار کم تھی اور پہاڑی کوؤں کی کرخت آوازوں نے ایک عجب سوگوار ماحول ترتیب دے رکھا تھا۔ ہم نے اپنے کمرے حاصل کیے اور سامان کھول کر لیٹ گئے۔ بچوں نے کھانے کے کمرے میں جا کر کھانا کھایا لیکن ہم اپنے ہوش و حواس میں نہ تھے کیونکہ ہمارا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ ہماری بیگم اور لڑکی کا بھی یہی حال تھا لیکن لڑکے قدرے بہتر حالت میں تھے اور انہوں نے حسب معمول ہوٹل کا جائزہ لینا شروع کردیا تھا۔ ہم جلد ہی سو گئے تاکہ دوسرے دن سفر کے قابل ہو سکیں۔ کمرے

PakiBooks.site

بہت معقول تھے اور ماحول بھی اچھا تھا۔ اس پورے سفر کے دوران ہمارا بہترین قیام یہیں تھا لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ہم اس سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہوسکے۔

دوسری صبح اٹھنے کے بعد طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی لیکن بالکل اعتدال پر نہیں آئی تھی۔ ہوٹل کی کشادہ اور آرام دہ طعام گاہ میں ناشتا کرنے سے کچھ توانائی جسم میں آئی اور ہم نے باہر نظر دوڑائی تو ایک بہت خوشکن منظر ہمارا منتظر تھا۔ ایک وسیع وعریض سبزہ زار دامن بچھائے ہوئے تھا جس کی دوسری طرف کچھ خصوصی کمرے بنے ہوئے تھے جو ان لوگوں کے لیے تھے جو الگ تھلگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کمرے نوبیاہتا جوڑوں کے لیے ایک جنت سے کم نہیں ہوسکتے۔ ان کمروں کے پیچھے گہری گھاٹیاں اور قد آور درختوں کا لامتناہی سلسلہ تھا جن پر پہاڑی کوے راگ الاپ رہے تھے۔ پہاڑی کوے میدانی کوؤں سے جسامت میں بڑے اور رنگت میں بالکل سیاہ ہوتے ہیں۔ ہمارے کمرے کے پیچھے بھی گھاٹیوں اور درختوں کا یہی سلسلہ تھا جس پر ایک کوا بیٹھا مسلسل کائیں کائیں کررہا تھا جس کی آواز ہماری یادداشت میں ہمیشہ کے لیے پیوست ہوگئی ہے۔ پہاڑی کوؤں کی آواز میں زمینی کوؤں کے مقابلے میں ایک تو ''ر'' کا اضافہ ہے، دوسرے 'کھرج' بہت ہے اور اس کے علاوہ ان کی آواز میں بلا کی بلند آہنگی ہے۔ صرف ایک کوا پوری وادی کے سکون کو غارت کرنے کے لیے کافی تھا۔ اگر دو چار ہوتے تو وہاں لوگوں کا ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ اگر اس کوے کی آواز کو ہماری یادداشت سے خارج کر دیا جائے تو یہ جگہ چند گھنٹے قیام کے لیے بری نہیں تھی۔ اگر محکمۂ تحفظ جنگلی حیوانات کے مرکزی دفتر میں اس کوے کو ایک پنجرے میں بند کرکے لٹکا دیا جائے تو بہت جلد ان کے اوسان بحال ہو جائیں گے اور وہ کم از کم اس کوے کی نسل کے تحفظ سے توبہ کرلیں گے۔ اس کوے کے علاوہ اس مقام پر کوئی اور قابل ذکر چیز ہمیں نظر نہیں آئی۔

طے شدہ معاہدے کی رو سے اس صبح ہمیں شوگراں سے سُری پائے جانا تھا جو شوگراں سے بھی بلندی پر ایک اور مقام تھا اور جس پر جانے کی سکت ہم اپنے قلب وجگر میں نہیں پا رہے تھے۔ ایک تو ہمارا سر ابھی تک، تارکول کی سڑک پر آرامدہ گاڑی میں سفر کرنے کے باوجود چکرا رہا تھا چہ جائیکہ ہم ایک جیپ گاڑی میں بیٹھ کر کچی سڑک پر ہچکولے کھاتے ایک اور بلند تر مقام پر جاتے اور مزید خوار وزبوں ہوتے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ سارا دن شوگراں میں آرام کیا جائے تاکہ شام کے سفر کے لیے اعصاب بحال ہو جائیں کیونکہ اسی شام ہمیں ناران پہنچنا تھا۔ شوگراں بلاشبہ ایک خوبصورت مقام ہے اور یہاں پر جس جگہ ہمارا قیام تھا وہ بھی ایک بہت اچھی جگہ ہے۔ اس کا نام پائن پارک (Pine Park) ہے۔ جب ہمارے اوسان ذرا بحال ہوئے اور کوا اپنا راگ الاپ کر خاموش ہوا تو اس جگہ کا حسن نکھرنے لگا۔ پائن پارک نامی ہوٹل بہت خوبصورتی سے بنایا گیا ہے بلکہ ناران اور سوات کے علاقے میں اس سے بہتر جگہ کوئی اور ہماری نظر سے نہیں گزری۔ کمروں کی ترتیب، زیبائش اور رکھ رکھاؤ کے علاوہ پھولوں اور سبزے کی آرائش بھی قابل ستائش ہے۔ کھانے کا کمرا بھی بہت اچھا، بڑا اور بارونق تھا۔ ہم نے زیادہ وقت باہر سبزہ زار میں کرسیوں پر بیٹھ کر دھوپ سینکتے یا پھر سبزہ زار کے اردگرد گھوم پھر کر مشاہدۂ قدرت میں گزارا۔ دوپہر کے قریب جب ہماری اور ہمارے اہل وعیال کی طبیعت دوبارہ معمول پر آچکی تو ہم نے آگے جانے کی ٹھانی۔

ہمارا اگلا پڑاؤ ناران تھا جہاں جانے کے لیے ہمیں کاغان سے گزرنا تھا۔ سامان گاڑی میں لدوایا اور شوگراں سے نشیب کی طرف جانا شروع کردیا۔ نشیب کے سفر میں ہمیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اس چڑھائی سے اتر کر جب ہم نے کاغان کی طرف سفر شروع کیا تو راستہ بہت اچھا اور ہموار تھا۔ اس مقام پر اتنی اچھی سڑک کی توقع ہمیں اپنی حکومت سے نہیں تھی۔ ایک زمانے میں یہاں سفر کرنا ایک مہم سر کرنے سے کم نہ تھا اور صرف مہم جو مزاج کے لوگ ہی ادھر کا رخ کر سکتے تھے۔ سفر بہت آرام دہ اور پُرسکون رہا۔ دریائے کنہار ہمارے ساتھ ساتھ لیکن مخالف سمت میں بہہ رہا تھا۔ ہر موڑ پر ایک خوبصورت منظر دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ جو منظر ہمیں زیادہ متاثر کرتا، ہم گاڑی رکواتے اور منظر کشی شروع کرتے، کبھی ساکت اور کبھی مووی کیمرے سے۔ اسی طرح ہر منظر کو اپنے ذہن اور کیمروں کے پردوں پر نقش کرتے ہم منزل بہ منزل آگے بڑھتے رہے۔

کاغان میں ہم رکے بغیر آگے بڑھ گئے۔ کاغان سے آگے جانے کے بعد ہمیں برف کے وہ تودے نظر آنا شروع ہو گئے جن کا ذکر ہم بچپن سے سنتے آئے تھے۔ پہلے پہل تو ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ سفید سفید چیز کیا ہے جو پہاڑوں کے پہلو پر پڑی ہوئی ہے لیکن جب ہمیں ایک ایسے تودے کے اوپر سے گزرنا پڑا تو پتا چلا کہ یہ برف ہے اور اسی کو پگھلا کر اللہ تعالیٰ فراہمی آب کا انتظام کرتا ہے۔ ان تودوں کو آپ

گلیشیر کے نام سے ضرور جانتے ہوں گے۔ ایک بہت بڑے تودے کے اوپر سے گزر کر ہم ناران میں داخل ہوئے۔ اس تودے پر رک کر ہم نے کچھ دیر اس کی ہیئت پر غور کیا اور ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ یہ ٹھنڈا، چکنا، ملائم اور بے جان تودہ جو بظاہر بے ضرر معلوم ہوتا تھا، ایک خطرناک عفریت تھا جو صرف ایک دن پہلے آدھ درجن انسانوں کی بھینٹ لے چکا تھا۔ ایک جامعہ کے چند طلباء یہاں سے گاڑی میں گزرتے ہوئے اس کی زد میں آکر جاں بحق ہو گئے تھے۔ جس طرح مری کی پہاڑیوں پر لینڈ سلائیڈنگ ہوتی ہے بالکل اسی طرح ناران کے پہاڑوں پر یہ تودے پھسلتے رہتے ہیں اور جو کوئی ان کی زد میں آجائے اپنی جاں سے گزر جاتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ ان باتوں سے بے نیاز اس تودے کی پیٹھ پر چڑھنے کی کوشش کررہے تھے اور اس کوشش میں بار بار پھسل رہے تھے لیکن اب یہ تودہ بے ضرر ہوچکا تھا بالکل اسی طرح جس طرح مردہ وھیل سمندر کے کنارے پر پڑی ہو اور لوگ اس پر سوار ہونے کی کوشش کررہے ہوں۔ اتنے میں ایک مقامی باشندہ اپنی پرانی سی گاڑی میں آیا جس کے پیچھے ایک چھکڑا بھی بندھا ہوا تھا اور ایک کلہاڑے کی مدد سے برف کے ٹکڑے توڑ کر لے گیا جبکہ لکڑی وہ پہلے ہی کہیں سے توڑ لایا تھا۔ سنا ہے مغلیہ دور میں یہیں سے برف بادشاہ سلامت کی مزاج کو اعتدال میں رکھنے کے لیے لے جائی جاتی تھی۔ برف کا اتنا بڑا ذخیرہ اور اتنا بڑا کارخانہ ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس مقام سے ناران کی آبادی نشیب میں سامنے نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر برف سے کھیلنے کے بعد ہم لوگ ناران میں اپنے پڑاؤ کی تلاش میں روانہ ہوگئے۔ ناران کے چھوٹے سے بازار سے گزرنے کے بعد دریائے کنہار کے کنارے ایک خوبصورت مقام پر ہمارے قیام کا بندوبست تھا۔ یہ بھی ''پائن پارک'' نامی ہوٹلوں کے سلسلے کی کڑی کا ایک حصہ تھا لیکن حسن انتظام میں اس سے کمتر تھا جو ہم شوگراں میں دیکھ چکے تھے۔ دیہاتی طرز کے بنے ہوئے اس ہوٹل میں ہمیں دو کمرے حسب معاہدہ دے دیئے گئے جس میں ہم نے ایک رات اور ایک دن قیام کرنا تھا۔ شام ہوچکی تھی رات کی آمد آمد تھی۔ کھانے کا کمرا معقول تھا لیکن ویران پڑا ہوا تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ بازار جا کر ٹراؤٹ مچھلی سے دل بہلایا جائے۔ بازار جا کر جب ہم نے ٹراؤٹ مچھلی کے دام پوچھے تو ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو ہمیں آگاہ کیا گیا کہ یہ مچھلی پانی کے بہاؤ کے مخالف بہتی ہے اس لیے اس قدر گراں ہے۔ ہم خود بھی ابھی تک بالا کوٹ سے یہاں تک دریائے کنہار کی مخالف سمت میں سفر کرتے اور دو برفانی تودوں سے جان بچاتے آئے تھے اور کچھ دادرسی چاہتے تھے لیکن دکاندار نے ہماری اس تگ ودو کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور ایک پیسے کی بھی رعایت سے صاف انکار کردیا۔ اگر کبھی آپ کو ناران جانے کا اتفاق ہو تو ہمارے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹراؤٹ مچھلی بالا کوٹ ہی سے خرید کر ساتھ لے جایئے گا تاکہ مچھلی کے بالا کوٹ سے ناران تک تیر کر جانے کی مشقت کے دام آپ کو نہ دینے پڑیں۔ ہمارے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا اس لیے منہ مانگے داموں مچھلی خرید کر کھائی جبکہ ہم سمجھے ہوئے تھے کہ ٹراؤٹ مچھلی یہاں کی پیداوار ہے اس لیے سستی ہوگی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے بازار کا ایک چکر لگایا اور واپس جائے قیام پہنچ گئے تاکہ صبح تک کچھ آرام کرسکیں۔

دوسرے دن تڑکے اٹھ کر ہم کمرے سے باہر نکلے اور قدرت کے اسرار کا مشاہدہ کرنے لگے۔ سرائے کے پچھواڑے رنگ برنگے خودرو پھول لاکھوں کی تعداد میں اگے ہوئے چشم تماشائی کے منتظر تھے۔ ہمیں محو نظارہ پا کر یہ پھول اور بھی کھل اٹھے اور خوشی سے لہلہانے لگے۔ کچھ دیر ان پھولوں کے درمیان گزارنے کے بعد ہم دریائے کنہار کا نظارہ کرنے پہنچ گئے جو قریب ہی بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے مختلف قسم کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے درمیان ایک جگہ ایف ،سی، کے حفاظتی دستے کا پڑاؤ تھا جو چند خیموں پر مشتمل تھا۔

خیموں میں چولہے جل رہے تھے جن پر چائے چڑھی ہوئی تھی اور پراٹھے تلے جارہے تھے۔ یہ لوگ فطرت کے بہت قریب تھے اور بہت سادہ زندگی گزار رہے تھے۔ ہم ان کے پڑاؤ سے ذرا دور نکل گئے تاکہ ان کے معمولات میں خلل واقع نہ ہو اور دوسرے ایک خدشہ یہ تھا کہ کہیں ان کی مہمان نوازی کی بھینٹ نہ چڑھ جائیں۔ اگر یہ لوگ ہمیں یہاں دیکھ لیتے تو بغیر چائے پلائے اور پراٹھا کھلائے جان نہ چھوڑتے اور ہماری سیر کا وقت تکلفات کی نظر ہو جاتا۔ ہم دریا کے بہاؤ کے مخالف کچھ دور اوپر تک چلے گئے تاکہ دریا کی روانی کے پیچ وخم پوری تفصیل سے دیکھ سکیں۔ اس دریا کو ہم بالا کوٹ سے دیکھتے آئے تھے لیکن اس کا ہر منظر دوسرے سے مختلف تھا۔ کافی دیر تک ہم نے دریا اور درختوں کا مشاہدہ کیا یہاں تک کہ ناشتے کا وقت ہوگیا۔ واپس آکر ہم نے ناشتا کیا اور

PakiBooks.site

جھیل سیف الملوک کی سیر کے لیے تیار ہونے لگے۔

جھیل سیف الملوک پر جانے کے لیے جیپ کا انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا جس کے لیے 8 بجے کا وقت طے تھا۔ وقت مقررہ سے پہلے ہی ایک سرخ رنگ کی ولی جیپ جس پر پوشش صوبہ سرحد کے خاص طرز سے کی گئی تھی، آراستہ پیراستہ ہمارے انتظار میں باہر ایک درخت کے نیچے کھڑی کر دی گئی۔ اس کا چلانے والا ایک مقامی باشندہ تھا جو اپنے کام کا ماہر تھا یعنی زمین پر چلنے والی گاڑی سے ہیلی کوپٹر کا کام لے سکتا تھا۔ اتنی پرانی گاڑی کو (بظاہر) اتنی اچھی حالت میں دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ یہ ضرور یہاں کے زندہ پانی کی کرامت تھی جو نہ صرف انسانوں کو بیماریوں سے بچائے رکھتی ہے بلکہ گاڑیوں کو بھی زنگ آلودگی سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس نمونے کی گاڑیاں اب اہل مغرب نے بنانا بند کر دی ہیں اس لیے ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ ان کے پرزہ جات کی ترسیل کا بندو بست کیونکر ہوتا ہے۔ ہم نے فاروق سے پوچھا کہ کیا یہ گاڑی اس قابل ہے کہ جھیل سیف الملوک تک جو کہ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق زمین سے کچھ اوپر بادلوں سے پرے پہلے آسمان پر واقع تھی، ہمیں بحفاظت لے جائے گی۔ اس نے جواب دیا۔ ”ہر روز تقریباً ایسی 40 گاڑیاں جھیل سیف الملوک تک آتی جاتی ہیں اور یہ یہاں کی گاڑیوں اور ان ڈرائیوروں کے لیے ایک لگا بندھا معمول ہے، اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔“

ان اعداد و شمار سے ہماری ڈھارس بندھی اور ہم اپنے اہل و عیال سمیت اس بے اعتبار گاڑی میں بیٹھ گئے۔

جھیل پر جانے سے پہلے حفاظت کی ایک حکایت پیش خدمت ہے۔ اس گاڑی میں بیٹھ کر ہمیں خیال آیا اور ہر کسی کو آتا ہوگا کہ اگر یہ گاڑی اس پُرخطر راستے پر الٹ کر گھاٹی میں جا گری تو کیا ہوگا؟ ایک یقینی موت جو ایک اٹل حقیقت ہے لیکن ایک ہی خاندان کے سب لوگوں کا اس طرح موت کے گھاٹ اتر جانا ایک المیہ بھی ہے اور حفاظتی منصوبہ بندی کا فقدان بھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ایک ضابطہ حکومت وقت کی حفاظتی تنظیم (جو کہ ابھی تک معرض وجود میں نہیں آئی ہے) کی طرف سے ایسا ہو جو سب سیاحوں کو اس بات کا پابند کرے کہ ہر خاندان کا صرف ایک ہی شخص ایک گاڑی میں بیٹھے اور اس طرح منتشر ہونے سے حادثے کی صورت میں ایک خاندان کا نقصان صرف ایک جان تک محدود رہے گا۔ اُمید ہے کہ آپ اس بات سے بدمزہ نہ ہوئے ہوں گے۔ آئیے اب جھیل سیف الملوک کی سیر کو چلیں۔

یوں تو ہم مانسہرہ سے ہی پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے لیکن یہاں کی چڑھائی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ عام گاڑی کا اس راستے پر چڑھنا ممکن نہیں، ایک تو راستہ عمودی اور تنگ اور اس پر برف کے تودوں پر سے گزرنا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ برف کے تودے نہیں تھے بلکہ قدرت نے تکثیف کے عمل سے بادلوں کو برفانی پلوں کی شکل میں ڈھال دیا تھا تاکہ اس کے بندے زمین سے آسمان پر چڑھ سکیں اور کارخانہ قدرت میں برف سازی اور فراہمی آب کے نظام کا مشاہدہ کر سکیں۔ ہماری ایک طرف نشیب میں دریائے کنہار بہہ رہا تھا اور ہم اس کی مخالف سمت میں، ٹراؤٹ مچھلی کی طرح، اوپر کی طرف محو سفر تھے۔ برف کے پلوں پر سے گاڑی کا گزرنا ایسا تھا جیسے دلدل پر سے گزرنا۔ منطقی طور پر تو انسان کو اس مقام سے واپس آجانا چاہیے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اتنے سارے لوگ پہلے جا چکے ہیں تو وہ یہ خطرہ مول لینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس پُرخطر اور دشوار گزار راستے پر گزرنے کے بعد ہم بالآخر دریائے کنہار کے منبع پر پہنچ گئے۔ دریا ایک چھوٹے سے لکڑی کے پل کے نیچے سے نکل کر اپنے سفر پر رواں دواں تھا۔ اس پل کے اس طرف جھیل سیف الملوک تھی، ایک بہت بڑے پیالے کی طرح جسے چاروں طرف سے پہاڑوں نے اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ ان پہاڑوں کے اوپر پانی سے لدے ہوئے بادل یوں جھکے ہوئے تھے جیسے ماشکی اپنی مشک سے پانی انڈیلنے کے لیے جھک جاتا ہے۔ یہ وہی بادل ہیں جو کراچی کے مقام پر اپنی مشکیں بھر بھر کر شمال کی طرف، اپنے رب کے حکم سے رواں دواں رہتے ہیں، اور اہل کراچی ان کو حسرت سے دیکھ کر کہتے:

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن، کچھ تو ادھر بھی

ذرا سوچیے کہ اگر یہ بادل وہیں برس جائیں تو پھر پانی کا یہ عالی شان چکر کیسے پورا ہوگا جو جھیل سیف الملوک سے شروع ہوتا ہے اور کراچی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تو صرف ایک منصوبہ ہے جو ہمارے مشاہدے میں آگیا ورنہ اللہ نہ جانے کتنے آب رسانی کے منصوبے ہوں گے جو کارخانہ قدرت میں جاری و ساری ہوں گے۔

گاڑی ایک طرف رکوا کر ہم لوگ اتر گئے اور جھیل کے کنارے جا کر کھڑے ہو گئے۔ جھیل سے کچھ فاصلے پر ایک

اطار میں کھوکھے تھے جن میں کھانے پینے کی چیزیں فروخت کے لیے موجود تھیں۔ اس جگہ خاصی چہل پہل تھی لیکن ہجوم نہ تھا جو ہمارے مزاج کے بالکل مطابق تھا۔ جھیل کی سطح ساکت تھی اور اس پر کچھ کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ہم نے بھی ایک کشتی میں کچھ دور تک اس جھیل میں سیر کی۔ کشتی سواروں کی حفاظت کے لیے حفاظتی جیکٹیں بھی موجود تھیں جو ملاحوں نے اصرار کے ساتھ مسافروں کو پہنائیں، شاید اس لیے کہ اس دن کوئی اہم شخصیت سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس مقام پر سیاحوں کی آؤ بھگت کے لیے کوئی خاص انتظام نہ تھا البتہ کشتی گھاٹ کے قریب ایک چھوٹا سا چھپر بنا ہوا تھا جہاں لوگ کشتی کے انتظار میں بیٹھ سکتے تھے۔ کشتی کی سیر کے بعد ہم جا کر اس لکڑی کے پل پر کھڑے ہو گئے جہاں سے جھیل سیف الملوک دریائے کنہار کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

اس پل پر کھڑے ہو کر ہم نے جھیل اور اس کے متعلقات کا ایک جائزہ لیا۔ یہ جھیل پانی کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جس کا توازن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ایک خاص سطح تک برقرار رکھتا ہے۔ بادلوں کا پانی فوراً جھیل میں منتقل نہیں ہو جاتا بلکہ ایک خاص وقت تک پہاڑوں کے سینے پہ برف کے تودوں کی شکل میں چمٹا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ پگھل کر جھیل کی سطح کو برقرار رکھتا ہے۔ فضا میں پانی کا بخارات، برف اور مائع کی شکل میں ایک خاص توازن اور توازن کو برقرار رکھنے کے تمام لوازمات یعنی بادل، پہاڑ، جھیل، دریا اور ایک خاص درجۂ حرارت یہاں قدرت کی طرف سے مہیا کیے گئے ہیں۔ اس توازن میں معمولی سا خلل اس تمام نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ فطرت کا یہی وہ توازن ہے کہ جسے دیکھ کر انسان دم بخود رہ جاتا ہے اور صناعی قدرت کا قائل ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ توازن یوں تو اس زمین کے چپے چپے پر موجود ہے لیکن کہیں کہیں یہ پردۂ حقیقت کی اوٹ سے اپنی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دیتا ہے۔ جھیل سیف الملوک وہ جگہ ہے کہ جہاں قدرت کسی حد تک اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتی ہے۔

اس جھیل کے بارے میں ہم نے بچپن میں سن رکھا تھا کہ یہاں چاندنی رات میں پریاں اترتی ہیں۔ ہم نے دن دہاڑے یہاں بادلوں کو اترتے تو دیکھا لیکن پریوں کے اترنے کی تصدیق ہم نہیں کر سکتے کیونکہ رات تک ٹھہرنے کا یارا ہمیں نہیں تھا۔ ہم نے جب اس بات کی تصدیق یہاں کے مقامی لوگوں سے چاہی تو انہوں نے جواب دیا کہ ایک زمانے میں یہ بات درست تھی جب لوگوں کا آنا جانا محدود تھا لیکن اب پریوں نے ایک اور جھیل کا رخ کر رکھا ہے جو یہاں سے چند گھنٹے کی مسافت پر ہے اور جہاں گاڑی کا راستہ نہیں، پیدل جانا پڑتا ہے۔ ہم ان سب باتوں سے اس نتیجے پر پہنچے کہ پریاں اس مقام پر اترنا پسند نہیں کرتیں جہاں جہاں انسان کے قدم پڑ جائیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں جہاں حضرت انسان کے قدم پڑ جائیں وہاں سے جنگلی جانور اور درندے بھی نقل مکانی کر جاتے ہیں پریاں تو پھر ایک نازک مخلوق ہیں۔

اس کے علاوہ ہم نے ایک اور نتیجہ بھی اخذ کیا اور وہ یہ کہ جو جگہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اس کے بارے میں وہ فرضی کہانیاں گھڑ لیتا ہے اور جب وہاں پہنچتا ہے تو اسے پھر غالب کا سہارا لینا پڑتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

انضباط اوقات کے مطابق جھیل سیف الملوک کی سیر کے بعد ہمیں واپس ناران آنا تھا اور پھر فوراً واپسی کا سفر اختیار کرنا تھا تاکہ رات کے قیام کے لیے شوگران پہنچ سکیں۔ ہمیں شوگران کی سرگرانی یاد تھی اس لیے فاروق سے کہا کہ اگر ممکن ہو سکے تو بالاکوٹ کے مقام پر قیام کا انتظام کر دو تاکہ دہرے چکر سے بچ جائیں اور اگلے دن سوات کا سفر آسان تر ہو جائے۔ صورت حال یہ تھی کہ ناران سے واپس جاتے ہوئے شوگران کی پہاڑی پر چڑھتے اور پھر دوسرے دن اسی پہاڑی سے اتر کر بالاکوٹ کے راستے سوات جاتے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ سیدھے بالاکوٹ جائیں تاکہ سفر کی کلفت کو کسی حد تک کم کیا جا سکے لیکن اس میں ایک ہی قباحت واقع ہوئی اور وہ یہ کہ بالاکوٹ کے مقام پر رہائش کا انتظام ایک پرانے ڈاک بنگلے کی طرز کی عمارت میں تھا جس میں ڈراؤنی فلم بہت اچھی بن سکتی ہے؛ اسی لیے سیاحت کے کارپردازوں نے شوگراں کے مقام پر ہمارے قیام کا انتظام کیا تھا جہاں ایک خوبصورت اور جدید طرز کا مہمان خانہ سیاحوں کے قیام کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

بالاکوٹ پہنچ کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر اس کے بعد باہر چبوترے پر بیٹھ کر چائے پی جہاں سے دریائے کنہار ایک چوڑے پاٹ کی صورت پوری آب و تاب کے ساتھ، ہماری جائے رہائش کے بالکل نیچے، بہہ رہا تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم اس بلند چبوترے سے اترے اور دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ یہ دریائے کنہار سے ہماری آخری ملاقات تھی کیونکہ اس کے بعد اگلی صبح ہمیں اس دریا کی عمل داری سے

PakiBooks.Site

نکل کر دریائے سوات کی عمل داری میں داخل ہونا تھا۔ مغرب کے قریب ہم دریا سے رخصت لے کر واپس اپنی جائے قیام پر پہنچ گئے۔ یہاں ہماری ملاقات ایک ادھیڑ عمر جرمن شہری سے ہوئی جو حشریات کا ماہر تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ وہاں قیام پذیر تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ کچھ کیڑوں کے نمونے حاصل کرنے یہاں آیا ہے۔ اس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ اس نے ایک خاص قسم کا قمقمہ تاروں سے جوڑ کر لگا دیا جس کی روشنی عام برقی قمقموں سے مختلف تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بھانت بھانت کے پتنگے اس قمقمے کا طواف کرنے لگے۔ اس نے ان پتنگوں کو پکڑ پکڑ کر خاص قسم کے مرتبانوں میں بند کرنا شروع کر دیا۔ ان میں کچھ پتنگے بہت بڑے، بدوضع اور ڈراؤنے تھے لیکن وہ شخص ان کی شکل وصورت اور جسامت سے ڈرے بغیر ان کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ پکڑ کر قید میں ڈال رہا تھا۔ اس شکل کے پتنگے ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے جو اس خاص قسم کے قمقمے کے باعث پردہ تاریکی سے ظہور میں آگئے تھے۔

یہ سب دیکھ کر ہماری دلچسپی اس شخص میں بڑھی اور ہم نے اس سے بہت سے سوالات حشریات کے بارے میں کیے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ کچھ پتنگے ایسے ہیں جو صرف یہیں ملتے ہیں جن کی تلاش میں وہ یہاں آتا رہتا ہے۔ ہمیں حیرت اس کی بیوی پر تھی جو اس صورتِ حال سے بالکل ہراساں یا پریشان نہیں ہوئی بلکہ ہر ممکن طور پر اپنے شوہر کی مدد کر رہی تھی۔ ابھی یہ تماشا بیچ ہی میں تھا کہ اس جرمن کا پڑوسی (اس کے ساتھ والے کمرے کا مکین جس کے کمرے کا راستہ اس جرمن کے کمرے کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا) آ پہنچا اور اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ یہ کیا تماشا تم نے لگا رکھا ہے۔ میں اپنے کمرے میں کس طرح جاؤں گا اور میری بیوی پتنگوں کے اس ہجوم عاشقاں میں سے اپنا دامن بچا کر کیونکر گزر سکے گی۔ اس احتجاج پر اس جرمن شخص نے فوراً وہ جادوئی قمقمہ بجھا دیا اور چند ثانیوں میں ماحول معمول پر آ گیا۔ یہ ایک دلچسپ تماشا تھا جو ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہم اپنے اگلے ہدف کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہماری مہم کے دو حصے یعنی مری اور ناران کی سیر مکمل ہو چکی تھی اور اب تیسرا مرحلہ درپیش تھا جو وادی سوات کی سیر پر مشتمل تھا۔ بالاکوٹ سے ہمیں شنکیاری درّے سے ہوتے ہوئے سوات کی وادی میں داخل ہونا تھا اور میاں دم کے مقام پر قیام کرنا تھا۔ یہ ایک لمبا سفر تھا لیکن راستہ مناظر قدرت سے پُر تھا اس لیے کوفت نہیں ہوئی۔ بالاکوٹ سے ہم دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلتے رہے اور پھر اس کے بعد ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے۔ مانسہرہ کے بعد ہم نے درۂ شنکیاری کا راستہ پکڑا اور چلتے گئے۔ مانسہرہ کے بعد سڑک اتنی اچھی نہیں تھی جتنی کہ ابھی تک ہم دیکھ چکے تھے لیکن اتنی بری بھی نہیں تھی کہ وحشت ہوتی۔

موسم معتدل تھا اور جو کچھ کسر رہ جاتی تھی وہ گاڑی کو ٹھنڈا کرنے والا نظام پوری کر دیتا تھا۔ ہم سب بہت خوشگوار کیفیت میں مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ ایک معقول چائے خانہ نظر آیا تو رک گئے تاکہ کچھ دیر کو ٹانگیں سیدھی کر سکیں۔ چائے خانے سے شیشوں کے پار بہت خوبصورت منظر نظر آ رہا تھا جس نے چائے نوشی کے عمل کو ایک خوشگوار تجربے میں ڈھال دیا۔ دور تک سرسبز میدان تھا جس کے خاتمے پر ایک پہاڑ اور اوپر نیلا آسمان جس پر روئی کے گالوں جیسے بادل تیر رہے تھے۔ اس سارے منظر میں جو گہرائی اور مبالغہ تھا اس کو ہم یہاں قلم بند کرنے سے قاصر ہیں لیکن اتنا کہہ سکتے ہیں کہ سبزہ بہت سبز تھا، آسمان بہت نیلا تھا، بادل بہت سفید تھے اور ہوا بہت صاف تھی یعنی ہر چیز درجۂ کمال پر تھی۔ کچھ دیر سستانے اور مناظر قدرت کو داد دینے کے بعد ہم نے پھر اپنی راہ ناپی یہاں تک کہ بشام پہنچ کر دم لیا۔ اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے ایک اچھے ہوٹل کی طعام گاہ میں جا اترے تاکہ کچھ کھا سکیں۔

شاہراہ قراقرم پر سفر کرنے کا یہ ہمارا پہلا موقع تھا۔ یہ سڑک اہل وطن کے لیے پاک فوج کا ایک ایسا تحفہ ہے کہ جس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسے سنگلاخ پہاڑوں میں اتنے آرام دہ سفر کا ایک زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں سفر کرنا مہم جوئی اور جان جوکھم کا کام تھا جو اب ایک روز کا معمول بن گیا ہے۔ اس راستے پر سفر کرتے چند ایک جگہوں پر ہم نے لوہے کے رسّے پر چلتی ہوئی ڈولیاں دیکھیں جو لوگوں کو اس سڑک سے ایک گہری کھائی کی دوسری طرف آبادی میں لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کھائی کی دوسری طرف ایک الگ ہی دنیا آباد ہے جہاں اس دنیا کا قانون نہیں چلتا۔ اس شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ہم ایک مشہور پل پر سے بھی گزرے جو چین نے بنا کر دیا تھا۔ اس پل کی تصاویر لینے کی ممانعت تھی اور یہاں فوج کا پہرا تھا۔ اس پل پر سے گزرنے کے بعد ابھی ہم چند گز ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔

ہماری بیگم کا خیال تھا کہ کسی نے ہماری گاڑی پر بندوق سے گولی داغی ہے جبکہ ہمارا خیال تھا کہ کوئی ”کنکر“ پہاڑ سے لڑھک کر ہماری گاڑی کی چھت پر گرا اور یہ آواز پیدا ہوئی۔ فاروق نے ہمارے خیال کی تائید کی کہ کوئی پتھر پہاڑ سے گرا ہے۔ قارئین کرام! یہ پتھر ذرا بڑا بھی ہو سکتا تھا اور گاڑی کو نقصان پہنچا سکتا تھا اور مزید بڑا ہونے کی صورت میں گاڑی کے مسافروں کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ان پہاڑی علاقوں میں سفر کے دوران ان خطرات کو بھی پیش نظر رکھ کر سفر کرنا چاہیے۔ ہمیں ان خطرات کا یہاں آ کر پتا چلا اور اب ہم آپ سب لوگوں کو قبل از وقت آگاہ کیے دیتے ہیں تاکہ آپ اپنے سفر کی منصوبہ بندی میں ان خطرات کو پیش نظر رکھ سکیں۔ اس پل کو عبور کرنے کے بعد جو دوسری اہم چیز سامنے آئی وہ ایک دریا تھا جو ہمارے پہلو بہ پہلو مخالف سمت میں بہنے لگا یا یوں کہہ لیجیے کہ ہم اس دریا کی مخالف سمت میں سفر کرنے لگے۔ ایک جگہ شاہراہ قراقرم کی تختی نصب تھی جس پر اس مقام سے مختلف شہروں کے فاصلے درج تھے۔ ہم نے یہاں رک کر اس تختی کی چند تصاویر مختلف زاویوں سے لیں۔

بشام میں کھانے کے بعد ہمیں ایک عجیب وغریب اطلاع ملی اور وہ یہ کہ مقامی باشندوں نے انتظامیہ سے ناراض ہو کر راستہ بند کر دیا ہے اس لیے ہم آگے اپنے سفر پر روانہ نہیں ہو سکتے۔ یہ خبر ہمارے لیے خوش آیند نہیں تھی کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ نہ صرف ہم باقی ماندہ سیر سے ہاتھ دھو بیٹھیں بلکہ اپنے اضافی خرچ پر آیندہ تین دن مختلف جگہوں پر قیام کرتے ہوئے واپس چلے جائیں۔ کھانے کے بعد جب ہم نے اس پابندی کے متعلق مزید معلومات کیں تو پتا چلا کہ خلاف ورزی کرنے والی گاڑیوں پر پتھراؤ کیا جاتا ہے اس لیے فاروق آگے جانے سے خائف تھا پھر ایک خبر آئی کہ پتھراؤ صرف تجارتی یا مال بردار گاڑیوں پر کیا جاتا ہے اور مہمانوں یعنی سیاحوں کو اپنی دیرینہ مہمان نوازی کی پختون روایات کے مطابق معاف کر دیا جاتا ہے۔ اس خبر پر فاروق نے کچھ حوصلہ پکڑا اور کچھ دلاسہ ہم نے دلایا کہ آخر ہم خود بھی پٹھان ہیں اور مہمان بھی ہیں اس لیے ضرور ہمارے بھائی ہم سے ہم زبان ہونے کے ناطے رعایت برتیں گے۔ کچھ تاخیر اور ردوکد کے بعد ہمارا قافلہ بالآخر روانہ ہو گیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

شاہراہ قراقرم جس پر ہم سفر کرتے ہوئے بشام تک پہنچے تھے سیدھی چین تک چلی جاتی ہے جبکہ ہم نے یہاں سے ایک ذیلی سڑک N-90 پر مڑ کر درہ شانگلہ سے وادی سوات میں داخل ہونا تھا۔ شاہراہ قراقرم چھوڑنے کے بعد N-90 شاہراہ پر درہ شانگلہ تک ہم بہت آرام سے پہنچے لیکن اس کے بعد راستہ خراب ہو گیا اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے رہے یہ مزید خراب ہوتا گیا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ ہمیں اس وقت تک منزل مقصود یعنی میاں دم میں ہونا چاہیے تھا لیکن بشام کے مقام پر شش و پنج میں مبتلا رہنے سے دیر ہو گئی تھی ورنہ غروب آفتاب کے بعد ان قبائلی علاقوں میں سفر کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا۔ پٹھانوں کی روایات کے مطابق دن کی روشنی میں کوئی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا لیکن غروب آفتاب کے بعد ہر شخص اپنی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہے اس لیے ہم چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل کر شہری علاقے میں پہنچ جائیں۔ خدا کے فضل وکرم سے ہم جلد ہی خیریت کے ساتھ سوات کے شہری علاقے میں داخل ہو گئے اور وہاں سے ایک ذیلی سڑک پر میاں دم کی طرف مڑ گئے۔ میاں دم پہاڑ پر واقع ایک پُرفضا مقام ہے جہاں مقامی لوگ رہتے ہیں اور یہ کوئی سیرگاہ نہیں ہے۔

یہاں کا مہمان خانہ ہمیں بہت پسند آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم اپنے کسی عزیز کے یہاں مہمان ٹھہر گئے ہیں۔ ایک پاکستانی میاں بیوی جو انگلستان پلٹ تھے اور جن کے بچے ہنوز وہیں مقیم تھے، انہوں نے یہ مہمان خانہ اپنی گزر بسر اور بقیہ ماندہ زندگی سکون سے گزارنے کے لیے بنا رکھا تھا۔ ان کے بچے بھی تعطیلات گزارنے یہیں آ کر ان کے ساتھ قیام کرتے تھے اور یہاں کے موسم کا لطف اٹھاتے تھے۔ یہاں ہمیں بالکل گھر جیسا ماحول ملا جو ایک امر محال ہے۔ ابھی تک اپنی زندگی میں ہم جہاں بھی ٹھہرے یا تو ہمیں گھر سے برا ماحول ملا، یا پھر بہت اچھا ماحول ملا اور دونوں چیزیں ہمارے لیے باعثِ الجھن رہیں۔ یہ لوگ چونکہ انگلستان جیسی جگہ رہ چکے تھے اس لیے ان کے مہمان خانے کی سجاوٹ میں ایک معیار بھی تھا لیکن سادگی کے ساتھ جو کہ کاروباری تصنع سے پاک تھا اور یہی چیز ہمیں یہاں پسند آئی جو اسے گھر کے ماحول کے بہت قریب لے آئی تھی۔ کمرے کشادہ تھے اور ان کی آرائش گھریلو طرز پر لیکن بہت عمدگی سے کی گئی تھی۔ ملحق غسل خانے بھی بہت اچھے بنے ہوئے تھے جن میں ٹھنڈے اور گرم پانی کا انتظام موجود تھا۔ ہر کمرے کے پہلو میں مغلئی طرز کا ایک جھروکا بھی بنا ہوا تھا جو پائیں باغ کی طرف کھلتا تھا اور اس میں کھڑے ہو کر پھولوں کی نمائش کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ الغرض اس مہمان

PakiBooks.site

خانے کو بہت خوبصورتی اور چاہ سے بنایا اور سنوارا گیا تھا۔

اس مہمان خانے کے پائیں باغ میں اور بہت سے پھولوں کے علاوہ گلاب کی مختلف انواع بھی لگی ہوئی تھیں جن میں زرد گلاب سب سے نمایاں تھا۔ اس جگہ ایک بڑا سا جھولا بھی تھا جس پر بلا تفریق عمر ہر کوئی جھول سکتا تھا اور جس پر بیٹھ کر ہم نے اپنی بیگم کے ساتھ کچھ یادگار تصویریں بھی کھنچوائیں۔ کھانے کا انتظام یوں کیا گیا تھا کہ ایک بڑا سا کھانے کا کمرا تھا جس سے ملحق ایک باورچی خانہ تھا جس میں دو عدد مقامی چھوکرے بالترتیب باورچی اور بیرے کے کام پر متعین تھے۔ مہمان گرامی جو چیز بھی کھانا چاہیں، اپنے خرچ پر، ان لڑکوں سے فرمائش کردیں، وہ بازار سے لا کر اسی وقت بنا دیں گے۔ اس مہمان خانے کے مالک اور مالکن کے ساتھ ہمارا خاندان گھل مل گیا اور بہت اچھا وقت کٹا، اگرچہ ایک دن سے بھی کم وقت ہم نے وہاں گزارا۔ ایسے مہمان خانے کا قیام ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ایک بہت معقول مشغلہ ثابت ہو سکتا ہے جو تفریح اور آمدن کے علاوہ وقت گزاری کا ایک معقول ذریعہ بھی ہو۔

میاں دم میں ہمارا قیام دراصل سوات میں ہمارا داخلہ تھا جبکہ ہماری اصل منزل کالام تھی اس لیے دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد ہم لوگوں نے اپنا سامان اٹھایا اور دریائے سوات کے ساتھ ساتھ ٹراؤٹ مچھلی کی طرح دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت میں کالام کی طرف روانہ ہوگئے۔ دریائے سوات کی ایک طرف سڑک تھی اور دوسری طرف گھر، مہمان خانے اور ہوٹلز ایک قطار میں بنی ہوئی تھیں۔ راستے میں مدین اور بحرین کے قصبوں سے گزرنے کے بعد ایک جگہ چشمہ تھا جہاں رک کر ہم لوگوں نے تصویر کشی کی اور اپنی پیاس پہاڑ سے گرنے والے تازہ اور زندہ پانی سے بجھائی جسے ابھی تک انسانی لمس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

راستے میں سڑک کے کنارے جگہ جگہ ٹراؤٹ مچھلی کے اشتہاء انگیز اشتہارات ہماری بھوک کو للکار رہے تھے جن میں بتایا گیا تھا کہ زندہ مچھلی کو ہمارے سامنے مار کر اور تل کر ہمیں کھلایا جائے گا۔ اگرچہ کھانا کھانے اور کھلانے کا یہ تاتاری حسن انتظام ہمارے لیے باعث ترغیب ہرگز نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود ہم ٹراؤٹ مچھلی کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت کے لیے تیار نہ تھے البتہ جب تک بھوک نے نہیں ستایا ہم نے اس سفاکی سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ دوپہر کے قریب جب بھوک ذرا چمکی تو ہم دریا کے کنارے ایک خوبصورت، وسیع اور کشادہ جگہ رک گئے جہاں مچھلیوں کا ایک چھوٹا سا تالاب بھی تھا، ان کو تلنے کے لیے کڑکڑاتی تیل کی کڑاہی بھی تھی اور کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے ایک بلند چبوترہ بھی بنا ہوا تھا جہاں بیٹھنے کا معقول انتظام تھا۔ ہم نے کچھ بدقسمت مچھلیوں کا انتخاب کیا جنہیں ان کے مالک نے تالاب سے نکال کر زمین پر جان کنی کے لیے چھوڑ دیا اور ان کو تلنے کے انتظامات میں منہمک ہوگیا۔ جب مچھلیاں ٹھنڈی ہو گئیں تو دکاندار انہیں صاف کرنے میں لگ گیا اور ہم اپنے اہل و عیال کے ساتھ دریائے سوات کے کنارے ٹہلنے لگے۔

موسم بہت خوشگوار تھا اور وہ لمحات ہماری زندگی کے چند بہترین لمحات میں سے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ایسا قدرتی ماحول اور ایسی تازہ مچھلی کبھی کبھی انسان کو نصیب ہوتی ہے۔ جب کھانا تیار ہونے کا غلغلہ بلند ہوا تو ہم لوگ اس اونچے چبوترے پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کھانے میں مشغول ہوگئے۔ مچھلی بہت لذیذ تھی اور ہم نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا لیکن ہمیں تعجب صرف ایک بات پر تھا کہ جوں جوں آپ آبادی سے دور ہوتے جائیں توں توں مچھلی کے دام بڑھتے جاتے ہیں جبکہ ہمیں گمان تھا کہ آبادی سے دور دریا کے کنارے یہ سستی ہونی چاہیے۔ وجہ وہی ہوگی جو تاران میں ہمیں بتائی گئی تھی کہ یہ مچھلی دریا کے مخالف بہاؤ پر تیرتی ہے اور اس لحاظ سے بلندی کے ساتھ ساتھ ان مچھلیوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہوگی جو دریا کے بہاؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ پاتی ہوں گی یعنی صرف صف اوّل کی تیراک مچھلیاں ہی یہاں تک پہنچ پاتی ہوں گی!

کھانے کے بعد ہم دوبارہ کالام کی طرف روانہ ہوگئے جہاں ہم شام تک پہنچ گئے۔ یہاں موسم سرد تھا اور گرم کپڑوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ رہنے کا انتظام معقول تھا لیکن صفائی کا معیار بہت اچھا نہیں تھا۔ کچھ دیر آرام کے بعد ہم نے چائے پی اور کالام کے نواح کی سیر کو نکل گئے۔ دریائے سوات عبور کرنے کے بعد ایک گھنا جنگل آیا جس کے درخت ایک خاص ترتیب اور فاصلے سے لگے ہوئے تھے اور نیچے زمین سپاٹ تھی گویا کسی نے ایک بڑے سے کمرے میں مصنوعی درخت لگا رکھے ہیں۔ اس جگہ ہم نے قیام کیا اور ان درختوں سے لپٹ لپٹ کر تصویریں بنوائیں۔ یہ درخت بالکل سیدھے کھڑے تھے جیسے فوجی جوان کسرت کے لیے میدان میں دم سادھے ہدایات کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان درختوں کو دیکھ کر ہماری بیگم صاحبہ کھل سی گئیں جیسے کوئی بچہ اپنا پسندیدہ کھلونا دیکھ کر لہک جاتا ہے۔ ہم نے پورے سفر میں انہیں اتنا مسرور کسی بھی مقام پر نہ دیکھا تھا۔ درخت ان کی کمزوری ہیں، اکثر کہتی ہیں کہ کاش ایک مکان ایسا ہو کہ جس میں ایک گھنا سایہ دار درخت ہو جس کے سائے میں چارپائی ڈال کر میں بیٹھ سکوں۔ بیس سال گزر گئے لیکن ہم ان کی یہ معمولی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکے۔ درخت ہمیں بھی بے حد پسند ہیں لیکن تلاش معاش نے ہمیں ان درختوں سے دور ایک کثیر المنزلہ عمارت کی چوتھی منزل پر ٹانگ رکھا ہے کہ جہاں رہتے ہوئے ہمارا زمین اور آسمان سے رابطہ کٹ گیا ہے۔ شاید ایک دن اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد ہم بھی ان درختوں میں پناہ لینے یہاں پہنچ جائیں اور فطرت کے مطابق اپنی زندگی کے آخری دن گزار سکیں۔

اس جنگل کے سحر انگیز ماحول سے دامن چھڑا کر ہم مجبوراً آگے بڑھ گئے اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئے کہ جہاں ہم دریا سے براہ راست مصافحہ کر سکتے تھے۔ یہاں بڑے بڑے سنگلاخ پتھروں نے دریا کو گھوڑے کی طرح رکاوٹوں والی دوڑ پر مجبور کر دیا تھا۔ دریا کا پانی کہیں رکتا اور کہیں غراتا اپنی برہمی کا اظہار کرتا ہوا مسلسل گزر رہا تھا۔ ان پتھروں کے بیچوں بیچ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں نے لکڑی کے چبوترے بنا کر بیٹھنے کا انتظام کر رکھا تھا جہاں دریا کی گود میں بیٹھ کر آپ کچھ دیر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہی ایک چبوترے کے قریب ایک بہت بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس پر چڑھا جا سکتا تھا اور اس پر بیٹھ کر تصویر کھنچوانے سے یوں محسوس ہوتا تھا گویا آپ دریا کے بالکل بیچ میں بیٹھے ہیں۔ جب ہمارے بچے اس پر بیٹھ کر تصویریں کھنچوا رہے تھے تو ایک دکاندار نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم ایسے خطرناک کام سے اجتناب کریں تو بہتر ہے کیونکہ ایک بچہ اس پتھر سے پھسل کر دریا برد ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس مشغلے سے توبہ کی اور انتباہ کے طور پر یہ واقعہ یہاں رقم کر دیا کہ تاکہ جو کوئی بھی پڑھے وہ اس پتھر سے اور ایسے سب پتھروں سے دور رہے جہاں سے پھسل کر دریا میں گرنے کا اندیشہ ہو۔ آج بھی جب ہم وہ تصویریں دیکھتے ہیں تو ہمارا دل لرز جاتا ہے۔ اس خوبصورت اور خطرناک جگہ کچھ وقت گزارنے اور مشروبات سے دل بہلانے کے بعد ہم واپس کالام کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں مختلف انواع کے درخت جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے دیکھتے ہوئے کالام کے بازار پہنچے۔

یہاں گاڑی سے اتر کر فاروق کو ہم نے رخصت کیا اور بازار کی سیر کو نکل گئے۔ رات کا کھانا بھی ہم لوگوں نے بازار میں کھایا جو چپلی کباب اور روٹی پر مشتمل تھا۔ صوبہ سرحد میں اس غذا کو صرف کباب کہتے ہیں نہ جانے ملک کے دوسرے حصّوں میں یہ چیز چپلی کباب کے نام سے کیونکر موسوم ہوگئی ہے؟ اسے سرحدی کباب بھی تو کہا جا سکتا ہے تاکہ اسے ان بے شمار دوسرے کبابوں سے ممیز کیا جا سکے جو ملک کے دوسرے حصوں میں بنتے ہیں۔ یہاں ہم نے شفتالو (آڑو) بھی کھائے جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہ ایسے پکے ہوئے تھے کہ چھلکا ایک طرف سے پکڑ کر کھینچنے سے سارا کا سارا اتر جاتا تھا اور چھلا ہوا پھل کھانے کے لیے تیار ہوتا تھا اور اس کی لذت کا اندازہ آپ لوگ اس تحریر سے اخذ نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارا پسندیدہ پھل ہے اور تازہ نہ ملنے کی صورت میں سربند ڈبوں میں بھی دستیاب ہوتا ہے اور ہم امریکی ریاست کیلیفورنیا کے شفتالو بھی کھا چکے ہیں لیکن سوات میں ملنے والے یہ شفتالو ہمارے محدود تجربے کے مطابق، بلاشبہ دنیا کے بہترین شفتالو تھے۔

ہماری بیگم نے بازار میں کچھ خریداری بھی کی جو زیادہ تر خاندان کے لوگوں کے لیے تحائف تھے جو یہاں کی یادگار کے طور پر وہ لے جانا چاہتی تھیں۔ کھانے، خریداری اور چہل قدمی کے بعد ہم لوگ واپس اپنے کمروں میں آگئے اور کل کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔ کالام سے آگے ایک دشوار گزار راستے پر ایک جھیل ہے جس کا نام ''مہوڈنڈ'' ہے، یعنی ''مچھلیوں کا تالاب۔'' دریائے سوات اسی جھیل سے پھوٹتا ہے جیسے دریائے کنہار جھیل سیف الملوک سے۔ ''مہوڈنڈ'' کی سیر ہمارے پہلے سے طے شدہ لائحہ عمل کا حصہ نہیں تھی لیکن ہم نے اضافی اخراجات کی ہامی بھر کر اسے اپنی سیر میں شامل کر لیا۔ رات ہی سے ایک جیپ گاڑی کا انتظام کر لیا گیا تاکہ صبح ہی صبح وقت ضائع کیے بغیر نکلا جا سکے۔ جھیل ''مہوڈنڈ'' کی سیر کے تمام انتظام کرنے کے بعد ہم لوگ استراحت کی غرض سے لیٹ گئے۔ جولائی کا مہینا تھا لیکن وہاں اس وقت موسم سرما کا سا عالم تھا اور گرم پانی کے بغیر وضو کرنا مشکل تھا۔ ہم سب لوگوں نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بستروں پر کمبلوں کا انتظام تھا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ہم لوگ جیپ گاڑی میں بیٹھ کر مہوڈنڈ جھیل کی سیر کو نکل گئے۔ ہمیں دراصل جھیل سیف الملوک کی سیر کے بعد جھیلوں کی سیر کا چسکا پڑ گیا تھا لیکن اس راستے پر آکر ہمیں احساس ہوا کہ یہاں کا راستہ کہیں زیادہ

دشوار گزار اور خطرناک ہے اور شاید اسی لیے یہاں کے سفر کو ہماری سیر میں شامل نہیں کیا گیا تھا لیکن اب راستے سے واپس ہونا شرم کی بات تھی اس لیے اس خود منتخب سزا کو ہم نہایت خوش اسلوبی سے بھگتا گئے۔

ہم دریائے سوات کے مخالف رخ پر سفر کر رہے تھے اور راستے میں برف کے ان پلوں پر سے بھی گزرے جو کہ اس قسم کی جھیلوں پر جانے کے لیے قدرت کی طرف سے ہم گنہگار انسانوں کو مہیا کیے جاتے ہیں۔ یہ پل (گلیشیر) بہت تنگ تھے اور ان پر سے گاڑی کے پھسل کر گر جانے کے امکانات کافی روشن تھے۔ اس راستے پر گاڑیاں بھی بہت کم چل رہی تھیں۔ ایک جگہ راستے میں رک کر ہم نے ایک کٹیا نما چائے خانے میں چائے پی جس کے قریب ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ مناظر بہت اچھے تھے۔ ایک جگہ سے نانگا پربت کی چوٹی کی جھلک بھی دکھائی دی۔

جھیل مہوڈنڈ جھیل سیف الملوک کا عشر عشیر تھی لیکن اس کا اپنا ایک حسن تھا۔ اس جھیل کے بیچوں بیچ ایک جزیرہ سا تھا جس پر درخت اگے ہوئے تھے۔ تین اطراف پہاڑوں سے چشمے بہہ کر اسے سیراب کر رہے تھے اور چوتھی طرف سے دریائے سوات خارج ہو رہا تھا۔ اس جھیل میں کشتی رانی بھی ہوتی تھی جس کا ہم نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور ایک چکر اس جھیل کا لگایا۔ ڈر اس وقت لگا جب کشتی جھیل کے اس حصے کی طرف گئی جہاں سے دریا گر رہا تھا۔ کشتی بان کی چوک سے ہم سب لوگ دریائے سوات کے بہاؤ پر بہہ کر بغیر گاڑی کے واپس کالام پہنچ سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا اور ہم لوگ بخیریت واپس کشتی گھاٹ پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہم نے جھیل کے ارد گرد ایک چکر لگایا اور ان چشموں کا نظارہ کیا جو اس جھیل کو وجود بخش رہے تھے۔ ان چشموں کا صاف اور شفاف پانی جو مختلف چٹانوں سے ٹکراتا اور اچھلتا ہوا جھیل میں گرنے کے لیے بے تابانہ بہہ رہا تھا، ایک قابل دید منظر تھا۔ یہ پانی پہاڑ کے پہلو سے لگے ہوئے، چاندی جیسے برف کے تودوں سے پگھل پگھل کر آ رہا تھا اور ہنوز کسی بھی قسم کی کثافت اور گندگی سے پاک تھا۔ ہم نے یہ پانی خوب پیٹ بھر کر پیا کہ ایسا مقطر اور پوتر پانی عام طور پر انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ جھیل میں گرتے ہی ان پانیوں پر انسان طبع آزمائی شروع کر دیتا ہے، کبھی اس کی سطح پر کشتی میں بیٹھ کر تیرنے لگتا، کبھی اس میں نہانے لگتا ہے اور کبھی اس کو گندگی بہالے جانے کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ ان چشموں کا مشاہدہ اس جھیل کی ایک خصوصیت تھی جو ہم جھیل سیف الملوک میں نہیں کر سکے کیونکہ وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے اتنی بڑی تھی کہ اس کا دوسرا سرا جہاں اس قسم کے چشمے گر رہے تھے، اس مقام تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

جھیل سیف الملوک کے مقابلے میں یہاں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک تو راستہ دشوار گزار تھا اور دوسرے یہ جھیل سیف الملوک کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس جھیل کی اپنی ایک خوبصورتی اور دلکشی تھی جسے ہم کبھی نہ بھلا سکیں گے۔ ہم نے وہاں کے کشتی بانوں سے پوچھا کہ وہ لوگ موسم سرما میں کیا کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ سرد موسم میں وہ کالام کی طرف اپنے گاؤں چلے جاتے ہیں کیونکہ اس موسم میں یہاں رکے رہنا دانش مندی کے خلاف ہے۔ گویا کہ سردی کے موسم میں یہ جگہ انسانی دسترس سے بالکل پاک ہو جاتی ہے اور یہی وہ موسم ہوتا ہوگا کہ جس میں پریاں یہاں اترنا پسند کرتی ہوں گی۔ ہم نے نہ کسی سے اس موضوع پر سوال کیا اور نہ کسی نے ہمیں کوئی روایتی کہانی سنائی لیکن اس جگہ کا ماحول دیکھ کر ہم نے خود سے یہ مفروضہ اخذ کیا۔ یہاں کی سیر ہماری زندگی کی یادگار سیروں میں سے ایک تھی کیونکہ ایسی جگہوں پر انسان قدرت کو بہت قریب سے دیکھ لیتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم ایک بنسی ساتھ لے جاتے اور "مچھلیوں کے اس تالاب" میں ڈال کر بیٹھ جاتے اور اپنے ہاتھ سے شکار کی ہوئی مچھلیوں سے جھیل کے کنارے بیٹھ کر ناشتا کرتے لیکن ہمیں آج ہی کے دن کالام چھوڑ کر مرغزار پہنچنا تھا اس لیے اس ملکوتی مقام سے کوچ کیا اور دریائے سوات کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف سوئے کالام روانہ ہو گئے۔ برف کے پلوں پر سے زندہ سلامت گزرنے کے بعد کالام پہنچتے ہی ہم نے فاروق کی گاڑی میں سامان منتقل کیا اور مرغزار کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمارا آج کا قیام مرغزار کے مقام پر سفید محل (White Palace) میں تھا جو پہلے والی سوات کی قیام گاہ تھی لیکن اب سیاحوں کا مسکن ہے۔ کالام سے چل کر ہم بحرین اور مدین کی بستیوں سے ہوتے ہوئے شام اترنے تک مرغزار پہنچے۔ سفید محل باہر سے ایک پر شکوہ لیکن اندر سے ایک سادہ عمارت ثابت ہوئی۔ یہ عمارت ایک بلند چبوترے پر قائم ہے اور سفید رنگ کی ہے۔ گھنے درختوں کے بیچ میں ایک سڑک پر چلتے ہوئے جب ہم محل کے سامنے پہنچے تو نیچے گاڑی ٹھہرانے کے بعد چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک باغ تھا جس میں سنگ مرمر کی کرسیاں بنی ہوئی تھیں جو کسی زمانے میں والی ریاست کے ذاتی استعمال میں رہی ہوں گی اور یقیناً بہت اہم شخصیات نے بھی اس جگہ کو رونق بخشی ہوگی۔ اس باغ کی ایک طرف ایک روش بنی ہوئی تھی جو سیاحوں کو استقبالیہ تک لے جاتی تھی۔ استقبالیہ پر ہمیں ہمارے کمروں کی چابیاں دی گئیں۔ استقبالیہ کے ساتھ ہی ایک حجرے پر "اہم شخصیات کے لیے" (For VIPS) کی تختی لگی ہوئی تھی جو شاید والی سوات کے لیے مخصوص تھا۔

استقبالیہ کے ساتھ ہی کھانے کا کمرا تھا جو خاصا وسیع و عریض تھا جو مہمانوں کی تواضع کے لیے بہت مناسب تھا لیکن مکھیوں کو بھی یہاں آنے کی کھلی چھٹی تھی۔ کھانے کے کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک قدیم طرز کا باورچی خانہ تھا جس کے سامنے خدمت گاروں اور باورچیوں کی بھیڑ تھی۔ یہ باورچی خانہ قدرے بلندی پر واقع تھا۔ پھر اس سے بھی بلندی پر مہمان خانہ تھا جہاں ہمیں کمرے دیے گئے تھے۔ یہ سارا محل ایک پہاڑی ڈھلوان پر بنا ہوا تھا جس پر مختلف سہولتیں مختلف بلندیوں واقع تھیں بلکہ مہمان خانے کے مختلف کمرے بھی مختلف سطح ہائے مرتفع پر واقع تھے۔ ہمارے کمرے سب سے زیادہ بلندی پر واقع تھے جن تک جاتے جاتے ہمارا سانس پھول جاتا تھا۔ ہمارے کمروں کے سامنے ایک خوبصورت سبزہ زار تھا جس میں انواع واقسام کے پھول اور پودے لگے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کے لیے چند مونڈھے بھی پڑے ہوئے تھے۔ کمرے صاف ستھرے کشادہ لیکن سادہ تھے جو پچھلی صدی کی طرز تعمیر کے غماز تھے۔ کمروں کے ساتھ غسل خانے بھی ملحق تھے جن میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتظام موجود تھا۔

یہاں کا درجہ حرارت معتدل تھا یعنی کالام کی طرح سرد نہ تھا۔ یہاں کی ساری سیر اس محل تک محدود تھی۔ ہمیں یہاں ایک رات گزارنی تھی اور دوسرے دن واپس اسلام آباد پہنچنا تھا تاکہ ہوائی جہاز پکڑ کر واپس کراچی جا سکیں۔ اس محل میں قیام کو بہت آرام دہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کی تاریخی اہمیت اور عظمت رفتہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس محل میں قیام ایک خوشگوار تجربہ تھا جو ہمیں یہ بتاتا تھا کہ آج سے چند سال پہلے کے روساء کس ڈھنگ سے رہتے تھے اور یہ کہ آج ایک متمول شخص کو جو سہولیات میسر ہیں پہلے کے والیان ریاست کو بھی وہ چیزیں میسر نہیں تھیں۔ ابھی ہم سبزہ زار میں بیٹھے یہ باتیں سوچ رہے تھے کہ ایک خدمت گار آیا اور ہماری سوچوں میں مخل ہوا۔ پوچھنے لگا۔ "کھانے میں کیا کھائیے گا؟"

اس کا یہ سوال ہمیں ذرا قبل از وقت لگا لیکن اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ہم شوربہ (Soup) یہیں منگوا کر پی سکتے ہیں جبکہ کھانے کے لیے بعد میں کھانے کے کمرے میں جا سکتے ہیں۔ یہ ایک معقول تجویز تھی اس لیے ہم نے اس کی اس تجویز کی پذیرائی کی اور اسے شوربہ لانے کو کہا۔ کچھ دیر کے بعد شوربہ آ گیا جو بہت خوش رنگ، خوش ذائقہ اور مزیدار تھا۔ برتن بھی معقول تھے یعنی اتنے پرانے نہیں تھے جتنا پرانا یہ محل تھا۔ دوپہر کا کھانا کھاتے بہت وقت ہو چکا تھا اس لیے اس شوربے نے بہت لطف دیا۔

اس کے بعد ہم دوبارہ باہر سبزہ زار میں آ کر بیٹھنا چاہتے تھے لیکن اب ان مونڈھوں پر ایک نوجوان جوڑا براجمان ہو چکا تھا لہٰذا ہم نے نیچے جا کر استقبالیہ کے سامنے والے باغ میں سنگ مرمر کی اس نشستوں پر اجلاس کیا جہاں ضرور ملکی اور غیر ملکی اہم شخصیتوں نے کسی زمانے میں نزول فرمایا ہوگا۔ اب رات کے کھانے کا وقت ہوا چاہتا تھا اس لیے ہم لوگوں نے کھانے کے کمرے کا رخ کیا۔ کھانے کا کمرا اچھا تھا اور کھانا اپنی مرضی کا منگایا جا سکتا تھا۔ کھانا معمول کے مطابق ہی ہوگا ورنہ اچھا یا برا ہونے کی صورت میں ہمیں ضرور یاد ہوتا۔ کھانے کے بعد ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ یہ ہمارے 8 روزہ سفر کی آخری رات تھی جو ہم نے سفید محل میں مرغزار کے مقام پر گزاری۔ اگلی رات ہمیں گھر واپس پہنچنا تھا۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر ہم کھانے کے کمرے میں پہنچے تاکہ روانہ ہونے سے پہلے ناشتا کیا جا سکے۔ یہاں پر ناشتے میں پراٹھے، انڈے، انگریزی اور فرانسیسی روٹیاں، شاہی ٹکڑے، سموسے اور بہت کچھ سجا ہوا تھا جو ہر شخص اپنی مرضی سے منتخب کر کے کھا سکتا تھا۔ ہمارے بچوں کو ناشتے کا یہ انتظام بہت پسند آیا۔ اس سے پہلے دوران سفر کسی جگہ اس قسم کا اہتمام دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ ناشتے کے بعد سامان گاڑی میں منتقل کیا اور واپسی کی راہ لی۔ سوات سے اسلام آباد کا سفر آدھے دن کا تھا لیکن اب اس سفر میں وہ جوش اور ولولہ باقی نہ رہا تھا۔ اب یہ ایک ناخوشگوار فرض رہ گیا تھا جسے ہم نے بہرحال طے کرنا تھا۔ اب ذہن سے سیر کی کیفیت ختم ہو چکی تھی گھر واپس پہنچنے کی جلدی تھی۔ شام تک ہم بخیریت اپنے منصوبے کے مطابق گھر پہنچ چکے تھے۔ ہماری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو چکی تھی لیکن ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ایک دفعہ دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی خواہش ہے۔ دیکھیے اب ہمارے بچے ہمیں کہاں کی سیر کراتے ہیں یعنی اب کس طرف جانے کی فرمائش کرتے ہیں؟

PakiBooks.Site

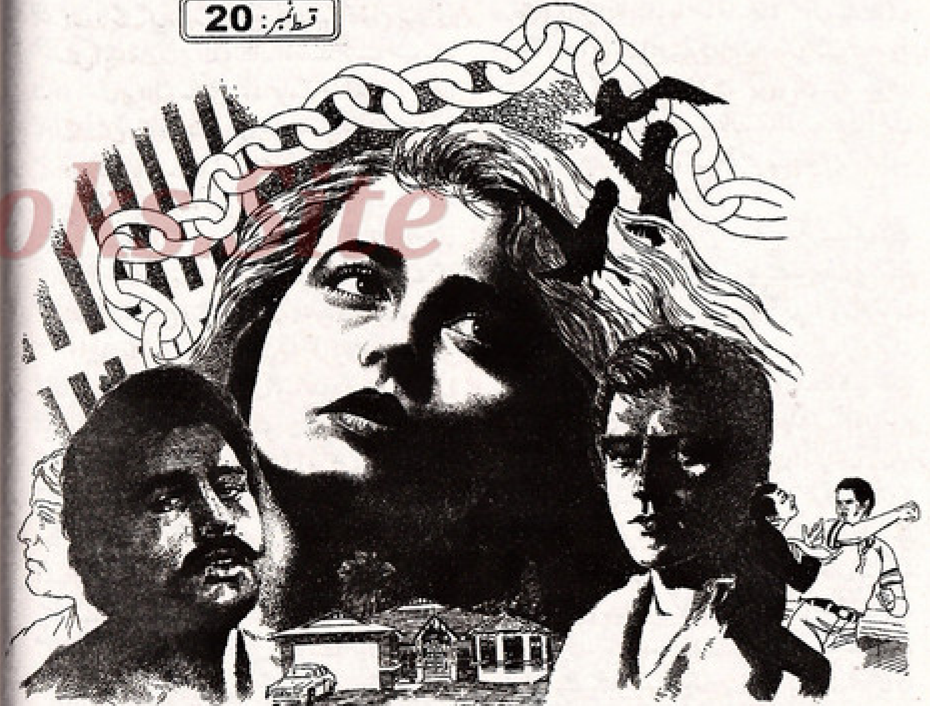
ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

قسط نمبر: 20



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دروازے پر دستک ہوئی، باہر واجد تھا جسے محمود الحسن نے بھیجا تھا مگر میں نے اسے قابل اعتبار نہ سمجھا اور اسے واپس کر دیا پھر رانا بشیر کو فون کر کے بتایا کہ بہرام خان کا میرے یہاں آنے سے کچھ پہلے قتل ہو گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ شاہ میر مجھے تلاش کر رہا ہے۔ میں کیمپ تھری جانے کے لیے ہوٹل سے نکل پڑا۔ وہاں سیکیوٹی والے نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا جہاں تمام افراد میرے جانے پہچانے تھے۔ راکا اور اس کا ساتھی بھی موجود تھا۔

محمود الحسن نے کہا کہ حتمی ہمنٹ کی ادائیگی کے بعد معاہدہ ختم کرنا پڑے گا۔ میں باہر آ گیا۔ اسی وقت ایک کار آ کر رکی اور کہا گیا کہ لقمان صاحب اندر آ جائیں۔ یہ وہی رات والا شخص تھا۔ اس نے کہا کہ محمود الحسن صاحب آپ سے مکمل کرباتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم محمود الحسن کے ہاں پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ ہمیں صرا نفہ کی شہزادی نیلم کی مدد لینی ہوگی کیونکہ انٹرنیشنل گینگ "بلیک ڈیول" سے بن رائد نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ میں ہاشم کے ساتھ شہزادی کے محل سے نکلا تو ہم پر فائرنگ شروع ہوگئی پھر ایک گولی ہاشم کے سر میں لگی اور وہ مجھ پر لڑھک گیا۔

اب آگے پڑھیں

یہی وہ وقت تھا جب دوسرا فائر ہوا...... گولی میرے چہرے کے بالکل قریب سے گزری۔ اس قدر قریب کہ مجھے اس کی سنسناتی ہوئی آتشی لہر اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوئی تھی۔

میں جو ہاشم کو ایک جیتے جاگتے انسان سے پل کے پل لاش میں بدلتے دیکھ کر ایک لمحے کو گنگ سا ہو کر رہ گیا تھا، یہ بھلا بیٹھا کہ ہاشم کو نشانہ بنانے والے کا اگلا ہدف میں بھی ہوسکتا تھا، یہ تو زندگی میری ابھی باقی تھی کہ بال بال موت سے بچا تھا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یک دم جھک گیا اور ساتھ ہی میرا ایک ہاتھ مردہ ہاشم کے لباس کے اندر رینگ گیا، دوسرے ہی لمحے اس کا پستول میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

میرا دل سائیں سائیں کرتا کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے مختل پڑتے حواسوں کو مجتمع کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور نیچے ریت پر رینگ گیا، پھر رکا نہیں۔

دوسری گولی کی "ڈائریکشن" کو بھانپتے ہی میں نے نسبتاً محفوظ سمت کی طرف... کہنیوں اور سینے کے بل پر کسی صحرائی چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا، پاس کی سوکھی جھاڑیوں کی آڑ میں چلا گیا۔ میری سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔

حالات اس نہج تک بھی پہنچ سکتے تھے، اس کی توقع میرے سان و گمان میں بھی نہ تھی۔ ساری حسیات جیسے میرے ایک ہی دھیان میں سمٹ آئی تھیں۔ میرا دل وحشت وجنوں خیزی کے باعث زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

یوں چھوٹی سی اس صحرائی بستی میں، میرے ساتھ خون خرابے کی ابتداء کردی گئی تھی۔ ہاشم نے جو حرکت کی تھی اس کی اسے سزا مل چکی تھی۔ لہٰذا اس پر افسوس کرنا بے کار رہی تھا۔

میرا دل سینے میں اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ہڈیوں کا پنجر توڑ کے ابھی باہر آن گرے گا۔

میرے پاس اس وقت سوچنے کا وقت بالکل نہ تھا۔ میں نے چہار اطراف دھواں اور دھول اڑاتی فضا میں نظریں دوڑائیں اور اس طرف رینگ گیا جدھر سے کار اور دوسری بار داغی جانے والی گولی کی سمت میری نظروں کے سامنے رہے۔

دوسری طرف فائرنگ جاری تھی جبکہ میری تیزی سے گردش کرتی عقابی نظریں گردو پیش کا جائزہ لینے میں مصروف رہیں۔ مجھے ہاشم کے قاتل، بہ الفاظ دیگر ہم پر فائر کھولنے والے کی تلاش تھی۔

تب ہی مجھے ایک بڑے سے جھنڈ میں کوئی حرکت کرتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ قاتل شاید ہماری موت کی تصدیق کرنے کے لیے ہی ہماری کار کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

اپنے مطلوبہ شکار کو بھانپتے ہی یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہوگئی۔ پھر میں بھی سارے خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کی سمت بڑھا۔ لیکن ابھی میں یا وہ کار سے چند قدموں کے ہی فاصلے پر تھے کہ مجھے یک دم ٹھٹک جانا پڑا۔

میں نے اپنے شکار کے عقب میں غبار کے بطن سے تین مسلح افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ پہلے میں انہیں اسی کا ہی ساتھی سمجھا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ان تینوں نے اس پر گنیں سیدھی کرلیں۔ میری سانسیں رک گئیں اور قدم بھی۔

ان تینوں میں سے ایک نے میرے شکار کو للکارا، وہ مڑا۔ اسی وقت ایک نے برسٹ فائر کیا۔ پُرشور فضا میں شکار کی لرزہ دینے والی چیخیں ابھریں۔ وہ تیورا کر ریت پر گرا۔ اسی وقت ان پر کہیں سے فائرنگ ہونے لگیں۔ دو تو موقعے پر ہی گر کر تڑپنے لگے۔ تیسرا جوابی فائر کرتا ہوا تیزی سے ایک نا پختہ گارے مٹی والی دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔

میں نے اس کے تعاقب میں پانچ چھ مسلح افراد کو فائرنگ کرتے ہوئے لپکتے دیکھا۔

دوسری جانب سماعت شکن دھماکوں کی آواز سنائی دیں، یہ دل دہلا دینے والے دھماکے تھے۔ میں خود ایک لمحہ کو لرز کر رہ گیا تھا۔ مجھے یہ باقاعدہ میدان جنگ کا ہی ماحول بنتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت ان آخرالذکر مسلح افراد میں سے دور کے اور ایک نے میرے گرے ہوئے شکار کی جانب پیش قدمی کی جبکہ دوسرے نے کار کی طرف قدم بڑھائے، پھر جانے کیسے اس کی نگاہ اچانک مجھ پر بھی پڑ گئی۔

ہاشم مرحوم کا پستول ہنوز میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور میں جانتا تھا کہ سامنے دکھائی دیے جانے والا شخص میرا دشمن تھا یا...... خیر، دوست تو میرا یہاں کوئی بھی نہ تھا، سوائے بدنصیب ہاشم کے، جو خود ملک عدم کو سدھار چکا تھا، یہ ممکن تھا وہ کوئی مخالف گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

لگتا بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسے یہاں کسی مخالف گروہ نے اچانک دھاوا بول دیا ہو۔

میرا کوئی قصور نہیں ہونا چاہیے تھا، ماسوائے اس کے کہ میں یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے آیا تھا، جو خطرناک ہی ثابت ہوئی تھی۔

''خبردار! رک جاؤ وہیں۔ پستول میرے ہاتھ میں بھی ہے۔'' میں نے فوراً چلا کر اسے وارن کیا۔ میں سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے تھے۔

''اوہو، تم، ہاشم کے دوست! شہزادی صاحبہ کے مہمان؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے عربی لہجے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں سوال کیا اور مجھے کچھ خوشگوار سی حیرت ہوئی، وہ گویا شہزادی نیلم کے خداموں سے تعلق رکھنے والا کوئی مسلح محافظ تھا۔ میں آگے بڑھا، وہ پھر بولا۔ ''مگر تم یہاں کیا کر رہے تھے؟ تم لوگ ابھی تک گئے نہیں؟''

''روانگی کے وقت پر ہی اچانک شور اٹھا اور فائرنگ کی آواز ابھری۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''اور ہم پر بھی فائرنگ کی گئی۔ جس کے نتیجے میں میرا ساتھی ہاشم ہلاک ہو گیا۔''

اسی وقت میرے شکار کا جائزہ لینے والے نے چلا کر اپنے ساتھی سے عربی میں کچھ کہا۔ وہ اسی طرف کو پلٹ گیا۔ غیر ارادتاً میرے قدم بھی اس کی تقلید میں اٹھے، شاید میں بھی لاشعوری طور پر یہ دیکھنا ضروری سمجھتا تھا کہ آخر وہ کس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو ہاشم کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اب میری تلاش میں تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ زندہ بھی تھا یا ختم ہو چکا تھا۔

میں قریب پہنچا تو ان دونوں کو روتا اور واویلا کرتے پایا۔ میں ٹھٹکا۔ آگے بڑھ کر ریت پر بے سدھ پڑے اپنے شکار کا چہرہ دیکھا تو مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔

وہ شہزادی نیلم کے مقرب خاص کارپرداز شیخ عالی جاہ کا چھوٹا بھائی سلطان تھا۔ اس کے بائیں پہلو سے خون بھل بھل نکلنے لگا تھا۔ برسٹ نے اس کے پہلو کو چھید ڈالا تھا اور وہ آخری سانسوں پر ہی پڑا نظر آتا تھا۔

میرا سوچتا ذہن غیر متوقع اور تیزی سے پیش آمدہ حالات اور واقعات کے تناظر میں تانے بانے بننے لگا۔ سلطان دشمنوں کے ٹولے سے لڑنے کی بجائے ہم پر کیوں حملہ کر بیٹھا تھا؟ کیا اس کا اصل ٹارگٹ میں اور ہاشم تھے؟ کیا اسے اس کے بڑے بھائی عالی جاہ نے ہی اسے ہمارے پیچھے لگایا تھا مگر سوئے اتفاق یا پھر طرفہ تقدیر کہ اسی وقت مخالف گروہ کے ہتھے چڑھ کر وہ خود اب بری طرح گھائل پڑا تھا۔

یوں میں نے دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھی تھی، البتہ مصنوعی حیرت کے اظہار میں متاسفانہ بولا۔ ''اوہو...... میرے خدا! ی ی...... یہ سلطان ہیں، شیخ عالی جاہ کے چھوٹے بھائی؟''

''ہاں!'' تخاطب نے زار و قطار روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''اس طرح رونے کا کوئی فائدہ نہیں......'' میں نے کہا۔ ''اسے فوراً اٹھاؤ اور محل میں لے چلو۔''

دھماکوں اور فائرنگ وغیرہ کی شدت میں اب کمی آ گئی تھی۔ ان کے چند مسلح ساتھی اور بھی وہاں آن موجود ہوئے۔ چار افراد ہمارے لیے مقرر کر کے باقی لوگ اپنے ہتھیار سنبھالے لڑنے چلے گئے۔

اثنائے راہ ذہن میں ابھرنے والے ایک برق آسا خیال کے تحت میں نے بے ہوش زخمی سلطان کا گرا ہوا پستول اچک کر اپنی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

تین افراد نے ہاشم کی لاش اور سلطان کے بے سدھ زخمی جسم کو سنبھالا، وہ عورتوں کی طرح روتے بھی جاتے تھے۔ ایک میرے قریب آ گیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا، سو ان کے ہمراہ ہی چل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد لڑائی ختم ہو گئی۔ ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی اور خون آلودہ لاشیں پڑیں ہولناک منظر پیش کرتی تھیں۔ ہم محل میں آ گئے۔

بستی اور قبیلے کے اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب بری طرح غم زدہ بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان میں کئی لوگوں کو غصے اور طیش کے عالم میں نعرے بھی بلند کرتے پایا۔

وہ سب آپس میں عربی میں ہی مخاطب تھے۔ سچی بات تھی کہ میرا دل اب ایسی خوں ریز فضا سے گھبرا رہا تھا اور ایک انجانہ سا خطرہ بھی محسوس کرتا تھا۔

ایک حقیقت اور بھی تھی۔ میں ایسے میں شیخ عالی جاہ سے دوبارہ سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسی کار میں ہاشم کی لاش لے کر واپس پلٹ جاؤں لیکن اب ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

میرے اندر سلطان سے متعلق بڑے پُراندیش خدشات کسی بڑے خطرے کا احساس بھی دلا رہے تھے۔ سلطان ہمیں قتل کیوں کرنا چاہتا تھا؟ کیا اسے اس کے بڑے بھائی عالی جاہ نے ہی ہمیں بہ الفاظ دیگر مجھے ہلاک کرنے کے لیے بھیجا تھا؟ اور اب کیا ہو گا جب وہ اپنے بھائی سلطان کی خون میں غلطاں جسم دیکھے گا اور پھر مجھے بھی......

تاہم مجھے اب کچھ تسلی تو تھی کہ شہزادی اب تک اپنی میٹنگ سے فارغ تو ہو ہی چکی ہو گی۔

یوں اب میں اس کے ساتھ کھل کر بات کر سکتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ شہزادی نیلم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اس سے ان دونوں بھائیوں کے توہین آمیز رویے کی شکایت ضرور کروں گا اور اس بات کا بھی صاف صاف اظہار کر دوں گا کہ ہم پر سوچی سمجھی اسکیم کے تحت قاتلانہ حملہ کروایا گیا تھا جس کے نتیجے میں میرا ساتھی ہاشم ہلاک ہوا۔

گھائل پڑے سلطان کو چند جبہ پوش افراد جو مجھے اپنی وضع و قطع سے حکیم ہی نظر آتے تھے، انہوں نے سلطان کے زخم کا معائنہ شروع کر دیا تھا پھر اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلے گئے، ان کے ہمراہ کچھ اور افراد بھی تھے۔

میں نے دیکھا محل میں خاصی ہلچل مچی تھی۔ چند لوگ مجھے دیکھ کر مجمع سے ہٹانے لگے۔ ایک دو نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے محل کے دوسرے گوشے کی طرف کھینچ کر لے جانے لگے۔

مجھے ان عرب بدوؤں کی یہ حرکت انتہائی نازیبا لگی اور میں نے غصے سے اپنے دانت پیس کر اپنا بازو ایک زوردار جھٹکے سے چھڑا لیا۔ وہ دونوں پرے کھسکے، لیکن ایک نے میری اس حرکت پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے میری جانب مکا تانے لپکا تو میں نے بھی اپنا گھونسا تان لیا اور وہ جیسے ہی میرے قریب آیا اس کی تھوڑی پر رسید کر دیا۔

اس کے دیگر ساتھی جارحانہ انداز میں میری جانب لپکے تھے اور اسی دوران میں میری نگاہ ایک گینڈے جیسے گٹھے ہوئے جسم والے شخص پر پڑی، وہ ایک طرف کھڑا انہی کو اپنا ایک ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ اشارے کرنے میں مصروف تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ ان کو ترغیب دے رہا تھا۔

میرا مکا کھا کر گرنے والے آدمی نے دوبارہ میرے قریب آنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ البتہ اس کے دوسرے ساتھی میری جانب حملہ کرنے کو لپکے ضرور تھے۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ جیسے مجھے وہاں سے جلد از جلد ہٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن کیوں؟

میری جانب جارحانہ انداز میں لپکنے والوں کو وہاں موجود دیگر لوگوں نے روک لیا۔ میں نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کر دیا۔ ''مجھے شہزادی صاحبہ سے ملواؤ، میں ان کا مہمان بن کر آیا تھا۔ لیکن مجھے ایک سازش کے تحت ان سے نہیں ملنے دیا گیا۔ ہم پر ظلم کیا گیا ہے۔'' جوش شدت سے میری آواز پھٹنے لگی۔

کئی لوگوں کو میں نے حیران ہوتے دیکھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہاں موجود کتنے لوگوں نے میری بات سمجھی ہو گی، تاہم جتنوں نے بھی سمجھی، انہیں میں نے چونکتے ضرور پایا تھا۔

اسی وقت میں نے مجمع میں شیخ عالی جاہ کو بھی دیکھ لیا۔ وہ غصے اور غیظ میں بپھرا ہوا تھا اور اول الذکر آدمی کو آنکھوں کے اشارے بھی کر رہا تھا، میں قیاس کر سکتا تھا کہ وہ اسے میرے بارے میں ہی ہدایت دے رہا تھا، پھر وہ اسی کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں اس کے زخمی بھائی کو غالباً طبی امداد کے ہی سلسلے میں لے جایا گیا تھا۔

ٹھیک یہی وقت تھا جب میری منتظر آنکھوں کے سامنے کوئی تجلی بھڑکی، جس نے ایک لمحہ کے لیے جیسے میری آنکھوں کو ہی خیرہ کر ڈالا۔

حسن کیا ہے، خوبصورتی کا معیار کہاں سے پرکھا جاتا ہے۔ کسی ایسی شے کو دیکھ کر دل کی دھڑکنیں ایک دم کیوں تیز ہو جاتی ہیں کہ ان کی دھمک گہرائی تک سنی جاتی ہے۔ حسن و جمال اور محسوسات کے کچھ ایسے انجانے لنک بھی ہوتے ہیں، جنہیں ہم کوئی نام دینے سے قاصر ہی رہتے ہیں۔ جمالیاتی حس ہر کسی کے اندر موجود ہوتی ہے۔ کہیں تو بس ''موجود'' ہی رہتی ہے اور کہیں ابل پڑتی ہے۔ مجھے بھی

PakiBooks.Site

اپنے بارے میں نہیں پتا تھا کہ میں بھی اپنی فطرت میں کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی حوالے سے نگاہِ جمال رکھتا تھا۔

وہ ایک ماہ پارہ ہی تو تھی، جس کے رخِ روشن پر ہزاروں چاندنیاں دمکتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ایک ایسا ہی شاہکار حسن تھی کہ جسے دیکھتے ہی انسان کا شاعر بننے کو جی چاہنے لگتا تھا، آپوں آپ اس کے حسن کی تعریف میں زمین وآسماں کے قلابے ملانے لگتا تھا۔

سروقد، شہد رنگ گھنے دراز گیسو، کتابی چہرہ، صراحی دار گردن، ستواں ناک، نرم وملائم جلد اور رنگت ایسی کہ جیسے دودھ میں گلاب کی سرخ پتیاں گھول دی گئی ہوں، آنکھیں، اف، وہ تو جیسے اس کے حسن کا سنگھاسن تھیں، جس پر وہ براجمان تھی۔ کشادہ اور قدرتی کاجل لیے ہوئے تھیں۔ وہ آنکھیں، کسی نخلستان کی جھیل جیسی اسرار بھری گہرائی لیے ہوئے تھیں اور ان میں ڈوب جانے کو جی کرتا ہو۔

قدرت نے اسے حسن کے ساتھ شباب بھی ایسا عطا کیا تھا کہ اس کے پیچ وخم کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے کو جی چاہے۔ اس کی آن بان میں غرور نہیں تھا، بلکہ ایک وقار تھا۔ دل کہہ اٹھتا تھا کہ اس میں کیا شک تھا کہ یہی شہزادی نیلم ہو سکتی تھی اور کوئی نہیں۔ غرضیکہ وہ واقعی شہزادی تھی۔ اس کے چہرے پر مہین سا سفید نقاب تھا مگر وہ نقاب ایسا ہی تھا جو اس کی ستواں ناک اور اس کے نازک اندام سے تراشیدہ نرم لبوں کی جھلک ضرور دکھاتا تھا۔

فوزیہ اور شہزادی نیلم کا موازنہ کرایا جاتا تو، فوزیہ صرف محبت تھی اور محبت کا اپنا حسن ہوتا ہے، گوکم حسین وہ بھی نہ تھی۔ ملکوتی حسن کی وہ بھی مالک تھی۔ فرق یہ تھا کہ فوزیہ کا حسن ایک دھیمی دھیمی آنچ تھی، جس میں کندن بن کر مضبوطی عطا ہوتی تھی۔ جبکہ شہزادی نیلم ایک تیکھے اور آتشی حسن و جمال کی حامل تھی، جو جلا کر رکھ دیتا ہو۔ شاید فوزیہ کی محبت نے مجھے خوامخواہ ہی رومان پرور بنا ڈالا تھا یا پھر یہ زندگی کے وہ تجربات تھے جن سے میں پہلی بار دوچار ہوا تھا اور میرے اندر چھپی ہوئی بہت سی ایسی جبلتیں نمو پانے لگی تھیں جو اب تک دبی رہی تھیں۔

شہزادی نیلم کو دیکھتے ہی وہاں موجود لوگ تعظیماً جھک گئے تھے۔ سنگی دیواروں اور بلند چھت والے اس ہال میں ایکا ایکی ایک احترام آمیز سی خاموشی چھا گئی تھی۔

موجود منتشر سے لوگوں نے ایک دم وہاں ایک قطار سی بنالی۔ مجھے نظر کچھ ایسا ہی آتا تھا کہ شہزادی نیلم کی بہ نفسِ نفیس خود وہاں آمد غیر متوقع تھی۔ وہ اس وقت سفید براق لبادے میں تھی۔ اس کھلے ڈلے لبادے میں بھی اس کا شباب اپنے مخصوص ابھاروں کی جھلک دیتا محسوس ہوتا تھا۔

اس نے ایک نگاہ مجمع پر ڈالی اور جب بولی تو اس کی دلکش ومترنم آواز کے جادو کا بھی مجھے معترف ہونا پڑا۔

وہ عربی میں کچھ کہہ رہی تھی۔ لوگ اسے اپنے طور پر جواب بھی دے رہے تھے۔ شہزادی نیلم کا لہجہ مجھے بیک وقت دھیما بھی محسوس ہوا اور گرمی دیتا ہوا بھی۔ آواز اور بولنے کے ڈھنگ سے وہ ایک سلجھے ہوئے اطوار کی ذہین اور پڑھی لکھی محسوس ہوتی تھی۔ یہی کچھ اس کی آنکھوں، چہرے اور انداز واطوار سے بھی جھلکتا نظر آتا تھا۔

جلد ہی پتا چل گیا کہ صرافقہ پر خدی والوں نے نہیں بلکہ..... ایک خطرناک گروہ صحرائی لٹیروں نے حملہ کیا تھا۔ وہ لوٹ مار کرنے آئے تھے، لیکن زیادہ تر یہی کہا جا رہا تھا کہ یہ شرارت خدی والوں کے سواء اور کسی کی نہیں ہو سکتی جو ایک عرصے سے صرافقہ پر غاصبانہ نظریں رکھے ہوئے ہیں۔

بہرکیف ان کے معاملات یہ جانیں، میں یہاں سے فی الفور نکلنے کی فکر میں تھا۔

اچانک ہی اس کے ایک عربی جملے پر وہ چند افراد اپنی گردنیں موڑے میری جانب دیکھنے لگے، جنہیں میں اپنا کسی حد تک خیر خواہ سمجھے ہوئے تھا۔

ان میں سے ایک نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

میں دھڑکتے دل سے ان لوگوں کی قطار کے درمیان میں چلتا ہوا شہزادی نیلم کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

خیر خواہ ٹولے کے ایک شخص نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے شہزادی سے عربی میں کچھ کہا۔ میں عربی سے بالکل ہی کورا تو نہ تھا لیکن بہرحال عربی میں روزمرہ کی عام گفتگو میرے بس سے باہر ہی تھی۔

شہزادی کو حیرت ہوئی اور پھر اس سے زیادہ مجھے ہوئی جب وہ مجھ سے نہایت شستہ اردو میں مخاطب ہوئی۔ ”اپنے بارے میں بتاؤ نوجوان!“

موقع پاتے ہی میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے ابتداء سے آخر تک ساری باتیں بتا دیں۔ اس درمیان میں مخالف ٹولے کے کسی آدمی نے مداخلت کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر شہزادی نے اسے بری طرح جھڑک کر خاموش کرا دیا۔

میں نے دیکھا کہ میری روئیداد سننے کے بعد شہزادی نیلم کے چہرے پر کچھ ایسے آثار ابھر آئے تھے جیسے وہ اپنے اندر کے جذبات اور ابال کو بہ مشکل ضبط کیے ہوئے ہو۔

پھر اس نے فوراً کسی سے تحکمانہ لہجے میں کچھ کہا اور واپس اس راہداری کی جانب مڑ گئی جہاں سے وہ اچانک نمودار ہوئی تھی۔

دو افراد مجھے انتہائی احترام کے ساتھ ایک کمرے میں لے آئے۔ یہ آرام دہ کمرا تھا۔ ایک نے مجھ سے نہایت مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”جناب! رات بہت ہو چکی ہے۔ آپ آرام کریں۔ صبح شہزادی صاحبہ آپ سے بات کریں گی۔“

میں نے وہ رات گزاری، اگلے دن مجھے شہزادی نیلم کے روبرو پیش کیا گیا۔

مجھے حیرت تھی کہ اس کمرے میں اس کے اور میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ہاں البتہ ایک خادمہ کچھ دیر پہلے وہاں موجود تھی لیکن میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی شہزادی نیلم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چلے جانے کا کہہ دیا تھا۔

وہ نشست گاہ کے طور پر استعمال ہونے والا ایک آرام دہ اور کشادہ کمرا تھا۔

فرش پر دیدہ زیب قالین بچھا ہوا تھا۔ سیٹی اسٹائل کی نشستیں اور میز دھری تھیں۔ فرنیچر عام سی لکڑی کا سہی لیکن اس میں بڑی نفاست اور دلکشی پائی جاتی تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

نقاب کے افق سے شہزادی نیلم کی کھنچی کمانوں جیسی گہری سرمگیں آنکھیں بہ غور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تب اس نے بدستور میری طرف اسی طرح ہی دیکھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ نقاب کی طرف بڑھایا تو یونہی میری نظریں اس کے مرمریں ہاتھ کی مخروطی انگلیوں پر جم گئیں۔

میرا دل جانے کیوں اس وقت بے طرح دھڑک رہا تھا۔

شہزادی نیلم نے نقاب ہٹا لیا تھا اور میں جیسے اس کے تراشیدہ ہونٹوں اور نیم کھلے دہن کے سحر میں کھو گیا۔ موتیوں کی لڑیوں میں پروئے ہوئے سفید دانتوں کی ہموار قطار کی ایک ذرا جھلک اُبھری۔ اس کے لبوں کے قدرتی گلابی پن میں مجھے چمک سی گھلی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا تروتازہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ چہرے سے گردن تک اس کی جلد صاف، ملائم اور نرم سی محسوس ہوتی تھی۔

وہ شاید میری محویت کو دیکھ کر ہولے سے مسکرائی تھی۔ بھیدوں بھری آنکھوں نے کچھ کہا تھا۔ اس کے شفق گالوں کے گلاب لمحہ بھر کو کھلے تھے۔ ایک گڑھا سا ان میں پڑا اور وہ جیسے ہلکی آواز میں مخاطب ہوئی۔ ”مسٹر نعمان! ہمیں افسوس ہے آپ ہمارے معزز مہمان ہی نہیں بلکہ ہمارے محسن بھی ہیں، لیکن آپ کے ساتھ جو کچھ یہاں ہوا ہم اس پر بے حد شرمندہ ہیں۔ بخدا! یہ سب ہماری لاعلمی میں ہوا۔“

اس کا مرتبہ اور رعبِ حسن اپنی جگہ لیکن میں باوصف ان سب باتوں کے جیسے ایک پل میں اس کے ٹرانس سے نکل آیا اور نہ چاہتے ہوئے میرے الفاظ میں تلخی اور لہجے میں طنز عود کر آیا، بولا۔ ”شہزادی صاحبہ! کسی غیر شناسا ماحول کی اور بات ہوتی ہے لیکن مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرے اور میرے ساتھی ہاشم کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک ایسی فضا میں ہوا جو دوستانہ تھی۔ میں یہاں کے لوگوں کے لیے نیا سہی لیکن محمود الحسن کا حوالہ، اس کا آپ کے نام خط اور بدنصیب ہاشم، بہرحال یہ سب آپ کے خدامون کے لیے نیا ہرگز نہ تھا۔ لیکن وہ ہم سے یوں پیش آ رہے تھے جیسے ہماری کوئی پرانی دشمنی ہو۔“

میں نے کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہی چھوڑی۔ وہ برہم ہونے یا کسی قسم کے طیش میں آنے کی بجائے مزید خجل اور شرمندہ سی دکھائی دینے لگی۔ اس نے اپنی نگاہیں اسی احساس تلے جھکا بھی لی تھیں جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی ہو کہ ”میں تمہارے سامنے ہوں، تمہاری مجرم...... لو، جو چاہے سزا دو، قسم کھاتی ہوں، اف تک نہیں کروں گی۔“

اسے اس قدر خجل اور خفیف سا ہوتے دیکھ کر میں نے لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد دوبارہ ذرا متحمل سے لہجے میں کہا۔ ”افسوس تو مجھے اس بات کا بھی ہے کہ ہمیں جس اہم مقصد کے لیے یہاں بھیجا گیا وہ اس غیر متعلقہ اور ایک فضول چکر میں الجھا دیا گیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں محمود الحسن کو کیا جواب دوں گا؟ یا وہ مجھے کیا جواب دے سکتا ہے؟ کہ اس نے جس اعتماد کے ساتھ مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا۔ وہ تو اس کے سان وگمان میں نہ ہوگا کہ یہ سب اس کے ساتھی کے ساتھ ساتھ میری موت کا ساماں بھی بن سکتا ہے، لیکن اس معاملے کی تحقیق اگر انصاف، غیر جانبداری اور اصولوں کے مطابق ہو تو کافی حد تک اس کی

تلافی ممکن ہوسکتی ہے۔ کچھ بار دل بھی ہلکا ہوسکتا ہے۔‘‘

’’اس کی تم بالکل فکر نہ کرو مسٹر نعمان!‘‘ وہ ایک دم جیسے جوش میں بولی۔ میری بات نے اس کے سینے میں دبے ہوئے جوشِ غیظ کو شاید ہوا دے ڈالی تھی۔ ’’تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا لیکن دیکھا جائے تو اس معاملے میں ہمارا آدمی بھی مرتے مرتے بچا ہے۔‘‘

اس کی بات مجھے ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ اس طرح کہہ کر شاید اس مقدمے کو ہلکا کرنا چاہتی تھی، لحاظ میں بھی نہیں کرتا تھا، جو بات سیدھی اور سچی ہوتی تھی بغیر کسی دباؤ کے بولا۔

’’معاف کیجیے گا شہزادی حضور! آپ کے آدمی سلطان کا معاملہ کچھ اور تھا، اسے صحرائی لٹیروں نے میرے سامنے گولیاں ماری تھیں اور اس کے گواہ بھی آپ ہی کے آدمی ہیں۔‘‘ ایک ذرا توقف کے بعد میں دانستہ خود کلامیہ انداز میں کہا۔ ’’خدا کرے وہ زندہ بچ جائیں ورنہ میرے آدمی ہاشم کا خون ضائع چلا جائے گا۔‘‘

میرے جواب پر پہلی دفعہ شہزادی نیلم کی بے داغ پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئیں اور ہونٹوں پہ طنزیہ سی تلخی ابھری پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ’’اس طرح تو تمہارا آدمی بھی انہی حالات کا شکار رہا تھا۔ اسے بھی تو صحرائی لٹیروں نے ہلاک کیا ہوگا اور یہ تم نے ابھی کہا کہ خدا کرے سلطان کی جان بچ جائے ورنہ ہاشم کا خون رائیگاں چلا جائے گا۔ اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟‘‘

’’بہت آسانی سے اور ٹھوس شواہد کے ساتھ۔‘‘ میں نے ایک دم مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ’’وقت اور انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ اس معاملے کو ہاشم کی لاش دفنانے سے پہلے فوری طور پر نمٹایا جائے۔‘‘

’’تم کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘ شہزادی نیلم نے اپنی کجراری آنکھوں کو سکیڑ کر بہ غور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

’’فقط اتنا کہ شیخ عالی جاہ اور ان کے چھوٹے بھائی سلطان نے میری آمد کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا پھر جب ہاشم نے یہ بتایا کہ محمود الحسن نے مجھے اس کے ہمراہ صرائفہ والوں کی مدد کے لیے خصوصی طور پر بھیجا ہے تو وہ میرا تمسخر اڑانے لگے۔ مجھے بھی غصہ آگیا تھا لیکن میں نے پھر بھی تحمل سے کام لیا اور برا مناتے ہوئے یہاں سے اسی وقت واپسی کے لیے روانہ ہوگیا پھر جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔‘‘

’’مجھے اس بات کا واقعی افسوس ہے انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، کچھ بھی سہی تم آخر کو ہمارے معزز مہمان کی حیثیت رکھتے تھے۔‘‘ شہزادی نیلم ایک بار پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ’’لیکن...... میرا نہیں خیال کہ عالی جاہ اور سلطان اتنی سی بات کے لیے......‘‘

’’یہ تو اب تحقیق سے ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ میری باتوں میں کتنی سچائی ہے، شہزادی صاحبہ! اس میں بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔‘‘ میں نے ٹھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔ ’’معاملہ اگر قتل کا نہیں ہوتا تو اور بات تھی۔‘‘

’’ٹھہرو...... میں خط منگوا کر پڑھتی ہوں۔ میں نے تو ابھی وہ ایک نظر دیکھا تک نہیں ہے۔‘‘ اس نے کہا اور آواز دے کر خادمہ کو بلایا اور اس سے کچھ کہا، وہ سر جھکائے واپس چلی گئی، ذرا دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں وہی خط تھا جو محمود الحسن نے ہاشم کے حوالے کیا تھا جو اس نے شہزادی نیلم کو دینا تھا۔

وہ خط کھول کر پڑھنے لگی، میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز رہیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات متغیر ہونے لگے، جب وہ خط پورا پڑھ چکی تو ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں اور چہرے سے حیرت اور ایک عجیب طرح کی مسرت چھلکنے لگی۔ اس کے باہم پیوستہ لبوں میں ارتعاش تھرکا، وہ جیسے مجھ سے بے اختیاری میں کچھ کہہ ڈالنا چاہتی ہو مگر ہمت نہ کر پا رہی ہو، وہ بہت متاثر دکھائی دے رہی تھی۔ ان تاثرات میں خوشی کے علاوہ ممنون بھرے جذبات بھی تھے۔

میں بھی خاموشی سے اس کی حسین و دلکش آنکھوں میں تکتا رہا۔ وہ ایسے مجھے دیکھتی ہوئی اچھی لگ رہی تھی پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

’’نعمان صاحب! مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ آپ تو میرے اصل مشن کے سرخیل میں سے ایک ہیں۔ آپ تو میرے قریبی ساتھیوں سے بھی بڑھ کر حیثیت رکھتے ہیں میرے لیے۔ بخدا! صرائفہ کے لیے آپ نے اپنی جان کی پروا نہیں کی اور اس کالے شیطان کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے آپ نے اپنے سر سے کفن تک باندھ لیا۔ پاکستان میں اپنے پیاروں کو چھوڑ کر اس نیک مقصد کے لیے یہاں دیارِ غیر کی خاک چھاننے کے لیے آ گئے۔‘‘ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولی۔

’’آپ نے بہادری، ہمت اور دلیری کی ایک داستان رقم کر ڈالی ہے اور...... اور...... یہاں آپ کے ساتھ میرے ہی ساتھیوں نے کیسا سلوک کیا...... میں تو بہت شرمندہ ہوں آپ سے مسٹر نعمان! لیکن میرا یہ وعدہ ہے کہ میں آپ سے ہونے والی اس زیادتی کا بدلہ ضرور لوں گی۔‘‘

وہ متاثر کن لہجے میں بولے چلی گئی اور میں اس کی طرف تکتا رہا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے میرے لیے زبردست خراجِ تحسین جھلکتا تھا۔ میں نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔

’’شہزادی صاحبہ! میں آپ کے دلی جذبات کی قدر کرتا ہوں جن کا اظہار آپ نے میرے بارے میں کیا۔ میری ایک کوشش ہے کہ شاید میں انسانیت کے ناطے کسی کے کام آسکوں، لیکن ایک حقیقت...... یہ بھی ہے کہ میرے کچھ جانی دشمن بھی میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ میں نے انہیں بھی کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔‘‘

’’آفرین ہے آپ پر نعمان صاحب!‘‘ وہ ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے جوش بھرے تاثر سے بولی۔ ’’مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ مجھے آپ جیسے ہی سچے ساتھی کی ضرورت تھی۔‘‘

یہ آخری لفظ اس کے لبوں سے اسی جوشِ تاثر کے سبب بے اختیار برآمد ہوا تھا۔ میں نے تو کچھ ایسا زیادہ محسوس نہیں کیا مگر شہزادی نیلم اپنے اس آخری الفاظ کی معنویت کو فوراً ہی بھانپ گئی اور اس کے چہرے پر سرخی کی ایک ذرا لکیر ضرور ابھری تھی وہ اسے رفع کرنے کی غرض سے جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی۔

’’ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کوئی تشویش و فکر نہ کریں۔ ہاشم اور عالی جاہ والا معاملہ میں آج ہی جرگے کے معززین سے مشاورت کرتی ہوں، اُمید ہے کہ یہ مقدمہ آج ہی نمٹ جائے گا۔‘‘

بعد کا وقت بڑی تیزی سے بیتا۔ شہزادی نیلم نے اس مقدمے کے سلسلے میں جرگے کے معززین سے مشاورت کی اس کے بعد پوری بستی میں جرگہ منعقد ہونے کی منادی کرا دی گئی۔

اس درمیان میں...... زخمی سلطان کی خیر خبر لی گئی، اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اس کا پستول میرے پاس محفوظ تھا۔ مناوا اور والی کی پولیس ان قبائلی لوگوں کے معاملات میں کم ہی ٹانگ اڑانا پسند کرتی تھی۔ زیادہ تر یہ لوگ اپنے اندرونی معاملات خود ہی حل کرتے تھے۔

ہاشم والا معاملہ بھی اسی طرح ہی حل کیا گیا۔ صبح سے ظہر اور پھر عصر تک تحقیق و بحث کا سلسلہ چلتا رہا۔ شہزادی نے اپنے محل کے باہر ہی عدالت قائم کر دی تھی۔

بستی کے وید اور جراح نے ہاشم کے جسم سے جو گولی برآمد کی تھی اس کی تصدیق سلطان کے اس پستول کے کلیبر سے کر لی گئی تھی کہ وہ اسی پستول سے چلائی گئی تھی یہی نہیں، وقوعے والی جگہ سے دوسری گولی کا شیل بھی تلاش کر لیا گیا۔ یہ گولی مجھ پر فائر کی گئی تھی۔

میں نے جب سلطان کا پستول جرگے کے معززین کے سامنے رکھا تو مجمع کے شرکا حیرت زدہ رہ گئے۔ بالخصوص عالی جاہ اور اس کا ٹولہ تو بغلیں جھانکنے لگ گیا تھا۔ میری ذہانت اور بروقت اقدام کی انہیں کہاں اُمید تھی۔

ثابت ہوگیا تھا کہ سلطان ہم دونوں مہمانوں کو ہی ہلاک کرنے کی نیت سے ہمارے پیچھے آیا تھا۔ وہ صحرائی لٹیروں کے حملے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

سب سے آخر میں بات یہاں تمام ہوئی کہ آخر عالی جاہ اور سلطان کو مجھ سے ایسی کیا دشمنی تھی تو تب میں نے اصل بات جرگے کے سامنے بیان کر دی۔

یہ وہی بات تھی جس کی ابتداء طیارے میں ایک جھگڑے سے ہوئی تھی اور ان دونوں بھائیوں نے اپنی بے عزتی اور خفت کا بدلہ لینے کی مجھے دھمکی دی تھی۔

عالی جاہ نے اپنے بھائی کے حق میں دلائل کا اظہار کرنے والوں سے کچھ کہا، مگر انہوں نے بھی اب نفی میں یوں سر ہلا دیا جیسے اب وہ اس کی صفائی میں کچھ بولنے سے قاصر ہو چکے ہوں۔

مغرب تک یہ مقدمہ نمٹا دیا گیا۔ محمود الحسن سے بھی ٹیلی فونک رابطہ کر کے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور اس نے بھی یہی کہا تھا کہ مرحوم ہاشم کا دنیا میں اس کے سواء اور کوئی نہ تھا اسی لیے اس کی لاش وہیں صرائفہ میں دفنا دی جائے۔

چنانچہ یہی کیا گیا۔ تاہم اس نے بھی مغرب تک صرائفہ پہنچنے کا وعدہ کیا تھا اور جرگے کی آخری کارروائی تک وہ بھی پہنچ چکا تھا، مجھ سے تو بہت ہی شرمندہ نظر آ رہا تھا اور پشیمان بھی تھا۔

بہرکیف ...... سلطان کو سزائے موت سنا دی گئی

PakiBooks.Site

تھی۔ اسے محل کے بندی خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ عالی جاہ کو سخت سرزنش کی گئی اور اسے محل وغیرہ کے ہر طرح کے معاملات سے الگ کردیا گیا تھا۔ اسے ایک ادنیٰ سا چوب دار بنادیا گیا تھا اور وہاں سے اس کے ہلنے پر بھی سخت پابندی عائد کردی گئی تھی۔ تاہم اس نے صرائفہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کی جرگے سے درخواست کردی تھی۔ جس کا فیصلہ اس کے بھائی کو علی الصباح پھانسی دینے کے بعد تک کے لیے محفوظ کردیا گیا تھا۔

فردِ جرم ثابت ہوتے ہی سلطان نے اس جرم کا اعتراف کرلیا تھا کہ وہ ہاشم کی بجائے مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن نشانہ چوکنے کی وجہ سے گولی میرے بجائے ہاشم کے لگی۔

مجھ سے دشمنی کی اس نے وجہ یہی بتائی تھی کہ طیارے میں میں نے ان کی سبکی کی تھی، تاہم میں نے اس کا پس منظر جرگے کو بتا دیا تھا کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ نیز ہاتھا پائی کی ابتداء ان دونوں بھائیوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ اگر سلطان تمام شواہد اور ٹھوس ثبوتوں کے باوصف اپنا جرم نہیں قبولتا تو اسے دن میں تپتی ریت پر اونٹ کے ساتھ باندھ کر برہنہ گھمایا جاتا اگر وہ تب بھی جرم نہیں قبولتا تو اسے بے قصور سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا مگر یہ مقامی لوگ ہی جانتے تھے کہ تپتی ریت پر برہنہ جسم کے ساتھ ایک اونٹ سے باندھ کر شام تک گھسیٹنے کا کیا عذاب ہوتا تھا۔ بہت کم لوگ ہی زندہ بچتے تھے، ہر قبیلے کی اپنی روایات تھیں۔

عالی جاہ اور سلطان دونوں بھائیوں کا شمار شہزادی نیلم کے خاص الخاص خداموں میں ہوتا تھا بلکہ وہ دونوں مصاحبین خواتین کے سربراہ کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

اب ان دونوں میں سے ایک کو قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا اور دوسرے کو ایک طرح سے نہایت ادنیٰ درجے کی چوکیداری سونپ دی گئی تھی۔

سلطان کا جرم بے حد سنگین تھا۔ اسے صبح فجر کے وقت صرائفہ کے بیچ چوراہے پر پھانسی دی جانے والی تھی۔ یہ فیصلہ جرگے کے سرپنچ نے کیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ عالی جاہ...... اس فیصلے کے خلاف بغاوت پر اتر آئے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ شہزادی بھی اس جرگے کی کارروائی میں موجود تھی۔ میں اس کے چہرے سے ایک طرف برہمی اور دوسرے رخ پر دکھ سا محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

جرگے کے آخری فیصلے پر اپنی شاہی مہر ثبت کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے محل کے اندرونی گوشے میں چلی گئی تھی۔ البتہ اس سے تھوڑی دیر پہلے ہی شہزادی نیلم نے بستی والوں اور جرگے کے شرکاء سے مختصراً خطاب کرتے ہوئے انہیں یہ بتایا تھا کہ میں ان کا خیر خواہ تھا اور ان کی بستی جو کہ عنقریب تیل کی دولت سے مالا مال ہونے والی تھی مگر بعض حاسدین اور غاصبین اس بے مثال متوقع ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہوئے تھے، ہمیں مل کر ان کا مقابلہ بھی کرنا ہے کیونکہ ہمارا (میرا) دشمن مشترکہ ہے۔ وغیرہ، لیکن افسوس اس بات کا ہوا کہ ایک چھوٹے سے جھگڑے نے دوست دشمن کی تمیز کھو دی مگر... خدا کا شکر ہے کہ ہم سرخرو ہیں۔ ہم نے انصاف کیا ہے اور ہمارے خیر خواہ ہمارے غیر جانبدارانہ اقدام سے خوش اور مطمئن ہیں۔ وغیرہ۔

اس فوری انصاف کے حصول اور غیر جانبدارانہ عمل نے مجھے ششدر سا کرکے رکھ دیا تھا۔ جبکہ میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ اس مقدمے کی کارروائی کو نمٹانے میں کم سے کم ہفتہ دس دن لگ سکتا تھا۔

ایک وجہ اس کی میں یہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ شہزادی نے ذاتی طور پر اور میری خاطر ہی یہ کارروائی ترنت نمٹانے کے احکامات دے رکھے ہوں۔

دوسری اہم وجہ صرائفہ کے خارجی اور داخلی مسائل بھی تھے جن کے حل کے لیے گلفو آئل کمپنی کے ''دوست گروپ'' نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔

لیکن میرے یہ سب قیافے اور اندازے اس وقت بالکل ہی غلط ثابت ہوئے تھے جب وہاں رہتے ہوئے میرے علم میں یہ بات آئی کہ یہاں صرف صرائفہ میں ہی نہیں بلکہ دیگر صحرائی قبائلی بستیوں میں بھی ایسا ہی کچھ رائج تھا۔ کوئی جھگڑا ہو تنازعہ ہو اسی طرح جلد از جلد نمٹا دیا جاتا تھا۔ بعض تو چند گھنٹوں میں ہی نمٹا دیے جاتے تھے، جیسا کہ میرے مقدمے میں ہوا تھا۔

میں نے شہزادی نیلم کے چہرے سے محسوس کیا تھا کہ وہ بے حد دکھی ہو رہی تھی۔ مجھے بھی دل میں گھونسا لگا تھا کہ کہیں میں نے اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں اسے جلدی فیصلہ سنانے پر مائل کر نہیں ڈالا تھا؟ کیا اس طرح انصاف کے تمام تقاضے پورے ہوئے تھے؟ حقیقت تو یہی نظر آتی تھی، تو پھر شہزادی نیلم کیوں اداس تھی؟

خیر خواہ ٹولے کے ایک باریش عمر رسیدہ شخص ابوشاہ نے مجھے بتایا۔

''نوجوان! پوری بستی شہزادی صاحبہ کے اس انصاف پر اش اش کر اٹھی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شہزادی صاحبہ نے اپنے مصاحب خاص کو اتنی بڑی سزاؤں کا مستوجب ٹھہرایا تھا۔''

باریش ابوشاہ نے اتنا بتاتے ہوئے اپنی مٹھ بھر سے ذرا نیچے سینے تک جھولتی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

ہم دونوں اس وقت محل کے بیرونی احاطے میں ایک پھونس کے چھپر تلے کھڑے تھے۔ دائیں جانب دیو ہیکل چوبی دروازہ تھا اور وہاں سے لوگ باہر نکل چکے تھے۔

بائیں جانب کچھ حجرے نما کمروں کی قطاریں اور ان کی قدیم طرزِ تعمیر کی بنی ہوئی ڈیوڑھیاں نظر آتی تھیں، وہاں شمعیں روشن کردی گئی تھیں۔ محمود الحسن اندر جا چکا تھا۔ وہ مجھ سے ملا تھا اور باتیں بھی کرتا رہا تھا۔ میرا دل و دماغ نجانے کیوں بوجھل سا ہو رہا تھا۔

وہ مجھے بھی اندر لے جانا چاہتا تھا لیکن میں کچھ سوچ رہا تھا۔ کوئی ایسی بات جس سے بستی کو اس اضافی تناؤ سے نجات مل جائے، پتا نہیں پھر بستی کو یا شہزادی نیلم کی خاطر میں یہ سب سوچ رہا تھا۔ اس کے لیے مجھے جس تجربہ کار شخص کی وہاں تلاش تھی وہ مجھے بالآخر نظر آہی گیا تھا۔

اس وقت فضا رکی رکی محسوس ہوتی تھی۔ ٹھنڈ جیسے معلق ہو چکی تھی۔ صحرا میں رات نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ آسمان صاف اور تاروں بھرا نظر آتا تھا۔ دور کہیں کسی اونٹ کے گلے میں بندھی ہوئی صدائے جرس نے اداس سے ماحول پر طاری آسیبی خاموشی کو لمحہ بھر کے لیے مجروح کیا اور پھر وہی عجیب سا تاثر دیتا ہوا ریگزار کا سناٹا۔

''نوجوان!'' وہ ضعیف آدمی چند ثانیے کے توقف کے بعد دوبارہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''صرائفہ کی بستی کے لوگ ہی نہیں بلکہ اس سے باہر بھی حلیف اور دشمنوں کو معلوم ہے کہ عالی جاہ اور سلطان شہزادی نیلم صاحبہ کے بازو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب وہ دونوں نہیں رہیں گے تو ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا پھر سر جھکائے ایک طرف کو جانے لگا۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر جانے کیوں میرے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔

غرضیکہ ایک عجیب سی کھنچی کھنچی، اداس اور ناقابلِ اعتباری فضا طاری ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

میں چند لمحے کھڑا رہا پھر دروازے کا رخ کیا۔

''کیا باتیں کر رہے تھے ابوشاہ سے؟'' اندر کمرے میں پہنچا تو محمود الحسن کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ وہ ایک کونے میں کرسی پر براجمان تھا۔ وہ شاید میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔

''میں تمہیں بلانے آیا تھا مگر تمہیں اس کے ساتھ مشغول پا کر واپس پلٹ آیا تھا۔'' وہ آگے بولا۔

میں ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے ہاشم کی موت کا دکھ ہوا۔'' میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔ میرے لہجے میں تاسف تھا۔ ''یہ سب میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ لیکن...... اس میں ہاشم کی بے وقوفی کا بھی دخل تھا۔''

''میں نے سنا ہے تمہاری شیخ عالی جاہ اور اس کے بھائی سلطان سے کوئی دشمنی تھی؟'' محمود الحسن نے اچانک سوال کیا۔ مجھے لگا جیسے وہ اپنے آدمی کی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دشمنی کیا تھی، پاکستان سے بحرین آتے ہی طیارے میں میری ان دونوں کے ساتھ بدمزگی ہوگئی تھی، نوبت معمولی ہاتھا پائی تک جا پہنچی لیکن جرگے میں اس مخاصمت کے سلسلے میں میری صفائی کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔''

''ہاشم نے کیا بے وقوفی کی تھی؟'' محمود نے بدستور ٹھنڈی ہوئی متانت سے پوچھا۔

''آپ نے شہزادی نیلم کے نام جو خط ہاشم کو دیا تھا وہ اسے شہزادی کے ہاتھ میں ہی دینا چاہیے تھا۔''

''مجھے یہ کوئی اتنی بڑی بے وقوفی والا کام نہیں لگتا۔ کون نہیں جانتا کہ شیخ عالی جاہ اور سلطان صرائفہ کی شہزادی کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔'' اس نے کہا اور میں نے دانستہ خاموشی اختیار کرلی۔

کمرے میں چند لمحے بوجھل سی خاموشی طاری رہی، محمود شاید میرے مزید کچھ کہنے کا منتظر تھا، مگر مجھے خاموش پا کر بولا۔

''اس کا سارا فائدہ مخالف گروپ اٹھائے گا۔ تم نہیں جانتے کہ عالی جاہ اور سلطان شہزادی کے لیے ہی نہیں صرائفہ کے لیے بھی بہت ضروری تھے۔''

''مجھے اس کا اعتراف ہے، میں شہزادی نیلم کو ہی نہیں،

PikiBooks.Site

بلکہ صرائفہ کے ہر شخص کو اسی دکھ اور پریشانی میں مبتلا ہوتا محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے مصلحتاً خفیف لہجہ اختیار کیا پھر وضاحت طلب انداز میں بولا۔ ”کیا تمہیں یا شہزادی نیلم کو ڈر ہے کہ بھائی کی پھانسی کے بعد...... عالی جاہ دشمن گروپ کے ساتھ جا ملے گا؟“

”اس خدشے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ بولا۔ ”لیکن اصل مسئلہ اب بھی کچھ اور ہے۔“

”وہ کیا؟“

”شیخ عالی جاہ ذاتی طور پر بڑے بااثر قسم کے رابطے رکھتا تھا۔ مقتدرہ حلقوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ جس تک شہزادی نیلم کی بھی رسائی نہیں۔ تم کیا ان دونوں بھائیوں کو شہزادی کا غلام سمجھتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ ان کی حیثیت قریب ترین خیر خواہوں کی تھی۔ بہت سے لوگ اسے جانتے مانتے تھے۔ اس میں اس کے باپ کے نام کا دخل تھا، سلیمان شیخ، وہ تمین قبائل کا امیر کہلاتا تھا۔ ان کی وجہ سے ہی آج تک کسی دشمن نے شہزادی نیلم پر براہِ راست ہاتھ نہیں ڈالا تھا، مگر اب......“

وہ خاموش ہوگیا۔

”میرے ذہن میں اس سارے مسئلے کا حل سمجھ میں تو آتا ہے۔“ میں نے قدرے گومگو کے انداز میں کہا۔

”وہ کیا؟“ کہتے ہوئے محمودالحسن تھوڑا آگے کو ہوا۔ اس کا چہرہ تاریکی سے روشنی میں آیا تو مجھے وہ بہت ستا ہوا لگا۔

”اگر میں سلطان کو معاف کر دوں؟“ میری آواز خود مجھے ڈوبی ڈوبی سی محسوس ہوئی۔ ”یعنی میں صلح نامہ پیش کر دوں، تم بھی ہاشم کا خون معاف کر دو؟“

میرا خیال تھا محمودالحسن کا اترا ہوا چہرہ کھل اٹھے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس وہ مزید تاریک ہوتا محسوس ہوا اور دوبارہ پیچھے کو ہو کے تاریکی میں چلا گیا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی تھی۔

”دیت، خون بہا، تاوان اور سر دھان...... یہاں ایسا کوئی قانون نہیں چلتا۔“ مجھے اس کی آواز تاریکی سے آتی سنائی دی۔ ”ان کے خیال میں اس طرح کے صلح نامے سے مزید شر پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ کہ ایسا صلح نامہ قانون کے مروج انصافی تقاضوں کو بھی کمزور کرتا ہے۔“

”میں نے تو نیک نیتی سے ایک حل نکالنے کی کوشش چاہی تھی۔ کیا اور کوئی دوسرا حل نہیں آتا تمہارے ذہن میں؟ بہت عرصے سے تم ان کے درمیان رہتے چلے آئے ہو۔“ میں نے مدھم سی روشنی میں نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں...... اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہمیں اب آگے کے بارے میں سوچنا ہوگا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”کیسی بدقسمتی ہے اور حالات کی ستم ظریفی بھی کہ میں نے تمہیں یہاں صرائفہ والوں اور شہزادی نیلم کی مدد کے لیے بھیجا تھا مگر افسوس! سب کچھ اس کے الٹ ہوگیا۔“

اس کی بات پر میرے دل کو ایک گھونسا لگا۔ بولا۔

”آپ کی کب واپسی ہے؟“

”ظاہر ہے کل صبح ہی نکلوں گا اب......“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیے گا۔“

”کیا مطلب؟ تمہیں تو کسی نے کچھ نہیں کہا؟ تم کیوں واپس چلے؟“ وہ قدرے چونک کر بولا۔

”آپ ہی نے تو کہا تھا کہ میری وجہ سے معاملات بجائے سلجھنے کے اور الجھ گئے؟“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا؟“

”مطلب تو آپ کا یہی تھا۔“

”ایسا کرو ابھی جا کر آرام کرو۔ کل صبح دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر لیٹا۔ عجیب سا جمود طاری ہو رہا تھا طبیعت پر۔ گھٹا گھٹا ماحول اور ایسے میں بنتے بگڑتے کام اور ایک سربہ سر اجنبی ماحول میں غیر یقینی سرگرمیاں ذہن پریشان اور طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی۔

یہاں میرے پہلے ہی بہت سے دشمن تھے۔ شیخ عالی جاہ کو بھی میں نے ایک طرح سے اپنا دشمن بنا لیا تھا حالانکہ دیکھا جاتا تو میرا اس میں کوئی قصور ہی نہ تھا لیکن بغض اور مخاصمت رکھنے والے اس طرح سوچیں تو پھر یہ ہنگامے ہی کیوں جنم لیں؟

ایسے میں مجھے کالیا کی یاد آگئی۔ وہ یار ہی میرا ایسا تھا کہ اس کی موجودگی سے از خود سارے تفکرات اور پریشانیاں ہوا ہونے لگتی تھیں۔

لیکن عجیب بات تھی کہ اس نے ابھی تک مجھ سے یا محمودالحسن سے رابطہ نہیں کیا تھا؟ ہوسکتا ہے اسپتال کی انتظامیہ نے ابھی تک اسے ہمارے دیے ہوئے نمبرز اس تک نہ پہنچائے ہوں یا کوئی اور مسئلہ ہو؟ بہرکیف مجھے اس

کے فون کا بے چینی سے انتظار تھا لیکن میں نے کل صبح بھی متعلقہ اسپتال فون کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ سیل فون گلنارا کا دیا ہوا تھا اور میں اسے بھی فون کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا البتہ مجھے حیرت تھی کہ اس نے بھی ابھی تک مجھ سے کوئی رابطہ یا خیر خیریت کا فون نہیں کیا تھا۔ میں نے خود بھی کوشش چاہی تھی لیکن یہاں کہیں کہیں سگنلز کے ڈراپ ہونے کا مسئلہ درپیش تھا اور یہاں ربع الخالی میں تو سگنل بالکل ہی کام نہیں کر رہے تھے۔ کیمپ تھری کے علاقے میں پھر بھی یہ مسئلہ کم دیکھنے میں آتا تھا۔

میں سونے کی کوشش کرتا رہا مگر مجھے بہت مشکلوں سے نیند آئی تھی۔ اگلے دن وقت فجر مجھے جگا دیا۔ سلطان کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ محل کے باہر پھانسی گھاٹ کا عام اور روایتی چوبی ”اسٹرکچر“ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس کی لکڑی... جانے کیوں مجھے سیلن زدہ سی نظر آرہی تھیں۔

میں یہ منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور محمود سے میں نے اس کی درخواست بھی کی تھی، لیکن اس نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ اس میں میری مرضی کا دخل نہیں ہوسکتا تھا۔ دیگر مجمع اور جرگے کے اراکین کے ساتھ مجھے بھی سلطان کو پھانسی لگتے ہوئے دیکھنا تھا۔

ناچار دل پر جبر کر کے میں بھی وہاں جا کھڑا ہوا۔ مجھے جرگے اور شہزادی نیلم والی پہلی قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اس دوران میں نے کن انکھیوں سے مجمع کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی، مجھے سلطان کا بڑا بھائی عالی جاہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

موقع ایسا نہ تھا کہ میں کسی سے اس کے بارے میں پوچھ سکتا، تاہم مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ کہاں غائب ہوگیا تھا؟ اور کیا اس کا یہاں موجود ہونا لازمی نہ تھا؟

شیخ عالی جاہ کی وہاں پھانسی گھاٹ کے مجمع میں عدم موجودگی میرے اندر کی بے چینی بڑھا رہی تھی۔ ممکن تھا وارثوں پر کسی ”اپنے“ کی پھانسی کا یہ دردناک منظر دیکھنے کی کوئی پابندی نہ رکھی گئی ہو۔ یا پھر کوئی اور بات تھی؟ ایک بار پھر اندیشناک وسوسوں نے مجھے آن گھیرا تھا۔

سلطان کو پھانسی گھاٹ پر لانے والے دو مسلح افراد تھے۔ سب کچھ کسی جیل مینوئل کی طرح کیا جا رہا تھا۔ مجرم کو ڈیتھ سیل میں غسل کرا دیا گیا تھا۔ پھانسی دینے سے پہلے جرگے کے ہی ایک نمائندے نے اس کا جرم اور پاداش پڑھ کر سنائی پھر جرگے کا متفقہ فیصلہ بہ آواز بلند سنایا گیا اس کے بعد مجرم سلطان سے اس کی آخری خواہش یا وصیت وغیرہ کے بارے میں پوچھا گیا۔

جواب میں وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد موجود جلاد نے اس کے دونوں پاؤں باندھ دیے۔ موت اس سے اب چند منٹوں کے فاصلے پر تھی۔

میں نجانے اب تک کتنے ہی خوں ریز حالات و واقعات سے گزر را پر کھا گیا تھا۔ میرا دل مضبوط ہوگیا تھا، لیکن یوں اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو لحہ بہ لحہ موت کے منہ میں جاتے دیکھنا اور بات تھی۔

ایک انسانیت کے ناطے دل میں درد ضرور اٹھتا تھا اور پھر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلطان کوئی عادی مجرم نہ تھا اور نہ ہی میری اس کے ساتھ کوئی پرانی یا سنگین دشمنی تھی۔ بس! ایک ذرا معمولی سے جھگڑے نے اچانک سنگین صورت اختیار کرلی تھی۔ دل بے اختیار کہہ اٹھتا تھا میرا کہ......

”کاش! عالی جاہ اور سلطان ایسی حرکت نہ کرتے۔“

ان بے وقوفوں کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ ہم تو آخرکار ان کی مدد کے لیے ہی آئے تھے۔ ان کا مشترکہ مفاد ہی میری اور ہاشم مرحوم کی آمد تھا لیکن افسوس! کہ ان دونوں بھائیوں نے ذاتی عناد کی خاطر اور وہ بھی کیا...... ایک محض تھپڑ یا گھونسے ہی کی تو بات تھی اور میں کیا کسی انسان کا بھی دل ایک معصوم سے بچے کو کسی گرانڈیل تنومند آدمی کا تھپڑ مارنا اسی طرح کھل سکتا تھا جس طرح میرا خون کھولا تھا۔

میرا اس میں کوئی قصور نہ تھا...... میں بار بار خود کو یہی تسلیاں دینے میں لگا ہوا تھا۔

پھانسی کے اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر مجھے اپنے باپ کی پھانسی یاد آگئی۔ وہ تو بے چارہ بے گناہ پھانسی چڑھ گیا تھا۔ اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی اس وقت کہ جسے یہ معلوم ہو کہ اس نے کسی کا خون نہیں کیا۔ اسے تو محض قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا۔

میں نے دیکھا سلطان کی ٹانگیں موت کے خوف سے کانپ رہی تھیں۔ پھر جلاد نے جب اس کے چہرے پر کالا کپڑا پہنایا تو موت سلطان کے اور قریب ہوگئی۔ اب بس گھاٹ کی چوبی چوکھٹ پر جھولتے ہوئے گرہ دار پھندے کو اس کے گلے میں فٹ کرنا باقی رہ گیا تھا۔

میرے اندر کی کیفیات شاید میرے چہرے پر نمودار

PakiBooks.Site

ہونے لگی تھیں، پھانسی سلطان کو لگ رہی تھی اور دل میرا ہول رہا تھا، میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا، کیا؟ یہ میں نہیں سن رہا تھا، بس کوئی اندر میرے چلا رہا تھا۔ کچھ کرنے سے روک رہا تھا۔

اچانک میری یونہی نظر مجھ سے پانچ افراد چھوڑ کر شہزادی نیلم پر پڑ گئی، اس طرح کہ وہ قطار قدرے نیم قوس کی صورت میں تھی۔

اس وقت سب لوگوں کی نظریں پھانسی گھاٹ اور مجرم سلطان پر جمی ہوئی تھیں لیکن میں نے دیکھا کہ شہزادی نیلم کی تیز نظر نقاب کے افق سے میرے چہرے پر چپکی ہوئی تھیں۔ ایسے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی تیز سی برقی لہریں ان کشادہ آنکھوں سے کوندتی ہوئی میری جانب لپک رہی ہوں اور میرے وجود کے اندر تک کو گرما رہی ہوں۔

ان تیز گھورتی نگاہوں میں جانے کیا مقناطیسیت تھی کہ میں ایک لمحہ کو جھرجھرا سا گیا۔

”ٹھہرو......“ اچانک میرے منہ سے یہ لفظ بہت بلند آواز میں برآمد ہوا اور سلطان کے گلے میں پھندا ڈالنے کے بعد لیور کی طرف بڑھتا ہوا جلاد وہیں رک گیا۔

مجمع میں ہلکا سا بم چیخ ابھرا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سب چہرے گھما کر میری جانب تکنے لگے۔

میں اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھا۔ میرا رخ اب جرگے کے مقدم اعلیٰ کی طرف ہو گیا۔

”کیا اس میں مجرم کو اپیل کا بھی حق حاصل نہیں ہے؟ کیا معافی کی کوئی گنجائش یا صلح نامہ؟“ میں نے کہا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نہیں کوئی اور میرے اندر سے بول رہا تھا۔

”کیا تم سے اس کے کسی وارث یا بھائی عالی جاہ نے کوئی درخواست کی تھی؟“ مقدم نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں، ان کا ایسا کوئی فرد میرے پاس نہیں آیا، یہ میں محض انسانی ہمدردی کے ناطے کہہ رہا ہوں۔“ میں نے پورے اعتماد سے جواب دیا اور اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

”کیونکہ سلطان بہر حال کوئی عادی مجرم نہیں ہے۔ محض مجھ سے ایک معمولی سے جھگڑے میں ان دونوں بھائیوں نے میرے ساتھ ذاتی عناد رکھا اور مجھے یہاں دیکھتے ہی وہ اپنے اشتعال پر قابو نہ پا سکے۔“

یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں کل رات محمود سے ہونے والی گفتگو بھی گونج رہی تھی۔ جس دوران محمود نے مجھے بتایا تھا کہ کوئی ایسی صورت کی گنجائش یہ لوگ یہاں نہیں رکھتے ہیں۔

”مجرم سلطان یا عالی جاہ، یا ان کے کسی عزیز اقربا نے تمہیں کوئی لالچ دیا؟“ مقدم نے اسی متانت سے اگلا سوال مجھ سے پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا مجھ سے غیر متعلقہ سوالات کرنے لگ گیا تھا۔

تاہم میں نے سر دست کوئی تاثر لیے بغیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”ایسا ہرگز ہرگز کچھ بھی نہیں ہوا میرے ساتھ۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ محض میں ایک انسانی ہمدردی کے ناطے کہہ رہا ہوں۔“

”کیا تم مجرم سلطان کے وارثوں اور بھائی سے خوف زدہ ہو؟“

”بالکل نہیں، میں صرف اس ذات پاک سے ڈرتا ہوں اور بس......“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔

مقدم نے اپنے ساتھ کھڑے دو آدمیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھے۔ میں ساکت کھڑا تھا۔ وہ میری طرف آئے۔

”ان کے ساتھ چلے جاؤ۔“ مقدم نے مجھ سے کہا۔ میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

اسی وقت محمود الحسن نے عقب سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”خدا کے لیے جو یہ کہہ رہے ہیں وہ کرو۔“ اس کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ پھر میں چپ چاپ ان دونوں کے ہمراہ چل پڑا۔

وہ دونوں مجھے محل کے اندر لے آئے۔ میرے کمرے میں چھوڑ کر وہ خاموشی سے واپس لوٹ گئے۔

میں اندر اپنے چارپائی نما بستر پر پاؤں جھلائے بیٹھ گیا۔ نجانے کیوں مجھے لگا جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اتر رہا ہو۔ میرا ذہن اور دل و دماغ یکا یک ہلا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ میں نے سوچا، کیا یہ کوئی لاشعوری عمل تھا کہ انسان بہت سی الجھنوں کے پندار میں پھنسے رہنے کے بعد یکا یک خود کو آزاد محسوس کرنے لگتا ہے، میری فطرت

تھی کہ میں بات کی گہرائی تک ضرور جاتا تھا۔ جلد ہی مجھے قیافہ ہوا کہ شاید میرے ضمیر کے بوجھ کو ایک طرح کے ”اتمامِ حجت“ نے پورا کر ڈالا ہے، میرے دل کی جو بات تھی وہ اب میرے لبوں سے نکل کر چاروں جانب پھیل گئی تھی۔ یوں شاید اندر کا میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ باہر پھانسی گھاٹ پر کتنا عمل درآمد ہو رہا تھا؟ لیکن پھر میرا دل اٹھنے کو نہ چاہا۔ کبھی کبھی انسان کا جی چاہتا ہے بس اسی طرح بیٹھا رہے۔ کوئی اسے مخاطب نہ کرے اور وہ بس اپنی دھن میں مگن خاموش بیٹھا رہے۔ شاید اسے ہی قنوطیت کہا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر اور بیت چلی مجھے باہر سے لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ لوگوں کے قدموں کی آہٹیں میں نے محل کے اندر بڑھتے ہوئے بھی سنیں۔

پھر اچانک میں کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر چونکا۔ دروازے پر نگاہ پڑی تو سامنے وہ بوڑھا ابوشاہ کھڑا تھا، جو میرے ساتھ اردو میں بات کر لیتا تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہونے لگا مگر اس نے اندر قدم بڑھاتے ہوئے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میری چارپائی کے قریب آ گیا۔ وہ میرے اس قدر قریب آ کر کھڑا ہو گیا کہ ناچار مجھے اپنا سر خاصا اونچا اٹھا کر اسے دیکھنا پڑا، مگر اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور آہستگی سے بولا۔

”تمہیں شہزادی صاحبہ نے بلایا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”اپنی نشست گاہ میں۔“

”اور......محمود؟“

”وہ بھی وہیں ہے۔“

”کیا سلطان کو پھانسی دے دی گئی ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا اور جواب میں...... بوڑھے ابوشاہ نے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے مختصراً کہا۔

”ہاں......!“

اس کے جواب پر میرا دل ایک لمحہ کو گھٹا تھا اور پھر اس کے بعد میں چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

ابوشاہ مجھے نشست گاہ کے دروازے پر چھوڑ کر خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا۔

وہاں دونوں موجود تھے۔ میں بھی خاموشی کے ساتھ محمود کے ساتھ والی نشست پر براجمان ہو گیا۔ شہزادی نیلم ہمارے سامنے کی نشست پر براجمان تھی، میں نے محسوس کیا۔ ان کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ ماحول پر ایک عجیب بھنچی بھنچی سی مرگِ آسا والی خاموشی طاری تھی۔ یہ چند ثانیے کے لیے ہی محیط رہی اس کے بعد مہرِ سکوت کو شہزادی نیلم نے ہی توڑا۔

”مسٹر نعمان!“ اس نے مجھے بہت نیچی آواز میں مخاطب کیا، یوں جیسے کسی برسوں خشک پڑے کنویں سے اس کی آواز آئی ہو۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔

”یہ اب آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ محمود صاحب کے ساتھ واپس لوٹ جائیں یا پھر......“ اس نے شاید دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔ وہ اب اپنی دلنشیں آنکھیں جھکائے ہوئے تھی۔ میں نے ایک نظر محمود الحسن پر ڈالی، جواب میری جانب ہی تکے جا رہا تھا۔ جیسے وہ بھی میرے جواب کا منتظر ہو مگر ایسا نہیں تھا کیونکہ مجھ سے اس کی نظریں ملتے ہی اس نے نفی میں سر کو جنبش دی تھی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر جواب دینے کے لیے شہزادی کی طرف دیکھا تو اسی لمحہ وہ بھی نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

”میں تو یہاں ایک نیک اور اہم مقصد کے لیے آیا تھا

مسلم ہسپانیہ میں قائم ہونے والی مسلمانوں کی وہ عظیم الشان سلطنت کہ جس کا علمی سرمایہ آج بھی دنیا بھر کی جامعات میں موجود ہے، دراصل یورپ میں روشن خیالی اور آزادی اظہار رائے کو فروغ دینے کا باعث بنا لیکن اس بات کا ذکر بھی قوموں کی زندگی کے عروج و زوال کی یاد دلائے گا کہ جب اسی سلطنت کے آخری چشم و چراغ کو فرڈیننڈ نے غرناطہ کی ایک ایسی جیل میں قید کیا کہ جہاں سے مسجد قرطبہ اور عبدالرحمن اول کا بنایا ہوا محل نظر آتا تھا تو اس بادشاہ کا گریہ دیکھ کر اس کی ماں نے کہا۔ ”تو عورتوں کی طرح اس سلطنت کے چھن جانے پر آنسو بہا رہا ہے جسے تو مردوں کی طرح بچا نہ سکا۔“

اقتباس: یاور مہدی از عون عباس

مرسلہ: محمد شہزاد۔ کراچی

PakiBooks.Site

جو ہم سب کا ایک مشترکہ کاز بھی ہے۔ لہٰذا شہزادی صاحبہ! اگر میرے یہاں رہنے سے آپ سمیت کسی کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر میں بھی اپنا مشن ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا۔''

میں اتنا کہہ کر چپ ہوا۔ نظریں البتہ میری اسی کے چہرے پر جمی رہیں۔ میں صرف اپنے بارے میں اس کی مرضی جاننا چاہتا تھا۔ مجھے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں رکھنا تھا۔

میرے جواب پر شہزادی نیلم کے ستے ہوئے سے چہرے پر جیسے ایک دم رونق کی چمک ابھری تھی۔ میرے دل کو قدرے تسلی ہوئی کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہ تھی۔

''میں آپ کی مشکور ہوں۔ آپ کے فیصلے سے مجھے واقعی دلی تسکین ملی ہے۔ ایک اطمینان سا ہوا ہے۔''

میں نے اس کے چہرے کو بھانپتی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے ہرگز یہ سب اوپری دل سے نہیں کہا تھا۔ جواباً میں نے بھی ہولے سے مسکرا کر اس کے جواب پر تشفی کا اظہار کیا۔ محمود جواب تک خاموش اور پریشان سا نظر آرہا تھا، ایک دم خوش ہو کر بولا۔

''شکر ہے خدا کا شہزادی صاحبہ کہ آپ نے نعمان پر اطمینان کیا اور اسے بھروسے کی نگاہ سے دیکھا، بلاشبہ آپ ایک وسیع النظر خاتون ہیں۔''

مجھے محمود کا شہزادی نیلم کو اس طرح کہنا کچھ عجیب سا لگا۔ کیا مطلب تھا اس کا؟ کیا شہزادی نیلم کا دل مجھ سے خراب ہو سکتا تھا؟ میں زیادہ نہ سوچ سکا کیونکہ اسی لمحے محمود اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''مجھے اب اجازت درکار ہوگی۔ میں کل سے یہاں ہوں۔''

''کھانا کھا کر نکل جاتے۔'' شہزادی نیلم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں شہزادی صاحبہ! آپ کا شکریہ، میں اب چلوں گا لیکن آپ سے رابطے میں رہوں گا۔''

وہ رخصت ہونے لگا تو اچانک مجھے ایک بات یاد آئی، میں نے اس سے پوچھ لیا کہ دبئی کے اسپتال سے میرے ساتھی شیراز (کالیا) کی کوئی کال تو نہیں آئی؟

اس نے نفی میں سر ہلا دیا نیز میرا کاندھا تھپتھپا کر تسلی دی کہ وہ کیمپ تھری پہنچ کر دوبارہ مذکورہ اسپتال فون کرے گا۔

وہ چلا گیا۔ میں اور شہزادی نشست گاہ میں اکیلے رہ گئے۔ میں نے ہولے سے کہا۔

''شہزادی صاحبہ! مجھے افسوس ہے، جو کچھ ہوا، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ عالی جاہ اور اس کا بھائی سلطان آپ کے لیے کیا اہمیت رکھتے تھے۔ کاش! وہ دونوں......''

''آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں نعمان صاحب!'' وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ اس کے عنابی سے لبوں پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ آنکھوں میں بھی اطمینان کی چمک موجود تھی۔ اس کے رویّے نے مجھے بھی تسلی دی۔

''بلکہ آپ نے تو آخری وقت تک سلطان کو بچانے کی کوشش بھی چاہی تھی۔ اس سے بڑھ کر بھلا آپ کی نیک نیتی کیا ہو سکتی ہے۔'' اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ میں خاموش رہا پھر کسی خیال کے تحت بولا۔

''کیا ان دونوں کی وجہ سے آپ کے لیے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں؟''

میری بات پر وہ پہلے عجیب سی نگاہوں کے ساتھ میری جانب تکنے لگی پھر جیسے بھیدوں بھری مسکراہٹ سے بولی۔

''آپ کو خود سے زیادہ شاید میری فکر پریشان کر رہی ہے۔'' اس کا لہجہ کچھ شوخ سا ہوا۔ میں نے کہا۔

''میں نے اس لیے کہا تھا کہ ان دونوں آپ کا مقربین خاص میں شمار ہوتا تھا۔ دوسری میری تشویش کی وجہ یہ بھی ہے کہ عالی جاہ اگر بددل ہو کر دشمنوں کے ساتھ مل گیا تو کہیں......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بھی بے یک جنبش بولی۔

''عالی جاہ کو میں جانتی ہوں اچھی طرح۔ وہ نہ میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر کوئی ساز باز کر سکتا ہے نہ ہی...... میرے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اسے عالی جاہ پر اتنا اعتماد کیوں تھا؟ اور پھر وہ آگے اپنے کس خدشے کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''لیکن کیا؟''

''نہیں، شاید میرا یہ خیال غلط ہے۔'' وہ ایک دم کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''آپ نے مجھے بتائے بغیر خود ہی فیصلہ کر لیا؟'' میں نے بھی دانستہ تھوڑی شوخی دکھانا ضروری سمجھا۔ وہ کچھ متفکر نظر آنے لگی تھی لیکن میری بات پر ایک دم زور سے ہنسی اس کے ادھ کھلے عنابی دہن سے جھانکتے موتیوں کی لڑی جیسے دانتوں کی ہموار قطار مجھے بے حد پُرکشش محسوس ہوئی۔ تاہم مجھے حیرت ہوئی، یہ کوئی ایسا ہنسی کا موقع نہ تھا۔ میں

نے عالی جاہ اور سلطان کے معاملے میں اسے کچھ دیر پہلے جس قدر افسردہ اور مایوس دیکھا تھا وہ اب اتنی ہی خوش باش اور مطمئن دکھائی دینے لگی تھی، کیا وجہ ہو سکتی تھی اس کی؟ میں نے خود سے پوچھا۔ جواب ملا۔ یقیناً اس میں میری ثابت قدمی اور دلیری کا دخل تھا۔ وہ اس افسوسناک واقعے کے بعد یہی سمجھے ہوئے تھی کہ میں بددل ہو کے صرائفہ سے واپس لوٹ جاؤں گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

بہرکیف وہ اسی طرح کھنکتے لہجے میں بولی۔

''بال کی کھال نکالنے والی تمہاری یہ عادت مجھے اچھی لگی۔ تم خاصے محتاط بھی ہو۔ درحقیقت مجھے خدشہ اس بات کا ہے کہ تمہاری دشمنی گاڑھی ہوتی جارہی ہے۔ مجھے تمہاری فکر ہورہی ہے۔''

''میرے لیے یہ باعث اطمینان ہے شہزادی صاحبہ کہ آپ میرے لیے ایسا سوچتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''رہی بات میرے دشمنی کے گاڑھے پن کی تو جب تک وہ زندہ ہیں، گاڑھے پن کا یہ عمل بڑھتا ہی رہے گا لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں، میں نے سر سے اپنے کفن باندھے رکھا ہے۔''

میری بات پر شہزادی نیلم مجھے عجیب سوچتی ہوئی سی نگاہوں سے تکتی رہی پھر اسی طرح بھیدوں بھرے انداز میں مسکرائی بولی۔

''پتا نہیں کیوں میرا دل ہی نہیں دماغ بھی مجھے یہ باور کرانے لگا ہے کہ تم صرائفہ والوں کے لیے ایک نجات دہندہ کی مکمل حیثیت رکھتے ہو۔ تمہاری موجودگی میں احساس ہونے لگا ہے مجھے کہ عالی جاہ اور سلطان کی جگہ تقدیر نے مجھے ان سے بڑھ کر ایک بہترین ساتھی دیا ہے۔''

میں اس کی بات سن کر چپ رہا۔ دراصل میں اس موضوع کو اب ختم کرنا چاہتا تھا، بہت بوجھل پن آگیا تھا اس میں اب...... لہٰذا ایک ثانیے کے وقفے کے بعد جب میں موضوع ختم کرنے کے لیے مقصد کی بات پر آنے لگا تو اچانک دروازے پر ابوشاہ نمودار ہوا۔

وہ اجازت طلب کر کے اندر آیا اور پھر شہزادی کے قریب آکر عربی میں کچھ کہا۔ مجھے صرف دو ہی الفاظ سمجھ آسکے۔

''ام الصمیم......اور راشد جمیل......''

میں نے شہزادی کو چونکتے اور پھر اس کے چہرے پر بیک وقت مسرت کی سرخی بھی دمکتے دیکھی۔ وہ کچھ بے چین بھی نظر آنے لگی۔ اس نے نہایت بے قراری سے ابوشاہ سے کچھ دریافت کیا اور جواب ملتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''آؤ میرے ساتھ......'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تشویش زدہ بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

ہم محل سے باہر آگئے۔ شہزادی نیلم کے ہمراہ دو مسلح محافظ تھے۔ ابوشاہ بھی ساتھ تھا۔

ہم محل کے احاطے سے نکلے۔ باہر خوب دھوپ چمک رہی تھی۔ گرمی سے برا حال ہوا جاتا تھا۔ آسمان پر سورج گویا سوا نیزے پر تھا اور اس چھوٹی سی صحرائی بستی پر ''العطش...... العطش'' کی سی کیفیت طاری تھی۔

اب ہمارے گرد کچے پکے مکانوں کی بے ترتیب سی قطاریں اور خالی گلیاں تھیں۔ ایک طرف کو ایک اداس گدھا چپ چاپ کھڑا تھا۔ وہیں سے مرغیوں کے کٹکٹانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پیش گرد ماحول سے دکھائی پڑتا تھا کہ صرائفہ کے لوگ کس قدر مفلوک الحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ خود شہزادی نیلم کا محل بھی بس ایک نام کا اثر ڈالتا تھا ورنہ اس کی عمارت بھی، بوسیدہ اور قدیم طرز کی تھی۔ گویا ایک اجڑا اجڑا سا دیار ہی دکھائی دیتی تھی یہ بستی۔

ہم بستی کے آخری مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ حتیٰ کہ آخری مکان بھی گزر گیا اور اب کھلا تپتا آسمان اور کھلی ریتیلی زمین تھی۔

میں نے دیکھا یہاں ذرا فاصلے پر کچھ اور لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرغوں کی لڑائی ہورہی ہے اور پورا صرائفہ یہاں امڈ آیا ہے۔ عورتیں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ ہر شخص باتیں کر رہا تھا اور باتوں کی آوازیں صحرا کی پرتپش دھوپ میں قیامت کا شور بن گئی تھیں۔

جب ہم ہجوم کی طرف بڑھے تو کسی نے پروا تک نہیں کی۔ وہ سب پریشان اور ہراساں نظر آرہے تھے۔ انہیں اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ لگتا تھا وہ اپنی پریشانی میں شہزادی نیلم کی (مقدور بھر سہی) شاہانہ زندگی، اس کے رعب داب اور وقار کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے، پریشانی، تشویش اور غیر یقینی حالات میں تو یوں بھی ہر انسان کو اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ یہاں ایک چٹان میں پانی کا پائپ بنا ہوا تھا۔ اس کی شکل رومیوں کی ''آبراہ'' کی سی تھی۔ پتا چلا کہ یہ بستی کو پانی فراہم کرنے والی ایک اہم ''فلج'' تھی اور بالکل خشک پڑی ہوئی تھی۔ میں آگے کو جھکا اور پائپ میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ جو ابھی تک کچھ گیلا تھا۔ جہاں

PakiBooks.Site

پانی گرتا تھا۔ وہاں چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ پانی سوکھ چکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پانی ابھی تھوڑی دیر پہلے خشک ہوا ہے۔

اب میں سمجھا تھا کہ واقعی ان لوگوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ نج کے خشک ہونے کا مطلب ہے صرائفہ کی تباہی...... میں یونہی مزید جائزہ لینے کی غرض سے خشک پائپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کھجوروں کے باغ تک چلا گیا۔ وہاں چند معززین کے علاوہ میں نے ایک اپنی عمر کے نوجوان عرب کو دیکھا۔ وہاں سب نے عربی چغے پہن رکھے تھے، میں واحد شخص تھا جس نے پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ وہ بھی بوسیدہ اور میلی چیکٹ ہو رہی تھی۔

میں نے دیکھا اسی وقت شہزادی نیلم اور ابوشاہ چند آدمیوں کے ساتھ اس نوجوان کے پاس پہنچے۔ شہزادی نیلم اور اس نوجوان نے ایک دوسرے کو سلام کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ ان دونوں میں خاصی بے تکلفی اور پرانی شناسائی تھی۔

لیکن اس وقت وہاں زور زور سے بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ لوگ غصے میں اور مشتعل نظر آ رہے تھے۔ کئی لوگ تو اپنے ہتھیاروں کو فضا میں بلند کر کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی جنگ کے لیے تیار ہوں۔

اسی دوران شہزادی نیلم نے اس نوجوان سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا اور وہ میری جانب تکنے لگا۔ شہزادی نیلم نے مجھے بلایا اور اس نوجوان سے میرا اور اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ نوجوان راشد تھا۔ شیخ سلیمان کا بھتیجا۔

شیخ سلیمان کا نام مجھے سنا ہوا لگا، پھر جلد ہی مجھے یاد آ گیا کہ یہ نام میں نے ہاشم کی زبانی سن رکھا تھا۔ جس کے مکان میں محمود الحسن نے اپنی رہائش قائم کر رکھی تھی۔

راشد کو بھی اردو آتی تھی۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملا اور صرائفہ کے سلسلے میں میرے عزائم جان کر بہت متاثر ہوا۔ قصبہ کارڈوف سے آیا تھا۔ جو گلفو آئل کے دفاتر اور ان کی رہائشی کالونی کے جنوب مغرب میں واقع تھا۔

شہزادی نیلم نے وہاں پر موجود مشتعل لوگوں کے لیے عربی میں تھوڑی دیر خطاب کیا۔ مجمع ذرا پُرسکون ہوا اور اس کے بعد ہم سب دوبارہ محل میں واپس لوٹ آئے۔

باریش ابوشاہ بہت متفکر نظر آ رہا تھا۔ میری موجودگی کی وجہ سے باتیں ساری اب اردو میں ہو رہی تھیں۔

اس گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ حدی والوں کے ساتھ جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ ان کی چیرہ دستیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اب انہوں نے ان کے پانی پر شب خون مارا تھا۔ ابوشاہ کا کہنا تھا کہ اگر اس کا جلد ہی سدِ باب نہ کیا گیا تو صورتِ حال محل (شہزادی نیلم) کے لیے خراب ہو جائے گی، لوگ اب محل کے باہر احتجاج کرنے لگے تھے۔

نوجوان راشد خاصا جوشیلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کے جنگجو لانے کا وعدہ کیا۔ طے پایا گیا کہ یہ جنگ کوہ جبل پر ہی لڑی جائے، جہاں حدی والوں نے غاصبانہ قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ اپنے علاقے کو وافر مقدار میں پانی فراہم کر رہے تھے مگر صرائفہ والوں کا پانی بند کر رکھا تھا۔ یہ ''جارحدہ'' معاہدے کی کھلی خلاف ورزی تھی اور اب اس کا حل انہیں صرف جنگ میں ہی نظر آ رہا تھا اور بہ ظاہر لگ بھی یہی رہا تھا کہ جنگ کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی نہیں رہا ہے۔

میں ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو کے درمیان خاموش رہا تھا۔ جب مجھ سے اس بارے میں مشورہ لیا گیا تو میں نے کہا۔

''یہاں کے حالات سے اگرچہ میں بھی اب کافی حد تک آگاہ ہونے لگا ہوں لیکن پھر بھی آپ لوگ مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ آپ کو اگر جنگ ہی اس مسئلے کا حل نظر آ رہی ہے تو اپنی بقا کے لیے یہ بھی ضروری ہوتی ہے۔''

''جنگ کے بغیر ہرگز یہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ مسٹر نعمان!'' شہزادی نیلم نے مجھ سے کہا۔ ''ہم تو ایک عرصے سے ان پر جنگ کے پر تولے ہوئے ہیں۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہی ہیں ہمارے درمیان، لیکن اس بار ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کوہ جبل کو حدی والوں کے غاصبانہ چنگل سے نجات دلا کر ہی رہیں گے۔''

یہ لوگ سب پُرعزم نظر آ رہے تھے۔ میں خاموش ہو گیا۔ میں یہاں ان کے ساتھ کسی جنگ میں پڑنے یا لڑنے نہیں آیا تھا، اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کا میرا اپنا طریقہ تھا۔ نہ ہی مجھے اس جنگ میں شامل ہونے کے لیے بھی کہا گیا۔

اسی وقت جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہاں ایک کھڑکی تھی جو محل کے باہر احاطے میں کھلتی تھی۔ وہاں آہستہ آہستہ مسلح افراد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ راشد اور قبیلے کے چند اور افراد اس کے ساتھ موجود تھے۔ میں نے دیکھا شہزادی نیلم بھی جنگجو لباس میں ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ اس کے دلکش جسمانی خطوط مخصوص طرز کے چست لباس میں خاصے پُرکشش نظر آتے تھے۔

راشد اور شہزادی نیلم کے درمیان کیا رشتہ تھا، اس کا ابھی مجھے صرف اسی حد تک ہی اندازہ ہو سکا تھا کہ ان دونوں کی کوئی پرانی شناسائی تھی۔

شام تک صرائفہ کے مسلح جوان جنگ کے لیے بالکل تیار ہو چکے تھے۔ سالار کے فرائض شہزادی نیلم ہی انجام دے رہی تھی۔ راشد اس کے ہمراہ تھا۔ یہ لوگ اونٹوں اور تخت دار ریڑھوں پر سوار تھے۔ گویا اب صرائفہ والے اپنی بقا کے لیے کوہ جبل پر غاصبوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

یہ درست تھا کہ میں بھی ایک مشترکہ مفاد کے تحت ان کی مدد کے لیے ہی آیا تھا۔ لیکن میری ''مدد'' کی نوعیت جنگ و جدل نہ تھی بلکہ ان کے دشمنوں کی طاقت کو کمزور بنانا تھا۔ جس کا لائحہ عمل میں ابھی تک تیار نہیں کر سکا تھا۔ وجہ یہاں میرے قدم پڑتے ہی ان حالات کا تھا جو میرے لیے اچانک اور غیر متوقع تھے۔ وہ سرے کچھ ٹلے تو یہ نیا معاملہ آن کھڑا ہوا تھا۔ یوں اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے یار کالیا کی یاد آتی تھی۔ جنگ و جدل میں وہ بھی کسی سے کم نہیں تھا لیکن وہ بھی میری دماغی پلاننگ کو پہلے فوقیت دیتا تھا۔

فاران اور ہاشم کی نصیحتیں مجھے یاد تھیں کہ میں بہر حال یہاں ایک غیر ملکی کی حیثیت سے تھا۔ بحرین کے قوانین ایسے غیر ملکیوں کے لیے بڑے سخت ہوتے تھے پھر میری یہاں کسی نوعیت کی ملازمت بھی نہ تھی۔ نہ ہی کسی آئل کمپنی کے ساتھ میرا کوئی تعلق تھا ماسوائے ایک مشینری سپلائرز کے۔ دشمن میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

ابھی ان کی ''محاذ'' پر روانگی عمل میں نہیں آئی تھی۔ میں نے ابوشاہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ متفکر اور تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے ابوشاہ! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' میں نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔ ''اب تو سب لوگ خوش اور پُرجوش نظر آ رہے ہیں۔''

''اللہ ہمیں کامیاب فرمائے۔'' وہ دعائیہ انداز میں ہولے سے بولا۔ ''لیکن حدی والے ہم سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ کوہ جبل پر قبضہ کرنے والے معمولی لوگ نہیں ہو سکتے۔ ان کی پشت پر ایک بڑی طاقت کارفرما ہے۔ اللہ رحم کرے، نجانے کتنا خون خرابہ ہو اور پھر شکست کی صورت میں سب ختم ہو جائے گا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ سب سامراجی اور اسلام دشمن قوتوں کے ایماء پر ہو رہا ہے۔ بھائی کو بھائی سے لڑوایا جا رہا ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ وہ اپنے اندر کا ابال نکالتا رہا۔ بولا۔

''یہ ناعاقبت اندیش لوگ ہیں، نہیں جانتے کہ فائدہ ان کو بھی نہیں ہوگا، ہمارے تیل کے لیے ہمیں ہی آپس میں لڑوا کر قبضہ غیروں کا ہو جائے گا۔ استعماری قوتوں کا یہی تو وتیرہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑواؤ اور اپنا اُلو سیدھا کرو۔ یہ ہمیں ہتھیاروں میں اُلجھاتے ہیں اور خود صرف دو ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہیں۔ ایک پانی اور دوسرا تیل...... یہ مکار سامراج جانتے ہیں کہ اب زمانہ ان ہی دو ہتھیاروں سے لڑنے کا ہے۔ وہ اپنے ہتھیار صرف فروخت کرنے کے لیے بناتے ہیں۔ ان کا پیسا وہ انہی کے خلاف ایسی در پردہ سازشوں میں خرچ کرتے ہیں۔ کاش! ہم ان کی یہ سازش سمجھ جائیں لیکن افسوس ہم اپنی ہی آگ میں بھسم ہوئے جا رہے ہیں۔''

وہ رو پڑا۔ ابوشاہ ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ شخص تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ اس کے دل میں صرائفہ اور یہاں کے لوگوں کے لیے بڑا درد چھپا ہوا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ اس بستی میں تیل کے کنوؤں کا بیش بہا خزانہ دفن تھا۔ دشمن ان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس معاہدے کو سبوتاژ کرنا بھی ان کا ایک مقصد تھا جس کے تحت یہاں کھدائی کی اجازت مل چکی تھی لیکن کہا یہی جا رہا تھا کہ یہاں کھدائی کرنا وقت اور سرمایہ دونوں برباد کرنے کے مترادف ہوگا، یہاں سوکھے کنوؤں کے سوا کچھ نہیں دھرا۔ اب ان کا مقصد صرائفہ کو پانی کے ہتھیار سے تباہ کرنا اور پھر اس پر قابض ہو کے تیل کے چھپے ہوئے کنوؤں کی کھدائی کرنا تھا۔ یہاں میلوں تک زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جب کہیں بھی تیل کے کنویں کی بھنک پڑتی۔ لوگ جاگ پڑتے تھے ورنہ برسوں یہ زمینیں خالی اور اجاڑ پڑی رہتیں کوئی ان پر حق ملکیت کا دعویٰ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا تھا۔

اچانک ایک آواز پر میں ٹھٹکا۔ گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ جیپ ٹائپ کی کار وہاں آ کر رکی۔ مجمع میں سے چند مسلح افراد اس کی طرف لپکے۔

PakiBooks.Site

میں کھڑکی کے قریب آ کر آنکھیں سکیڑ کر اس طرف تکنے لگا۔

جیپ سے اُترنے والا پہلا آدمی محمود الحسن تھا۔ دوسرا اس کا مسلح محافظ اور تیسرا شخص جو سب سے آخر میں اُترا تھا اسے دیکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھیں صرف اسی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہوں۔ یہ وہ شخص تھا جو میرے ڈھتے حوصلوں کے لیے بادبانوں کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ میرے لیے سب کچھ تھا اور جس کے بغیر میں خود کو اُدھورا سمجھتا تھا۔ وہ تیسرا شخص میرا یارِ بے بدل شیراز عرف کالیا تھا۔

وہ بڑی بے چینی کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور یہاں جنگلی قسم کا ماحول دیکھ کر متفکر بھی نظر آ رہا تھا۔

میں پھر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کھڑکی سے ہٹا اور اپنے پیچھے بوڑھے ابوشاہ کو حیران و پریشان تکتا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا اور وہاں سے باہر دوڑ لگا دی۔

ٹھیک اسی وقت کالیا کی نظر بھی مجھ پر پڑی اور وہ بھی اسی بے چینی کے ساتھ میری جانب لپکا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر گویا جھپٹنے کے انداز میں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی زبان سے نکلنے والا پہلا لفظ یہی تھا...... ''ابے لے...... جگری!''

وہاں موجود بھی لوگ حیرت اور عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کیا تھے۔ کالیا نے بھی سیاہ رنگ کی پینٹ اور ہلکے میرون رنگ کی ٹی شرٹ چڑھا رکھی تھی اور وہ خاصا خوبرو اور کسرتی بدن کا حامل شخص نظر آتا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان چند لمحے کچھ جذباتی نوعیت کے جملوں کا تبادلہ ہوا اور پھر اس کے بعد ہم مجمع کو حیران پریشان چھوڑ کر محل کے اندر بڑی سی نشست گاہ میں آ گئے۔

محمود الحسن نے بتایا کہ کالیا اسی روز سے جس دن ہم نے دبئی اسپتال فون کیا تھا۔ وہ ہم سے دونوں نمبروں پر رابطے کی مسلسل کوشش کرتا رہا تھا۔ کالیا کو دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ گیا تھا اور حوصلہ بھی۔

وہ دبئی سے آج صبح ہی مناوا پہنچا تھا۔ محمود الحسن کا مجھ سے رابطہ نہ ہو سکا تو وہ محمود کا نمبر ٹرائی کرتا رہا تھا، وہ بھی چونکہ صرائفہ میں ہی تھا اور یہاں سگنلز کا ایشو تھا لیکن جب محمود یہاں سے روانہ ہوا تو کالیا کو اس کا نمبر لگ گیا اور یوں اس نے کالیا کو اپنے ہاں بلا لیا۔

محمود کا ارادہ کل آنے کا تھا، کیونکہ آج تو وہ خود ہی یہاں سے صبح روانہ ہوا تھا، مگر کالیا کو میرا سراغ ملتے ہی ایک پل کے لیے بھی چین نہیں آیا تھا۔ وہ تو خود اکیلا صرائفہ روانگی کے لیے تیار بیٹھا تھا، ناچار اس کے بصد اصرار پر محمود کو ہی اسے یہاں لانا پڑا اور جب تک اس نے کالیا کو سارے حالات سے آگاہی دے ڈالی تھی۔

محمود کو چونکہ میں کالیا کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میرے لیے وہ کیا شے تھا اسی لیے اس نے بھی اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

میں نے کالیا سے فہیم اور اس کے بعد فوزیہ کے سلسلے میں بھی دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔ بہت سے سوالات تھے میرے پاس کالیا سے کرنے کو۔

اس نے یہی بتایا کہ فہیم کے ساتھ ساتھ فوزیہ اور اس کے منگیتر مسعود کا علاج بھی جاری ہے لیکن شاہ میر یا فوزیہ کے باپ کو نہیں پتا تھا کہ میرا بھائی اور کالیا بھی اسی اسپتال میں موجود ہیں۔ یہ کالیا کا کہنا تھا مگر دوسری جانب اس نے اپنے اس یقینی خدشے کا بھی اظہار کر ڈالا کہ اگر فوزیہ کے باپ عطا محمد کو نہیں لیکن شاہ میر کو ان کی وہاں موجودگی کا علم ہو چکا ہے کیونکہ اس نے دو مشکوک افراد کو وہاں دبئی کے اسپتال میں اس کی (کالیا کی) ریکی کرتے محسوس کیا تھا۔

''چل جگری! اس کو کھڈے لگا......'' آخر میں کالیا اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''یہ بتا یہاں کیا تُو کھچڑی پکا رہا ہے؟ مجھے تو یہاں جنگ کا سماں دیکھنے میں آ رہا ہے۔''

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور جواب میں بولا۔

''تجھے محمود نے سب بتایا تو ہوگا کہ یہاں میں کن حالات سے دوچار رہ چکا ہوں؟''

''ہاں! بتایا تو ہے، اسی لیے میں تجھ سے یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ تُو یہاں آ کر اپنے مقصد سے ہٹ چکا ہے جگری! اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''لیکن میرا خیال تم سے مختلف ہے کالیا!'' میں نے پُرمتانت سے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ میرا اصل مقصد تو اب شروع ہوا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں اپنے اصل مشن سے ہٹ گیا ہوں۔ شاہ میر اور بن رائد کو ہم جتنا معمولی سمجھے ہوئے تھے وہ ہماری خام خیالی ہی نہیں بلکہ خطرناک غلطی بھی تھی۔ ان کی پشت پر ایک بڑی طاقت کا ہاتھ ہے اور وہ اس کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔

اس وقت ان کا ٹارگٹ بحرین کی دور اُفتادہ صرائفہ کی یہ صحرائی بستی ہے۔''

کالیا میری باتیں غور سے سنتا رہا۔ محمود بھی اس سے باتیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی نیلم ابوشاہ کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ہم سب اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اس کے چہرے سے جوش ہویدا ہوتا تھا لیکن ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائی تھی اور پھر اس نے کالیا کے بارے میں پوچھا تو میں نے اس کے بارے میں بتا دیا کہ یہی وہ میرا دوست تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ شہزادی نیلم نے اس سے بھی مل کر خوشی کا اظہار کیا۔

کالیا نے نہایت احترام سے اسے سلام کیا تھا، میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے کچھ مرعوب سا ہو رہا تھا، حالانکہ صرف میں ہی کالیا کو اس بارے میں جانتا تھا کہ وہ کسی سے کم ہی مرعوب ہوتا تھا۔ بے شک وہ خواتین کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن شہزادی نیلم کے سامنے اس کے انداز و اطوار کی بات کچھ اور ہی نظر آ رہی تھی۔

''ہم لوگ جنگ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔'' شہزادی نیلم نے باوقار لہجے میں جیسے اعلان کیا اور اپنا بیان جاری رکھا۔

''اور...... مجھے اُمید ہے تم لوگ ہماری کامیابی کی دعا ضرور کرو گے۔''

وہ مختصراً اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔

''شہزادی صاحبہ! ہم ضرور آپ سب کی کامیابی کے لیے دعا گو رہیں گے لیکن آپ بہتر سمجھتی ہیں کہ اس مسئلے کا حل جنگ ہی ہے؟'' میں نے کہا تو شہزادی نیلم میری بات پر دھیرے سے مسکرائی اور بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس سلسلے میں کچھ تحفظات ہیں۔ ہم خود بھی اس سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن اب موجودہ حالات بھی تمہاری نظر سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ پانی بند کر دینا ایک بہت بڑا قبیح اور مجرمانہ فعل ہے۔ ایسے دشمنوں کے خلاف اعلانِ جنگ جہاد ہی کہلاتا ہے۔ ہم اب اس ناگزیر جنگ سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ یہ بھی ایک مجرمانہ غفلت کہلائے گی، کیونکہ ہمارے لیے اب یہ زندگی اور موت کا سوال بن چکا ہے۔''

شہزادی نیلم نے مجھے بولنے کا موقع دیا تو پھر میں خاموش نہیں رہ سکا اور بولا۔

''شہزادی صاحبہ! بے شک بعض حالات میں جنگ نہایت ضروری ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ آیا ہم جنگ کرنے کی کس پوزیشن میں ہیں؟ اگر کمزوری پر ہیں اور دشمن طاقت ور تو خدانخواستہ شکست بھی ہو سکتی ہے اور پھر یہی شکست دشمن کی طاقت کو کئی گنا بڑھا دے گی پھر کیا ہوگا؟ اس کشت و خون میں اپنے ہی بے گناہ ساتھی مارے جائیں گے۔ آپ کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ صرائفہ آپ کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اس کی زمین میں چھپے ہوئے تیل کے خزانوں پر دشمن قابض ہو جائیں گے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو! مسٹر نعمان؟ کیا میں ان لوگوں سے یہ کہوں کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ ہم دشمن سے مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اذیت ناک اور بزدلوں والی موت مر جائیں؟ پھر یہ سب محل پر ہلہ بول دیں گے۔ یہاں خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔''

''یہ سب باتیں آپ کی درست ہیں شہزادی صاحبہ!'' اس بار کالیا نے مداخلت کی۔ وہ پورے اعتماد سے نیلم سے مخاطب ہوا تھا۔ آگے بولا۔ ''لیکن آپ ہم پر بھی بھروسا کر کے دیکھیں۔ ہمیں کچھ کرنے کا موقع ہی کب ملا ہے؟ نعمان کو یہاں آئے ہوئے دوسرا ہی دن ہوگا اور آتے ہی اسے ایک تلخ تجربے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ وہ بات ختم ہوئی لیکن اب ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔ آپ یہاں کی شہزادی ہیں اور قبیلے کی سردار بھی۔ لوگوں کو تھوڑا سمجھانے کی کوشش کریں۔''

کالیا کی بات پر میں نے شہزادی کے جوش میں دراڑیں سی پڑتے محسوس کیں اور اس کی فراخ و شفاف پیشانی پر سوچ کی سلوٹ اُبھری۔ تب ابوشاہ اور محمود نے بھی ہماری ہی بات کی تائید کی تو بالآخر شہزادی واپس پلٹ گئی۔

اب ہم تینوں اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد غم زدہ سا ابوشاہ بھی ہمیں ڈھونڈتا ہوا اسی کمرے میں آ گیا۔

''برادر نعمان! میں سخت فکر مند ہوں۔ میں جانتا ہوں صرائفہ کے غریب لوگ خدی والوں کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ ان کے پاس برائے نام اسلحہ ہے۔ یہ لوگ محض اللہ کے آسرے پر سروں پہ کفن باندھے نکلے ہیں۔ شہزادی نیلم کو اگر کچھ ہو گیا تو دشمنوں کے خلاف ایک بہت بڑی دیوار ڈھے جائے گی۔ کاش! تمہاری باتوں کا اثر شہزادی پر ہو جائے۔''

PakiBooks.Site

محمود روہانسا ہوگیا۔ محمود نے جو کہا تھا وہ میں خود بھی محسوس کررہا تھا۔ جبکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ خود میرے اندر حذی والوں کے خلاف نفرت و جوش کا لاوا پک رہا تھا۔

میں نے دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

’’تم فکر مت کرو محمود! یہاں میں صرف صرائفہ والوں کا مہمان بننے نہیں آیا ہوں۔ کالیا میرا یار آگیا ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اسے سید حا میرے پاس لے آئے، نہ بھی لاتے تو بھی میں یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ شہزادی نیلم کے ہماری باتیں دل کو لگی ہیں۔‘‘

’’یہ دعا کرواب کہ صرائفہ کے لوگ ان کی بات تسلیم کرلیں۔‘‘ ابوشاہ نے بھی فکرمندی سے کہا۔

یہ سب پُر اُمید نظر آنے لگے۔

میں نے کالیا کی طرف دیکھا۔ ’’تیار ہے ناتُو؟‘‘

’’ابے لے جگری! میں تو ہردم تیار ہی رہتا ہوں، آگے بول......‘‘ وہ بھی پورے جوش سے بولا۔

اس درمیان میں تھوڑی دیر بیتی تھی کہ باہر لوگوں کی جھنجھناہٹیں گونجنے لگیں۔ میں اور کالیا کھڑکی کی طرف آئے، وہاں سے باہر سرمئی شام میں احاطے کا منظر واضح تھا۔ مجمع کے کچھ لوگ اپنے ہتھیاروں کو بلند کیے اُونچی آوازوں میں کچھ کہہ رہے تھے لیکن پھر وہ سب ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اس کے بعد ہم نے مجمع کو منتشر ہوتے دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد شہزادی نیلم نے آکر بتایا کہ وہ لوگ بڑی مشکل سے ہی اس کی بات مانے ہیں لیکن اب حذی والوں کے خلاف کچھ نہ کچھ ہوجانا چاہیے۔‘‘

’’آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں شہزادی صاحبہ!‘‘ اچانک کالیا بولا۔ میں نے محسوس کیا کہ کالیا شہزادی نیلم میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے کی کوشش کررہا تھا، کیوں؟ مجھے ابھی اس کا کچھ صحیح طرح اندازہ نہ ہوا۔ وہ اب خود ہی شہزادی نیلم سے مخاطب ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

بہرکیف میں محمود اور ابوشاہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے حذی کی طرف جانے کا راستہ پوچھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جب رات سر پہ تھی میں اور کالیا خانہ بدوش بدوؤں کے بھیس میں حذی کی جانب روانہ ہوچکے تھے لیکن صرائفہ سے روانگی سے قبل ہم شہزادی نیلم سے یہ کہہ چکے تھے کہ کل صبح تک صرائفہ کے سارے فلج پانی سے لبالب بھر جائیں گے۔

ہم نے ایک ہی اونٹ لیا تھا۔ ایک ایک پستول ہمیں ابوشاہ نے روانگی کے وقت تھما دیا تھا۔

ہم دونوں تیز رفتار اُونٹنی میں سوار اسی راستے پر گامزن تھے جو کوہِ جبل کی طرف جاتا تھا۔

تیس، چالیس کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے تیز رفتار اُونٹنی میں نصف سے پون گھنٹے میں طے کرلیا تھا۔ ہمیں اب پہاڑیوں کے آثار نظر آرہے تھے۔

پہاڑیاں کیا تھیں، بس خشک ٹیلے تھے، جو باہم اس طرح پیوست تھے کہ اچھا خاصا پہاڑی سلسلہ نظر آتا تھا۔ نیز ابوشاہ نے ہمیں یہاں کا نقشہ بھی سمجھاتے ہوئے یہ کہہ کر تھما دیا تھا کہ اس کے جنوب مغرب میں تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر حذی کی سرحدیں شروع ہوجاتی تھیں۔

مدھم سی چاندنی اور تاروں کے جھرمٹ کی روشنی میں نسبتاً بلند ٹیلوں کے آثار نظر آتے ہی میں نے اُونٹنی کی باگیں کھینچ لیں اور اسے مخصوص انداز میں ہشکارے دے کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نیچے اُتر آئے۔

ابوشاہ نے ہماری رہنمائی کی تھی۔ قریب اُونٹ کٹارا کے جھنڈ میں اُونٹنی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد میں اور کالیا ان خشک اور بنجر پہاڑی ٹیلوں کی طرف بڑھنے لگے۔

بلاشبہ یہ اقدام خطرناک اور اس سے زیادہ رسکی تھا، لیکن اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ اپنے مشن کو آگے بڑھانا ازبس ضروری ہوگیا تھا۔

’’جگری! یہاں مجھے دور نزدیک تک کسی قسم کی پہرے داری کا بندوبست نظر نہیں آتا۔‘‘

ایک نسبتاً اُونچی ریتیلی ڈھلان پر ذرا رکنے کے بعد کالیا نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

’’حذی جیسے قصبے کو بھلا کن لوگوں سے خطرہ ہوسکتا ہے؟ صرائفہ کی کم مائیگی اور اُجڑی پجڑی حیثیت سے تو بھی آگاہ ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن پھر بھی ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔ ہم اپنے سب سے خطرناک دشمن کی کچھار میں گھسنے والے ہیں۔‘‘

’’ابے لے جگری احتیاط تو ہمیں اپنے سائے تک سے بھی رہتا ہے۔‘‘ کالیا بولا اور میں نے اس کا شانہ تھپتھپا دیا۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھ گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہماری اُونٹنی اپنے من پسند ’’کھاجے‘‘ سے دور کہیں بھی نہیں جاسکتی۔ اُونٹ کٹارا ان کی بڑی مرغوب غذا ہوتی ہے، یہ بات ہمیں ابوشاہ نے بتائی تھی۔

ہم اب ٹیلوں کے درمیان بنے ٹیڑھے میڑھے قدرتی راستوں پر چلنے لگے۔ چند گام اور آگے بڑھے ہوں گے کہ ہمیں سامنے پہاڑی ٹیلوں پر چاندکی روشنی میں چند مسلح ہیولے دکھائی دیے، جہاں کہیں کہیں اُونٹ بندھے ہوئے تھے اور ایک پرانا سا ٹرک کھڑا تھا۔ اس پر گول ٹینکر نصب تھا۔ اس سے ایک موٹا پائپ منسلک تھا جس کا دوسرا سرا زمین پر ایک جگہ قدرے مستطیل قطع اراضی پر بنے ہوئے کنویں نما شے کی منڈیر کے اندر جاتا تھا۔

’’صرائفہ اور حذی کو جانے والے پانی کی نالیاں اسی کنویں سے جاتی ہیں۔‘‘ میں نے سرگوشی کی۔ ’’مگر حدی والے یہاں قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔‘‘

’’ابے لے......! یہ تو بہت کم تعداد میں نظر آرہے ہیں۔‘‘ کالیا بولا۔ ’’اگر صرائفہ کے جنگجو یہاں لڑائی کرتے تو انہیں با آسانی فتح حاصل ہوسکتی تھی۔‘‘

’’یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔‘‘ میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں ہونٹ سکیڑے پھر بولا۔ آگے بڑھتے ہیں، ابھی تک تو کچھ واضح بھی نہیں ہورہا۔

’’میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، ان خشک ریتیلے ٹیلوں سے بھلا ایسے قدرتی چشمے کہاں سے اور کیسے نکلتے ہوں گے؟ جبکہ اس بوڑھے مدبر (ابوشاہ) نے بتایا تھا کہ کوہِ جبل ایک بڑا پہاڑی سلسلہ ہے۔‘‘ کالیا نے بھی اپنے اندر کی اُلجھن نکالنا چاہی تھی۔

ہم آگے بڑھے اور جب ایک نسبتاً اُونچے ٹیلے کی ڈھلان کو سر کرکے اس کی چوٹی پر پہنچے تو سامنے کا منظر ہمیں دنگ کرگیا۔

سرمئی پہاڑیوں کا سلسلہ ان ریتیلے ٹیلوں سے کہیں آگے تھا اور وہاں کی سنگلاخ ڈھلانوں سے بہتے چشموں کا پانی چاندنی میں ابرق کی طرح چمک رہا تھا اور وہاں سامنے ایک وسیع میدان نظر آتا تھا، جہاں اُونٹ اور موٹر گاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں، ہم دونوں نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے وہاں خیمے بھی گڑھے ہوئے دیکھے اور اس کے اطراف میں لاتعداد مسلح اور غیر افراد کو بھی مٹرگشت کرتے دیکھا۔ ہنڈوں کی روشنی میں گویا وہاں ہمیں کسی فوجی چھاؤنی کا ہی منظر دیکھنے میں آرہا تھا۔

’’ابے لے......جگری! یہاں تو اور ہی کھچڑی پکی ہوئی نظر آرہی ہے۔‘‘ کالیا کے منہ سے سرگوشی کی صورت، متحیرانہ آواز برآمد ہوئی۔ جس کی تہہ میں گہری تشویش بھی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے اور پھر بولا۔

’’ان کم بختوں نے صرائفہ والوں کا مکمل طور پر پانی بند کرنے کی مذموم سازش یہاں تیار کررکھی ہے۔ صرائفہ کی تباہی میں اب کوئی شک نہیں رہا۔‘‘

’’یہ بعد کی بات ہے جگری! یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟ یہ تو تعداد میں کسی فوج سے کم نہیں ہیں۔‘‘ کالیا بولا۔ ’’اور ہم صرف دو ہیں، پستولیں بھی دو۔ جن کے چیمبر میں چھ سے زیادہ گولیاں نہیں سماسکتیں۔‘‘

’’ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے، لیکن واپس صرائفہ بھی کس منہ سے لوٹیں گے؟‘‘ میرے لہجے میں تفکر و پریشانی کے گہرے آثار سموئے ہوئے تھے۔

’’ابے لے جگری! اتنی جلدی گھبرا کے ہمت توڑ ڈالی۔‘‘ وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ ’’ہم حذی کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں بن رائد کو یرغمال بناکر اسے کوہِ جبل کا قبضہ ختم کرنے پر مجبور کردیں گے۔‘‘

’’سننے کی حد تک تمہاری تجویز پُرکشش ہے کالیا!‘‘ میں نے نیچی آواز میں کہا۔ ’’لیکن عملی طور پر یہ بھی ناممکن نظر آتا ہے۔ بن رائد یہاں اپنے قبیلے کا سردار ہے۔ وہاں وہ اکیلا ہمارے انتظار میں نہیں بیٹھا ہوگا۔‘‘

’’یہ تو ہے۔ لیکن یارا یہ بھی تو دیکھ کہ یہاں ایک پورے محاذ کی کیفیت نظر آتی ہے۔ حدی میں ایسا کچھ نہیں ہوگا اور پھر اس کے سواہ ہمارے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ ممکن ہو دوسرا آپشن نسبتاً آسان ہو۔‘‘ کالیا کی اس تجویز کو آزمانے کے سواہ ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا، یہ سوچ کر ہم واپسی کے لیے پلٹے ہی تھے کہ اچانک ہمارے چہروں پر روشنی کا جیسے سیلاب اُمڈ آیا اور ساتھ ہی ایک گرجدار کرخت آواز اُبھری۔

’’خبردار......! کوئی حرکت مت کرنا، ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔‘‘ یہ خونخوار سی کرخت آواز میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس وقت ہماری آنکھیں ایک لمحہ کو چندھیا گئی تھیں۔ دیکھنے کے ذرا قابل ہوئیں تو سامنے آٹھ دس کی تعداد میں مسلح افراد ہماری جانب گنیں تانے مستعد کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک گرانڈیل شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی جدید ساختہ گن تھمی ہوئی تھی۔

یہ راکا تھا۔

(جاری ہے)

PakiBooks.Site

بیت بازی

قارئین

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

عبدالستار..........ساہیوال

اب تو یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے بہت دور بسائی ہیں بستیاں

ممتاز اشعر..........لاہور

اشکوں سے تر ہے پھول کی ہر اک پنکھڑی
رویا ہے کون تھام کے دامن بہار کا

احمد جان..........لاہور

اس قدر سہمے ہوئے رہتے ہیں ہم حالات سے
گھر میں بھی رہتے ہوئے لگتے ہیں بے گھر کی طرح

سہیل اختر..........جھنگ

انجان نگاہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے تھے

مسز اشفاق احمد..........کراچی

اے کاش یہاں برس جائے نور کی بارش
ایمان کے شیشوں پہ بڑی گرد پڑی ہے

افشاں بتول..........ساہیوال

افلاک کے پردوں سے یہ جاری ہوا فرمان
والعصر خسارے ہی خسارے میں ہے انسان

(عبدالحکیم شر کراچی کا جواب)

نمایاں امتیاز..........کراچی

وفا کی کرچیاں ٹوٹی ہوئی میں یاد رکھوں گی
وہ اپنی چاہتیں چھوٹی ہوئی میں یاد رکھوں گی

عطاء الجلیل..........واہ کینٹ

وہ شخص لباس تھا مرا
رقیبوں کو مبارک ہو اترن ہماری

(نزابت افشاں مہورہ فتح جنگ)

نواب علی..........کراچی

نہ کرنا دولت و حشمت پہ ناز جیتے جی
مریں تو جانے کفن بھی کسے کہاں سے ملے

عابد علی عطاری..........میر پور خاص

نہ رہا حسن کی محفل میں کوئی میرے بعد
عشوہ و ناز کے انداز سمجھنے والا

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

احمد مختار..........بھکر

رئیس اس انجمن میں تم بھی چلے
کہ سوئے شمع پروانے چلے ہیں

نعمان احمد..........سیالکوٹ

روتے روتے اے ساغر ابھی ہنس پڑوں
سوتے سوتے مقدر میرا جاگ اٹھے

زاہدہ انیس..........شادی پور

راس نہ آئی تیری چاہت
دل دے کر ہم تو پچھتائے

زاہد علی..........میر پور

راضی ہیں ہر اک حال خرابات میں کشور
جو درد ملا اس کو دوا مان لیا ہے

عباس انصاری..........مظفر گڑھ

رکھ کر یہ بات پیش نظر میں چلا گیا
کوئی نہ جا رہا تھا اُدھر میں چلا گیا

(افشین عزیز وہاڑی کا جواب)

محمد فہیم..........کراچی

یہی ہوا ہے مرا دل کے ساتھ سمجھوتا
کہ پاس ہی رہے اس کے مگر بدل جائے

نصرت ڈرائیور..........حیدر آباد

یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا

نسیم شیخ..........لاہور

یہ بوند بوند سی بارش کسی کی یادوں کی
میرے یقین کا کچا مکاں گرائے گی

(ایم افضل کھرل ننکانہ کا جواب)

اشعر ناز..........راولپنڈی

نیتوں کا بھید تو کھلتا ہے منزل کے قریب
ورنہ آغاز سفر میں راہزن کوئی نہیں

نعمان احمد..........سرگودھا

نمود صبح کا پیغام لا رہے ہیں چراغ
اندھیری رات کے دامن پہ چھا رہے ہیں چراغ

عابد علی..........راولپنڈی

نہ جانے کون دبے پاؤں خواب میں آیا
کھلی جو آنکھ تو خوشبو میں بس رہا تھا مکاں

(احمد علی کراچی کا جواب)

مریم بنت کاشف..........حیدر آباد

بیٹھا ہوں اس درخت کے سائے میں اس لیے
اک زلف مہرباں تھی اسی چھاؤں کی طرح

آفاق حسین..........لاڑکانہ

بادل گرج رہے ہیں گھٹاؤں کی خیر ہو
ہیں لوگ بے زباں صداؤں کی خیر ہو

(ناہید ابرار شجاع آباد کا جواب)

نزابت افشاں..........مہورہ فتح جنگ

آپ جس بات پر اترائے پھرتے ہیں
اسے ہم فقیروں میں عیب گنا جاتا ہے

شیخ اکرام..........سرگودھا

اس کے قریب جاؤں، اس تک نہ پہنچ پاؤں
آئینہ یاد رکھوں اور عکس بھول جاؤں

(فلک بنت عبدالندیم حیدر آباد)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان..........فورٹ عباس

اب نزاع کا عالم ہے مجھ پر اپنی محبت واپس لے لو
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں

زاہد خان..........کراچی

اس رونق بہار کی محفل میں بیٹھ کر
کھاتے رہے فریب بڑی سادگی سے ہم

(ڈاکٹر عبدالغنی شکیل ملتان کا جواب)

غضنفر عباس مرزا..........اسلام آباد

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

عطیہ زہرا..........پشاور

یہ دنیا بڑی کاروباری ہوئی
مجھے چند لمحوں کی سوغات دو

محمد فیض..........ساہیوال

یہ زندان قفس آخر کو اک دن ٹوٹ جائے گا
لبوں پر گو اسیروں نے صدائیں باندھ رکھی ہیں

بیت بازی کا اصول ہے۔ جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے)

113

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

PakiBooks.Site

پکار

محترم مدیراعلیٰ

السلام علیکم

مجھے کہانی لکھنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں، ہاں پڑھنے کا شوق بہت ہے۔ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ اپنی آپ بیتی بھی لکھ دوں سو ذہن پر زور دے دے کر تمام باتیں لکھ دیں۔ یقیناً یہ سچ بیانی قارئین کو بھی متاثر کرے گی۔ جنگ ستمبر نے بے شمار کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ میری روداد میں بھی جنگ ستمبر کا کردار اہم ہے۔ اس جنگ نے میری زندگی کے رخ کو تبدیل کردیا ہے۔ ایک اہم بات بتادوں کہ میں نے اپنے شہر اور کرداروں کے نام تخیلی رکھے ہیں، سب کے نام تبدیل شدہ ہیں۔

احمد

(فیصل آباد)

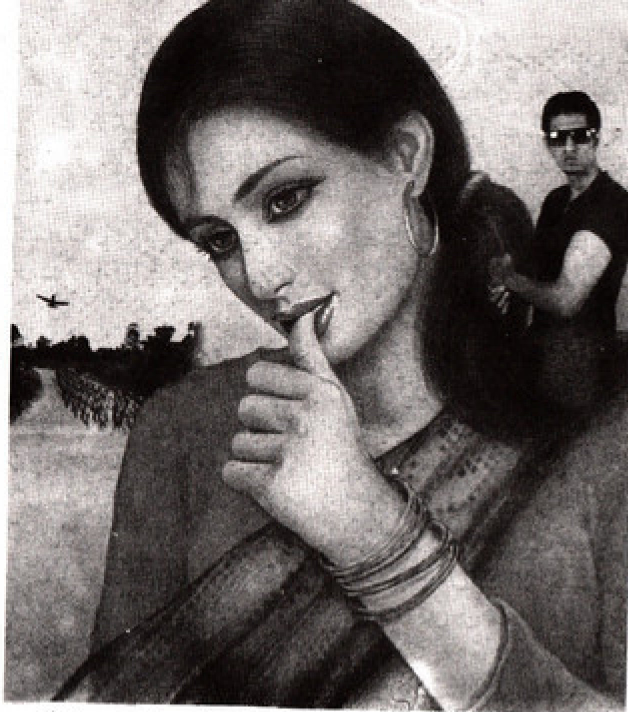
ساجد سے میری کبھی نہیں بنی۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ مجھ جیسے سیدھے سادے اور صلح جو قسم کے لوگ اس سے دور رہنے میں ہی عافیت محسوس کرتے تھے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرتا لیکن مجبوری تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس سے ملنا پڑتا کیونکہ رشتہ داری کا معاملہ تھا۔ دراصل وہ ثوبیہ کا تایا زاد بھائی تھا اور وہ میری پھوپی کی بیٹی تھی۔ اس وجہ سے اس گھر میں ہمارا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پھوپی ماجدہ، ابو کی اکلوتی بہن تھیں اور دونوں بہن بھائیوں میں بڑی محبت تھیں۔ پھوپا ذرا سخت طبیعت کے تھے اور انہیں پھوپی کا گھر سے نکلنا پسند نہیں تھا۔ اس لیے وہ ہمارے گھر بہت کم آتی تھیں لیکن ابو کو ان کی شکل دیکھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ ہر چھٹی والے دن ہم لوگوں کو لے کر وہاں چلے جاتے اور واپسی رات کے کھانے کے بعد ہی ہوتی تھی۔

پھوپا کی طبیعت میں سختی ضرور تھی لیکن وہ بے حد ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ ابو سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی اور وہ ان سے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ ان کا مکان دو منزلہ تھا اور اوپر ان کے بڑے بھائی کی فیملی رہتی تھی۔ ساجد انہی کا بیٹا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اس کے خوب ناز نخرے اٹھائے جاتے۔ ثوبیہ کے تایا ارشد مرزا کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ ان کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس لیے وہ ساجد کی ہر فرمائش پوری کرتے۔ اس بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے وہ بہت خودسر اور ضدی ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں بچپن سے ہی یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ دنیا اس کے لیے ہی بنی ہے اور وہ جب چاہے اپنی مرضی کی چیز حاصل کر سکتا ہے۔

شروع شروع میں تو گھر والوں نے اس کے رویے اور حرکات پر توجہ نہیں دی لیکن جب اس کی شکایتیں آنا شروع ہوئیں تو ارشد مرزا کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے اسے سمجھانا چاہا تو وہ صاف مکر گیا اور اس نے انہی لوگوں کو برا بھلا کہا جو اس کی شکایت لے کر آئے۔ ارشد مرزا کو خود بھی اس کی بہت سی باتوں کا علم تھا۔ انہوں نے جب ذرا سختی سے بات کی تو وہ بھتے سے اکھڑ گیا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسے زیادہ تنگ کیا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا اور وہ اس کی شکل دیکھنے کو ترس جائیں گے۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور ارشد مرزا نے خاموشی اختیار کر لی لیکن وہ گاہے بگاہے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے، اس اُمید پر کہ شاید وہ سدھر جائے۔

بچپن کی شرارتیں رفتہ رفتہ آوارگی کا روپ دھارنے لگیں۔ کالج میں جا کر تو وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ اتفاق سے میں نے بھی اسی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اس لیے مجھے اس کی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ باقاعدگی سے کالج جاتا تھا لیکن کلاس اٹینڈ کرنے کی بجائے بیشتر وقت کامن روم میں ٹیبل ٹینس یا کیرم بورڈ کھیلنے میں گزار دیتا اور جب اسے سگریٹ کی طلب ہوتی تو وہ کالج کے احاطہ کے باہر ایک کونے میں بنے ہوئے جھونپڑی نما ہوٹل میں چلا جاتا جو کیفے ڈی پھونس کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں کڑک چائے کے علاوہ سگریٹ بھی ملتی تھی۔ حالانکہ ہمارے کالج کی کینٹین بھی بہت صاف ستھری تھی اور وہاں اسپیشل چائے کے علاوہ بسکٹ اور پیسٹری بھی ملتی تھیں لیکن سگریٹ لینے کے لیے کیفے ڈی پھونس ہی جانا پڑتا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ساجد پڑھائی کے علاوہ ہر سرگرمی میں پیش پیش تھا۔ وہ کرکٹ کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس نے ٹرائلز میں حصہ لیا اور کالج کی ٹیم کے لیے منتخب ہو گیا۔ سالانہ گیمز ہوئے تو اس نے سو میٹر کی دوڑ، لانگ جمپ اور ڈسکس تھرو میں حصہ لیا اور تینوں میں اسے پہلا انعام ملا۔ اس زمانے میں کالجوں میں طلبہ یونین ہوا کرتی تھی۔ اس نے یونین کے انتخابات میں بھی اپنے حامی امیدواروں کے



لیے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ ہمارے کالج میں مخلوط تعلیم تھی۔ اس نے چند لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھائی اور ان کے ساتھ مل کر اپنے پینل کے لیے کام کرنے لگا تھا۔ اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور اس کا گروپ بھاری اکثریت سے جیت گیا۔

الیکشن ختم ہونے کے بعد بھی ان لڑکیوں سے اس کا تعلق قائم رہا۔ کالج کے کینٹین میں لڑکے اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ پورشن بنے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہاں ساتھ بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ کالج کا وقت ختم ہونے کے بعد کسی لڑکی کے ساتھ مرکزی سڑک پر واقع ایک ریستوران میں چلا جاتا جو ایسی ملاقاتوں کے لیے مشہور تھا۔ کئی مرتبہ وہاں پولیس کا چھاپہ بھی پڑ چکا تھا لیکن ہوٹل کی انتظامیہ کچھ دے دلا کر معاملہ رفع دفع کر دیا کرتی تھی۔

امتحانات قریب آئے تو حاضریاں کم ہونے کی وجہ سے اسے وارننگ مل گئی۔ میرا خیال تھا کہ اس وارننگ کے بعد وہ محتاط ہو جائے گا اور سال کے بقیہ حصے میں اپنی حاضریاں پوری کرے گا لیکن اس کے برعکس اس نے یونین والوں کا اثر رسوخ استعمال کر کے اپنی حاضریاں پوری کروالیں اور اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تیاری نہ ہونے کے سبب وہ امتحان میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا لیکن جب نتیجہ آیا تو وہ پانچوں پرچوں میں پاس تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے نقل کی تھی لیکن اتنی ہوشیاری سے کہ کوئی بھی نگراں اسے نہیں پکڑ سکا۔

سیکنڈ ایئر کی کلاسیں شروع ہوئیں تو ایک دن اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ کینٹین لے گیا۔ اس نے چائے اور پیٹیز منگوائیں اور کہنے لگا۔ ”احمد ہم کلاس فیلو ہونے کے ساتھ رشتہ دار بھی ہیں۔ اس کے باوجود تم مجھ سے دور دور رہتے ہو۔ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

اس کے بدلے ہوئے رویّے نے مجھے حیران کردیا۔ اسے اچانک ہی کیوں یاد آگیا کہ ہم کلاس فیلو ہونے کے علاوہ آپس میں رشتہ دار بھی ہیں ورنہ گزشتہ ایک سال کے دوران اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اگر اتفاقاً آمنا سامنا ہو گیا تو ہائے ہیلو سے آگے معاملہ نہیں بڑھا۔ یقیناً اسے مجھ سے کوئی کام ہوگا۔ بہرحال میں نے اخلاقاً کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل ہم دونوں کی مصروفیات الگ الگ ہیں اس لیے کبھی قریب ہونے کا موقع نہیں ملا۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ میری طرف غور

PakiBooks.Site

سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دراصل میں نے اپنی ٹانگ اتنی جگہ پھنسالی ہے کہ مجھے کلاسیں اٹینڈ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے میری فرسٹ ایئر میں تیاری نہیں ہوسکی۔ میں نے جیسے تیسے امتحان پاس تو کرلیا لیکن اب پوری تیاری کے بغیر کامیابی مشکل ہے۔“

”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ان مصروفیات کی وجہ سے تمہاری پڑھائی متاثر ہورہی ہے تو ساری ایکٹویٹیز چھوڑ کر پڑھائی میں لگ جاؤ۔“

”بہت مشکل ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں اتنا پھنسا ہوا ہوں کہ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو ان مصروفیات سے الگ نہیں کرسکتا اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم میری مدد کرو۔“

”میں؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”میں بھلا تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟“

”دیکھو احمد، میں جانتا ہوں کہ تم روزانہ کالج آتے اور ساری کلاسیں اٹینڈ کرتے ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم لیکچر سن کر اپنے نوٹس خود بناتے ہو۔“

”پھر؟“ میں نے کہا۔ ”میرے نوٹس سے تمہیں کیا لینا دینا؟“

”اگر تم اپنے نوٹس مجھے دے دو تو میں انہیں اپنی کاپی میں اتار کر واپس کردوں گا۔ اس طرح میری تیاری بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہے گی۔“

پہلے میں نے سوچا کہ اسے صاف انکار کردوں۔ وہ لاابالی طبیعت کا بندہ تھا۔ اگر اس کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے میرے نوٹس ضائع ہوگئے تو مجھے دوبارہ محنت کرنا پڑے گی لیکن انکار کرنے کی صورت میں یہ خطرہ تھا کہ وہ کہیں میرا دشمن نہ بن جائے اور مجھے کوئی بڑا نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے اس لیے میں نے اسے نوٹس دینے پر رضامندی ظاہر کردی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ ایک دن بعد مجھے نوٹس واپس کردیا کرے تاکہ میرے کام کا ہرج نہ ہو، اس نے یہ شرط مان لی اور یوں یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

آگے کے واقعات بیان کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے اور ثوبیہ کے تعلق کے بارے میں کچھ بتا دوں، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ابو اور پھوپی میں بڑی محبت تھی اور ہم ہفتہ میں ایک بار ان کے گھر ضرور جاتے تھے پھر ہوا یوں کہ ابو کا ٹرانسفر دوسرے شہر ہوگیا۔ انہوں نے جاتے وقت مجھے تاکید کی کہ میں وقتاً فوقتاً پھوپی کی خیروعافیت معلوم کرنے ان کے گھر جاتا رہوں، مجھے بھی ثوبیہ سے ایک طرح کی انسیت ہوگئی تھی اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ ابو کے جانے کے بعد اس سے ملنے کی کیا صورت ہوگی لیکن انہوں نے خود ہی اس کے گھر جانے کا کہہ کر یہ مسئلہ حل کردیا۔

میں ہفتہ میں ایک دو مرتبہ کالج سے واپسی پر پھوپی سے ملنے چلا جاتا اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اپنے گھر آجاتا۔ پھوپی اصرار کرکے مجھے کھانے کے لیے روک لیتیں۔ اس کے بعد ثوبیہ میرے لیے چائے بناتی اور ہم ہلکی پھلکی گپ شپ شروع کردیتے۔ اسے کرکٹ، فلموں اور سیاست سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ کرید کرید کر مجھ سے فلم اسٹارز کے اسکینڈلز کے بارے میں پوچھتی کیونکہ میں اخبار باقاعدگی سے پڑھتا تھا اس لیے میری جنرل نالج بہت اچھی تھی۔ مجھے کچھ معلوم ہوتا، اسے بتا دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے درمیان بے تکلفی بڑھتی گئی اور ہم اچھے دوست بن گئے۔

انہی دنوں مجھے ٹائیفائیڈ نے آن گھیرا جس کی وجہ سے میں پندرہ بیس دن تک کالج نہ جاسکا، اس زمانے میں ٹیلی فون عام نہیں ہوا تھا اس لیے میں کسی کو بھی اپنی بیماری کی اطلاع نہ دے سکا۔ نہ جانے پھوپی کو کیسے خبر ہوگئی اور وہ ثوبیہ کے ساتھ مجھے دیکھنے آگئیں۔

ثوبیہ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک سی اتر آئی لیکن گھر میں اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے اس لیے ہمارے درمیان صرف رسمی گفتگو ہی ہوسکی۔ اس کے جانے کے بعد میری تشنگی اور بڑھ گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا جب مجھے اس سے دوری کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دوڑتا ہوا جاؤں اور اس سے جی بھر کر باتیں کروں لیکن مجبوری تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے مزید ایک ہفتہ آرام کرنے کا کہا تھا۔

بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد جب میں پھوپی سے ملنے گیا تو ثوبیہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ اس کا یہ انداز میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں خود بھی اس کے لیے عجیب سے جذبات محسوس کررہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب ہم صرف کزن اور دوست نہیں رہے بلکہ ہمارے درمیان اس سے بڑھ کر کوئی رشتہ قائم ہوگیا ہے۔ فوری طور پر میں اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکا۔ شاید میری عمر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان باتوں کو سمجھ سکوں۔ بس ایک کشش تھی اور میں اس کی طرف کھنچا چلا جارہا تھا۔

وہ میرے لیے چائے اور ایک پلیٹ میں مٹھائی لے کر آئی اور بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ”یہ لو صحت یابی کی خوشی میں

منہ میٹھا کرو۔“

ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ساجد بھی وہاں آگیا۔ مجھے دیکھ کر وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”تم یہاں کیوں آگئے۔ اتنی طویل بیماری سے اٹھے ہو۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“

ایک مہینا تو اس نے میری خبر نہیں لی اور اب اسے میرے آرام کی فکر ہورہی تھی۔ میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔ ”دراصل ابو یہاں نہیں ہیں، وہ کہہ گئے تھے کہ میں ان کی غیر موجودگی میں یہاں کا چکر لگاتا رہوں۔“

”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان لوگوں کا خیال رکھنے کے لیے ہم موجود ہیں۔“ اس نے انتہائی بدتمیزی سے کہا۔ شاید اسے میرا آنا اچھا نہیں لگا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا لیکن ثوبیہ سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ تڑخ کر بولی۔ ”تم ہمارا کیا خیال رکھو گے، تمہیں تو اپنا ہوش نہیں۔ صبح کے نکلے رات کو گھر آتے ہو۔“

”تمہیں میرے معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ ”میری مرضی میں جب بھی گھر آؤں۔“ یہ کہہ کر وہ پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ثوبیہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ”اس شخص نے میری زندگی عذاب بنادی ہے، ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔ میں اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرسکتی۔ ہر کام میں بولتا ہے۔ یہ کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں۔ فلاں رنگ تم پر بہت اچھا لگتا ہے۔ بالوں کو کھلا چھوڑ دو۔ جوڑا تو بڑی عمر کی عورتیں بناتی ہیں اور اس طرح کی کئی باتیں۔ میری پرائیویسی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ ماں باپ نے بھی میرے معاملے میں مداخلت نہیں کی لیکن یہ فضول بکواس کرنے سے باز نہیں آتا۔“

”تم اس کے سامنے ہی مت آیا کرو، جب وہ آئے تو اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔“

”وہ وہاں بھی پہنچ جاتا ہے۔“ ثوبیہ تلخ لہجے میں بولی۔ ”اسے اتنی بھی تمیز نہیں کہ کمرے میں آنے سے پہلے دروازے پر دستک دے لیا کرے۔ بعض اوقات تو مجھے اتنی مہلت بھی نہیں ملتی کہ اپنا دوپٹا ہی اوڑھ...... لوں۔“

”بس تو پھر برداشت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مختلف بہانے سے اس سے دور رہو۔ کچن میں جاکر پھوپی کا ہاتھ بٹاؤ یا اپنے کمرے میں کتابیں کھول کر بیٹھ جاؤ۔“

”سب کچھ کرکے دیکھ لیا۔ وہ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے اور اب تو اس نے بہت ہی گھٹیا حرکتیں شروع کردی ہیں۔ لگتا ہے کہ بالکل ہی آوارہ ہوگیا ہے۔ مجھے بے ہودہ قسم کے لطیفے سناتا ہے میرے سامنے عشقیہ اشعار پڑھتا ہے اور تمہیں کیا کیا بتاؤں۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”تمہارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں۔ ان کا خیال رکھا کرو۔“ جی میں آیا کہ اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاؤں لیکن یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ بلاوجہ ہنگامہ ہوگا۔ میری بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ سب اسی کی حمایت کریں گے۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ سب کی آنکھ کا تارا ہے۔ اسے پوری آزادی ہے وہ جو چاہے کرتا پھرے اس کے عیب کسی کو نظر نہیں آتے۔“

”بس تو اس کا ایک ہی حل ہے۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”جب وہ آئے تو تم اسے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مت دو اور پھوپی کے ساتھ چپکی رہو۔ ان کی موجودگی میں وہ کوئی گستاخی نہیں کرسکے گا۔“

”ہاں یہ ہوسکتا ہے۔“ ثوبیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ثوبیہ کی باتیں سن کر میرے اندر غصے کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ساجد کا دماغ ٹھیک کردیتا لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں جسمانی طور پر اس سے کمزور تھا۔ اگر میں اس سے الجھتا تو شاید الٹا میری ہی دھنائی ہوجاتی۔ دوسرے یہ کہ وہ مجھ سے پوچھ سکتا تھا کہ میں کیوں ثوبیہ کے غم میں دبلا ہورہا ہوں۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے کس طرح بتاتا کہ ثوبیہ میرے لیے دن بدن اہم ہوتی جارہی ہے اور میں اسے کسی حال میں بھی پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔

دوسرے دن ساجد مجھے کالج میں ملا تو اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”احمد! تم نے میری کل والی بات کا برا تو نہیں منایا؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ”دیکھو یار! میں نے تمہارے بھلے کے لیے ہی کہا تھا ورنہ مجھے کیا، تم جہاں چاہو جاؤ۔ ویسے بھی وہ تمہاری پھوپی کا گھر ہے۔ وہاں آنے

PakiBooks.Site

سے تمہیں کون روک سکتا ہے۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ چاپلوسی کس لیے ہو رہی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ میں کہیں غصے میں آ کر اسے نوٹس دینا بند نہ کردوں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بالکل برا نہیں لگا۔ جانتا ہوں کہ تم نے میری بھلائی میں ہی کہا تھا۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ لمبی غیر حاضری کی وجہ سے میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔ جیسے ہی نوٹس تیار ہوں گے میں تمہیں دے دوں گا۔''

بیماری کی وجہ سے میں کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ اس خامی کو دور کرنے کے لیے میں نے ہمت پکڑی اور پوری دلجمعی کے ساتھ پڑھائی میں لگ گیا۔ اس وجہ سے کئی روز تک پھوپی کے یہاں بھی نہ جاسکا حالانکہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں ثوبیہ کی صورت ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتی۔ وہ بری طرح میرے حواسوں پر چھائی رہتی بالآخر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں ایک دن کالج سے واپسی میں پھوپی کے یہاں پہنچ گیا۔ ثوبیہ نے ہمیشہ کی طرح ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور بولی۔ ''کیا بات ہے۔ اس مرتبہ بہت دنوں بعد آئے؟''

''بس یونہی، ذرا مصروفیت زیادہ تھی۔'' میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو یا کوئی اور وجہ بھی ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''ہاں ثوبیہ! میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس دن میں نے ساجد کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اسے میرا یہاں آنا پسند نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو اس لیے میں نے جان بوجھ کر آنے میں دیر لگائی۔''

''تم اس کی پروا مت کرو۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں اس کی باتوں کو بالکل بھی اہمیت نہیں دیتی اب اگر اس نے تمہارے آنے پر اعتراض کیا تو میں اس کا دماغ ٹھیک کردوں گی اگر پھر بھی وہ باز نہ آیا تو میں ابو سے اس کی شکایت کروں گی۔''

''نہیں نہیں۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بس خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔''

''تم نہیں جانتے احمد۔'' اس نے تھوڑا سا جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب تم کئی دن تک نہیں آتے تو میں بے چین ہوجاتی ہوں۔ ہر گھڑی ہر پل تمہارا ہی انتظار رہتا ہے۔ پلیز آیندہ اتنی دیر مت لگانا۔ جلدی جلدی آیا کرو۔ تم سے مل کر تم سے باتیں کر کے مجھے بڑی ڈھارس ملتی ہے۔ کیا تم بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہو؟''

''ہاں ثوبیہ! میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میرے بس میں ہو تو روزانہ تم سے ملنے آؤں لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ بہرحال کوشش کروں گا کہ آیندہ زیادہ وقفہ نہ ہو۔''

امتحان قریب آئے تو میں پوری تندہی سے پڑھائی میں لگ گیا۔ میری مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے باوجود مجھے ثوبیہ سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ میں ہفتہ میں ایک مرتبہ پھوپو سے ملنے ضرور جاتا۔ چاہے دس منٹ کے لیے ہی سہی۔ مجھے ہر قیمت پر اچھے نمبر لانے تھے تاکہ میرا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہوسکے۔ ثوبیہ نے مجھے بتایا کہ ساجد بھی ان دنوں نہیں آرہا۔ لگتا ہے کہ وہ بھی امتحان کی تیاری کررہا ہے۔ مجھے یہ سن کر ہنسی آگئی کیونکہ میں اس کی تیاری کے بارے میں جانتا تھا۔ وہ میرے دیئے ہوئے نوٹس سے کارتوس بنا رہا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے خود بتائی تھی۔

''یار احمد! تمہارے نوٹس سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ کتاب سے نقل کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ بعض اوقات ممتحن سمجھ جاتے ہیں لیکن جب تمہارے نوٹس چھاپوں گا تو انہیں بالکل شک نہیں ہوگا اور وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے اپنی طرف سے لکھا ہے۔''

میں اس کی ذہانت اور چالاکی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر وہ پوری طرح پڑھائی پر توجہ دیتا تو نقل کے بغیر بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوسکتا تھا لیکن اس کے پاس پڑھائی کے لیے وقت نہیں تھا۔ بہرحال وہ جیسے تیسے سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔ اس کے مقابلے میں میرے بہت اچھے نمبر آئے تھے اور میں فرسٹ ڈویژن لانے میں کامیاب ہوگیا (اس زمانہ میں گریڈ کا رواج نہیں تھا)

میں مٹھائی لے کر پھوپی کے گھر گیا تو وہ بھی وہاں موجود تھا۔ خلاف توقع وہ مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور بولا۔ ''سچ پوچھو تو مجھے تمہاری کامیابی کی بہت خوشی ہے۔ کم از کم تمہارے سامنے ایک مقصد تو ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سیکنڈ ڈویژن میرے کس کام آئے گی۔''

''یہ مت سوچو۔'' میں نے کہا۔ ''ہر کوئی ڈاکٹر اور انجینئر نہیں بن جاتا۔ اس کے باوجود یہ دنیا کامیاب لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ تم بھی اپنے لیے کسی ایسی فیلڈ کا انتخاب کرسکتے ہو جس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا امکان

ہو۔''

''یار سچ پوچھو تو میرا پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگتا۔ میں بابا سے کہوں گا کہ وہ مجھے کوئی بزنس کروا دیں۔''

یہ کہتے کہتے اس نے میز پر پڑا اخبار اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک اشتہار پر گئی اور وہ نعرہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''وہ مارا۔''

ثوبیہ اور میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''یہ دیکھو فوج میں کیڈٹوں کی بھرتی کا اشتہار آیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ درخواست دے دوں۔ تین سارھے تین سال بعد کمیشن مل جائے گا۔''

''تم...... تم فوج میں جاؤ گے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ کیا میں فوج میں نہیں جاسکتا۔ اشتہار میں جو شرائط لکھی گئی ہیں میں ان پر پورا اترتا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہاں کا ڈسپلن، سختی برداشت کرلو گے۔ تمہارا لائف اسٹائل تو اس سے بالکل مختلف ہے۔''

''وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ساری زندگی تو اس طرح نہیں رہ سکتا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' ثوبیہ بولی۔ ''میں تم سے پوری طرح متفق ہوں۔ ویسے بھی مجھے فوجی بہت پسند ہیں۔ ان کی کیا شان ہوتی ہے۔ جس گلی سے گزر جائیں لوگ انہیں تعظیم دیتے ہیں۔ عزت سے پیش آتے ہیں۔''

''کیا واقعی تمہیں فوجی بہت پسند ہیں؟'' وہ ثوبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں تو کیا میں مذاق کررہی ہوں۔'' ثوبیہ نے کہا۔

''پھر تو میں فوج میں ضرور جاؤں گا۔ تمہارا دل جیتنے کے لیے یہ بہت ضروری ہوگیا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' ثوبیہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہارا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔''

''اپنے الفاظ یاد رکھنا۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ایسا نہ ہو کہ وقت آنے پر مکر جاؤ۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے ثوبیہ سے کہا۔ ''تمہیں اتنا بڑھ چڑھ کر بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب دیکھ لینا، وہ تمہاری جان کو آنک جائے گا۔''

''میں جان بوجھ کر اسے چڑھا رہی تھی تاکہ وقتی طور پر اس سے جان چھوٹ جائے اور تین چار سال سکون سے گزر جائیں۔ اس طرح اس کا کیریئر بھی بن جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ ٹریننگ کے بعد وہ ایک بدلا ہوا انسان نظر آئے۔''

''ہونہہ۔ کیریئر۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''مجھے تو اس کا سلیکٹ ہونا ہی مشکل لگ رہا ہے اور اگر ہو بھی گیا تو ایک دو ماہ بعد ہی واپس آجائے گا۔ اس سے وہاں کی سختی برداشت نہیں ہوگی۔''

''یہ اس کا مسئلہ ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ ساجد کے لہجے اور انداز سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ثوبیہ کو حاصل کرنے کے لیے کسی حد تک بھی جاسکتا ہے۔ اس کا آخری جملہ میرے دل میں پیوست ہوگیا تھا۔ شاید اس نے مجھے سنانے کے لیے خاص طور پر یہ بات کہی تھی تاکہ مجھے بھی معلوم ہوجائے کہ وہ ثوبیہ کے معاملے میں کتنا سنجیدہ ہے۔ اگر واقعی اس نے ثوبیہ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو میرا چانس تقریباً ختم ہوجائے گا کیونکہ یہ بالکل سامنے کی بات تھی کہ پھوپا میرے مقابلے میں اپنے بھتیجے کو ہی ترجیح دیں گے۔

ساجد پر برتری حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں اور وہ فوج میں نہ جاسکے۔ اس کے بعد اس کا مستقبل بالکل ہی تاریک ہوجاتا اور اس کی پوزیشن خاصی کمزور ہوجاتی۔ ظاہر ہے کہ پھوپا کسی آوارہ مزاج اور نکمے شخص کو اپنا داماد نہ بناتے۔ چاہے وہ ان کا بھتیجا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر ثوبیہ سے اس کی رائے معلوم کی گئی تو اس کا ووٹ بھی میرے حق میں ہوگا۔

ساجد اتنا خودسر اور من موجی تھا کہ اس نے والدین کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا اور انہیں بتائے بغیر ہی درخواست بھیج دی۔ انہیں اس وقت معلوم ہوا جب اس کی انٹرویو کال آئی۔ اس کے ابا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کے خاندان اور برادری کا کوئی فرد فوج میں نہیں گیا تھا اس لیے انہیں حیرانی ہو رہی تھی کہ ساجد کے دماغ میں یہ خیال کیسے آیا۔ گو کہ وہ خود بھی اس کے مستقبل کے بارے میں پریشان رہتے تھے لیکن انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ساجد تعلیمی میدان میں آگے نہ بڑھ سکا تو وہ اسے کوئی کاروبار کروا دیں گے تاہم ان کی خواہش تھی کہ ساجد کم از کم گریجویشن تو کرلے تاکہ اس کا شمار بھی پڑھے لکھے لوگوں میں ہوسکے۔ انہیں اس پر بھی غصہ تھا کہ ساجد نے انہیں بتائے بغیر ہی کمیشن کے لیے

PakiBooks.Site

درخواست دے دی۔

''تم اب اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ اپنے فیصلے خود ہی کرنے لگے۔ ہم تو جیسے تمہارے کچھ لگتے ہی نہیں ہیں۔''

ساجد نے ان کی ناراضی کو کوئی اہمیت نہیں دی اور بے پروائی سے بولا۔ ''میں آپ لوگوں کو سرپرائز دینا چاہ رہا تھا۔''

''اچھا سرپرائز دیا ہے تم نے۔'' وہ غصہ سے بولے۔ ''میں نے تو تمہارے لیے نہ جانے کیا کچھ سوچ رکھا ہے اور تم نے یہ گل کھلا دیا۔''

''پھر آپ ہی مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔'' وہ معصوم صورت بناتے ہوئے بولے۔ ''اگر انٹر میں اچھے نمبر آجاتے تو میں بھی میڈیکل میں داخلہ لے سکتا تھا۔''

''سب لوگ ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن جاتے۔'' اس کے ابا نے قدرے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سامنے اور بھی کئی راستے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم بی کام میں داخلہ لے لو۔''

''اوہ نو، یہ میں نہیں کرسکتا۔ بی کام کی پڑھائی بہت مشکل ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اکیڈمی میں تمہاری پڑھائی سے جان چھوٹ جائے گی۔ دس طرح کے کورس کرنا پڑتے ہیں اوپر سے انتہائی سخت ٹریننگ اور وہاں کا ڈسپلن۔ تم تو وہاں ایک مہینا بھی نہیں گزار سکتے۔''

''آپ دنیا کے واحد باپ ہیں جو اولاد کی حوصلہ شکنی کررہے ہیں ورنہ لوگ تو دعائیں مانگتے ہیں کہ ان کا بیٹا فوج میں چلا جائے۔''

''اگر تم اس قابل ہوتے تو میں بھی اس فیصلے سے خوش ہوتا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو اور جو میں کہہ رہا ہوں یہی کرو۔''

''میں نے اسی لیے پہلے نہیں بتایا تھا کہ آپ مجھے فوج میں جانے کی اجازت نہیں دیں گے بہرحال اب آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہے تو میرا راستہ نہ روکیں۔ میں وہی کروں گا جو مجھے کرنا ہے۔''

اس کے بعد ساجد کے ابا خاموش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اب مزید بحث کرنا بے کار ہے ساجد اپنی مرضی کا مالک ہے اور اس نے جو سوچا ہے اس پر عمل کرکے ہی رہے گا۔ تاہم انہیں یقین تھا کہ ساجد انٹرویو کے مرحلے سے آگے نہیں جا سکے گا۔ میرا بھی یہی خیال تھا لیکن اس وقت ہمیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب ساجد نے فخریہ انداز میں اعلان کیا کہ اس کا سلیکشن ہو گیا ہے اور وہ ایک ہفتہ بعد ٹریننگ کے لیے کاکول جارہا ہے۔ یہ خبر اس کے ابا پر بجلی بن کر گری کیونکہ نتیجہ ان کی توقع کے خلاف آیا تھا۔

اس کے جانے کی سب سے زیادہ خوشی ثوبیہ کو تھی کیونکہ اس کا ایک لمبے عرصے کے لیے ساجد سے پیچھا چھوٹ رہا تھا لیکن وہ ساجد کے عزائم سے بے خبر تھی یا پھر اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا حالانکہ جانے سے پہلے جب وہ اس سے ملنے آیا تب بھی اس نے وہی بات دہرائی اور بولا۔ ''دیکھو ثوبیہ! تمہیں فوجی اچھے لگتے ہیں اسی لیے میں فوج میں جارہا ہوں۔''

ثوبیہ یہ سن کر گڑبڑا گئی اور پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو یونہی سرسری طور پر ایک بات کہی تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اتنے سیریس ہو جاؤ گے۔''

''بہرحال جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ کم از کم مجھے آگے بڑھنے کے لیے ایک راستہ تو مل گیا۔ اب تم بھی اپنی بات پر قائم رہنا۔''

''ہنوز دلی دور است'' ثوبیہ نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''پہلے تم کچھ بن جاؤ پھر دیکھا جائے گا۔''

ہم سب کا یہی خیال تھا کہ اس سے اکیڈمی کا ڈسپلن اور سختی برداشت نہیں ہوگی اور وہ جلد ہی واپس آجائے گا لیکن ساری توقعات اور اندازے غلط ثابت ہوئے۔ وہ کامیابی سے تربیتی مراحل طے کررہا تھا۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کی سہولت عام نہیں تھی اس لیے خطوں کے ذریعے ہی رابطہ ہوتا تھا۔ ایک ماہ بعد اس کا پہلا خط آیا جسے پڑھ کر اس کے ابا کا منہ لٹک گیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ خط میں اس کا رونا دھونا ہوگا لیکن ان کا خیال غلط نکلا۔ وہ بڑی دلجمعی سے تربیت حاصل کررہا تھا۔ اس نے کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس خط کو پڑھ کر لگا کہ وہ بہت خوش اور مطمئن ہے۔

اس کے خط باقاعدگی سے آتے رہے۔ ایک سال بعد وہ چھٹیوں میں گھر آیا تو کافی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی ساری بدتمیزی اور آوارگی غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ تہذیب اور شائستگی نے لے لی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ایک سال پہلے والا ساجد ہے۔ مجھ سے بھی وہ بڑی گرم جوشی سے ملا اور دیر تک میری پڑھائی کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں آرمی میڈیکل کور میں شمولیت اختیار

کراوں۔

ثوبیہ کا خیال تھا کہ وہ جتنے دن یہاں رہا، اسے تنگ کرتا رہے گا اس لیے وہ کافی ڈری ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہہ دیا تھا کہ میں ساجد کی موجودگی میں کم سے کم آؤں تاکہ کسی قسم کی تلخی کا امکان نہ رہے لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ اس بار ساجد نے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی اور نہ ہی اسے تنگ کیا۔ البتہ اس کی وارفتگی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ثوبیہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ثوبیہ کالج سے آنے کے بعد بھی پڑھائی میں مصروف رہتی ہے تو اس نے پہلے کی طرح زبردستی ثوبیہ سے چپکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اسی وقت اس سے ملنے آتا جب وہ فارغ ہوتی۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد وہ واپس اکیڈمی چلا گیا اور زندگی ایک بار پھر معمول کے مطابق گزرنے لگی۔ میرا میڈیکل کا دوسرا سال شروع ہو گیا تھا اور ثوبیہ سیکنڈ ایئر میں آگئی تھی۔ ایک دن میں پھوپی کے گھر گیا تو وہ لاؤنج میں کتابیں کھولے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''اچھا ہوا تم آگئے۔ مجھے یہ مسئلہ تو سمجھا دو۔'' اس نے فزکس کی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کتاب ہاتھ میں پکڑی اور کاپی پر اسے سمجھانے لگا۔ اس کام میں مجھے پانچ منٹ لگے۔ جب میں نے وہ پرابلم حل کردی تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''واہ تم نے تو کمال کردیا۔ اتنی اچھی طرح تو ہمارے سر بھی نہیں سمجھاتے۔ کبھی کبھی تو پورا لیکچر سر پر سے گزر جاتا ہے۔''

''اگر تمہیں کسی مضمون میں مشکل پیش آرہی ہے تو کسی اچھے ٹیوٹر کی مدد لے لو تاکہ تمہاری اچھی طرح تیاری ہو سکے۔''

''یہاں قریب میں کوئی اچھا پڑھانے والا بھی تو نہیں ہے اور جو ہیں ان کی پڑھائی بس یونہی ہے۔ انہوں نے کم پیسوں پر میڈیکل اور انجینئرنگ کے اسٹوڈنٹ ہائر کیے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کالج لیکچرار کی برابری نہیں کر سکتے۔''

''میں بھی تو اسٹوڈنٹ ہوں پھر تم نے مجھ سے مدد کیوں مانگی؟''

''تمہاری بات اور ہے۔ تم جیسے شائننگ اسٹار بہت کم ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم میری کچھ مدد کرسکتے ہو؟''

جی میں آیا کہہ دوں کہ میں تو تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر بھی لاسکتا ہوں لیکن اپنا بھرم رکھنا بھی ضروری تھا اس لیے میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو بھئی میں روزانہ تو نہیں آسکتا کیونکہ کالج سے بہت دیر میں واپسی ہوتی ہے اور جس دن پریکٹیکل ہو تو شام ہی ہو جاتی ہے پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار تمہیں پڑھانے آجاؤں۔''

''یہ بھی بہت ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم انکار نہیں کرو گے کیونکہ تم میرے سچے اور مخلص دوست ہو۔''

''صرف دوست؟'' میں نے شرارتی انداز میں کہا۔

''اچھا اب زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''کچھ باتیں آئندہ کے لیے بھی چھوڑ دو۔''

اس کا اشارہ سمجھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی وہی کچھ سوچ رہی تھی جو میرے دل میں تھا لیکن ابھی ہم دونوں پڑھ رہے تھے اور ایسی بات زبان پر لانا بے وقت کی راگنی چھیڑنے کے مترادف تھا۔ نہ جانے آگے چل کر حالات کیا رخ اختیار کریں اس لیے فی الحال دل کی بات دل میں ہی رہے تو بہتر ہے۔

میں نے اس سے ہفتے میں ایک دن پڑھانے کے لیے کہا تھا لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ فزکس میں کافی کمزور ہے اس لیے اسے زیادہ وقت دینا ہوگا۔ میں نے ایک دن کی شرط ہٹا دی اور جب بھی مجھے وقت ملتا۔ میں اسے پڑھانے چلا جاتا۔ اس نے پھوپی کو بتا دیا تھا کہ میں پڑھائی میں اس کی مدد کررہا ہوں اور ان کے توسط سے یہ بات پھوپا تک بھی پہنچ گئی تھی اس لیے میں بلاخوف و خطر وہاں جانے لگا۔

چند روز بعد میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے آپ پر زیادہ توجہ دینا شروع کردی ہے۔ پہلے وہ گھر کے عام کپڑوں میں سادہ سا حلیہ بنائے میرے سامنے آجاتی تھی لیکن اب وہ شوخ رنگوں کے لباس میں ہلکا سا میک اپ کرکے پڑھنے بیٹھتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس کے حسن میں دن بہ دن نکھار آرہا تھا بلکہ وہ پہلے کے مقابلے میں کافی شوخ و چنچل ہو گئی تھی۔ بعض اوقات اس کی توجہ پڑھائی پر کم اور باتوں پر زیادہ ہوتی تھی۔ وہ جان بوجھ کر کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیتی کہ میں اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتا۔

PakiBooks.site

میری خاطر داری میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے دوپہر میں کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی اگر کبھی بھوک لگتی تو کینٹین سے برگر یا فروٹ چاٹ کھا لیا کرتا۔ اسے یہ بات معلوم تھی اس لیے وہ میرے لیے چائے اور دیگر لوازمات کا بندوبست کرتی اور اصرار کرکے مجھے کھلاتی۔ رفتہ رفتہ ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی بڑھ گئی کہ ہم صحیح معنوں میں ایک جان دو قالب بن گئے۔ آنکھوں اور اشاروں کی زبان میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا تھا۔ اب صرف زبان ہلانے کی دیر تھی جس کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

ثوبیہ کے سالانہ امتحان میں اتنے نمبر نہ آسکے کہ وہ میڈیکل میں جاسکتی۔ چنانچہ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میرا تیسرا سال چل رہا تھا اور مصروفیت بڑھ گئی تھی کہ ویسے بھی اب ثوبیہ کے گھر جانے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن ہم دونوں اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ ایک دوسرے کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی تھی۔ اس کا میں نے یہ حل نکالا کہ اس سے ملنے یونیورسٹی جانے لگا۔ میرے پاس بائیک تھی اس لیے مجھے وہاں جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ہم لائبریری، کینٹین یا کسی اسٹال پر کچھ دیر بیٹھتے پھر میں اسے گھر کے قریب چھوڑ دیتا۔ اس نے احتیاطاً عبایا اور نقاب لینا شروع کردیا تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں میڈیکل کے چوتھے سال میں تھا کہ ساجد کی ٹریننگ ختم ہوگئی۔ پاسنگ آؤٹ کے بعد اس کی پوسٹنگ کھاریاں میں ہوئی۔ وہ جانے سے پہلے گھر آیا تو اس کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ فوجی وردی میں وہ بے حد ہینڈسم لگ رہا تھا۔ سب سے بڑی تبدیلی اس میں یہ آئی تھی کہ وہ بہت مہذب اور تمیزدار ہوگیا تھا۔ البتہ ثوبیہ کے ساتھ وہ پہلے جیسی بے تکلفی سے پیش آیا۔ البتہ جانے سے ایک دن پہلے اس نے ثوبیہ سے کہا۔ ”تمہیں فوجی بہت پسند ہیں۔ دیکھ لو میں نے تمہاری پسند کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ اب تم بھی اپنی بات پر قائم رہنا۔“

ثوبیہ اس کی بات سن کر شپٹا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری طور پر کیا جواب دے۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ”ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔ ڈگری ملنے میں دو سال باقی ہیں۔“

”مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ البتہ میں چاہتا ہوں کہ ہماری منگنی ہوجائے۔ میں نے سنا ہے کہ جہاں بیری ہو وہاں پتھر بھی آتے ہیں۔ میں ان پتھروں کو روکنا چاہتا ہوں۔“

ثوبیہ نے بے رخی سے کہا۔ ”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ فیصلہ تو میرے والدین ہی کریں گے۔“

ساجد کے جانے کے دو تین دن بعد میری ثوبیہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے یہ بات بتائی جسے سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا لیکن میں نے ثوبیہ پر اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دی اور اس سے پوچھا۔ ”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں نے ابھی اس بارے میں نہیں سوچا۔“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”پہلے میں اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتی ہوں۔“

”اس نے تم سے یہی کہا ہے کہ وہ صرف منگنی کرنا چاہ رہا ہے۔ شادی کے لیے وہ تمہاری پڑھائی مکمل ہونے تک انتظار کرسکتا ہے پھر تمہیں کس بات کی پریشانی ہے؟“

”کیا تم ابھی تک نہیں سمجھے کہ میں کیوں پریشان ہوں۔“ وہ چڑ کر بولی۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ وہ بات میں اپنی زبان سے ادا کروں جو تمہیں کہنی چاہیے تھی۔“

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا، اس نے بڑے سلیقے سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم کسی طرح اس معاملے کو ایک ڈیڑھ سال کے لیے ٹال دو۔ میں فائنل امتحان کے فوراً بعد امی کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔“

”اگر یہ میرے بس میں ہوا تو......“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت ان سے نہیں پوچھا جاتا۔“

”بس تو سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔“

کئی مہینے گزر گئے لیکن ساجد کی جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ میں بھی مطمئن ہوکر اپنی پڑھائی میں لگ گیا۔ میری وارڈ ڈیوٹی شروع ہوچکی تھی۔ میرا زیادہ وقت کالج اور اسپتال میں گزرتا، کئی کئی دن تک ثوبیہ سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ عید کی چھٹیوں میں ساجد گھر آیا تو اس کی خواہش پر والدین نے پھوپا اور پھوپی سے ثوبیہ کا رشتہ مانگ لیا۔ یہ بات صرف ثوبیہ اور ساجد کے والدین کے درمیان ہی تھی۔ اس لیے کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہوئی۔ ثوبیہ کے والدین کو اس رشتے پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ساجد ان کا اپنا خون تھا اور کمیشن ملنے کے بعد اس کی مارکیٹ کئی گناہ بڑھ گئی تھی۔ پھوپی کے بقول ایسے لڑکے قسمت والوں کو ملتے ہیں۔

اس زمانے میں شادی کے لیے لڑکی بلکہ لڑکے کی بھی مرضی معلوم کرنے کا رواج نہیں تھا۔ اگر کوئی لڑکا ہمت کرکے اپنی پسند بتا دے تو وہ اور بات تھی ورنہ عام طور پر والدین یہی سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کے حق میں بہتر فیصلہ کیا ہے۔

ثوبیہ کے معاملے میں بھی یہی سمجھ لیا گیا کہ ساجد ہر لحاظ سے اس کے لیے بہترین ہے۔ کسی نے اس کی مرضی جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ثوبیہ کسی اور کو چاہتی ہے اور ساجد کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمیں اس رشتے کا پتا اس وقت چلا جب پھوپی کے یہاں سے منگنی کی مٹھائی آئی۔ وہ خود یہ مٹھائی لے کر آئی تھیں۔ امی اور ابو نے انہیں رشتہ طے ہونے کی مبارک باد دی اور ساتھ ہی ابو نے یہ شکایت بھی کی کہ اس موقع پر پھوپی نے غیر سمجھا اور کسی معاملے میں شریک نہیں کیا۔ جب سب باتیں طے ہوگئیں تو مٹھائی لے کر آگئیں۔

پھوپی شرمندہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”کیا کروں بھائی صاحب! میں تو خود اس کے حق میں نہیں تھی لیکن لڑکے نے ضد کی کہ جب تک رشتہ طے نہ ہوجائے اس بات کی بھنک کسی کو نہیں پڑنی چاہیے۔ نہ جانے وہ کیوں یہ بات چھپانا چاہ رہا تھا۔ اسے کس کا ڈر تھا؟“

میں فوراً ہی بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ ساجد نے یہ راز داری میری وجہ سے برتی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ اس کے ساتھ ثوبیہ کے رشتے کی بات چل رہی ہے تو کہیں میں بیچ میں نہ کود پڑوں۔ اس طرح پھوپا کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی مستقبل کے ڈاکٹر سے کریں یا اسے فوجی کے پلے باندھ دیں۔

اس رازداری کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور ثوبیہ میری دسترس سے بہت دور جاچکی تھی۔ دراصل سارا مسئلہ ٹائمنگ کا تھا میں یہی سوچتا رہا کہ فائنل امتحان سے فارغ ہونے کے بعد امی کو ثوبیہ کا رشتہ مانگنے بھیجوں گا جب کہ ساجد کو ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ وہ صرف ٹریننگ سے ہی فارغ نہیں ہوا بلکہ برسر روزگار بھی ہوگیا تھا۔ اس نے ثوبیہ سے منگنی کرنے میں اسی لیے جلدی کی کیونکہ وہ میری انٹری سے پہلے اس کے جملہ حقوق اپنے نام کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔

کئی دن تک میں ثوبیہ کی طرف نہیں جاسکا۔ مجھ میں اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں تھی میں اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ غلطی میری ہی تھی کہ مجھے چاہیے تھا کہ فائنل امتحان کے نتیجے کا انتظار کرنے کی بجائے امی کے کان میں یہ بات ڈال دینی چاہیے تھی کہ میں ثوبیہ کو پسند کرتا ہوں۔ ویسے بھی مجھے ثوبیہ کی زبانی ساجد کے عزائم کا علم ہوچکا تھا اس لیے اگر ان لوگوں کی طرف سے بات شروع ہونے سے پہلے امی میرا رشتہ لے کر پہنچ جاتیں تو میرا پلڑا بھاری ہوسکتا تھا۔ پھوپو کا جھکاؤ بھی میری طرف ہی ہوتا اور وہ پھوپا کو اس رشتے کے لیے راضی کرسکتی تھیں لیکن میری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور سستی کی وجہ سے سب کچھ گڑبڑ ہوگیا اور ثوبیہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔

بالآخر میں ایک دن ہمت کرکے ثوبیہ سے ملنے چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری ٹھیک ٹھاک کلاس لے گی اور مجھے ہی مورد الزام ٹھہرائے گی اس لیے میں نے خود ہی صفائی پیش کرنا شروع کردی اور کہا۔ ”ثوبیہ! مجھے بہت افسوس

آشنا

سید محمد نام، آشنا تخلص، حافظ وارث علی کے فرزندِ اکبر تھے۔ محسن لکھنوی نے آشنا کا مختصر تعارف اسی طرح تحریر کیا ہے۔ ”سید محمد مغفور خلفِ اکبر غفران مآب سید حافظ وارث علی شاہ صاحب باشندۂ لکھنو، شاگرد شیخ امام بخش ناسخ“ (سراپا سخن)۔ نام کے ساتھ لفظ ”مغفور“ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1269ھ مطابق 1853ء سے پہلے ان کا انتقال ہوچکا تھا۔ دیوان ناسخ میں حافظ وارث علی کے فرزند کی تاریخ ولادت کا ایک قطعہ موجود ہے۔ حافظ وارث علی ناسخ کے استاد تھے۔ ان سے ناسخ نے ثانوی معیار کی کتابیں پڑھی تھیں۔ بروز جمعہ 20 شوال 1216ھ ان کی ولادت کی تاریخ اگر مان لی جائے تو 52 یا 53 برس کی عمر میں ان کی وفات ہوئی اور ناسخ کی وفات 1254ھ کے وقت آشنا کی عمر 38 برس کے قریب تھی۔ سعادت خان ناصر نے آشنا کا ذکر مختصر لکھا ہے لیکن چند جملے ان کی سیرت کو واضح کرتے ہیں۔ ”آشنائے بے ریا، مجمع خوبی رہا، سید محمد، تخلص آشنا، خلف الصدق حافظ وارث علی مغفور ابتداء میں شاگرد شیخ ناسخ کے تھے۔

مرسلہ: نظیر احمد۔ کراچی

ہے، یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میں اپنی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا اور ساجد نے اپنا کام دکھا دیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ پہلے ہی اپنا رشتہ بھیج دیتا۔''

اس نے زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم جب بھی رشتہ بھیجتے وہ نامنظور ہو جاتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھ میں ایسی کیا خرابی ہے؟''

''خرابی تم میں نہیں بلکہ میری قسمت ہی خراب ہے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ تایا ابو نے میرے پیدا ہوتے ہی مجھے ساجد کے لیے مانگ لیا تھا۔ تمہیں پتا ہے کہ ابو اپنے بڑے بھائی کی مرضی کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتے پھر وہ اس رشتے سے کیسے انکار کر سکتے تھے۔''

''تمہیں یہ بات معلوم تھی؟''

''نہیں، جب تایا ابو نے شادی کی بات چھیڑی تو میں نے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کہ ''پہلے مجھے اپنی پڑھائی مکمل کرنے دیں، امی آپ کو اتنی جلدی کیوں ہو رہی ہے۔ تھوڑا سا انتظار کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اس سے اچھا رشتہ آجائے۔''

''اس ٹال مٹول سے کوئی فائدہ نہیں۔'' امی بولیں۔ ''تمہاری شادی تو ساجد سے ہی ہوگی۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ بچپن میں ہی ساجد سے تمہارا رشتہ طے ہو گیا تھا۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ثوبیہ کو دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکا۔ ''تم نے اس فیصلے پر احتجاج نہیں کیا؟''

''ہمارے یہاں اس کا رواج نہیں۔ رشتہ طے کرتے وقت لڑکی کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ ویسے بھی میرے پاس انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں انہیں کیا بتاتی کہ ساجد سے شادی کرنا کیوں نہیں چاہتی۔''

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ منہ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''جو کچھ بھی ہوا یا ہونے والا ہے اسے تم تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔ ضروری نہیں کہ ہم جسے چاہیں وہ ہمیں مل جائے۔''

میں واقعی اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گیا۔ سانپ نکل چکا تھا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ میں نے سب کچھ بھلا کر اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔ ادھر پھوپو کے گھر میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ ستمبر میں شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت تک میں فائنل امتحان سے فارغ ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ میں اس شادی سے بالکل ہی لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا وہ میری پھوپی کی بیٹی تھی اس لیے میرا فرض بنتا تھا کہ شادی کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤں

ساجد ایک ماہ کی چھٹی پر آیا تھا۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ چھ ستمبر کی شام اس کا نکاح اور رخصتی تھی۔ ثوبیہ مایوں بیٹھ گئی تھی اور ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں شادی بیاہ کے گیت گا رہی تھیں حالانکہ رات کو سب لوگ دیر سے سوئے تھے لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ صبح ہوتے ہی گھر میں غیر معمولی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ساجد بھی ناشتا کرنے کے بعد بیرونی صحن میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ مضطرب اور بے چین نظر آرہا ہے۔ شادی والے دن اس کے چہرے پر جو خوشی ہونی چاہیے تھی وہ مجھے نظر نہیں آئی۔

مجھے کئی کام نمٹانے تھے۔ حالانکہ باورچی سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح دس بجے تک پہنچ جائے۔ وہ نہیں آیا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں اس کی تلاش میں نکل گیا۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ مجھے بڑی سڑک پر لوگوں کا ہجوم نظر آیا جو اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں ہاکیاں اور لاٹھیاں تھیں، جیسے وہ کسی سے لڑنے جا رہے ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے ایک راہ گیر کو روک کر پوچھا تو وہ ہوا میں مکا لہراتے ہوئے بولا۔ ''بھائی جی تساں نئی پتا، دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔''

میں الٹے قدموں گھر واپس آیا تو سب لوگ ریڈیو سے کان لگائے بیٹھے تھے اور صدر ایوب کی تقریر آرہی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دشمن کی افواج نے رات کی تاریکی میں اعلان جنگ کیے بغیر بین الاقوامی سرحد عبور کر لی ہے اور لاہور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ صدر ایوب نے انتہائی پُرعزم اور جوشیلے انداز میں افواج پاکستان کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر دشمن کی جارحیت کا مقابلہ کریں اور اسے پیچھے دھکیل دیں۔

تقریر ختم ہوتے ہی ساجد اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کا چہرہ وفور جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں گیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ ثوبیہ کے تایا

اور تائی اس کے پیچھے گئے۔ ارشد مرزا نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''جانے کی تیاری!'' اس نے جواب دیا۔ ''جنگ شروع ہو گئی ہے۔ ایسے میں فوجیوں کی چھٹیاں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ شاید ایک دو گھنٹے بعد میرا بلاوا بھی آجائے ورنہ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ مجھے فوری طور پر یونٹ میں رپورٹ کرنی ہے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' ارشد مرزا بولے۔ ''شام کو تمہاری شادی ہے۔ سب تیاریاں ہو گئی ہیں۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں اور تمہیں محاذ پر جانے کی سوجھ رہی ہے۔''

''شادی بعد میں بھی ہو سکتی ہے لیکن اس وقت میرا ڈیوٹی پر حاضر ہونا بہت ضروری ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو صبح چلے جانا۔ کم از کم نکاح تو ہو جائے، ایک رات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس کی امی نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں۔'' وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ''ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ میرا وقت قوم کی امانت ہے۔ میں اس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف رائیڈر کا انتظار ہے۔ وہ جیسے ہی پیغام لے کر آیا میں فوراً ہی روانہ ہو جاؤں گا۔''

سب اسے سمجھاتے رہے لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور یہی کہتا رہا کہ اس وقت وطن کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ اس پکار پر اپنے کان بند نہیں کر سکتا آپ لوگ دعا کریں کہ میں فاتح بن کر واپس آؤں پھر دھوم دھام سے شادی ہوگی۔

اس کی توقع کے عین مطابق دو بجے گہرے سفید رنگ کی موٹر سائیکل پر ہیلمٹ لگائے فوجی وردی میں ملبوس رائیڈر آگیا۔ ساجد کو فوری طور رپورٹ کرنے کا حکم ملا تھا۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ اس نے سب گھر والوں کو الوداع کہا اور اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں اسے ٹرین میں بٹھانے ساتھ گیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بڑے جذباتی انداز میں گلے لگایا اور بولا۔ ''میں اپنی امانت ثوبیہ کی شکل میں تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں۔ اگر جنگ میں مجھے کچھ ہو گیا تو تم ثوبیہ سے شادی کر لینا۔''

''ایسی باتیں نہ کرو۔'' میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو تم غازی بن کر واپس آؤ گے۔ اس وقت تک میں تمہاری امانت کی حفاظت کروں گا۔''

''ایک سپاہی کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ وطن کی خاطر لڑتے ہوئے جان دے دے اور اسے شہادت کا درجہ ملے۔''

ٹرین نے وسل دی تو وہ مجھ سے گلے مل کر رخصت ہو گیا۔ کئی دن تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ جنگ پورے زور و شور سے جاری تھی۔ پورا ملک تن من دھن سے اس جنگ میں شریک تھا۔ ایک طرف افواج پاکستان دشمن کو ناکوں چنے چبوا رہی تھیں تو دوسری جانب ہماری فضائیہ کے طیارے دشمن پر قہر بن کر ٹوٹ رہے تھے۔ سترہ دن بعد جنگ ختم ہوئی اور ہم اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

جنگ ختم ہوئے دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ ایک فوجی گاڑی اس کے دروازے پر آکر رکی۔ ایک آفیسر نے دروازے پر دستک دے کر ارشد مرزا کو باہر بلایا اور ایک خط ان کے حوالے کیا پھر اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے جوانوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے گاڑی سے تابوت نکال کر زمین پر رکھا اور روایتی انداز میں اسے سلامی دی۔

وہ آفیسر، ارشد مرزا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیفٹیننٹ ساجد مرزا نے اگلے مورچوں پر داد شجاعت دیتے ہوئے وطن کے لیے اپنی جان دے دی۔ اللہ تعالیٰ شہید کے درجات بلند کرے۔''

☆......☆

ثوبیہ نے بڑے ضبط اور حوصلے کا مظاہرہ کیا۔ وہ شہید کی منگیتر کہلانے پر فخر محسوس کرتی تھی پھر میں نے ایک دن اسے ساجد کی وصیت کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ ''وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد تم ہی میرا خیال رکھ سکتے ہو۔''

اس کے بعد ثوبیہ سے میری شادی میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ ہم دونوں خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ اب تو میرا بڑا بیٹا بھی فوج سے ریٹائر ہو چکا ہے۔ بیٹی اپنے گھر کی ہے۔ ہر سال چھ ستمبر کے موقع پر ساجد کی یاد بہت ستاتی ہے اور اس کے وہ الفاظ تو میں کبھی نہیں بھول سکتا ''میرا وقت قوم کی امانت ہے، اس میں خیانت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

عمر کے اس حصے میں یہی خواہش ہے کہ کاش ایک بار پھر ہمارے اندر وہی جنگ ستمبر والا جذبہ بیدار ہو جائے تاکہ پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو کر اندرونی اور بیرونی سازشوں کا مقابلہ کر سکے۔

درداں ماری

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

یہ روداد میری نہیں رانی، میرل اور شاہ جی کی ہے۔ یہ پوری کہانی کئی لوگوں کی زبانی تھوڑی تھوڑی کر کے مجھ تک پہنچی اور میں نے ان تمام واقعات کو ایک جگہ سمیٹ کر لکھا۔ یہ واقعات کچھ میرل کے دوستوں سے کچھ بھاگ بھری اور نور محمد سے الگ الگ سنے لیکن لکھنے میں تسلسل رہے اس لیے تمام واقعات کو ملا دیا ہے۔ اُمید ہے قارئین کو پسند آئے گی۔

محمد سجاد میرانی

(کراچی)

پیدائشی نام تو اس کا سکینہ تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ سکینہ سے سکو بنتی جیسے کہ دیہات میں اور خصوصاً غریب علاقوں میں نام شبانہ ہے تو وہ شبو بن جائے گی، زرینہ ہے تو زری اور اگر شمیم ہے تو وہ شمو بن جائے گی مگر وہ تین چار سال کی عمر میں سکینہ سے سکو نہیں بلکہ رانی بن گئی تھی کیونکہ پیدا ہوتے ہی وہ سرخ رنگ کی تھی اور جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی رنگت مزید نکھرتی گئی۔ اس کی گوری رنگت کے سبب ہی اس کی ماں نے اس کو ایک بار پیار سے کہا تو میری بدھی رانی ہے۔ تب سے وہ خاندان اور اس کے بعد محلے میں رانی مشہور ہوگئی۔

رانی کا تعلق انتہائی غریب خاندان سے تھا۔ باپ گدھا گاڑی چلاتا جس کا نام تو نور محمد تھا مگر وہ نورل کے نام سے مشہور تھا۔ والدہ بھاگ بھری بھی بس نام کی ہی بھاگ بھری تھی۔ گھر میں غربت کے ڈیرے دیکھے، ماں باپ کے گھر بھی اور شوہر کے گھر بھی مگر شادی کے بعد اس کی خوش قسمتی تھی کہ شوہر غریب تو تھا مگر انتہائی شریف اور سادہ طبیعت کا تھا۔ ہر بات میں بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ شادی کے پہلے پانچ سال تک تو ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی، نور محمد کے ماں باپ اور بہنوں وغیرہ نے اس کے کان بھرنے شروع کردیے کہ وہ دوسری شادی کرلے مگر اس نے بیوی کی محبت میں کسی کی نہ سنی اور جب وہ لوگ بہانے بہانے سے لڑائی جھگڑے کرنے لگے تو نور محمد نے علیحدہ ہونے میں ہی عافیت سمجھی اور بیوی کو لے کر پہلے کچھ عرصے تو سسرال میں رہا پھر تین مرلے کا اپنا گھر لے لیا۔ ایک کمرے کا گھر تھا مگر دونوں میاں بیوی کے لیے جنت سے کم نہ تھا، جہاں کسی کے کوئی طعنے نہیں تھے مگر بچوں کے بغیر بھی گھر کیا جنت ہوتا، دونوں ہی اس کمی کو شدت سے محسوس کررہے تھے مگر ایک دوسرے سے اس کا ذکر نہیں کرتے تھے کہ کہیں دل آزاری نہ ہوجائے مگر اس دوران دونوں میاں بیوی نے اپنی سی کوشش جاری رکھی۔ علاج معالجہ، تعویذ گنڈے، مزاروں پر حاضری بالآخر شادی کے بارہ سال بعد سکینہ پیدا ہوئی جواب رانی بن گئی تھی۔ نور محمد کے لیے رانی کے دنیا میں آنے سے جہاں گھر میں خوشی آگئی تھی وہیں کچھ معاشی مسائل بھی بڑھنے لگے۔ وہ رحیم یار خان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے۔ جہاں آمدنی کے محدود ذرائع تھے مگر نور محمد کے لیے اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ مسلسل محنت اور جدوجہد میں لگا ہوا تھا مگر اس سے ان کے گھر کا خرچ تو آسانی سے چلنے لگا مگر کوشش کے باوجود بچت نہیں کرپارہے تھے۔

رانی مسلسل بڑی ہورہی تھی وہ جوں جوں بڑی ہورہی تھی اس کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ محلے میں ہی ایک خاتون کے پاس قرآن اور اردو بھی پڑھتی رہی۔ وہ خاتون محلے کی بچیوں کو قرآن شریف اور واجبی سی اردو پڑھاتی تھیں کیوں کہ وہ خود چھ جماعت تک پڑھی ہوئی تھیں مگر اس سے یہ فائدہ ہوا کہ محلے کی بچیاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی مضامین بھی دلچسپی سے پڑھتیں۔ وہ خاتون اردو اخبارات اور میگزین وغیرہ منگوا کر رکھتیں اور پھر..... بچیوں کے درمیان اخبارات کی سرخیاں پڑھوانے کا مقابلہ کرواتیں۔ اس طرح بچیوں میں پڑھنے کا شوق مزید پروان چڑھا، خاص طور پر رانی تو بہت ہی زیادہ دلچسپی سے اخبار و میگزین پڑھتی۔ اس کے لیے یہ الگ ہی دنیا تھی۔ وہ مختلف میگزین میں گاڑیوں کی تصاویر، ماڈل کے کپڑے، ہینڈ بیگ اور شوز دیکھتی تو بس ایک آہ بھر کر رہ جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب چیزیں اس کے لیے خواب ہیں۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی مگر ساتھ ساتھ عقل مند بھی تھی اور اب جب اس نے اردو پڑھنا سیکھا اور پھر اخبار اور میگزین پڑھنے لگی تو شعور بھی آنے لگا۔ اب وہ بارہ سال کی ہوگئی تھی

PakiBooks.Site



قرآن شریف بھی اس نے ختم کرلیا تھا۔ دونوں میاں بیوی اب اس کے لیے دن رات پریشان رہنے لگے تھے کیونکہ محلے کے اوباش لڑکے اب ان کے گھر کے آس پاس ہی ٹہلتے رہتے تھے کہ بس کسی طرح رانی کی ایک جھلک نظر آجائے۔

غربت کے باعث کوئی اچھا رشتہ بھی نہیں آرہا تھا۔ ایک دفعہ تو رات کو کوئی دیوار کود کر اندر بھی داخل ہوگیا تھا۔ پھر نور محمد کے جاگنے اور چور چور کے شور مچانے پر وہ جو کوئی بھی تھا بھاگ گیا۔ اب دونوں میاں بیوی پریشان ہونے کے ساتھ ہوشیار بھی ہوگئے تھے۔ انہیں پتا تھا رانی کے علاوہ اور کوئی قیمتی چیز گھر میں موجود نہیں ہے۔ جلد ہی انہیں اس چور کا پتا بھی لگ گیا۔ وہ محلے کا ہی ایک لوفر میر محمد عرف میرل تھا۔ پہلے تو نور محمد نے اس کے والدین سے بات کی اور انہوں نے میرل کو اچھا خاصا ذلیل کیا تھا مگر وہ تھا ہی بدفطرت۔ کچھ دن تک تو سب ٹھیک ہی رہا مگر کچھ عرصے بعد وہ پھر رانی کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ اب کی بار نور محمد نے اسے سمجھایا تو وہ بے شرمی سے بولا۔ ”چاچا اگر اتنا ہی تنگ ہو مجھ سے تو رانی کا رشتہ مجھے دے دو نا۔“

نور محمد کا پارہ چڑھ گیا۔ ”تُو رانی سے شادی کرے گا، شکل دیکھی ہے اپنی، کردار دیکھا ہے اپنا، میری بچی ابھی معصوم ہے جا دفعہ ہوجا یہاں سے۔“ نور محمد نے میرل کو تقریباً دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”اوہ صبر کر چاچا صبر کر، شکل میری اتنی بری نہیں ہے جتنی تو کہہ رہا ہے۔ کردار کا بھی میں برا نہیں بس میں بدنام ہوں اور رہی بات رانی کے معصوم ہونے کی تو میں کون سا صبح برات لے کر آجاؤں گا۔ دو چار سال انتظار کروں گا۔ جب جوان ہوگی تب نکاح کرلوں۔“ میرل دھکا کھانے کے باوجود ڈھٹائی سے کھڑا رہا۔ نور محمد کو مزید غصہ آگیا۔

”بے غیرت تو رانی سے شادی کرنے کے خواب دیکھنے کی بجائے کوئی کام دھندا کر، محنت کر کچھ بن، پھر رانی نہ سہی تو کوئی اور رشتہ تجھے مل ہی جائے گا۔“ نور محمد کا لہجہ اب کچھ دھیمہ پڑ گیا تھا۔ دراصل وہ میرل کی ڈھٹائی سے پریشان ہوکر اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

میرل نور محمد کے دھیمے لہجے سے شیر ہوگیا۔ ”چاچا نورل تو دس سال کی عمر سے مزدوری کررہا ہے۔ اب تیری عمر چالیس سے بھی اوپر ہے۔ کیا بنایا تو نے کچھ بھی تو نہیں۔ جہاں سے سفر شروع کیا وہیں کھڑے ہو۔ یہ باتیں ساری قسمت کی ہوتی ہیں اگر نصیب میں ہوا تو ایسا چھکا لگے گا کہ بلے ہی بلے۔ نہیں تو تیرے جیسی دال روٹی تو میں کام نہ کر کے بھی کھا رہا ہوں۔“ میرل نے ہنس کر کہا۔

”تو ماں باپ کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ اپنی کمائی نہیں کھا رہا اور میری ایک بات غور سے سن تو کام کریا نہ کر مگر

آئندہ میری رانی کا نام اپنی گندی زبان پر مت لانا۔'' نور محمد کو پھر غصہ آگیا۔

''نہیں لوں گا چاچا رانی کا نام، یہ دیکھو میں نے کان پکڑ لیے۔'' میرل نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بے شرمی سے مسکرانے لگا۔

نور محمد غصے سے اندر چلا گیا مگر اس دن کے بعد نور محمد نے نوٹ کیا کہ میرل اب اس سے کترانے لگا ہے اور اس نے اب اس کے گھر اور گلی کے چکر لگانے بھی کم کر دیے تھے۔ دونوں میاں بیوی اور خود رانی نے بھی سکھ کا سانس لیا کیوں کہ میرل کی وجہ سے نہ صرف وہ محلے میں بلکہ اپنے ماں باپ کی نظروں میں بھی مشکوک ہو گئی تھی کہ شاید وہ بھی میرل کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے۔ ایک دن نور محمد نے پیار سے رانی کو سمجھایا کہ دیکھو بیٹا یہ مرد کی فطرت ہے اگر عورت اسے ایک دفعہ دیکھے تو وہ دس دفعہ دیکھتا ہے۔ بیٹا تم میرل کی طرف دیکھا بھی نہ کرو، اگر تم دیکھو گی تو اس کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

یہ سن کر رانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ''بابا کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں بے قصور ہوں، مجھے آپ کی عزت عزیز ہے۔'' رانی باقاعدہ رونے لگی تھی۔

اس نے فوراً رانی کو گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''میرا پتر میں تو تجھے سمجھا رہا تھا اور تو رونے لگی نہ پتر نہ۔'' نور محمد کی بھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

وقت گزرتا رہا ایک سال مزید گزر گیا مگر نور محمد کے حالات میں تبدیلی نہیں آئی بلکہ اب نوبت تنگ دستی تک پہنچنے لگی کیونکہ نور محمد نے دس سال پہلے جو گدھا خریدا تھا اب وہ نہ صرف بوڑھا ہونے لگا تھا بلکہ کمزور بھی ہو گیا تھا اس لیے سامان وغیرہ اٹھوانے والے لوگ اب نور محمد سے کترانے لگے تھے۔ نور محمد اور اس کی بیوی بے انتہا پریشان تھے مگر ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اپنے حالات میں تبدیلی کیسے لائیں۔ ایک دن رات کو دونوں میاں بیوی اس سلسلے پر بات کر رہے تھے اور رانی قریب ہی چائے بنانے میں مصروف تھی۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ نور محمد دروازے پر گیا۔ باہر میرل ایک ٹرے میں گوشت والا پلاؤ لیے کھڑا تھا۔ میرل کو دیکھ کر نور محمد کے چہرے پر تناؤ آنے لگا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ میرل سے جان چھوٹ گئی مگر میرل تو گلی کا چکر لگانے سے گھر کا دروازہ کھٹ کھٹانے تک آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ نور محمد کچھ کہتا میرل بول پڑا۔

''چاچا آپ ناراض نہ ہوں آج گیارھویں شریف ہے تو ہم لوگوں نے گھر میں نیاز بنائی تھی، اماں نے بولا کہ میں آپ لوگوں کو چاول دے آؤں۔'' میرل نے ٹرے نور محمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آج گیارھویں شریف ہے اور یہ چاول تمہاری امی نے دیے ہیں مگر اس سے پہلے تو تم لوگوں نے کبھی نہیں دیے۔'' نور محمد نے ٹرے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چاچا آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ دراصل ہر مہینے ہم لوگ مسجد میں چندہ دیتے تھے اور وہیں نیاز بنتی تھی اور نمازیوں میں تقسیم ہوتی تھی مگر اس دفعہ ہم نے گھر ہی میں نیاز بنائی تو امی نے آپ لوگوں کے لیے بھی بھیج دی۔'' میرل نے وضاحت کی۔

نور محمد نے میرل کے ہاتھ سے چاول کی ٹرے لے لی مگر ایسے جیسے وہ میرل کی وضاحت سے مطمئن نہ ہو۔ ''اچھا ٹھہرو میں برتن واپس لاتا ہوں۔'' نور محمد نے کہا اور اندر آ گیا۔

''کون ہے اتنی دیر لگا دی اور یہ چاول کون دے گیا؟'' بھاگ بھری نے حیرت سے نور محمد سے پوچھا۔

''ارے بتاتا ہوں پہلے تم کوئی برتن لے آؤ اور یہ ٹرے خالی کر دو۔'' نور محمد نے کہا۔

بھاگ بھری اٹھی اندر سے برتن لے آئی اور ٹرے خالی کر دی۔ نور محمد نے ٹرے میرل کو دی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

''کوئی بات نہیں چاچا۔'' کہہ کر وہ چلا گیا۔

رانی ابھی تک چائے بنا رہی تھی۔ ''رانی بیٹا چائے کو اچھی طرح پکا کر لانا۔'' نور محمد نے رانی کو کہا اور خود بھاگ بھری کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''یہ چاول میرل دے گیا ہے، کہہ رہا تھا آج گیارھویں شریف کی نیاز گھر میں بنائی تو اس کی امی نے ایک ٹرے چاول ہماری طرف بھی بھجوا دیے۔'' نور محمد نے بھاگ بھری کو بتایا اور ایک نوالہ کھاتے ہوئے کہا۔

''زبردست بڑا ذائقہ ہے اس خاتون کے ہاتھ میں۔''

''پھر جاؤ اور اس کے گھر میں رہنا شروع کر دو۔'' بھاگ بھری نے غصیلی آنکھوں سے نور محمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے تم تو خوامخواہ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہو۔ میں تو بس چاولوں کی بات کر رہا تھا، یہ لو کھا کر دیکھو۔'' نور محمد نے پیار سے اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر بیوی کو

PakiBooks.Site

کھلایا اور بھاگ بھری کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں صحیح ہیں۔'' بھاگ بھری نے منہ بنا کر کہا۔

''اچھا اب رانی کو بھی بلا لیتے ہیں۔'' نور محمد نے کہا اور رانی کو آواز دی۔ ''رانی بیٹا اگر چائے بن گئی ہو تو پیالیوں میں ڈال کر جلدی لے آؤ اور چاول کھا لو۔''

''جی ابا میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔ رانی نے کہا اور تین پیالیوں میں چائے ڈال کر ٹرے میں رکھ کر آ گئی۔ ''ابا یہ چاول کہاں سے آئے ہیں؟'' رانی نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''او پتر اپنے محلے سے ہی آئے ہیں۔ بس تم کھانا شروع کر دو۔ کوئی سوال نہیں کرو۔'' نور محمد نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابا۔'' کہہ کر رانی نے بھی چاول کھانا شروع کر دیے۔ چاول میں گوشت کی بوٹیاں بھی کافی تھیں۔ میرل کافی بڑی ٹرے بھر کر لایا تھا وہ ان تینوں نے ختم کی۔ حالانکہ وہ لوگ اپنا کھانا بھی کھا کر ہی بیٹھے تھے۔

''ابا چاول بہت اچھے بنے ہوئے تھے۔'' رانی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اپنی ماں سے کہو۔'' نور محمد نے کن اکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

بھاگ بھری نے غصے سے رانی کی طرف دیکھا۔ ''چلو اپنی چائے ختم کرو اور سونے کی تیاری کرو۔''

''جی اماں۔'' رانی نے کہا اور جلدی جلدی چائے پینے لگی۔ تھوڑی دیر میں تینوں نے سونے کی تیاری کی اور اپنی اپنی چارپائی پر سو گئے۔ صبح وہ تینوں ہی دیر تک سوتے رہے جب بھاگ بھری کی آنکھ کھلی سورج کافی نکل آیا تھا بلکہ اب تو وہ اپنی تھوڑی تھوڑی شوخی بھی دکھانے لگا تھا۔

''یا اللہ آج کیا ہو گیا اور یہ نورا بھی اب تک سو رہا ہے۔'' بھاگ بھری نے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی پتا نہیں کیوں آج اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھی نلکے تک گئی۔ ہاتھ منہ دھویا اور وہیں سے رانی کو آواز دی۔ ''رانی بیٹا اٹھو جب تک تم آٹا گوندھو میں چائے بنا لیتی ہوں۔'' مگر رانی نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ رانی کو اٹھانے کے لیے کمرے میں آئی مگر چارپائی پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم کمرے کے دروازے پر ہی رک گئے۔ رانی عجیب حالت میں سو رہی تھی۔ بالکل سیدھی، بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ قمیص بھی ایک طرف سے اٹھی ہوئی تھی۔ بھاگ بھری کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ تیزی سے رانی کی طرف بڑھی۔ آگے بڑھتے ہی وہ مزید خوف زدہ ہو گئی کیوں کہ رانی کی چارپائی کے قریب ہی ایک مردانہ پرس پڑا تھا۔ بھاگ بھری نے رانی کو اٹھانے کی بجائے نور محمد کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔

''نورل نورل اٹھو ہم برباد ہو گئے ہیں۔''

نور محمد گھبرا کر اٹھا۔ ''کیا ہوا کیا ہوا اور تم رو کیوں رہی ہو۔''

بھاگ بھری نے روتے ہوئے رانی کی طرف اشارہ کیا۔ نور محمد نے رانی کی طرف دیکھا مگر فوراً ہی سر نیچے کر لیا اور بیوی سے بولا۔ ''پہلے تم اس کی قمیص درست کرو۔''

بھاگ بھری نے رانی کی قمیص درست کی اور چارپائی کے ساتھ پڑا پرس اٹھا کر لے آئی، نور محمد کو دیا۔ نور محمد نے پرس کھولا اس میں کچھ پیسے پڑے ہوئے تھے اور میرل کا شناختی کارڈ بھی تھا۔

''اس کا مطلب ہے اسی کتے نے ہمارا گھر برباد کیا ہے۔ میں اس بے غیرت کو نہیں چھوڑوں گا۔ اسے قتل کر دوں گا۔''

''حوصلہ کرو نورل اس میں ہماری مزید بربادی ہے۔ اول تو تم اسے مار نہیں سکتے اور کسی طریقے سے مار بھی دیا تو ہمارا کیا بنے گا نورل، ہم کہاں جائیں گے اور پھر بے سہارا عورتوں کے لیے تو ہر جگہ کوئی نہ کوئی میرل موجود ہے۔'' بھاگ بھری نے روتے ہوئے کہا۔ اسی دوران رانی نے پانی مانگا۔ بھاگ بھری نے بھاگ کر پانی کا گلاس لا کر رانی کو دیا۔ رانی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، اس کا پورا بدن دکھ رہا تھا۔ بھاگ بھری نے اسے ہاتھ کے سہارے سے اٹھایا۔ ''پتر آرام سے اٹھ، ساری رات تجھے بخار تھا۔'' بھاگ بھری نے کہا اور رانی کو لٹا دیا اور ناشتا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ کیوں کہ حالات جیسے بھی ہوں پیٹ کی آگ تو بجھانی ہی پڑتی ہے۔ نور محمد بھی گدھا گاڑی لے کر بجھے دل کے ساتھ کام پر روانہ ہو گیا کیونکہ اس کا تعلق ایسے طبقے سے تھا جو روز کماتا اور روز کھاتا ہے۔ سارا دن نور محمد پریشان رہا۔ کام بھی بس نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اتنا ہو گیا تھا کہ شام کی روٹی تو چل جاتی۔ اب شام بھی ہو چکی تھی۔ اس نے واپس گھر کی راہ لی مگر اس کا ذہن ابھی تک میرل پر اٹکا ہوا تھا۔ نور محمد بستی کے کونے پر پہنچا تو اسے میرل نظر آگیا۔ نور محمد نے گدھا گاڑی سائیڈ پر روکی اور بھاگ کر پیچھے سے جا کر میرل کو دبوچ لیا اور تھپڑوں، مکوں اور لاتوں سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ میرل اچھا خاصا تگڑا جوان تھا مگر اس وقت وہ صرف اپنا بچاؤ

ہی کرتا رہا اگر وہ چاہتا تو میرل کو اچھی طرح سبق سکھا سکتا تھا مگر اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ جلد ہی نور محمد بھی تھک گیا۔ ”بول ذلیل تو نے ایسا کیوں کیا؟“ نور محمد نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”ارے چاچا کیا ہو گیا آپ کو۔ کیا کر دیا میں نے ایسا؟“ میرل نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

”تو رات میرے گھر کیا کرنے آیا تھا؟“ نور محمد نے کہا۔

”میں آپ کے گھر کیا کرنے آؤں گا۔ چاچا میں رات بستی میں بھی نہیں تھا۔ آپ کو چاول دینے کے بعد اپنے دوست حبیب کے پاس بستی لقمان میں تھا۔“ میرل نے کہا۔

”اچھا اگر تو رات بستی لقمان میں تھا تو تمہارا پرس اور اس میں موجود تمہارا شناختی کارڈ اڑ کر میرے گھر آ گیا تھا۔“ نور محمد نے کہا اور دوبارہ میرل کا گریبان پکڑ لیا۔

”چھوڑ چاچا نورل، بہت ہو گیا رات میرا پرس گر گیا تھا تو کسی نے اٹھا کر تمہارے گھر پھینک دیا ہو گا۔ تمہیں تو پتا ہے نہ پوری بستی میں سارے میرے دشمن ہیں۔ مجن تو کوئی ہے ہی نہیں۔“ میرل نے کہا اور جھٹکا دے کر اپنا گریبان چھڑوا لیا۔

”تو صحیح کہہ رہا ہے؟“

میرل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”او چاچا پنچایت رکھ لے لیکن اتنا یاد رکھنا بدنامی تمہاری ہی ہے۔ میں تو ہوں ہی بدنام آدمی۔“

نور محمد خاموش ہو گیا تھا۔ پھر اپنی گدھا گاڑی لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ بہر حال اس دن کے بعد تو جیسے پریشانیوں نے نور محمد کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ کبھی بھاگ بھری بیمار تو کبھی رانی کو بخار۔ نور محمد خود بھی اب ہمت ہارنے لگا تھا پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

نور محمد کا گدھا بوڑھا تو ہو ہی گیا تھا مگر وہ ایک دن اچانک ہی ساتھ چھوڑ دے گا نور محمد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ رات کو تو اس نے اسے صحیح سلامت اپنی جگہ پر باندھا تھا۔ صبح جب نور محمد اسے پانی پلانے گیا تو وہ مردہ حالت میں پڑا تھا۔ گدھے کے مرنے پر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑا تھا بلکہ اس کے ساتھ بھاگ بھری اور رانی بھی روئے تھے کیونکہ ایک تو وہ ان کی روزی روٹی کا ذریعہ تھا اور ان کے گھر میں پندرہ سال سے تھا۔ وہ گھر کے تینوں افراد سے ہی مانوس تھا۔ ابھی نور محمد اس غم سے نکلا ہی نہ تھا کہ

دو دن بعد رانی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ بھاگ بھری اسے فوراً قریبی کلینک لے گئی جہاں لیڈی ڈاکٹر ایک فلاحی تنظیم کے تعاون سے بہت کم پیسوں سے دوائی وغیرہ دے دیتی تھی۔ اس نے رانی کا چیک اپ کیا اور بھاگ بھری کو بلا کر کہا کہ اب رانی کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنا اور اگلی مرتبہ آنا تو مٹھائی بھی ساتھ لے کر آنا کیونکہ یہ اُمید سے ہے۔

وہ تو یہ کہہ کر دوسرے مریضوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گئی مگر بھاگ بھری پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ جیسے تیسے رانی کو لے کر گھر تک آئی اور گھر کے اندر ہی رانی پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ ”ارے تو پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی تو اچھا تھا۔

رانی چپ چاپ اس جرم کی سزا سہتی رہی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اس دن بھاگ بھری شاید رانی کو مار ہی دیتی اگر نور محمد نہ آ جاتا۔ نور محمد نے پہلے تو بھاگ بھری کو پیار سے منع کیا مگر جب وہ نہ رکی تو اس نے اسے زور سے پکڑ کر دھکا دیا اور پھر رانی کو گلے سے لگا لیا۔ ”کیوں مار رہی ہو میری معصوم بچی کو۔“

بھاگ بھری نے کوئی جواب نہ دیا، بس چپ چاپ روتی رہی۔ اس دن گھر کے تینوں افراد نے رونے میں ہی گزارہ۔ بھاگ بھری دوپٹے سے سر باندھ کر ایک طرف پڑی رہی، رانی بھی چارپائی پر تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ نور محمد بھی کافی دیر تک روتا رہا مگر وہ مرد تھا اسے ہمت پکڑنی تھی۔ وہ اٹھا اور قریبی قصبے مزدوری کے لیے نکل گیا۔ شام کو وہ ہوٹل سے پانچ روٹیاں اور دال پارسل کروا کر لے آیا تھا اور ساتھ ہی دودھ بھی لیتا آیا تھا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بھاگ بھری بھی بے سدھ پڑی تھی اور رانی بھی سو رہی تھی۔ دراصل دونوں ہی روتے روتے سو گئی تھیں۔ نور محمد نے روٹی اور سالن ایک سائیڈ پر رکھا۔ چائے کے لیے پانی چولہے پر چڑھا دیا کہ جب تک چائے بنتی ہے میں ان دونوں کو اٹھا لوں تاکہ ہم کھانا کھا سکیں۔ نور محمد نے سوچا اور پھر پہلے بھاگ بھری کو اٹھایا اور پھر رانی کو دونوں کو بھوک لگی ہوئی تھی کیونکہ دونوں نے صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے دوران رانی خاموشی سے سر جھکا کر کھانا کھاتی رہی۔ بھاگ بھری بھی شرمندہ تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے رانی کو کیوں مارا۔ کھانے کے بعد نور محمد تین کپوں میں چائے لے آیا۔ چائے پینے کے بعد بھاگ بھری نے اٹھ کر رانی کو گلے لگایا۔

PakiBooks.Site

رانی اب بھی خاموش تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، کون ہے، آتا ہوں نور محمد نے کہا اور پھر جا کر دروازہ کھولا، سامنے میرل کھڑا تھا اس سے پہلے کہ نور محمد اسے کچھ برا بھلا کہتا وہ دروازے کو ایک طرف دھکیل کر اندر داخل ہو گیا اور سیدھا بھاگ بھری کے قدموں میں جا بیٹھا اور اس کے پیر پکڑ لیے۔ ”چاچی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔“

نور محمد نے پیچھے سے آ کر میرل کو گردن سے پکڑا۔ ”بے غیرت تجھے میرا گھر برباد کر کے بھی چین نہ آیا اور اب تو میرے گھر کے اندر آ گیا۔“

”چاچا میں اس غلطی کو سدھارنے آیا ہوں جو آپ کے گلے میں سانپ بن کر لپٹی ہوئی ہے۔ مجھے سب پتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے رانی کی کیا رپورٹ دی ہے۔“ میرل نے کہا۔

نور محمد نے اس کی گردن چھوڑی اور جا کر باہر کا دروازہ بند کیا اور پھر آ کر میرل کے قریب بیٹھ گیا۔ ”اچھا تو تجھے یہ سب کچھ پتا ہے اور تو اپنی پہلی غلطی بھی تسلیم کرتا ہے۔“ نور محمد نے کہا۔

”ہاں چاچا میں رانی کی محبت میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے پتا تھا آپ رانی کا ہاتھ مجھے کبھی نہیں دیں گے۔ اس لیے میں موقع تلاش کرتا رہا اور پھر اس دن جب اماں نے آپ لوگوں کے گھر نیاز بھجوانے کا کہا تو میں نے چاولوں میں بے ہوشی کی دوائی ملا دی اور جاتے ہوئے میں نے اپنا پرس جان بوجھ کر یہاں گرایا تھا تاکہ آپ کا شک یقین میں بدل جائے۔“ میرل نے کہا۔

”نور محمد یہ سن کر اٹھا اور سامنے پڑی سبزی کاٹنے والی چھری اٹھا لی اب تو تیرا قتل واجب ہو گیا ہے کمینے۔“ نور محمد نے کہا اور میرل پر حملہ کیا مگر میرل نے پھرتی سے اٹھ کر نہ صرف اپنا بچاؤ کیا بلکہ نور محمد کا چھری والا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے نور محمد کا گریبان پکڑ لیا۔ ”ذات کی کیوڑی اور چاہتیر وں سے چھپیاں، اوقات میں رہ چاچا اوقات میں۔“ میرل نے کہا اور جھٹکے سے چھری نور محمد سے چھین لی۔

نور محمد بے بس ہو گیا تھا مگر پھر بھی تلملا رہا تھا۔ ”میں تیری ذات بچانے کی خاطر اپنی عزت تیرے ہاتھوں بار بار نیلام کروا رہا ہوں اور تو شیر بنتا جا رہا ہے اگر رشتہ دینا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تیری مرضی لیکن یاد رکھنا رانی کے پیٹ میں میرا بچہ ہے اور یہ تیرے گلے کا ڈھول ہے جسے تو چاہتے ہوئے

بھی نہیں اتار سکے گا۔“ میرل نے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں مجھے دو دن میں بتا دینا۔“

یہ کہہ کر میرل چلا گیا مگر نور محمد اور بھاگ بھری کو پریشانیوں نے گھیر لیا۔ دونوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ رانی بھی پریشان تھی مگر وہ جلد سو گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی رات بھر آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے اور آخر میں وہ فیصلہ کرنے میں متفق ہو گئے۔ انہوں نے رانی کا ہاتھ میرل کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں اب اطمینان سے سو گئے تھے۔ دوسرے دن نور محمد نے میرل کو اکیلے میں بلا کر کہا۔ ”دیکھو میرل میں تمہیں رانی کا رشتہ دینے پر تیار ہوں مگر میری ایک دو شرطیں ہیں۔“

”حکم کر چاچا مجھے تیری ہر شرط منظور ہے۔“ میرل نے کہا۔

”تو پھر سنو، میری پہلی شرط ہے کہ تم اپنے ماں باپ کو میرے گھر رشتے کے لیے لے آؤ۔ نکاح سادگی سے ہو گا اور تیسری شرط تو نہیں مگر میں تجھے سمجھا رہا ہوں تمہاری اور رانی کی عمر میں کافی فرق ہے تمہیں ہر معاملے میں اس کا خیال رکھنا ہو گا اگر اس سے کوئی غلط ہو بھی جائے تو تمہیں درگزر کرنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے چاچا وہ رانی ہے تو میں بھی اسے رانی بنا کر رکھوں گا۔“ میرل نے کہا اور پھر دوسرے دن اپنے ماں باپ کو لے آیا اور ایک ہفتے بعد ہی سادگی سے نکاح ہو گیا۔ میرل رانی کو اپنے گھر لے گیا۔ رانی کو نور محمد اور بھاگ بھری نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ کس مجبوری کے تحت اس کا رشتہ میرل سے کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس رشتے کو ہر حال میں نبھانے کی کوشش کرنا۔ میرل کی کام نہ کرنے کی عادت پختہ پہلے ایک مہینے تو اس کے ماں باپ اور بھائیوں نے خاموشی اختیار کیے رکھی مگر جب میرل نے پھر بھی کام نہ کیا تو اس کے ماں باپ اور بھائیوں نے پہلے پیار سے کام دھندا کرنے کا کہا مگر جب میرل کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تو انہوں نے نہ صرف سختی سے کہا بلکہ ایک ہفتے بعد اسے الگ کر دیا اور اسے کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر جہاں دل کرے چلا جائے مگر اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

میرل نے پہلے تو احتجاج کیا مگر جب ماں باپ اور بھائیوں کے سامنے دال نہیں گلی تو اس نے اپنا حصہ طلب کیا۔ اس بات پر اس کے بھائی آگ بگولہ ہو گئے کہ تم نے آج تک کیا ہی کیا ہے جو تمہیں حصہ دیں۔ الٹا چوری چکاری کے الزام

میں کبھی پنچایت میں پیسے بھرتے ہیں تو کبھی تھانے میں، لڑ جھگڑ کر میرل کے حصے میں صرف گھر کے تھوڑے برتن ہی آئے۔ جو وہ اٹھا کر اور رانی کو لے کر اپنے ساس سسر کے پاس آگیا اور انہوں نے بھی بیٹی کی خاطر چپ سادھ لی۔ یہاں بھی میرل نکما ہی رہا۔ نور محمد نے گدھے کے مرنے کے بعد مزدوری شروع کردی تھی اگر وہ کوشش کے باوجود بھی خالی آجاتا تو کھانے کے لالے پڑ جاتے مگر وہ بے چارہ خاموش رہتا۔ میرل کو پیار سے سمجھاتا مگر میرل ہر دفعہ ایک ہی جواب دیتا، کوشش کر رہا ہوں چاچا بس جیسے ہی کوئی ڈھنگ کا کام ہاتھ آیا میں شروع کردوں گا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے ان کی پریشانی میں اضافہ اور تنگدستی بڑھنے لگی۔ نور محمد کا گدھا تو پہلے ہی مر گیا تھا باقی لکڑی والی گاڑی بچی تھی وہ بھی بک گئی۔ اس کے پیسے بھی تیزی سے ختم ہونے لگے۔ میرل بھی اب نور محمد کی فیملی کا حصہ بن گیا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ میرل سے مشورہ کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک رات جب گھر کے چاروں افراد اکٹھے تھے نور محمد نے کہا۔ ''میرل اب کام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچو کیونکہ اب گھر میں نیا مہمان بھی آنے والا ہے۔ میرے پاس اب گدھا گاڑی کا آسرا بھی نہیں اگر فوری طور پر کام نہ ملا تو بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔''

''اوہ چاچا بھیک مانگیں ہمارے دشمن، میں کل تک کام ڈھونڈتا ہوں ویسے میرے پاس ایک مشورہ ہے اگر آپ لوگ مان جائیں تو اس سے ہم امیر نہ سہی مگر غریب بھی نہیں رہیں گے۔''

نور محمد کے ساتھ بھاگ بھری اور رانی بھی میرل کی طرف دیکھنے لگے پھر نور محمد نے پوچھا۔ ''ایسا کون سا مشورہ ہے تمہارے پاس جس سے ہمارے دن پھر جائیں گے؟''

''چاچا اگر ہم لوگ کراچی شفٹ ہو جائیں تو شاید ہمارے دن پھر جائیں۔'' میرل نے کہا۔

''اوہ بیٹا! ہم رحیم یار خان شہر تک نہیں گئے تو پھر کراچی میں ہم کہاں رہ سکیں گے۔'' نور محمد نے کہا۔

''چاچا کہاں کا پردیس وہ بھی اپنے پاکستان کا حصہ ہے اور ویسے بھی میرے کچھ رشتے دار وہاں کافی عرصے سے ہیں میں ان سے رابطہ کرتا ہوں۔ رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور وہ لوگ ہمیں کام پر بھی لگوا دیں گے۔'' میرل نے کہا۔

نور محمد نے بھاگ بھری اور رانی کی طرف دیکھا۔

دونوں خاموش رہیں مگر ان کی آنکھوں سے رضامندی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ نور محمد خود بھی اس چھوٹے سے قصبے سے نکلنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے بھی ہاں کردی اور کہا۔ ''دیکھو میرل پہلے اپنے رشتے داروں سے بات پکی کرلو کہیں ایسا نہ ہو ہم جائیں اور وہ لوگ پہچاننے سے انکار کردیں کیونکہ بڑے شہروں میں ایسا ہوتا ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا چاچا بس تو تیاری کر باقی میرا کام ہے۔'' میرل نے کہا۔

ایک ہفتے میں وہ لوگ تیاری کر کے کراچی آگئے۔ یہاں میرل کے رشتے داروں نے واقعی تعاون کیا انہوں نے گلشن اقبال کی کچی آبادی میں نہ صرف مکان کرائے پر لے کر دیا بلکہ بھاگ بھری اور رانی کو بھی انہوں نے ماسی کا کام دلوادیا۔ نور محمد کو بھی ایک جگہ چوکیداری مل گئی۔ صرف میرل ہی نکما رہا۔ وہ بھی خود کام نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ اس کے رشتے داروں نے ایک دو جگہ اس کی بات کرادی تھی مگر وہ خود ہی کوئی ایسا بہانہ تلاش کرتا کہ بات بگڑ جاتی۔ دراصل میرل کی سوچ شروع سے ہی ایسی تھی کہ کام نہ کرنا، جرائم پیشہ افراد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، بڑھکیں مارنا۔ یہاں بھی اسے اپنے جیسے لوگ مل گئے تھے۔ میرل بس صبح اٹھتا ناشتا کرتا جب بھاگ بھری، رانی اور نور محمد کام پر چلے جاتے تو وہ اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ چرس پیتا، گپیں لگاتا، دوپہر کا کھانا وہ ایک ویلفیئر کے دسترخوان پر کھانے چلا جاتا جہاں بکرے کا گوشت اور نان ملتے۔ کچھ دیر ادھر اُدھر گھومتا اور پھر گھر آکر سو جاتا، شام کو جب رانی اور بھاگ بھری لوٹتیں تو ساتھ میں کھانا بھی لاتیں جو اکثر بریانی، کباب، قورمہ وغیرہ ہی ہوتا۔ میرل نے ایسے کھانے کب کھائے تھے، اس کے تو مزے لگ گئے۔ دو مہینے میں ہی اس کی صحت بدل گئی۔ قد اس کا ویسے ہی لمبا تھا، روزانہ گوشت اور چاول کھانے سے وہ کافی موٹا ہوگیا تھا۔ مونچھیں بھی اس نے بڑھالی تھیں جس کی وجہ سے وہ شکلاً جرائم پیشہ لگنے لگا۔ بھاگ بھری اور رانی روزانہ نو بجے کام پر نکلتیں اور واپسی شام چار بجے ہوتی تھی۔

تین چار مہینے بعد رانی گھر بیٹھ گئی کیونکہ ڈلیوری کے دن قریب آتے جارہے تھے۔

دو مہینے بعد رانی نے ایک بیٹے کو جنم دیا مگر میرل کی روٹین میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی گھومنا، گلی میں آوارہ دوستوں کے ساتھ بیٹھنا ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دوستوں میں اضافہ ہونے لگا مگر اس کے سارے ہی دوست

PakiBooks.site

نہ صرف نکمے اور چرسی تھے بلکہ کچھ تو چھینا جھپٹی اور ڈکیتی جیسے جرائم میں بھی ملوث تھے۔ ان کے ساتھ مل کر میرل بھی ڈکیتی کی چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرنے لگا تھا۔ نور محمد تک یہ باتیں پہنچیں تو اس نے میرل کو پہلے پیار سے پھر دھمکا کر بھی دیکھا مگر اثر الٹا ہوا۔ وہ انہیں دھمکانے لگا۔

اب وہ رانی کو بھی دھمکا کر رکھتا تھا کیونکہ وہ بیٹے کی وجہ سے گھر پر بیٹھی تھی۔ آخر روز روز کی بک بک سن کر رانی نے ماں کو کہا کہ اماں اب میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ میں گھر میں بیٹھ کر بور ہو جاتی ہوں۔ اس نے ماں کو میرل کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ کام کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے ورنہ بھاگ بھری میرل سے جھگڑتی اور میرل بدتمیزی پر اتر آتا۔ گھر میں نیا فساد کھڑا ہو جاتا مگر ماں نے اسے سمجھایا۔ ''بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے۔ صرف دو مہینے کا ہے۔ کام کیسے کروگی اور اس کو کیسے سنبھالو گی۔''

''اماں کوئی ایسا گھر ڈھونڈو ناں جہاں میں شہزاد کو بھی ساتھ لے جاسکوں۔'' رانی نے کہا۔

''اچھا میں کہیں بات کرتی ہوں۔'' بھاگ بھری نے کہا اور پھر ایک ہفتے کی کوششوں کے بعد ایک بنگلے میں بات بن گئی۔ دو ہزار گز کے ڈبل اسٹوری بنگلے میں صرف میاں بیوی رہتے تھے۔ بچے شادی شدہ اور ملک سے باہر تھے۔ مسز شاہ نے سارے دن کے لیے رانی کو کام پر رکھ لیا اور بچہ بھی ساتھ لے کر آنے کی اجازت دے دی۔ گھر کے مالک اسد شاہ ریٹائرڈ بیورو کریٹ تھے اور خاندانی جاگیردار تھے۔ شراب کے رسیا تھے جب کہ ان کی بیوی سائرہ شاہ پڑھی لکھی مگر انتہائی سادہ مزاج تھیں، نہ لباس کا خیال نہ فیشن کی پروا اسی لیے 55 سال کی عمر میں بھی 60 سال سے اوپر کی لگتی تھیں جب کہ اس کے برعکس اسد شاہ نہ صرف اپنی فٹنس کا خیال رکھتا بلکہ لباس کا بھی خاص اہتمام کرتا۔ شراب وہ صرف رات کو ہی پیتا تھا۔ گاؤں کی زمینیں ٹھیکے پر دے رکھی تھیں۔ جن کے سالانہ پیسے ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔

رانی نے جب اسد شاہ کے گھر کام شروع کیا تو وہ سائرہ شاہ کے رویے سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی اور اس کے دو مہینے کے بیٹے شہزاد کے لیے کپڑے وغیرہ بھی لے کر دیتی۔ اکثر نقد پیسے بھی دیتی رہتی تھی، رانی کو مکمل آزادی تھی کہ جو چیز ان دونوں کے لیے پکائے وہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی لے کر جاسکتی ہے۔ اچھے کھانے ملنے لگے تو وہ نکھرنے لگی۔ مسز شاہ اسے بیٹی کی طرح مانتی تھی۔ تین مہینے میں اسے تین سوٹ سلوا کر دیئے تھے جسے پہن کر وہ شہزادی جیسی لگتی۔ اسے خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی معصومیت اس کی خوب صورتی اسد شاہ کے سکون کو برباد کررہی ہے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ اسد شاہ کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا مگر وہ سائرہ شاہ کے ڈر سے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ خود سائرہ شاہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسد شاہ رانی کو ایسی نظروں سے دیکھ سکتا ہے کیونکہ رانی ہمیشہ سائرہ شاہ کو امی اور اسد شاہ کو ابا جی کہتی مگر اسد شاہ نے کبھی ایسا تاثر نہیں دیا تھا کہ سائرہ شاہ کو شک ہوتا۔ اس طرح رانی بھی آزادانہ اسد شاہ کے کمرے میں چلی جاتی۔ کبھی چائے دینے کبھی ڈسٹنگ کرنے، کبھی جھاڑو لگانے۔ اسے دیکھتے ہی اسد شاہ تڑپ جاتا مگر رانی بھولی بھالی تھی۔ اس کی زبان پر ہمیشہ گردان رہتی کہ ابا جی چائے لے آؤں، ابا جی آپ باہر چلیں میں جھاڑو لگالوں۔ ابا جی آپ ہٹیں میں ڈسٹنگ کردوں۔

ایک دو دفعہ اسد شاہ نے اسے پیار سے سمجھایا بھی کہ رانی بیٹا مجھے انکل بلایا کرو مگر رانی ہمیشہ بھولے پن سے کہتی۔ ''نہیں ابا جی آپ لوگوں نے مجھے اتنا سکھ دیا ہے کہ مجھے آپ دونوں امی ابا کی طرح ہی لگتے ہیں۔''

اور اسد شاہ دل ہی دل میں جل کر رہ جاتا۔ رانی اس کے حواس پر سوار ہوگئی تھی۔ اکثر ماہر نفسیات کہتے ہیں مرد کی عمر بڑھنے کے ساتھ دو چیزوں کی طلب اس میں بڑھ جاتی ہے۔ ایک عمر کی اور دوسری ہوس کی اور اسد شاہ بھی اب بھیڑیا بن کر رانی کو بھنبھوڑنا چاہتا تھا مگر زمانے سے ڈرتا بھی تھا لیکن چھ مہینے بعد حالات نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ اس کی بیٹی نمرہ شاہ اپنے شوہر کے ساتھ شارجہ سے پاکستان آئی تو اپنے ماں باپ کو ایک مہینے کے لیے شارجہ لے جانا چاہا کیونکہ شارجہ میں وہ لوگ اپنے سپر اسٹور کا افتتاح کررہے تھے۔ اسد شاہ نے انکار کردیا کہ بیٹا ابھی تم ماں کو لے جاؤ میں بیس دن بعد آجاؤں گا کیونکہ گاؤں کی زمینیں جو ٹھیکے پر دی ہوئی ہیں اس کی میعاد ختم ہوگئی ہے اب نیا معاہدہ ہوگا۔

''پھر رانی کو ایک مہینے کی چھٹی دے دیں؟'' سائرہ شاہ بولی۔

''جیسے تمہاری مرضی، ویسے اگر رانی بیٹی ہفتے میں دو دفعہ ڈسٹنگ کے لیے آجایا کرے تو بہتر ہے، کھانا میں باہر کھا لیا کروں گا۔'' اسد شاہ نے مکاری سے جال پھینکا۔

اس نے اتنے پیار سے رانی بیٹی کہا تھا کہ جیسے رانی اس کی سگی بیٹی ہو، سائرہ شاہ بھی راضی ہوگئی تھی پھر ایک ہفتے

بعد ان لوگوں کی تیاری ہوگئی جانے سے پہلے سائرہ شاہ نے رانی کو ایک مہینے کی تنخواہ ایڈوانس اور دو ہزار علیحدہ سے بھی دیے۔

رانی سائرہ شاہ کے گلے لگ کر رونے لگی تھی۔

''ارے کیا ہوا بیٹا میں ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہی ہوں صرف ایک مہینے کی بات ہے۔'' سائرہ شاہ نے کہا۔

''پتا نہیں کیوں امی میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' رانی نے کہا۔

''تم ایسا کرنا ہفتے میں دو بار آکر صرف اپنے ابا جی کے کمرے کی ڈسٹنگ کر دینا، کھانا وغیرہ نہیں بنانا، یہ باہر کھا لیں گے۔'' سائرہ شاہ نے اسد شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

''جی امی میں آجایا کروں گی۔ بس آپ اپنا خیال کرنا۔'' رانی نے کہا۔

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ ہم ایک گھنٹے میں چلے جائیں گے۔ تم دو دن بعد آکر ڈسٹنگ کر جانا۔'' سائرہ شاہ نے کہا۔

رانی گھر چلی گئی ایک گھنٹے بعد سائرہ شاہ بھی اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ شارجہ روانہ ہوگئی۔ سب کے جانے کے بعد اسد شاہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ شادی کے بعد آج پہلی دفعہ سائرہ شاہ کے جانے پر اسد شاہ خوشی محسوس کر رہا تھا ورنہ وہ اسے کہیں بھی نہیں جانے دیتا تھا پھر وہ رانی کے بارے میں سوچنے لگا کہ کیسے وہ قابو میں آسکتی ہے، کیونکہ رضا مندی سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ پھر ایک مہینے تک کام پر ہی نہ آتی اور ایک مہینے بعد یہ بات سائرہ شاہ تک جا پہنچتی اور سائرہ شاہ سے بچوں تک، اس طرح اسد شاہ نہ صرف اپنی بیوی بلکہ اپنے بچوں کی نظروں میں بھی گر جاتا اور یہ سب اسد شاہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ وہاں سے شراب کی بوتل لی۔ فریج سے برف کے چھوٹے ٹکڑے نکالے اور پھر ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ گلاس میں تھوڑی برف اور شراب ڈال کر پینے لگا۔ اسد شاہ شروع سے تنہائی پسند بھی تھا اس لیے جاگیردارانہ پس منظر اور بیورو کریٹ ہونے کے باوجود نوکروں کی فوج تو دور ڈرائیور بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ کنجوس تھا۔ وہ بہترین شاہ خرچ تھا مگر نوکر رکھنے سے ہمیشہ الرجک رہتا تھا کیوں کہ اس نے ایسے کئی واقعات دیکھے تھے کہ نوکروں نے گھر لوٹ لیا۔ اسد شاہ نے پہلا پیگ پیا پھر دوسرا پھر تیسرا آہستہ آہستہ سب خیالات منتشر ہونے لگے صرف ایک ہی خیال اس پر غالب آنے لگا، رانی کا خیال۔

دو دن بعد صبح نو بجے رانی کام پر آئی تو اس نے پورا پلان تیار کیا ہوا تھا۔ رانی نے سلام کیا۔ اسد شاہ نے صرف سلام کا جواب دیا بیٹا نہیں کہا جو وہ اکثر سائرہ شاہ کے سامنے کہتا تھا۔ رانی نے شہزاد کو جھولے میں سلایا جو سائرہ شاہ نے اسے دلایا تھا تاکہ شہزاد آرام سے سو سکے اور رانی گھر کا کام کر سکے۔ رانی آج بھی قیامت ہی لگ رہی تھی۔

''ابو جی آپ نے ناشتا کرلیا۔'' رانی نے پوچھا۔

اسد شاہ کو اس کا بار بار ابو جی کہنا زہر لگ رہا تھا مگر وہ برداشت کرتا رہا۔ ''ہاں میں نے ناشتا کرلیا ہے اور سنو میرے کمرے میں جوس رکھا ہوگا صبح میں نے کچھ زیادہ بنالیا تھا اس لیے کچھ بچ گیا ہے فوراً پی لینا ورنہ خراب ہو جائے گا۔'' اسد شاہ نے کہا۔

''جی ابو میں پی لیتی ہوں۔'' رانی نے کہا اور اسد شاہ کے کمرے کی طرف چلی گئی تاکہ کمرے کی صفائی وغیرہ بھی کرلے اور جوس بھی پی لے۔ رانی نے کمرے میں داخل ہو کر پہلے جوس پیا اور پھر کمرے میں صفائی شروع کردی۔ جھاڑو لگا کر رانی نے کپڑا اٹھایا اور بیڈ روم کے فرنیچر صاف کرنے لگی مگر اسی دوران اس پر غنودگی طاری ہونے لگی سر بھی چکرانے لگا۔ ''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' رانی بڑبڑاتی ہوئی بیڈ پر بیٹھی اور پھر لیٹ گئی۔

اسد شاہ تھوڑی دیر بعد بیڈ روم میں آگیا۔ رانی اس کے بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اسد شاہ نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر انسان سے حیوان بن گیا۔ شام چار بجے تک وہ اسے درندہ بن کر نوچتا رہا مگر اس کا ابھی دل نہیں بھرا تھا۔

میرل کو تو پروا ہی نہیں تھی لیکن بھاگ بھری چار بجے کام سے واپس آئی تو رانی کو گھر نہ پاکر پریشان ہوگئی کیونکہ رانی نے اسے بتایا تھا کہ سائرہ شاہ اپنی بیٹی کے ساتھ ملک سے باہر ہے صرف ابو جی یعنی اسد شاہ گھر پر ہے اس لیے وہ نو بجے جائے گی اور بارہ ایک بجے واپس آجائے گی۔ اس نے میرل کو ساتھ لیا اور اسد شاہ کے بنگلے پر گئی۔ وہاں اسد شاہ نے دروازہ کھولا اور جو کچھ اس نے کہا اس سے بھاگ بھری کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسد شاہ نے کہا ہم نے تو اسے ایک مہینے کی چھٹی دی تھی کیوں کہ سائرہ یہاں ہے نہیں اور میں بھی کھانا وغیرہ باہر کھاتا ہوں اس لیے رانی کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ایک مہینے بعد آئے جب سائرہ واپس آجائے۔ اسد شاہ نے کہا تو بھاگ بھری وہیں نیچے بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

اسد شاہ پریشان ہوگیا کہ کہیں معاملہ بڑھ نہ جائے لیکن زمانے کے سرد و گرم جھیلے ہوئے تھا اس نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا ہو۔ ایکسیڈنٹ وغیرہ، اسپتالوں اور ایدھی سینٹر دیکھتے ہیں، نہیں تو پھر تھانے میں رپورٹ کرا دیں گے۔ میں ابھی گاڑی نکالتا ہوں۔'' اسد شاہ نے کہا اور اندر چلا گیا۔

میرل بھی اب پریشان ہوگیا تھا۔ رانی اس کی بیوی تھی اور سب سے بڑی بات آٹھ مہینے کا شہزاد بھی اس کے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر میں اسد شاہ نے گاڑی نکالی ان لوگوں کو پیچھے بٹھایا پھر پوچھا۔ ''تم لوگوں کے پاس رانی کی کوئی تصویر وغیرہ ہے تاکہ ہم اسے دکھا کر ایدھی سینٹر اور اسپتالوں سے معلومات کرسکیں۔''

''اس کی تصویر تو نہیں ہے صاحب جی۔'' بھاگ بھری نے کہا۔

''اس کی تصویر ہے چاچی ہم نے ایک مہینے پہلے بنوائی تھی۔'' میرل نے کہا۔

''ٹھیک ہے گاڑی لے چلتے ہیں گھر، پہلے تصویر اٹھاتے ہیں پھر آگے دیکھتے ہیں۔'' اسد شاہ نے کہا۔ ''مجھے راستہ بتاتے رہنا۔''

''ٹھیک ہے آپ چلیں میں بتا رہا ہوں۔'' میرل نے کہا۔

دس منٹ میں ہی وہ لوگ تصویر لے کر پہلے ایدھی سینٹر پھر مختلف اسپتالوں میں دیکھتے پھرے مگر رانی وہاں ہوتی تو پتا چلتا۔ اسد شاہ ان لوگوں کو لے کر اپنے علاقے کی حدود میں موجود تھانے کی طرف چلا گیا۔ ''تم لوگ ابھی باہر رکو میں اندر بات کرتا ہوں پھر میں تم لوگوں کو بلواتا ہوں۔'' اسد شاہ نے کہا اور تھانے کے اندر چلا گیا۔ وہ ڈائریکٹ ایس ایچ او سے ملا۔ اپنا تعارف کرایا اور کہا ہمارے گھر میں ایک لڑکی کام کرتی تھی وہ آج صبح سے غائب ہے۔ اس کی والدہ اور شوہر پریشان ہیں۔ ویسے مجھے لگتا ہے وہ خود ہی کہیں گئی ہے۔ کیوں کہ ہم لوگوں نے اسے ایک مہینے کی چھٹی دی تھی مگر اس نے گھر میں بتایا نہیں بلکہ ان لوگوں کو کہا کہ میں کام پر جا رہی ہوں۔ آپ ان لوگوں کو تسلی دے دیں اور جو ممکن مدد ہو ان کی کر دیجیے گا۔ یہ رکھ لیں چائے وغیرہ منگوا لیں گے۔'' اسد شاہ نے یہ کہتے ہوئے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ ایس ایچ او کی طرف بڑھائے۔

ایس ایچ او نے نوٹ دیکھے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ''آپ فکر نہ کریں ہم عوام کی خدمت کے لیے ہی تو بیٹھے ہیں۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''اچھا اب میں ان لوگوں کو بلا لیتا ہوں۔ کیا نام ہے ان کا۔'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''بھاگ بھری اور میرل۔'' اسد شاہ نے کہا۔ ''ویسے آپ نے بھی اپنا نام نہیں بتایا۔''

''شاہ صاحب میرا نام نواز بھٹی ہے ویسے آپ مجھے بھٹی کہہ سکتے ہیں۔'' ایس ایچ او نے اسد شاہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر سپاہی کو آواز دی۔ ''اوئے مشتاق! تھانے کے باہر ایک عورت اور مرد کھڑے ہوں گے، بھاگ بھری اور میرل ان دونوں کو بلا کر لے آؤ۔'' بھٹی صاحب نے ہدایت دی۔

جی سر، کہہ کر سپاہی باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں میرل اور بھاگ بھری کو لے آیا۔ بھاگ بھری تو کمرے میں آتے ہی تھوڑی کنفیوژ ہوگئی مگر میرل بالکل اعتماد کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ وہ شروع ہی سے چھوٹے موٹے جرائم میں نہ صرف تھانے جا چکا تھا بلکہ جیل اور عدالتی نظام سے بھی واقف تھا۔ وہ شکل سے بھی بدمعاش لگتا تھا ایسے لوگوں سے خود پولیس والے بھی کتراتے ہیں۔ نواز بھٹی بھی کن انکھیوں سے میرل کا جائزہ لیتا رہا۔ بھاگ بھری نے روتے ہوئے بتایا صاحب جی وہ صبح نو بجے شاہ صاحب کے گھر کام پر آئی اور پھر......''

ابھی بھاگ بھری نے بات مکمل نہیں کی تھی کہ نواز بھٹی نے بات کاٹ دی۔ ''اماں یہ سب مجھے شاہ صاحب بتا چکے ہیں، آپ یہ بتائیں آپ لوگوں کی کسی سے دشمنی تو نہیں؟''

''نہیں صاحب جی ہم غریب لوگ ہیں ہماری کسی سے کیا دشمنی۔'' بھاگ بھری نے روتے ہوئے کہا۔

''اماں اس کا کسی سے کوئی چکر وکر تو نہیں تھا، میرا مطلب ہے وہ خود تو کہیں نہیں چلی گئی؟'' نواز بھٹی نے پوچھا۔

''نہیں صاحب جی میری بیٹی معصوم اور نیک تھی اللہ کے واسطے اس کے بارے میں غلط سوال نہ کریں۔'' بھاگ بھری نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

نواز بھٹی نے دیکھا۔ اس سوال پر میرل کے چہرے پر بھی غصے کے تاثرات تھے مگر وہ خاموش تھا۔ ''اماں آپ حوصلہ رکھیں۔ پولیس آپ کے ساتھ ہے، ہم آج ہی سے اس معاملے کی چھان بین کرتے ہیں۔ آپ سامنے والے کمرے

PakiBooks.Site

میں جائیں وہاں رپورٹ لکھوا دیں اور بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' نواز بھٹی نے اٹھ کر بھاگ بھری کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اسد شاہ نے بھاگ بھری اور میرل کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔ دونوں اٹھے اور سامنے ہیڈ محرر کے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں رپورٹ لکھوائی اور پھر اسد شاہ کے ساتھ واپس آ گئے۔ واپسی پر اسد شاہ نے ایک نہاری ہوٹل پر گاڑی روکی، بھاگ بھری اور میرل کے لیے کھانا پیک کروایا اور ایک نہاری اور دو روٹی اپنے لیے بھی پارسل کروائی کیوں کہ اسد شاہ کے اندازے کے مطابق اب تک رانی کو ہوش آ گیا ہو گا۔ آتے ہوئے احتیاطاً اس کے پاؤں میں زنجیر اور تالا ڈال دیا تھا اور شہزاد کو اس کے قریب ہی سلا کر آیا تھا۔ اس نے روٹی والا ایک شاپر بھاگ بھری کو دیا اور ان کو گاڑی سے اترتے وقت ہزار ہزار کے تین نوٹ دیے۔ ''تم لوگ بالکل پریشان نہ ہونا، یہ میرا نمبر رکھ لو، کسی بھی وقت میری ضرورت پڑے تو مجھے بلا جھجک فون کر دینا اور پریشان بالکل نہیں ہونا، ایک دو دن میں رانی تم لوگوں کے درمیان ہو گی۔ ہو سکتا ہے وہ راستہ بھول گئی ہو۔'' اسد شاہ نے کہا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے صاحب جی آپ ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں۔'' بھاگ بھری نے کہا۔

''ٹھیک ہے بس تم لوگ جاؤ کھانا کھاؤ اور فکر نہیں کرو، میرا ایک ڈی ایس پی دوست ہے میں اسے بھی فون کرتا ہوں۔ وہ تھانے فون کرے گا تو یہ لوگ اس معاملے میں زیادہ دلچسپی لیں گے۔'' اسد شاہ نے کہا۔

بھاگ بھری پریشان تھی مگر اسد شاہ کی تسلیوں سے مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ اسد شاہ کو دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد اسد شاہ کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''رانی دو دن میں تم لوگوں کے پاس ہو گی بس دعا کرو میرا دل اس سے جلدی بھر جائے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا اور گاڑی چلا دی۔ گھر پہنچ کر گاڑی سے اترا۔ مین گیٹ کھولا، گاڑی اندر پارک کی اور پھر سیدھا رانی کے پاس پہنچ گیا۔ لائٹیں بند اور کمرے کو لاک کر کے وہ گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھولنے اور لائٹ جلانے کے بعد اس نے دیکھا رانی کو ہوش آ چکا تھا مگر وہ حیران اور پریشان ہو کر اسد شاہ کو دیکھ رہی تھی۔

''ابو جی یہ سب کیا ہے؟'' رانی رونے لگی۔

''کم از کم اب تو مجھے ابو جی نہیں بولو۔'' اسد شاہ نے رانی کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

''ابو جی مجھے گھر جانے دیں۔ میرے اماں ابا پریشان ہوں گے۔ میرل بھی غصے میں ہو گا۔'' رانی نے روتے ہوئے کہا۔

''جانے دوں گا پہلے تم کھانا کھاؤ اور مجھے اب ابو جی بالکل نہیں کہنا۔'' اسد شاہ نے کہا اور ایک پلیٹ میں نہاری اور دوسری میں دو روٹی رکھ کر رانی کے آگے رکھ دی۔

''میں نہیں کھاؤں گی ابو۔''

''خاموش، اگر دوبارہ مجھے ابو کہا تو......'' اسد شاہ نے اسے ٹھوڑی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کھانا تو تمہیں کھانا ہی پڑے گا اور میری بات بھی ماننا پڑے گی۔ میری خاطر نہ سہی شہزاد کی خاطر۔'' اسد شاہ نے درندگی سے شہزاد کی طرف دیکھا پھر اسد شاہ نے نمک کے بہانے بے ہوشی کی دوا سالن میں ملا دی۔ کھانا کھا کر اسے دودھ پلا دینا کیوں کہ صبح سے تم بے ہوش تھیں اور یہ بھوکا۔'' اسد شاہ نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

شہزاد بھی رونے لگا تھا۔ رانی بھی نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے تھوڑا کھانا کھایا اور شہزاد کو گود میں اٹھا کر دودھ دینے لگی شہزاد بھی ماں کی گود میں آخر خاموش ہو گیا تھا۔ رانی نے اسے دودھ دیا اور تھپ تھپا کر سلا دیا۔ اسے باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر پاؤں میں زنجیر دیکھ کر وہ بیٹھ گئی۔ اسی دوران اسد شاہ کمرے میں داخل ہوا۔

''وہ مجھے باتھ روم جانا تھا۔''

''ہاں ہاں تو جاؤ یہ اٹیچ باتھ ہے۔'' اسد شاہ نے کہا۔

''وہ میری زنجیر کھول دیں۔'' رانی نے بے بسی سے کہا۔

یہ زنجیر اتنی لمبی ہے کہ تم باتھ روم تک جا سکتی ہو، میں جب تک کچن میں جا کر تمہارے لیے ٹھنڈا پانی لے آتا ہوں۔'' اسد شاہ نے کہا اور کمرے سے نکل کر کمرے کو لاک کر دیا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آ کر شراب پینے لگا جو وہ پہلے ہی رکھ کر آیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے بعد رانی کے کمرے کی طرف گیا جب تک بے ہوشی کی دوا اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر شیطان بن گیا تھا۔ اسد شاہ رات بھر درندگی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ صبح کو اسد شاہ نے رانی کے کمرے میں ڈبل روٹی، آملیٹ اور دودھ کا گلاس بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور باہر سے کمرے کو لاک کر دیا۔



جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات
دنیا بھر میں
خدمات
اور مصنوعات
کی مؤثر تشہیر کے لیے









جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
عالمی ادب سے شاہکار کہانیوں، افسانوں اور معلومات کے نمونوں کا انتخاب
جنہیں ہر براعظم کے لاکھوں قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں



جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں
63-C فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون نمبر: 35804200، 35802552 (21-92) فیکس: 35802551 (21-92) ای میل: group@hotmail.com

بھاگ بھری اور نور محمد اپنے رشتہ داروں سے مل کر اپنی سی کوشش کرتے رہے۔ میرل بھی ساتھ رہا مگر ناکام رہا۔ صبح وہ پھر ایک آس کے ساتھ اسد شاہ کے پاس آگئے مگر اسد شاہ کے پاس وہی کہانی تھی۔ ''میری ابھی بھٹی صاحب سے بات ہوئی ہے۔ پولیس پوری کوشش کررہی ہے۔ شام تک انشاء اللہ ہمیں خوش خبری ملے گی۔''

بھاگ بھری اور نور محمد اسد شاہ کو دعائیں دینے لگے مگر میرل نہ صرف خاموش رہا بلکہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اسے اسد شاہ کا بار بار یقین دلانا اور بنگلے کے باہر ہی روک لینا عجیب سا لگا۔ اسد شاہ اکیلا رہتا تھا۔ اتنا بڑا بنگلا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اندر بٹھا کر بات کرسکتا تھا مگر وہ باہر سے ہی بات کرکے بھگا دیتا تھا۔ نور محمد اور بھاگ بھری کے ساتھ گھر واپس آنے کے بعد میرل گھر سے باہر چلا گیا اور اپنے دوستوں کے ساتھ چرس بھری سگریٹ کے کش لگائے اور اپنے دوستوں کو مسئلہ بتایا۔

''اوئے میرل بندہ تو بڑے جگر والا لگتا ہے مگر تو ابھی تک خاموش کیوں ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''تو پھر تم لوگ ہی بتاؤ یار میں کیا کروں، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں۔ ہم لوگوں نے اپنے طور پر بھی ڈھونڈا ہے اور دو دن ہوگئے ہیں۔ پولیس بھی کچھ نہیں کرسکی پتا نہیں رانی کو زمین کھا گئی یا آسمان۔'' میرل نے مایوس لہجے میں کہا۔

''اوہ میرل جو کہانی تو نے بتائی ہے۔ میرا شک نہیں بلکہ یقین ہے رانی اسی بنگلے میں ہے۔ اسی لیے شاہ جی کسی کو اندر آنے نہیں دے رہا ہے۔ اب وہ قید ہے یا اپنی مرضی سے، یہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' دوسرے نے کہا۔

''تو پھر کیا کریں بنگلے میں کود جائیں یا تھانے چل کر شاہ صاحب کے خلاف مقدمہ درج کرائیں؟'' میرل نے کہا۔

''اوئے یار مجھے لگتا ہے پریشانی میں تیرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم شاہ صاحب کے بنگلے میں گھسے تو ڈکیتی کا مقدمہ پکا ہے اور اگر تھانے چلے بھی گئے تو وہ لوگ ہمیں لفٹ نہیں کرائیں گے۔ نہ تو ہمارے پاس رشوت ہے اور نہ ہی کوئی سفارش۔'' پہلے والے نے کہا۔

''تو پھر کیا کریں؟'' میرل نے تنگ ہو کر کہا۔

''اوئے میرل اپنا ایک یار ہے، وہ اخبار میں کام کرتا ہے کبھی کبھار یہاں آتا ہے بھرے ہوئے سگریٹ پینے۔ اس کا نمبر ہے میرے پاس۔ اکبر ملک نام ہے اس کا۔'' پہلے نے کہا۔

''تو پھر جلدی اس کو فون کر، مجھے تو پریشانی میں سگریٹ بھی مزہ نہیں دے رہی۔'' میرل نے کہا۔

''اوئے یار کچھ بھی ہوجائے پولیس تو پیسے لے گی؟'' دوسرے نے کہا۔

اس بات پر میرل کچھ پریشان ہوگیا، اس کے چہرے پر بدلتے تاثرات دیکھ کر وہ بولا۔ ''اوئے یار میرل تو پریشان نہیں ہو، اگر کچھ پیسے دینا بھی پڑے تو اکبر ملک دے دے گا، پھر بعد میں وہ پولیس کے ساتھ مل کر حساب کتاب کرلے گا۔'' پہلے نے کہا۔

''حساب کتاب کرے گا میں سمجھا نہیں؟'' میرل نے کہا۔

''تو پھر سمجھ ناں۔ اگر رانی کے اغواء کا مقدمہ اسد شاہ کے خلاف کٹتا ہے تو وہ اپنی عزت بچانے کے لیے پیسا پھینکے گا اور اگر رانی اس کے بنگلے سے برآمد ہوتی ہے تو پھر وہ سب کو پیسے میں نہلا دے گا۔ مدعی کو جو تم ہوگے اور صحافی کو تاکہ اخبار میں خبر نہ چھپے اور پولیس، وہ تو بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے گی۔'' پہلے نے کہا تو میرل کی آنکھوں میں پریشانی کے بجائے لالچ کی چمک پیدا ہوگئی۔

''اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ اسد شاہ کی شکل میں ایک بڑی مچھلی میرے جال میں پھنس گئی ہے۔'' میرل نے سوچا پھر بولا۔ ''جلدی سے ملک اکبر کو فون کرو اور اسے یہاں بلواؤ۔''

ایک گھنٹے میں ہی ملک اکبر پہنچ گیا تھا۔ میرل نے اسے ساری بات بتائی۔ ''ٹھیک ہے تم میرے ساتھ چلو، بھٹی صاحب تو اپنے دوست ہیں اگر نہ بھی ہوتے تو بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔'' ملک اکبر نے کہا اور میرل کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا کر تھانے پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر نواز بھٹی سے بات کی اور اسے سمجھایا کہ اسد شاہ کے خلاف مقدمہ بنتا ہے تو پھر کس کس کا کتنا فائدہ ہوگا۔

''ملک صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں اسد شاہ کون ہے، وہ نہ صرف بیوروکریٹ ہے بلکہ خاندانی جاگیردار بھی ہے، اگر کل کو یہ مقدمے کا مدعی میرل اسد شاہ کے دباؤ میں آکر کیس واپس لیتا ہے تو پھر میں کیوں بیٹھے بٹھائے ایک طاقت ور آدمی کو اپنا دشمن بناؤں؟'' نواز بھٹی نے کہا۔

''بھٹی صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں، وہ سرائیکی میں ایک کہاوت ہے نا کوئی جیوے یا مرے ساڑھے بیج بھرے، آپ مقدمہ بنائیں، یہ سب بعد کی باتیں ہیں اور ویسے بھی پریس یعنی میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔'' اکبر ملک نے کہا۔ بہرحال نواز بھٹی نے میرل کی مدعیت میں اسد شاہ کے خلاف اپنی بیوی رانی کے اغواء، زیادتی اور حبس بے جا کا مقدمہ درج کرادیا۔

☆......☆

رانی شہزاد کے رونے پر جاگ گئی اسے گود میں اٹھایا اور پھر پیروں میں زنجیر دیکھ کر رونے لگی۔ پھر اس کے دماغ میں فکر کا طوفان اٹھنے لگا کہ اماں کیسی ہوں گی ابا کا کیا حال ہوگا۔ میرل میرے بارے میں کیا سوچے گا اور پھر وہ اللہ سے دعا مانگنے لگی۔ ''اے میرے اللہ! مجھے اس جہنم سے نجات دلا اور اس شیطان کو غرق کر میرے مولا۔'' رانی رو رہی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر وہ روتی رہی۔ شدید بھوک کے باوجود اس نے ناشتا نہیں کیا اور روتے روتے سوگئی۔ اس کی آنکھ باہر سے آنے والی باتوں کی آواز سے کھلی۔ اس وقت دن کے شاید چار بج رہے تھے۔ اسد شاہ ڈرائنگ روم میں ڈرنک لے رہا تھا جب بیل بجی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا، سامنے ایس ایچ او نواز بھٹی سول کپڑوں میں کھڑا تھا۔ دراصل وہ اسد شاہ کے اثر و رسوخ سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھا۔ وہ پہلے اطمینان کرنا چاہتا تھا اسی لیے کچی رپورٹ لکھ کر آیا تھا۔

نواز بھٹی کو دیکھ کر اسد شاہ کچھ پریشان تو ہوا مگر اس نے فوراً معاملہ سنبھالا۔ ''بھٹی صاحب آپ یہاں؟''

''ہاں شاہ صاحب میں پچھلی گلی میں کسی کام سے آیا تھا تو سوچا آپ کو بھی سلام کرلوں۔'' بھٹی نے سوچا شاید اسد شاہ خود مجھے اندر آنے کے لیے کہے گا مگر اسد شاہ نے اندر آنے کے لیے بالکل بھی نہ کہا تو پھر مجبوراً نواز بھٹی نے خود کہا۔ ''شاہ صاحب مجھے ذرا باتھ روم جانا تھا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کا باتھ روم استعمال کرسکتا ہوں۔''

بھٹی کی بات پر اسد شاہ ایک دم گھبرا گیا اور پھر بولا۔ ''ہاں جی کیوں نہیں، آجائیں۔''

''آپ ہٹیں گے تو میں آؤں گا۔'' نواز بھٹی نے کہا۔

''او آئیے۔'' اسد شاہ نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ سامنے باتھ روم ہے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آجائیے گا۔ میں آپ کا انتظار کررہا ہوں۔'' اسد شاہ نے کہا اور فوراً اندر چلا گیا کیوں کہ اس کا اپنا بیڈ روم جس میں رانی قید تھی اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر گیا اور کمرے کا دروازہ لاک کیا۔ بدحواسی میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ بھٹی باتھ روم گیا بھی ہے یا نہیں، کیوں کہ وہ روم کے دروازے تک گیا تھا مگر اسد شاہ کی بدحواسی دیکھ کر پیچھے آگیا تھا اور پھر اسد شاہ کو کمرا لاک کرتا دیکھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ پھر واپس باتھ روم گیا۔ اتنے میں بیل بج اٹھی۔ اسد شاہ نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب کون آگیا؟''

وہ اٹھنے لگا تھا کہ بھٹی نے کہا۔ ''بیٹھیں شاہ صاحب میں دیکھتا ہوں کون ہے۔'' وہ تیزی سے مین گیٹ پر پہنچا۔ ''دراصل وہ تھانے میں بیٹھے میرل اور اکبر سے کہہ آیا تھا کہ اگر کوئی مشتبہ بات نوٹ کی تو مس کال دوں گا۔ تم لوگ فوراً آجانا۔ باتھ روم میں پہنچ کر اس نے مس کال دے دی تھی۔

مین گیٹ پر ایک ایس آئی دو سپاہیوں کے ساتھ وہی دونوں تھے۔ بھٹی نے سرگوشی میں کہا لڑکی اندر ہی ہے، شاہ صاحب کو ملنے مت دینا اور تم اپنا کیمرا آن کرلو، اسد شاہ کو فل نفسیاتی دباؤ میں رکھنا ہے۔'' بھٹی نے ہدایت کی۔

''جی سر کہہ کر اے ایس آئی، سپاہی اور ملک اکبر اندر آگئے۔ ان کے پیچھے میرل بھی اندر آگیا۔ پولیس کو دیکھ کر اسد شاہ کے چھکے چھوٹ گئے مگر اس نے دھمکی کا آخری حربہ آزمایا۔ ''تم لوگوں کو جرأت کیسے ہوئی اندر آنے کی؟''

''سر آپ اطمینان رکھیں ابھی تو آپ کی تصویریں بنیں گی اخبارات میں شائع ہوں گی۔ راتوں رات آپ کی عزت میں اضافہ ہوگا۔'' بھٹی نے کہا۔

''بھٹی صاحب آپ کا لہجہ مجھے سمجھ نہیں آیا۔'' اسد شاہ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''فی الحال آپ کو کچھ سمجھ نہیں آئے گا شاہ صاحب، پہلے آپ یہ بتائیں کہ سامنے والے کمرے کا لاک آپ خود کھولیں گے یا پھر ہمیں توڑنا پڑے گا؟'' بھٹی نے کہا۔

اسد شاہ کے ماتھے پر پسینا آگیا۔

''کیا ہے سامنے والے کمرے میں، وہ تو بالکل بند ہے۔'' اسد صاحب کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ خوف زدہ ہوگیا ہے۔

''میں نے کہا کہ آپ لاک کھول رہے ہیں یا پھر میں وہ لاک تڑواؤں۔'' بھٹی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں، میں کھول دیتا ہوں۔'' اسد شاہ نے مردہ آواز میں کہا اور پھر اٹھ کر کمرے کا لاک کھولا اس کے پیچھے

PakiBooks.site

سپاہی اور اے ایس آئی چوکس کھڑے رہے، کمرے کا لاک کھلتے ہی ایک سپاہی نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا پھر سامنے کے منظر نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ رانی بیڈ پر اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی مگر اس کی سوجی ہوئی آنکھیں الجھے ہوئے بال اور پاؤں میں زنجیر نے سب کچھ بتا دیا کہ وہ کس قیامت سے گزر چکی ہے۔

ملک اکبر نے فوراً تصویریں لینا شروع کر دیں۔ اسد شاہ بالکل ساکت کھڑا رہا، اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ جب اخباروں میں تصویریں چھپیں گی تو پھر خاندان والے، محلے والے اور پھر سب سے زیادہ اس کے گھر والے اس کی بیوی بیٹا بیٹی داماد بہو...... اس کا دماغ پھٹنے لگا اس نے اس بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا۔ رانی میرل کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ مسلسل اسد شاہ کو بددعائیں دے رہی تھی پھر اچانک بے ہوش ہو گئی۔

''ایمبولینس منگواؤ اور اسے فوراً اسپتال منتقل کرو اور اس کا میڈیکل چیک اپ کراؤ۔ میں شاہ جی کو ہتھکڑی لگا کر پورے محلے میں گھما کر تھانے پہنچتا ہوں تاکہ تمام لوگوں کو اس کے کرتوت کا پتا چل سکے۔'' بھٹی نے رعب دار لہجے میں کہا تو اسد شاہ کی بچی کچی ہمت بھی جواب دے گئی۔ بھٹی کے پاؤں میں گر گیا اور کسی بچے کی طرح گڑگڑانے لگا۔

''بھٹی صاحب مجھے بچا لیں، میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔'' اسد شاہ گڑگڑایا۔

''شاہ صاحب یہ آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' بھٹی نے کہا پھر میرل اور اکبر ملک کی طرف دیکھا، دونوں نے اثبات میں سر ہلایا جیسے کہہ رہے ہوں، لوہا اب گرم ہے صرف ضرب لگانے کی ضرورت ہے۔

''اچھا شاہ صاحب آپ اٹھیں تو سہی پھر میں دیکھتا ہوں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں اور آپ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' بھٹی نے کہا تو اسد شاہ کی جان میں جان آگئی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''بھٹی صاحب آپ حکم کریں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں بس کسی طرح میری جان چھڑائیں۔'' اسد شاہ نے کہا۔

''شاہ صاحب بات صرف میری نہیں آپ کے خلاف اغواء اور زیادتی کا مقدمہ بن گیا ہے اور میرل رانی کا شوہر اس کا مدعی ہے اور پھر یہ صحافی ہیں اکبر ملک، ان کے پاس فوٹوگراف ہے۔ ایسی صورت میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔'' بھٹی نے اسد شاہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہا۔

''بھٹی صاحب آپ ایک منٹ میرے ساتھ سائیڈ پر چلیں۔'' اسد شاہ نے کہا اور بھٹی کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

''بھٹی صاحب آپ ان دونوں سے بھی بات کر لیں میں منہ مانگی رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔ بس آپ مسئلے کو یہیں ختم کرا دیں۔'' اسد شاہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے پچاس لاکھ روپے میرے تیار رکھیے۔ ان سے میں بات کر لیتا ہوں۔'' بھٹی نے کہا۔

''مجھے منظور ہے بس آپ میری جان چھڑائیں۔'' اسد شاہ نے کہا۔

''آپ بیٹھیں میں بات کر کے آتا ہوں۔'' بھٹی نے کہا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا پھر میرل اور اکبر ملک کو ایک سائیڈ پر لے آیا۔ ''دیکھو میرل پچیس لاکھ روپے تجھے مل جائیں گے اور پانچ لاکھ روپے ملک صاحب کو معاملے کو یہیں دبا دیتے ہیں، تو بھی عیش کر اور ملک صاحب بھی مزے کریں۔'' بھٹی نے کہا۔

''اور آپ بھٹی صاحب آپ کچھ نہیں لیں گے کیا؟'' ملک اکبر نے ہنستے ہوئے بھٹی کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

''ملک صاحب میں بھی سگریٹ پانی کے پیسے لے ہی لوں گا۔'' بھٹی بھی جواباً مسکرایا۔

''بھٹی صاحب ابھی تو رانی زندہ ہے اگر مر گئی تو؟'' میرل نے پوچھا۔

''تو پھر پیسے ڈبل۔'' بھٹی نے کہا۔

''تو پھر آپ پیسے ڈبل کرائیں سمجھو رانی مر گئی۔'' میرل نے سفاکیت سے کہا اور پھر میرل کا پلان سن کر اکبر ملک کیا بھٹی بھی حیران رہ گیا کہ پیسے کی خاطر کوئی اتنی درندگی بھی کر سکتا ہے۔

''سوچ لو میرل وہ تمہارے ایک آٹھ ماہ کے بچے کی ماں ہونے کے ساتھ تمہاری بیوی بھی ہے۔'' اکبر ملک نے کہا۔

''ملک صاحب میں غیرت مند آدمی ہوں اور غیر مند آدمی کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس کی بیوی ایک رات کسی اور کے ساتھ گزارے پھر اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ رات اس نے اپنی مرضی سے گزاری یا کسی مجبوری میں۔ کاری ہونا اس کی قسمت ہے۔'' میرل نے انتہائی سفاک لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو، میں اسد شاہ سے بات کرتا ہوں تم لوگ ذرا سائیڈ میں بیٹھو آرام کرو۔'' بھٹی نے اے ایس آئی اور سپاہیوں سے کہا۔ ''سنو ایمبولینس آجائے تو اسے باہر ہی روکنا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' تینوں نے کہا اور ایک طرف چلے گئے۔ بھٹی اندر گیا اور پھر اسد شاہ سے بولا۔ ''شاہ صاحب معاملہ بگڑ گیا ہے۔ رانی مر چکی ہے اور میرل کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں۔ میرا خیال ہے اب میں بھی شاید آپ کو نہ بچا سکوں۔''

اسد شاہ کا گلا خشک ہو گیا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا نظر آنے لگا۔ وہ بھٹی کے پاؤں پڑ گیا۔ ''بھٹی صاحب کچھ بھی کریں مجھے بچائیں۔''

''ٹھیک ہے شاہ صاحب آپ ایک کروڑ روپے دیں میں میرل اور اکبر ملک کو راضی کر لیتا ہوں، کیسے، وہ میرا کام ہے بس آپ پیسوں .... کا انتظام کریں ایک اے ایس آئی اور دو سپاہی بھی بیٹھے ہیں۔'' بھٹی نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں بس معاملہ یہیں دب جائے۔'' اسد شاہ نے کہا۔

''شاہ صاحب! آپ تجوری سے رقم تو نکالیں سمجھیں یہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔'' بھٹی نے کہا۔

تمام معاملات میرل اور اکبر کو بتائے لیکن انہیں آدھے پیسے بتائے یعنی ٹوٹل رقم پچاس لاکھ روپے پچاس لاکھ میرل اور دس لاکھ اکبر ملک، اس کے بعد اے ایس آئی کو دو لاکھ اور سپاہیوں کو پچاس پچاس ہزار روپے۔ پیسا اسد شاہ کا تھا اور دماغ بھٹی کا سب کے منہ بند ہو گئے۔ سب سے زیادہ سفاکیت کا مظاہرہ میرل نے کیا۔ اس نے کمرے میں دکھ اور صدمے سے بے ہوش رانی کے سر پر ڈنڈے کا وار کیا۔ سر بری طرح پھٹ گیا تھا، رانی تڑپنے لگی مگر میرل نے تکیہ اٹھا کر رانی کے منہ پر رکھا اور پھر بے دردی سے دونوں ہاتھوں کے زور سے تکیے کو دبائے رکھا۔ رانی تھوڑی دیر مچھلی کی طرح تڑپی مگر جلد ہی زندگی کی بازی ہار گئی، اس کا سر کافی پھٹا تھا مگر حیرت انگیز طور پر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ شہزاد رو رو کر اس سے لپٹ رہا تھا۔ اکبر ملک نے تصویر اتار لی تھی تاکہ صبح خبر بن سکے۔ تھوڑی دیر میں ایمبولینس آگئی تھی رانی کو اس میں لٹا کر لے جایا گیا۔ بھٹی اور میرل ساتھ گئے تھے۔ بھٹی نے یہاں بھی ایک لاکھ روپے خرچ کیے تب پوسٹ مارٹم رپورٹ بن گئی مگر ان کی اپنی مرضی کی، دوسرے دن رانی کی تصویر کے ساتھ ایک مقامی روزنامے میں خبر چھپی۔ 24 سالہ شادی شدہ خاتون ٹریفک حادثے میں ہلاک، نیچے تفصیل بھی درج تھی کہ روڈ کراس کرتے ہوئے ایک نامعلوم گاڑی کی ٹکر سے 24 سالہ رانی زوجہ میر محمد ہلاک حیرت انگیز طور پر بچہ محفوظ رہا۔ میرل نے اپنی ساس بھاگ بھری اور سسر نور محمد کو بھی یہی کہانی سنائی کہ رانی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ جاں بحق ہو گئی۔ اسد شاہ نے رانی کے کفن دفن کے لیے ایک لاکھ روپے دیے ہیں۔

وہ دونوں بے چارے ایک تو سیدھے سادھے اور پھر جوان بیٹی کا غم انہیں کیا پتا کہ کیسی سازش ہوئی ہے وہ بے چارے اسد شاہ کو دعائیں دینے لگے۔

مرتے وقت رانی کی کھلی آنکھیں ایک ہی سوال کر رہی تھیں میرا قصور کیا ہے۔ شاید ایسے کسی موقع پر ایک سرائیکی شاعر نے کہا تھا

اساں جمدیوں لادیاں دکھ ماریاں
حک ڈکھ ہووے تاں گال کروں

رانی کی کہانی یہیں پر ختم ہو گئی...... ! لیکن نہیں، اس کے بعد کی کہانی نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔ رانی کے کفن دفن کے تیسرے روز میرل کش لگا کر گھر آرہا تھا کہ ایک تیز رفتار ٹینکر کی زد میں آگیا۔ اس کے قیمہ بنے جسم کو نور محمد گھر لے کر آیا تھا جس دن اس کی تدفین تھی اسی دن بھٹی رہزنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے اگلے دن ملک اکبر کو اس کے گھر سے کچھ لوگ بلا کر کہیں لے گئے اس کی لاش بوری میں بند نالے سے ملی تھی۔ سب سے عبرت ناک موت شاہ جی کی ہوئی، پتا نہیں یہ رانی کی بددعا کا اثر تھا یا قسمت کا پھیر عین اس روز جس دن بھٹی کو گولی لگی تھی، اس کا دماغ الٹ گیا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا گھر سے دوڑتا ہوا نکلا اور سامنے والے بنگلے میں گھس گیا۔ وہاں دو السیشن کتے تھے۔ چوکیدار انہیں روکتا کہ شاہ جی کو... ایک کتے نے ٹانگ پکڑ کر کھینچا۔ بس دونوں کتوں نے اسے اس طرح بھنبھوڑا کہ اس بنگلے سے اس کی لاش نکلی۔ ادھر نور محمد حیران پریشان ہوا تھا جب میرل کے تکیے سے بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکلیں۔

PakiBooks.Site

دیس پردیس

مکرم و محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
لالچ انسان کی عقل کو مسخ کر کے بینا کو نابینا بنانے میں دیر نہیں لگاتا۔ گناہ اور ثواب کا فرق بھی ذہن سے محو کردیتا ہے۔ اس نے دوستی کا بھرم بھی کھو دیا۔ اعتماد کو کرچی کرچی کر بیٹھا مگر وہ بھول گیا تھا کہ اوپر ایک میزان عدل بھی ہے اور اس میزان کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔

عاصم شہزاد
(کوئٹہ)

"خیام کا فون نہیں آیا؟" رضیہ نے دال میں سے کنکر نکالتے ہوئے اپنے شوہر تیمور سے پوچھا۔

"نہیں۔"

تیمور... جو مطالعے میں غرق تھا اس نے کتاب سے نظر ہٹائے بغیر مختصر ترین جواب دیا۔

"اس نے نہیں کیا تو آپ ہی کر لیتے مگر آپ کو تو ان کتابوں سے ہی فرصت ملے تب ناں۔" رضیہ کے لہجے میں شکایت کا عنصر نمایاں تھا۔

"یہ دو صفحات پڑھ لوں پھر کرتا ہوں۔" اس نے ایک پل کے لیے رضیہ کی طرف دیکھا اور پھر کتاب میں دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں پڑھ لیں یہ بہت ضروری ہے ناں۔" رضیہ نے طنز کیا۔

"اچھا اچھا کر رہا ہوں۔" آخر تیمور کو ہار ماننا پڑی اور اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ اس نے سائیڈ میں لگے پاور بٹن کو دبایا تو موبائل کی ٹچ اسکرین روشن ہوگئی۔

وہ کچھ دیر تک فون میں مصروف رہا اور پھر بولا۔ "خیام تو آف لائن ہے اس وقت۔ ڈیوٹی پہ ہوگا اس لیے شام کو کال کروں گا۔"

رضیہ کوئی جواب دیے بغیر کچن میں چلی گئی اور تیمور پھر سے کتاب میں غرق ہوگیا۔

☆......☆

تیمور کا بیٹا خیام پانچ سال قبل تلاش معاش کے سلسلے میں سعودی عرب چلا گیا تھا۔ پہلے پہل تو سب ٹھیک رہا۔ خیام ایک دو ماہ بعد ایک معقول رقم گھر بھیج دیتا اور ہفتے میں تین چار بار فون بھی کر لیتا تھا مگر مکہ مکرمہ میں ہونے والے کرین حادثے کے بعد کمپنیوں کو بھاری جرمانے ادا کرنے پڑے جس سے کمپنیوں کا خاصا نقصان ہوا اور انہیں ورکرز کی تنخواہیں روکنا پڑیں۔

خیام نے گھر فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا تو تیمور نے اپنے بیٹے کو یہی مشورہ دیا کہ وہ پاکستان واپس آجائے مگر خیام تنخواہیں ملنے کے بعد ہی آنا چاہتا تھا۔

قریب تین سال گزر گئے خیام ہر تیسرے یا چوتھے دن گھر فون کر لیا کرتا تھا مگر اس بار ایک ہفتے سے اوپر ہوگیا تھا اس نے فون نہیں کیا تھا اسی لیے رضیہ پریشان تھی۔

شام کو تیمور نے پھر اپنے بیٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہی صورت حال سامنے تھی۔

"آپ اس کے ساتھ کام کرنے والے کسی لڑکے کو فون کریں۔" رضیہ نے تیمور کو مشورہ دیا۔ اس مشورے کے پس پشت اس کی ممتا چھپی تھی۔

تیمور کو رضیہ کا یہ مشورہ پسند آیا۔ اس کے پاس جمال نامی ایک لڑکے کا نمبر تھا۔ اس نے آئی ایم او میں جا کر دیکھا تو وہ آن لائن تھا۔ اس نے کال ملائی اور فون کان سے لگا لیا۔ کال فوراً ہی کنکٹ ہوگئی۔

"السلام علیکم بیٹا کیسے ہو؟ میں تیمور بات کر رہا ہوں۔"

"وعلیکم السلام انکل، اللہ کا شکر ہے، آپ سنائیں۔"

"اگر خیام کہیں آس پاس ہے تو اس سے بات کروا دو، اس کی ماں بہت پریشان ہے اس کے لیے۔" تیمور رسمی علیک سلیک کے فوراً بعد ہی مدعے کی بات پر آگیا۔

"انکل یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" جمال کی آواز میں حیرت تھی۔

"کیوں، کیا ہوا؟" تیمور نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"انکل خیام تو ایک ہفتہ پہلے ہی پاکستان چلا گیا تھا۔"

"کک کیا؟" جمال کے اس انکشاف پر تیمور اچھل پڑا۔

"جی انکل ایک ماہ پہلے اسے ساری سیلری ملی تو اس نے چھٹی کے لیے درخواست دے دی جو پچھلے ہفتے ہی منظور ہوئی تھی۔" جمال نے تیمور کو بتایا۔

"مگر اس نے تو ہمیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔"

"اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" جمال نے جواب دیا۔

"تمہیں پورا یقین ہے کہ......" تیمور نے ایک بار پھر تصدیق کرنا چاہی۔

"جی جی انکل بلکہ میں خود خیام کو ائرپورٹ چھوڑنے گیا تھا۔"

"اچھا بیٹا بہت شکریہ۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" رابطہ منقطع ہوگیا اور تیمور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ رضیہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔

"کیا ہوا کدھر جا رہے ہیں آپ؟"

"کہیں نہیں، بس کام ہے تھوڑا سا، ابھی واپس آجاؤں گا۔" تیمور نے مڑے بغیر جواب دیا اور متوازن قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

رضیہ کچھ دیر تک اس کھلے ہوئے گیٹ کو دیکھتی رہی اور پھر بند کر کے واپس کمرے میں چلی آئی۔

☆......☆

تیمور اس وقت اپنے دوست کے بیٹے انسپکٹر خلیل الرحمٰن کے گھر بیٹھا اسے تمام تر صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

"ہونہہ۔ بات تو تشویش کی ہے انکل، مگر آپ فکر نہ کریں اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد خیام آپ کے پاس ہوگا۔" خلیل نے اسے تسلی دی اور پھر موبائل میں مصروف ہوگیا۔

کچھ دیر بعد اس نے موبائل کان سے لگایا۔ بیل جا رہی تھی تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"ہیلو...... میں انسپکٹر خلیل بات کر رہا ہوں۔" رابطہ ہونے پر اس نے اپنا تعارف کروایا۔

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

"جی کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ قریب ایک ہفتہ پہلے سعودیہ سے کوئی خیام ولد تیمور نامی شخص پاکستان آیا ہے یا نہیں۔"

دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا۔ جسے سن کر اس نے اوکے کہا اور پھر خاموش ہوگیا۔ موبائل اب بھی اس کے کان کے ساتھ تھا۔

PakiBooks.Site

قریب ایک منٹ گزرنے کے بعد دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا۔ جسے سن کر اس نے او کے تھینکس کہا اور کال منقطع کردی۔

”جی انکل وہ لڑکا واقعی درست کہہ رہا تھا، خیام پاکستان آچکا ہے۔“ اس نے موبائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”مگر وہ گھر کیوں نہیں آیا کہیں اس کے ساتھ......“ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

”کچھ نہیں ہوگا اسے، آپ فکر مت کریں۔“ خلیل نے اسے تسلی دی اور کھڑا ہوگیا۔ تیمور بھی کھڑا ہوگیا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا کرنا ہے۔

”میرے ساتھ آئیں۔“ اس نے تیمور سے کہا اور تیز تلے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا، تیمور بھی اس کے پیچھے تھا۔

☆......☆

اس نے گیٹ کے عین قریب جا کر گاڑی روک دی۔

”انکل آپ جائیں آرام کریں اور خیام کی تلاش کا ذمہ اب میرے سر چھوڑ دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں آپ کے بیٹے کو صحیح سلامت آپ تک پہنچاؤں گا۔“

”مگر بیٹا۔“

”انکل میں آپ کی تکلیف سمجھ سکتا ہوں مگر آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔ جائیں آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

کچھ ہی دیر بعد تیمور گاڑی سے اترا اور بوجھل قدموں کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆

”اسے پہچانتے ہو۔ پچھلے ہفتے شاید اس نے تمہاری ٹیکسی بک کی ہو۔“ خلیل نے ائرپورٹ سے باہر موجود ایک ٹیکسی ڈرائیور کو خیام کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ خیام تیمور کو گھر چھوڑنے کے بعد سیدھا ائرپورٹ آگیا تھا۔

”نہیں۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے تصویر کو بغور دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

اس نے چند اور ڈرائیوروں سے پوچھ تاچھ کی مگر نتیجہ صفر نکلا۔

کوئی دوسرا طریقہ اپنانا ہوگا اس نے سوچا اور روڈ کے دوسری سائیڈ کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

”اوئے بات سن۔“ ابھی وہ چند قدم ہی دور گیا تھا کہ عقب سے آنے والی یہ آواز سن کر رک گیا۔

وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا جو ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔

اس طرح پکارے جانے پر خلیل کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ ضبط کر گیا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ ایک ناگوار سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

”ہاں بولو۔“ اس نے بدبو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

”وہ تصویر دکھاؤ۔“ اس نے خلیل کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔

خلیل نے اسے موبائل میں موجود خیام کی تصویر دکھائی۔

تصویر دیکھ کر وہ چلا اٹھا۔ ”ہاں یہی ہے وہ ہاں بالکل یہی ہے۔“

”کیا تم جانتے ہو اسے۔ کہاں دیکھا ہے۔“

”اوہ میں بھول گیا۔“ اس نے لمحے بھر میں رنگ بدل لیا۔

مگر خلیل سمجھ چکا تھا وہ کیا چاہتا ہے اس نے جیب سے بٹوا نکالا اور پھر سو کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے کیا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھی۔ اس نے نوٹ پر جھپٹنا چاہا مگر خلیل نے ہاتھ فوراً پیچھے کرلیا۔

”یہ ملنے کے بعد تمہاری یادداشت واپس آجانی چاہیے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو خلیل نے نوٹ اسے دے دیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں میں نے اسے دیکھا ہے۔ یہ اس کالونی کی طرف گیا تھا۔“ اس نے ائرپورٹ کے کچھ دور بنی کالونی کی طرف اشارہ کیا۔

”اس طرف؟ کیا تمہیں پورا یقین ہے؟“ خلیل نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں بالکل۔“ اس نے کہا اور ایک طرف چل دیا۔

”ارے بات تو سن......“ خلیل اسے پکارتا رہ گیا۔

کیا یہ سچ بول رہا ہے؟ خلیل نے سوچا۔ ”خیام ادھر کیوں جائے گا اسے تو گھر جانا چاہیے تھا۔“ اس نے سوچا۔

اور پھر ایک فوری خیال کے تحت اس نے جیب سے موبائل نکالا اور تیمور کا نمبر ملانے لگا۔ پہلی بیل پہ ہی کال ریسیو کرلی گئی۔

☆......☆

پولیس اور تیمور کو اپنے سامنے دیکھ کر فاروق بہت گھبرا گیا اس نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔

”انکل آپ اور یہاں اس وقت وہ بھی پولیس کے ساتھ خیریت ہے نا۔“

”خیریت نہیں ہے۔ ان کا بیٹا خیام ایک ماہ سے لاپتا ہے۔ کیا تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”میں کیسے کچھ بتا سکتا ہوں۔“ خیام کا نام سنتے ہی اس کا رنگ متغیر ہوگیا۔

”مگر خیام کے موبائل کی لوکیشن کے مطابق تو وہ یہیں تھا۔“

”مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے اس دن تو اس کا موبائل......“ فاروق نے فوراً جملہ ادھورا چھوڑا مگر وہ ایک فاش غلطی کر چکا تھا۔

”ہاں اس دن اس کا موبائل آف تھا۔ مگر تمہیں یہ کیسے معلوم۔“ خلیل نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ جو سیدھا نشانے پر لگا۔ ”اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ سب سچ سچ بتا دو ورنہ......“ خلیل کا لہجہ سخت اور تحکم آمیز تھا۔

فاروق کچھ لمحے خاموش رہا اور پھر اس نے ہولناک انکشافات کیے۔

خیام ایک ماہ قبل رات کے دو بجے یہاں پہنچا تو فاروق اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

خیام نے اسے بتایا کہ وہ ابھی سعودی عرب سے پاکستان پہنچا ہے چونکہ اس کے پاس ایک موٹی رقم ہے اس لیے اس نے رات کے وقت سفر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور یہاں آگیا۔ خیام نے یہ بھی بتایا کہ اس کے گھر والے نہیں جانتے تھے کہ وہ پاکستان آچکا ہے کیونکہ وہ اچانک پہنچ کر ان کو حیران کرنا چاہتا تھا۔

رقم کا سن کر فاروق کے دل میں لالچ پیدا ہوگیا اور سونے پر سہاگا یہ کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خیام اس کے گھر ہے پھر کیا تھا......

فاروق نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر خیام کا کام تمام کردیا اور اس کی لاش کے ٹکڑے کرکے سوٹ کیس میں ڈال دیے اور یہ سوٹ کیس گھر کے پیچھے خالی پلاٹ میں دفنا دیا جسے فاروق کی نشاندہی کے تحت برآمد کرلیا گیا تھا۔

فاروق اور اس کی بیوی کو گرفتار کرلیا گیا مگر خلیل شرمندہ تھا کہ وہ اپنے وعدے کی پاسداری نہ کرسکا تھا۔ خیام کو زندہ نہیں لاسکا تھا۔

آغا

سید محمد نام، آغا محمد میر عرف معتمد الدولہ، مختار الملک ضیغم جنگ خطاب، میر تقی خرکمانی کے بیٹے تھے۔ ایرانی نسل کے سید تھے۔ شعر و سخن میں معتمد الدولہ کو ناسخ سے تلمذ تھا۔ نجم الغنی کا بیان ہے: ”معتمد الدولہ، شیخ امام بخش ناسخ کے باخلاص شاگرد تھے۔“ (تاریخ اودھ) اور عشرت لکھنوی کا بیان ہے کہ ”معتمد الدولہ آغا میر نے ناسخ کی شاگردی اختیار کی اور ایک لاکھ روپے نذرانہ کے نام سے پیش کیا جو انہوں نے اپنے منظور نظر مرزائی صاحب کو دے دیا۔“ معتمد الدولہ، غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے بچپن کے دوست تھے اس لیے انہوں نے اپنے عہد میں مرزا حاجی کی جگہ معتمد الدولہ کو نائب بنایا تھا۔ جب غازی الدین حیدر نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا تو یہ وزیر کہلائے اور ان کو نواب معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر عرف آغا میر کا خطاب ملا۔ وزارت کے لیے ان کو بائیس پارچے کی خلعت ملی۔ ہاتھی اور پالکی سواری کے لیے دیے گئے اور سلطنت کی طرف سے تمام شان و شوکت کے سامان ہوئے۔ عین شہر لکھنو کے مرکز میں آغا میر کی ڈیوڑھی (وزیر گنج) کی انہوں نے بنیاد رکھی ایک شاندار امام باڑہ (موجودہ جوبلی انٹر کالج لکھنو) اور ایک کربلا تعمیر کی تھی۔ آغا میر کی کربلا حضرت گنج میں واقع ہے۔ کربلا میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے روضہ کاظمین (عراق) کی شبیہ بنوائی گئی تھی۔ انہوں نے کانپور میں بھی ایک عالیشان امام باڑہ تعمیر کیا تھا۔ ایک کروڑ سے زیادہ روپیا اس زمانے میں ان عمارتوں پر خرچ ہوا تھا۔ ”معتمد الدولہ بڑے ذہین اور ہوشیار مدبر تھے۔ سلطنت اودھ کے سپید و سیاہ کے مالک تھے۔ 1230ھ میں معتمد الدولہ معزول کردیے گئے کچھ عرصہ معطل رہنے کے بعد 1233ھ میں دوبارہ اپنے عہدے پر بحال کردیے گئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ناسخ کے لیے سو روپے مہینے کا وظیفہ مقرر کیا لیکن ناسخ نے درباداری اور مصاحبت سے یکسر انکار کردیا۔ ناسخ معتمد الدولہ سے وابستہ رہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی بڑی فراغت بلکہ خاصی عشرت کے ساتھ گزرتی تھی۔ مالی فراغت کے علاوہ معتمد الدولہ کے تقرب کی وجہ سے لکھنو کی سماجی و سیاسی زندگی میں بھی ناسخ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔“ معتمد الدولہ شعر و ادب کے سرپرست تھے۔ ان کے یہاں جو مشاعرہ منعقد ہوتا تھا وہ بڑی دھام سے ہوتا تھا۔ ان کی سرکار سے بہت سے شعراء اور مرثیہ گو شاعر وابستہ تھے۔ معتمد الدولہ کی مدح میں مرزا فصیح کے بھی بکثرت اشعار ہیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ 1243ھ میں نصیر الدین حیدر نے معتمد الدولہ کو معزول کردیا۔ آخر عمر میں کانپور جا کر مقیم ہوئے اور وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔ 5 ذی الحجہ 1247، مطابق 7 مئی 1832ء کو انتقال کیا۔ ناسخ نے رحلت کی تاریخ کہی۔ معتمد الدولہ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ معتمد الدولہ کی بیٹی سلطان بیگم شاعرہ تھیں۔ وہ سلطان تخلص کرتی تھیں۔

مرسلہ: نظیر احمد۔ کراچی

PakiBooks.Site

مجبوریاں

جناب مدیر سرگزشت

سلام مسنون

انسان نہ تو بزدل ہوتا ہے اور نہ بہادر۔ حالات اسے بزدل یا بہادر بناتے ہیں۔ حالات کس طرح انسان کو کمزور بنا دیتے ہیں اس کی جھلک آپ کو اس سچ بیانی میں مل جائے گی۔ مدیحہ کے والد نے کس طرح سے کڑوے گھونٹ کو برداشت کیا یہ وہی جانتے ہیں۔ ان کا رعب و دبدبہ کس طرح سے مجبوریوں کے بوجھ تلے دب کر پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ واقعی انسان مجبوریوں کی ڈور سے بندھا ہوا کٹھ پتلی کی طرح حالات کے اشارے پر ناچ رہا ہے۔ ہم آپ اپنی آنکھوں سے ایسے نظارے دیکھتے رہتے ہیں مگر اندرونی حالات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ مذاق اڑانا شروع کردیتے ہیں۔

نوشاد عادل

(کراچی)

اچانک ہی موبائل بجا تھا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی کتاب رکھی اور موبائل کے ڈسپلے پر نظر ڈالی۔

''کون ہے؟'' اپنی چار پائی پر نیم دراز میری چھوٹی بہن صبیحہ نے سر اٹھا کر پوچھا۔ وہ بھی کالج کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

''عدنان آیا ہے۔ دروازے پر کھڑا ہے وہی بیل دے رہا ہے۔'' میں نے موبائل رکھا اور اپنی چار پائی پر سوئی ہوئی امی پر نظر ڈالی۔ پھر میں اپنی چار پائی سے اترنے لگی تھی کہ امی نے کروٹ بدلی اور کہا۔ ''تو رہنے دے مدیحہ میں دیکھتی ہوں جا کے۔'' پھر وہ کراہتی ہوئی چار پائی سے اتریں اور پیروں میں چپلیں پھنسا کر پٹر پٹر چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

''اس نے تو روز کا وطیرہ بنا لیا ہے دیر سے آنا۔'' صبیحہ نے دھیمی آواز میں برہمی سے کہا۔ ''ابا ٹھیک ہی غصہ ہوتے ہیں اس پر۔ سمجھا سمجھا کر تنگ آگئے ہیں۔ مگر اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ ایک نمبر کا ڈھیٹ ہوگیا ہے۔''

''ابھی ابا جاگ گئے تو ٹھیک ٹھاک خبر لے لیں گے۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔ پھر میں نے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ امی ہلکی آواز میں عدنان سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

''بے چاری امی بھی اس کی وجہ سے جاگتی رہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ماں ہیں نا۔ سب سے زیادہ فکر تو ماں کو ہی ہوتی ہے اولاد کی۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔

اتنے میں ابا کی گرج دار آواز صحن میں گونجی۔ ''مانے گا نہیں تو۔ تیری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ بول بول کر تھک گیا ہوں مگر تیرا راتوں کو دیر سے آنا ختم نہیں ہوا اب کب سدھرے گا تو۔''

''دیکھا کہا تھا نا میں نے۔'' صبیحہ دبی آواز میں بولی۔

اسی وقت عدنان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ ابا اور امی اس کے پیچھے اندر آگئے۔

''جواب بھی نہیں دیتا ہے۔ باپ پوچھ رہا ہے اور اس کے منہ پر تالا پڑا ہوا ہے۔ کہاں جاتا ہے راتوں کو۔ کون سے ایسے دوست ہیں تیرے جو راتوں کو ملتے ہیں۔'' ابا مسلسل اس کے لتے لے رہے تھے۔

''کہیں نہیں جاتا ابا، ادھر ہی ہوتا ہوں۔ پھپھو کے گھر۔'' عدنان نے اطمینان سے جواب دیا۔

''وہاں کیا کرتا ہے اتنی رات تک اور کیا کام ہے تیرا وہاں؟'' ابا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''ذاکر بھائی کے ساتھ فلم دیکھ رہا تھا۔'' عدنان پھٹ سے بولا۔

''لاحول ولاقوۃ، بے ہودہ انسان کتنے مزے سے بول رہا ہے کہ فلم دیکھ رہا تھا۔'' ابا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''ذرا شرم نہیں آتی تجھے باپ سے یہ بولتے ہوئے۔''

''تو ابا ابھی خود ہی تو بول رہے تھے جواب کیوں نہیں دیتا۔ اب دے دیا تو غصہ ہو رہے ہو۔'' عدنان نے جوتے اتار کر چار پائی کے نیچے رکھے۔

''اچھا بس کریں رات کا وقت ہے لوگ سنیں گے، میں سمجھا دوں گی۔ آپ جا کر سو جائیں۔'' امی نے مداخلت کی۔ اس کے باوجود ابا چند منٹ تک اسے ڈانٹتے رہے۔ میں اور صبیحہ بظاہر کتابوں کے مطالعے میں مصروف تھیں مگر ہمارا دھیان ان کی طرف لگا ہوا تھا۔ ایسے میں کیا خاک پڑھائی ہو سکتی تھی۔

پھر ابا بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ امی نے بھی عدنان کو پیار سے ڈانٹ پلائی پھر اس کے لیے کھانا لینے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

''آ گیا مزہ، مل گیا دل کو سکون؟'' میں نے غصے سے عدنان کو دیکھا۔ ''اتنے بڑے ہو گئے ہو مگر بچوں کی طرح ڈانٹ کھاتے رہتے ہو۔''

''ابا کی تو عادت ہے ذرا ذرا سی باتوں پر چلانے کی۔'' عدنان نے منہ بنا کر کہا۔ وہ اپنا موبائل چارجنگ پر لگا رہا تھا۔

''تم بھی تو باز نہیں آتے بھائی۔'' صبیحہ نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''کیا باز نہیں آتا۔'' عدنان نے اسے گھورا۔ ''میں کون سا ڈکیتیاں کرتا پھرتا ہوں۔ کون سا جرم کر دیا میں نے۔ ایک فلم ہی تو دیکھتا ہوں۔ وہ بھی پھپھو کے گھر جا کے۔ اس میں ابا کو پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔''

''تو فلمیں دیکھنا ضروری ہیں کیا؟'' میں نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

''تو بیٹھ کر گھر میں بور ہوتا رہوں۔'' عدنان تنگ کر بولا۔ ''ابا تو ٹی وی کے بھی دشمن ہیں۔ گھر میں ٹی وی رکھنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔''

''آہستہ بول۔ ابھی وہ جاگ رہے ہوں گے۔'' امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھیں۔ ''جا...... جا کے ہاتھ منہ دھولے۔''

عدنان اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆......☆

''ہمارا گھرانا ہمیشہ سے صوم و صلوٰۃ کا پابند چلا آرہا ہے۔ میرے ابا رشید الدین مذہب کے سخت پابند ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے کبھی گھر میں ٹی وی نامی کوئی شے نہیں دیکھی۔ ابا ٹی وی کو شیطان قرار دیتے تھے۔ بچپن سے میں ان کے منہ سے مخصوص جملے سنتی آتی ہوں کہ یہ ٹی وی جو ہے نا یہ شیطان ہے۔ اسی کی وجہ سے ہر گھر میں برائیاں پھیل رہی ہیں۔ اب دیکھ لو۔ گھر گھر سے ناچ گانوں کی آوازیں آتی ہیں۔''



میری امی بے چاری سیدھی سادی خاتون تھیں۔ انہیں ابا سے بھی کوئی شکوہ شکایت کرتے نہیں دیکھا۔ سب

PakiBooks.Site

سے بڑی میں ہوں مدیحہ پھر صبیحہ اور آخر میں عدنان کا نمبر آتا ہے۔ ہم تینوں میں صرف ایک ایک سال کا فرق ہے۔ اس لیے پتا نہیں چلتا کہ ہم میں سے بڑا کون ہے۔ پندرہ سال بعد عدنان نے ایک دم قد نکال لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود کو بڑا آدمی سمجھنے لگا تھا۔ اس کی نافرمانیوں میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ اکثر و بیشتر ابا اس کی خبر لیتے رہتے تھے لیکن وہ مزید بگڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پڑھنے سے ابا نے ہم بہنوں کو منع نہیں کیا تھا لیکن ہم دونوں جب آٹھویں جماعت میں آ گئی تھیں تو ہمیں عبایا پہنا دیا گیا۔ اب ہم کالج عبایا پہن کر جاتی تھیں اور اپنی دوستوں کے مذاق کا نشانہ بنتی تھیں۔

میرے ابا پوسٹ آفس میں ملازمت کرتے تھے۔ ان کی زندگی لفافوں پر ٹکٹ اور ٹھپے لگاتے گزر گئی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک چھوٹا سا سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا۔ ہم تینوں کی پیدائش بھی یہیں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ ابا گھر میں دم درود بھی کیا کرتے تھے۔ شروع میں صرف محلے والے ہی ان کے پاس آتے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابا کی شہرت پھیلتی چلی گئی اور اب آس پاس کے علاقوں سے بھی ضرورت مند اور حاجت مند اپنی پریشانیاں لے کر آنے لگے تھے۔ کوارٹر کا ایک کمرا ابا نے اپنے اس کام کے لیے مختص کر لیا تھا۔ شام چھ بجے سے رات نو بجے تک ابا حاجت مندوں کو دیکھتے تھے۔ ویسے ابا کبھی کسی سے پیسے وغیرہ نہیں مانگتے تھے۔ ہاں اگر کسی نے اپنی خوشی سے پیسے رکھ دیے تو منع بھی نہیں کرتے تھے۔ ضرورت مند تو ابا بھی تھے۔

یعنی حاجت مندوں کی مدد ابا کرتے تھے اور وہ ابا کے کام آتے تھے۔ دونوں کا کام چل رہا تھا۔ اس طرح الگ سے ایک آمدنی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ لوگ ابا کو میاں جی کے نام سے پکارتے تھے۔ محلے میں ابا کی بڑی عزت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اور صبیحہ جب گھر سے باہر کسی کام سے نکلتے تو محلے کے لڑکے ہمیں دیکھ کر احتراماً نظریں جھکا لیتے تھے۔ سچی بات ہے مجھے یہ دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ لڑکی جب جوان ہوتی ہے تو وہ مرکز نگاہ بنی رہنا چاہتی ہے۔ وہ صنف مخالف کی توجہ حاصل کرنا چاہتی ہے مگر ہمارے ساتھ معاملہ الٹ تھا۔ اگر میری امی ساتھ ہوتی تھیں تو لڑکے انہیں ادب سے سلام کرتے تھے۔

سب کچھ ٹھیک تھا۔ بس ابا کو عدنان کی طرف سے پریشانی لاحق تھی۔ وہ ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا اگرچہ وہ میٹرک میں تھا۔ ابا اکثر امی سے بولتے۔ ”شمیم بیگم! میری سمجھ میں نہیں آتا میں اس لڑکے کا کیا کروں؟ یہ تو بالکل آوارہ ہو گیا ہے۔“

”ہو جائے گا ٹھیک، تھوڑا وقت گزرے گا تو خود ہی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگے گا۔ آپ زیادہ فکر نہ کیا کریں۔“ امی انہیں جواب دیتیں۔

”ارے بھئی! اب لوگ دبے لفظوں میں عدنان کی باتیں بتانے لگے ہیں مجھے۔ اس کی آوارہ گردیوں کا ذکر کرتے ہیں۔“ ابا پریشانی کے عالم میں بولتے۔ ”کیا لوگ یہ نہیں سوچیں گے کہ میاں جی ہمیں تو پریشانیوں کا حل بتاتے ہیں۔ دم درود کرتے ہیں۔ وظیفے بتاتے ہیں اور خود اپنے اکلوتے لڑکے کو قابو نہیں کر پا رہے۔“

”سمجھاتی تو ہوں میں اسے۔“ امی کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ ”لڑکیاں تو جلدی سمجھ لیتی ہیں مگر یہ لڑکے جو ہوتے ہیں نا انہیں باہر کی ہوا لگ جاتی ہے تو تھوڑا ضدی اور خودسر بھی ہو جاتے ہیں۔“

”اب میری ریٹائرمنٹ کے دن آ رہے ہیں۔“ ابا کی اصل پریشانی ان کی زبان پر آ گئی تھی۔ ”پھر کیا ہوگا۔ کس طرح گھر چلے گا؟ یہ سوچ کر تو میرے دماغ میں درد ہونے لگتا ہے۔ بیٹے سے تو کوئی اُمید ہی نہیں ہے۔ اسے ذرا احساس ہوتا تو خود ہی کچھ کر لیتا۔ کہیں چھوٹی موٹی ملازمت پر لگ جاتا۔ اس سے چھوٹے چھوٹے لڑکے کما کر گھر لا رہے ہیں۔“

”ریٹائرمنٹ کا پیسا تو ملے گا نا۔ اس سے کوئی کام کر لینا۔“

”سب سے پہلے گھر کا بندوبست کرنا ہے شمیم بیگم۔ لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ کب تک دو کمروں میں گزارہ کریں گے۔ پھر ان کی شادیوں کے لیے بھی پہلے سے بندوبست کرنا ہوگا۔ کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں۔“

میں اور صبیحہ کمرے میں سے ابا اور امی کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ دونوں صحن میں بیٹھے تھے۔ لائٹ گئی ہوئی تھی۔ امی ابا کو ہاتھ کا پنکھا جھل رہی تھیں۔

”پر آپ کا یہ دم درود کا کام تو چل ہی رہا ہے نا۔“

”اس سے اتنا تو نہیں ہو پاتا کہ گھر چل سکے۔ یہ تو بس ہوائی روزی ہے۔ کسی نے کچھ نذرانہ دے دیا تو ٹھیک ہے ورنہ زیادہ تر بے چارے غریب غربا ہی آتے ہیں میرے پاس۔ اپنے منہ سے تو میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔“

بابا بول رہے تھے۔

”تو کوئی کام کر لینا آپ ریٹائرمنٹ کے پیسے سے یا پھر......“ امی بولتے بولتے رک گئیں۔

”یا پھر کیا؟“ ابا چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

”یا پھر یہ کہ ریٹائرمنٹ کا جو پیسا ملے وہ ہم بینک میں رکھوا دیتے ہیں۔“ امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کا ہمیں ہر ماہ منافع ملتا رہے گا اور رقم بھی جوں کی توں رہے گی۔ وہ جو نسیمہ ہے نا کونے والی اس کے میاں نے بھی یہی کیا ہے۔ آرام سے گزر بسر ہو رہی ہے ان کی۔“

ابا ایک دم اٹھ بیٹھے۔ میں اور صبیحہ کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔

”گویا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم سود کے پیسوں پر گزارہ کریں۔ حرام کی کمائی پر۔“

امی گھبرا گئیں۔ انہیں ابا کے اتنے شدید ردِعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ ہکلا کر بولیں۔ ”م...... میں تو صرف ایک بات بتا رہی تھی۔ یہ تھوڑی کہا کہ ایسا کر لیں۔“

”کہہ تو دیا سب کچھ۔“ ابا کی آواز شدید غیظ سے لرز رہی تھی۔ ”شمیم بیگم بھوکا مر جاؤں گا مگر اس گھر میں حرام کی ایک پائی بھی نہ آنے دوں گا۔ سن لینا کان کھول کے، دنیا کو حلال حرام کی تمیز سکھاتا ہوں اور خود حرام کی طرف چلا جاؤں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”تو کیا کریں گے پھر؟ کوئی دکان کھول لینا۔“ امی نے موضوع بدلنے کی غرض سے بات گھمائی۔

”کچھ تو کرنا پڑے گا۔ بیٹے سے تو کوئی اُمید نہیں ہے مجھے۔ وہ بس ایسے ہی آوارہ گردیاں کرتا رہے گا بدبخت۔“ ابا کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”میں سوچ رہا ہوں پہلے اپنے مکان کا کچھ کر لوں بچیوں کی شادی کا بھی کرنا ہے پھر......“

”دیکھ لیں جو آپ کی مرضی۔“ امی پھر پنکھا جھلنے لگیں۔

☆......☆

”مدیحہ یہ دیکھو میری فوٹو۔“ کرن نے اپنے بیگ میں سے ایک میگزین نکال کر میرے سامنے کر دیا۔

میں نے دیکھا میگزین کے ٹائٹل پر کرن کی ایک غضب کی فوٹو تھی۔ اس کا میک اپ بھی بہت شاندار تھا۔ بال بھی جدید انداز میں بنے ہوئے تھے مگر اس کا لباس...... اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔

”کیسی لگی؟“ کرن نے فخریہ انداز میں پوچھا۔

”کیا ہے مجھے دکھاؤ۔“ اتنے میں صبیحہ بھی وہاں آ گئی۔ اس نے میرے برابر میں بیٹھ کر میگزین دیکھا تو حیران رہ گئی۔

”اف کرن یہ...... یہ تم ہو؟“ صبیحہ ششدر رہ گئی تھی۔ بلاشبہ کرن اچھی شکل و صورت کی تھی مگر فوٹو میں اس کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ اصل سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ اس کے میک اپ، بے باک لباس اور اس کے دلفریب اسٹائل کے سبب زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔

”ہاں جی اپنی ہی ہے۔“ کرن مزید پھیل گئی۔

”کمال ہے یار، زبردست۔“ صبیحہ نے میرے ہاتھ سے میگزین لے لیا اور اندرونی صفحات میں دیکھنے لگی۔ اندر بھی کرن کی کئی فوٹوز تھیں۔ وہ سب مختلف اسٹائل اور لباس میں کھینچی گئی تھیں۔ سچی بات ہے مجھے اس کا لباس دیکھ کر شرم آ رہی تھی۔ کہیں فوٹوگرافر نے اس کے جسم کو نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی تو کہیں کرن نے بھی اس کی بھرپور مدد کی تھی۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے مگر تمہارا لباس......!“ میں بولتے بولتے رہ گئی۔

”کیا ہوا لباس کو۔“ کرن نے بھنویں اچکائیں۔

”بالکل غیر مناسب ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔“ میں نے کہہ دیا۔

کرن برا ماننے کے بجائے ہنس دی۔ یہ اس کی خوبی تھی کہ وہ کسی بھی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔

”ہنس کیوں رہی ہو۔ جو مجھے لگا میں نے کہہ دیا۔“

”بات ہی ہنسنے والی کی ہے تم نے۔“ کرن نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ”بے وقوف یہ جو شوبز کی دنیا ہے نا یہ سب چیزیں اس میں ضروری ہیں۔ سمجھو یہ اوپر جانے کا زینہ ہے۔ زینہ نہ ہو تو اوپر کیسے چڑھا جائے گا؟“

”مجھے معلوم ہے۔“ صبیحہ نے اس کی تائید کی۔ ”یہ جو ٹی وی فلم میں اداکارائیں ہوتی ہیں نا، یہ سب بھی اسی زینے سے چڑھ کر اوپر آتی ہیں۔“

”تم دیکھنا بہت جلد مجھے کوئی ڈراما سیریل بھی مل جائے گا۔“ کرن نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”پھر مزے ہی مزے۔ پیسا بھی خوب ملے گا، شہرت الگ۔ میڈیا ہر وقت آگے پیچھے مانو لائف ہی چینج ہو جاتی ہے یار۔“

میں نے گہری سانس لے کر اس کی شکل دیکھی مگر میں نے سنا ہے کہ اوپر جانے کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دینی

ہوتی ہیں۔''

''وہ تو ہے مگر یار، سب دیتی ہیں قربانیاں۔'' کرن نے پہلے جھجک کر کہا اور پھر بے فکری کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ جو فلموں، ڈراموں میں مشہور اداکارائیں نظر آتی ہیں۔ سب قربانیاں دے کر مشہور ہوتی ہیں۔ یہاں کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر کام چلتا ہے۔'' پھر وہ رک گئی۔

ہم تینوں اس وقت کالج میں تھے اور لان میں بیٹھے تھے۔

''یار تم تو بڑی مشہور ہوگئی ہو ایک دم۔'' صبیحہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''تم دونوں بھی ہوسکتی ہو۔'' کرن بولی۔ ''خوب صورتی میں تم دونوں بھی کسی سے کم نہیں ہو۔ شوبز میں خوب صورتی کی ہی تو ویلیو ہے۔ کئی پروموٹرز میرے جاننے والے ہیں اگر کہو تو بات کروں تم دونوں کی۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی تھوڑے عرصے میں کہیں جب لگالوگی۔''

''نا بابا نا۔'' میں نے گھبرا کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ہمیں تو معاف ہی رکھو ان چیزوں سے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔''

''اس میں مضائقہ کیا ہے بھلا؟'' کرن حیرت زدہ رہ گئی۔ ''ارے اپنے کالج کی کئی لڑکیاں میرے آگے پیچھے گھوم رہی ہیں۔ خوشامدیں کر رہی ہیں کہ اپنے پروموٹرز سے ان کی بات کروادو۔ میں تو تمہیں خود آفر کر رہی ہوں۔''

''مضائقہ نہیں۔ بلکہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''وہ کیا؟''

''ابا ماریں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ابا کیوں ماریں گے؟'' کرن نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''ارے ہمارے ابا جو ہیں نا وہ بہت سخت مزاج ہیں۔'' اس بار صبیحہ نے جواب دیا تھا۔ ''بڑے مذہبی ہیں اب اندازہ کرو کہ ہمارے گھر ٹی وی تک نہیں ہے۔ وہ تو کبھی کبھی ہم اپنی پھپھو کے گھر جاتے ہیں تو وہاں ڈرامے وغیرہ دیکھ لیتے ہیں۔ اگر ابا کو ہمارے ارادے کی بھنک بھی پڑگئی تو سمجھو ہمارا کام ہوگیا۔ پھر خبر سن لینا ہم دونوں کی۔'' صبیحہ بے بس آمیز انداز میں ہنس دی۔

''بڑی عجیب بات ہے یار۔'' کرن بڑبڑائی۔

''میری فوٹو پر تو گھر والے بہت خوش ہوئے۔ پورے خاندان میں چرچا ہوگیا میرا۔ فیس بک پر بھی فرینڈز کی تعداد بڑھ گئی ہے اور تم بتا رہی ہو کہ تمہارے ابا ماریں گے۔ کمال ہے بھئی۔''

''بس نصیب نصیب کی بات ہے۔'' صبیحہ بے دلی سے بولی۔

میں خاموشی سے دور دیکھ رہی تھی مگر میرا دماغ کہیں اور تھا۔ جو کچھ کرن کہہ رہی تھی وہ ہم خواب میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ابا کی کھینچی ہوئی لکیر کو عبور کرنے کا حوصلہ نہ تھا ہم میں۔ یہ بات درست تھی کہ میں اور صبیحہ کرن سے کئی گنا زیادہ خوب صورت اور حسین تھے۔ اگر ہم شوبز کی فیلڈ میں آجاتے تو ہمیں آگے بڑھنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آتی۔ ایک لمحے کو میرا دل بھی للچایا تھا مگر ابا کی صورت نظروں کے سامنے گھوم گئی تو اپنے دل کو مارنا پڑا اور خیال باطل کو ذہن سے نوچ کر نکالنا پڑ گیا۔

☆......☆

آخر وہ دن بھی آگیا جب ابا کی مدت ملازمت ختم ہوگئی۔ پھر وہ گھر بیٹھ گئے اور فل ٹائم اپنے دم درود کے کام پر توجہ دینے لگے مگر پریشانی یہ تھی کہ اس کام سے گھر نہیں چلایا جاسکتا تھا کچھ ادھار کی رقم بھی چکائی اور پھر تین کمرے کا ایک گھر خرید لیا۔ یہ مکان اپنے ہی علاقے میں خریدا تھا کیوں کہ یہاں سب لوگ جان پہچان والے تھے۔ ادھر ہی ابا نے ایک کرائے کی دکان لی اور اس میں پرچون کا کام شروع کردیا۔ عدنان گھر کے حالات دیکھ رہا تھا لیکن اسے کوئی فکر نہ تھی اس کی آوارگیاں بدستور جاری تھیں۔ صبح ہم دونوں بہنیں کالج جانے کے لیے نکلتیں اور ابا دکان جانے کے لیے تیار ہوتے تو اس وقت عدنان سو رہا ہوتا تھا۔ روز نہار منہ ابا سے کھری کھری باتیں سنتا اور تکیے میں منہ دے کر سوتا بنا رہتا۔ بعد میں امی بھی اس کو بہت سمجھاتی تھیں۔ وہ ہنستا ضرور تھا مگر عمل ندارد۔ ہم دونوں بہنیں بس میں کالج آتی جاتی تھیں۔ یہ ابا کی بڑائی تھی کہ انہوں نے ہم دونوں پر تعلیم کی پابندی نہیں لگائی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ ابا کو پرچون کے کام کا کوئی تجربہ نہ تھا، لہٰذا نقصان ہوتا رہا اور پھر یہ وقت بھی آگیا کہ کرایہ، بجلی کا خرچا نکالنا دشوار ہوگیا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟'' ایک دن ابا کھانے کے وقت بولنے لگے۔ ہم سب ساتھ ہی بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ بس عدنان حسبِ معمول غیر حاضر تھا۔

''میں کیا بتا سکتی ہوں۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' امی نے اپنی بے بسی کا اظہار کردیا تھا۔

''ایک روپے کا فائدہ نہیں ہو رہا۔ الٹا روز بروز نقصان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دو ماہ کا کرایہ بھی چڑھ گیا ہے۔ وہ تو دکان مالک شریف آدمی ہے سمجھو میرا مرید بھی ہے۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتا لیکن پیسے دینا تو ہیں نا، سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے دوں؟'' ابا بہت پریشان تھے۔

''ابا......ایک...... ایک بات بولوں؟'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

ابا چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ ''ہاں ہاں بولو بیٹا۔''

''ابا میں سوچ رہی ہوں کہ ٹیوشن پڑھانا شروع کردوں بلکہ میرے ساتھ صبیحہ بھی پڑھا سکتی ہے۔ چار پیسے تو گھر میں آئیں گے ابا آخر ہمارے پڑھنے لکھنے کا کچھ تو فائدہ ہو۔ کسی پرائیویٹ اسکول میں ملازمت بھی کرسکتی ہوں میں۔'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

''ہاں کر تو سکتی ہو بیٹا مگر...... مگر لوگ پتا نہیں کیا کیا باتیں بنائیں گے کہ میاں جی کی بیٹیاں نوکری کر رہی ہیں اور وہ نکما۔ ناکارہ بیٹا آوارہ گردیاں کرتا پھر رہا ہے۔'' ابا کے انداز میں نیم رضامندی تھی۔ وہ ایک دم اجازت دینے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

''ارے دنیا والوں کا کام ہی باتیں بنانا ہے۔'' امی ہماری حمایت پر آگے آئیں۔ ''آپ لوگوں کی پروا نہ کیا کریں۔ یہ میری بچیاں ماشاء اللہ بہت سمجھ دار ہیں۔ ویسے بھی آج کل لڑکیاں عورتیں ملازمتیں کرتی ہیں پورے پورے گھر سنبھالے ہوتی ہیں۔ اس میں قباحت کیا ہے بھلا۔''

''قباحت تو کچھ نہیں ہے۔'' ابا نے پانی پینے کے بعد کہا۔ ''میں منع تو نہیں کر رہا مگر ایک دو دن بعد بتاؤں گا۔''

پھر وہ ایک دو دن کئی ہفتوں میں تبدیل ہوگئے۔ ابا نے جواب نہیں دیا۔ امی نے ایک دو بار دبے لفظوں سے پوچھا تو ہوں ہاں کرکے رہ گئے۔ تنگ دستی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ ابا سے دم درود کروانے کے لیے لوگ دکان پر ہی چلے جاتے تھے۔ آمدنی مسلسل کم ہوتی جارہی تھی۔ پھر ایسا بھی ہونے لگا کہ میرے اور صبیحہ کے کالج جانے تک کے پیسے نہیں ہوتے۔ بس کا کرایہ بھی نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں بہنیں بھی سخت پریشان تھیں۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹنے لگتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ کئی دن سے ہم کالج بھی نہیں گئے۔ ایک روز کرن کی کال آگئی۔

''ارے کہاں ہو بھئی کالج کیوں نہیں آرہی ہو۔ خیریت تو ہے نا؟'' کرن نے چھوٹتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

جواب میں، میں نے اسے گھر کے تمام تر حالات سے آگاہ کردیا۔ کرن ہماری بہت اچھی دوست تھی۔ اس سے کچھ چھپانا اچھا نہیں لگا۔ وہ بھی اپنے گھر کی ایک ایک بات ہمیں بتادیتی تھی اور ساتھ ہی مشورے بھی لیتی تھی۔

''ویری سیڈ یار! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ بولنا تو چاہیے تھا۔ ایک کال ہی کردیتی۔ تم بھی عجیب ہو مدیحہ۔'' وہ شکایت کرنے لگی۔

''موبائل بھی ہماری طرح کنگال ہے یار کب سے بیلنس ہی نہیں ڈالا کہاں سے کال کرتی۔'' میں نے بے بسی آمیز انداز میں ہنستے ہوئے بتایا۔

''کل تم دونوں کالج آجاؤ رکشا کرکے میں کرایہ دے دوں گی۔ کچھ خبریں بھی سناؤں گی تم دونوں کو لازمی آنا ہے کل۔'' کرن نے زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے ہامی بھرلی اگلے روز میں اور صبیحہ رکشے میں کالج پہنچ گئیں۔ کرن دروازے پر ہی کھڑی تھی اس نے رکشے کا کرایہ ادا کیا۔ پھر وہ ہمیں کالج سے قریب ایک اچھے سے ریسٹورنٹ میں لے آئی۔ میں اور صبیحہ پہلی بار اتنی اچھے ریسٹورنٹ میں آئے تھے۔ اس لیے نروس ہو رہے تھے۔

''یار کالج نہیں جانا کیا۔ یہاں کیوں لے آئی ہو؟'' صبیحہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

میں وہاں کا جائزہ لے رہی تھی۔ زیادہ تر وہاں مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت سوں کی نظریں ہم تینوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''جانے دو کالج کو پہلے میری بات سنو۔'' کرن نے صبیحہ کی بات ٹال دی۔ ''مجھے ایک ڈراما سیریل میں کام مل گیا ہے۔ لیڈنگ رول ہے میرا۔ آٹھ لاکھ روپے میں بات ہوئی ہے۔''

''آ...... آٹھ لاکھ۔'' میری آنکھیں پھیل گئیں۔

''ایک دم آٹھ لاکھ۔'' صبیحہ کی کیفیت بھی مجھ سے الگ نہ تھی۔

''جی اور یہ تو شروعات ہے۔ سیریل ہٹ ہوگیا تو سمجھو۔ پھر پندرہ بیس لاکھ میں بات ہونے لگے گی۔ چند

PakiBooks.Site

مزید ڈراموں کی آفرز ہیں۔'' کرن فخریہ انداز میں بتا رہی تھی۔ ''کئی اخباروں اور میگزینز میں میرے انٹرویوز لگے ہیں۔''

''یہ تو تم نے کمال کر دیا۔'' میں نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم مت کرنا کمال۔ بس ایسے ہی غربت کی چکی میں پستی رہو۔'' کرن نے اگلے ہی لمحے ہم دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''ایک نمبر کی بے وقوف ہو تم دونوں بہنیں۔ اب بھی پورا پورا موقع ہے۔ میرے جاننے والے پروموٹرز کو فریش چہروں کی تلاش رہتی ہے۔ اتفاق سے میں نے تم دونوں کا ذکر بھی کیا تھا مگر تم راضی ہی نہیں ہوتی ہو۔''

''بات یہ نہیں ہے کرن...... اصل بات یہ ہے کہ......'' میں بولنے لگی تو کرن نے درمیان میں سے میرا جملہ اچک لیا۔

''اصل بات یہ ہے کہ ابا ماریں گے۔ یہی بات ہے نا؟''

میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

صبیحہ بولی۔ ''مدیحہ ٹھیک کہہ رہی ہے کرن، تم ہمارے ابا کو نہیں جانتی ہو۔''

''ارے تو بے وقوفوں ابا کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم دونوں ویسے بھی نقاب کرتی ہو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ بس جو میں بول رہی ہوں اس پر عمل کرتی جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں کو آگے آنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ پھر میں جو ہوں تم دونوں کے ساتھ۔ میں بھی اپنے تمام تعلقات استعمال کروں گی۔'' کرن آگے جھک کر بول رہی تھی۔

''ہم بتا دیں گے تمہیں۔ تھوڑا سوچنے کا موقع تو دو۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''بالکل سوچو مگر کوئی بے وقوفی والا فیصلہ نہیں کرنا۔'' کرن نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''اچھا اب بتاؤ کیا منگواؤں؟''

☆......☆

میرے دو دن بڑے شش و پنج میں گزرے۔ صبیحہ مجھ سے چھوٹی تھی۔ ہم دونوں میں بہت اچھی دوستی تھی لیکن وہ میری رائے کا احترام کرتی تھی۔ اسے میرے فیصلے کا انتظار تھا۔ میں جانتی تھی کہ صبیحہ میری ہاں یا نہ میں وہی کرے گی جو میرا فیصلہ ہوگا۔ یہاں روز کی بنیاد پر گھر کے معاشی حالات دگرگوں ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ابا بھی مستقل پریشان اور فکر مند رہنے لگے تھے۔ اس وجہ سے ان کی صحت ایک دم گرتی چلی جا رہی تھی۔ منتشر اور پاگل سوچوں نے انہیں بالکل نڈھال کر ڈالا تھا۔ چڑچڑے الگ ہو گئے تھے یا پھر خاموش ہی رہتے۔ گھر کا ماحول یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ابا وہ بات بھول گئے تھے جو میں نے کہی تھی۔ اسکول کی ملازمت والی۔ بس لے دے کر ابا کے پاس عزت رہ گئی تھی۔ ایک بھرم تھا جو قائم تھا۔ ان کا سب سے بڑا دکھ نافرمان اولاد تھی۔ عدنان کی سرکشی اور نافرمانی نے انہیں آدھا کر ڈالا تھا۔ پتا نہیں ان سے زندگی میں کیا گناہ سرزد ہوا تھا کہ عدنان جیسا بیٹا ملا تھا۔

ایک صبح ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دکان پر نہیں جا رہے تھے۔ ادھر عدنان دیر تک سونے کا عادی تھا۔ میں اور صبیحہ گھر کے کاموں میں مصروف تھیں۔ ہم دونوں کا بھی کالج جانا نہیں ہوا تھا۔

امی عدنان کو جگا رہی تھیں۔ ''اٹھ جا بیٹا گیارہ بج گئے ہیں۔ کب تک سوتا رہے گا۔ اٹھ شاباش۔''

''مت اٹھاؤ اسے حرام خور کو۔'' دفعتاً ابا اپنے کمرے سے اٹھ کر آ گئے۔ وہ خون خوار نظروں سے امی کو دیکھ رہے تھے۔ ''تمہاری انہی حرکتوں نے اس کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ اس کے تو اٹھتے بیٹھتے جوتے لگیں تو دماغ ٹھکانے پر آئے گا۔ بے شرم کہیں کا۔ بس کھانا اور آوارہ گردی کرنا، یہی کام رہ گئے ہیں اس کے۔ سونے دو اسے۔ اس سے مجھے ایک پائی کی اُمید نہیں ہے۔ لعنت ہے ایسی اولاد پر۔ گھر کا رتی برابر خیال نہیں ہے۔ یہاں فاقوں کی نوبت آ گئی ہے اور نواب کا بچہ پڑا سو رہا ہے۔''

''کیا ہو گیا ابا صبح صبح۔'' عدنان کروٹ لے کر برہمی سے بولا۔ ''کیوں چلا رہے ہو۔ ساری نیند خراب کر دی ہے خاماخائی میں۔''

''بتاؤں ابھی تجھے میں۔'' ابا جوتا اٹھا کر اس کی طرف لپکے۔

امی چیخ کر ان کے سامنے آ گئیں۔ ''نہیں نہیں اللہ کے واسطے چھوڑ دیں اسے اپنی صحت کا خیال کر لیں۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے آپ کی۔ مت بولیں اسے کچھ۔ اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ ٹھوکر لگے گی تو خود ہی سنبھل جائے گا۔''

''ٹھوکر نہیں شمیم بیگم اس کے تو ٹھڈے لگنے چاہئیں ہڈ حرام کہیں کا۔ بس پڑے پڑے چارپائی توڑتا رہتا ہے۔ اسے سمجھا لو کہ انسان بن کر رہے اس گھر میں ورنہ کہیں دفع

ہو جائے۔ جائے کہیں اور ٹھکانا کر لے۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی نافرمان اولاد۔'' ابا چلا رہے تھے۔

میں اور صبیحہ خاموشی سے اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔ سب کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا تھا۔ عدنان بڑی ڈھٹائی سے تکیے میں منہ دے کر دوبارہ سوتا بن گیا۔

امی بمشکل ابا کو باہر لے گئیں۔ دن کا آغاز ہی ایسا ہو جائے تو باقی دن خالی خالی ہی گزرتا ہے۔ گھر کا ہر شخص کونا پکڑ کر خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ میں اور صبیحہ ایسے کسی معاملے کے درمیان نہیں بولتے تھے۔ جب عدنان ناشتا کرنے بیٹھا تو میں عدنان کو سمجھانے لگی۔ ''کیوں ابا سے زبان چلانے لگے ہو۔ وہ بے چارے پہلے ہی اتنے پریشان ہیں تم نے الگ ان کو دکھ دیے ہوئے ہیں۔''

''میں نے کیا کر دیا باجی۔'' عدنان نے منہ بنا کر کہا۔ ''میں کون سا اس گھر میں عیش کر رہا ہوں۔ بے کار میں مجھ پر رعب جماتے رہتے ہیں۔ ایک بار کہا تھا موٹر سائیکل دلانے کا۔ آج تک نہیں دلائی۔ میرے سارے دوستوں کے پاس نئی نئی زیرو میٹر موٹر سائیکلیں ہیں۔ ان کے اباؤں نے دلائی ہیں اور ایک میں ہوں فالتو میں پابندیاں لگاتے رہتے ہیں۔ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ لے دے کر ایک فلمیں ہی تو رہ گئی ہیں ان پر بھی روک ٹوک لگا رکھی ہے۔''

''تھوڑا صبر نہیں کر سکتا۔'' میں نے پیار سے اسے ڈانٹا۔ ''دیکھ میں اب نوکری کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ نوکری ہو گئی تو سمجھو تمہاری بائیک پکی۔''

''بائیک پکی۔'' اس نے میری نقل اتاری۔ ''ابا کرنے دیں گے نوکری؟''

''وہ ہو جائے گا۔ بھوکے مر جائیں وہ اچھا ہے؟'' میں نے مضبوطی سے کہا۔ ''مگر دیکھو بائیک آ جائے تو پھر تم بھی اپنی حرکتیں ٹھیک کر لینا۔ وعدہ!''

''پہلے نوکری تو کر لو۔'' عدنان نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''پھر وعدہ بھی کر لوں گا۔ دو منٹ کی بات ہے وعدہ کرنے میں کون سا ٹائم لگتا ہے۔''

میں خاموش ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اب مجھے کرن کی کال کا انتظار تھا۔

☆......☆

اتفاق سے رات کو کرن کی کال بھی آ گئی۔

''میں تمہاری ہی کال کا انتظار کر رہی تھی۔'' میں نے دبے لہجے میں کہا اور تیزی سے چھت پر آ گئی۔ وہاں ایک پرانی چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گئی۔ نیچے کمرے میں امی بھی تھیں۔ وہاں میں ان کی موجودگی میں کھل کر بات نہیں کر سکتی تھی۔

''اوہو! یعنی فیصلہ کر لیا ہے۔'' کرن نے بھانپ لیا۔

''ہاں...... اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''صبیحہ بھی؟''

''نہیں فی الحال صرف میں کام کروں گی۔''

''گڈ تو پھر تیار رہنا۔ صبح میں آ رہی ہوں تمہارے گھر آنٹی کو بتا دوں گی کہ تمہاری نوکری کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔ اوکے۔'' کرن خوش ہو کر بولی تھی۔

میں نے کرن کی باتیں صبیحہ کو بتا دیں۔ اگلی صبح کرن پرائیویٹ کمپنی کی کار لے کر گھر آ گئی۔ تب تک میں نے امی کو بتا دیا تھا اور امی نے ابا کو، دونوں اس لیے مطمئن تھے کہ وہ کرن کو جانتے تھے۔

''کرن بیٹا خیال رکھنا مدیحہ کا۔ کالج کے علاوہ اس نے دنیا دیکھی نہیں ہے۔ نوکری کے لیے پہلی بار قدم نکال رہی ہے۔'' امی خوش تو تھیں لیکن کہیں نہ کہیں ان کا دل گھبرا رہا تھا۔

''ارے آنٹی! میں ہوں نا، میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں نا۔'' کرن نے آگے بڑھ کر ان کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ رکھ دیئے۔ ''کرن اور صبیحہ کو میں نے ہمیشہ دوست نہیں بلکہ بہنیں ہی سمجھا ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میرے انکل کا اسکول ہے۔ بہت بڑا اور انگلش اسکول۔ میں بہت اچھی تنخواہ دلواؤں گی۔ بس آپ بے فکر ہو جائیں۔''

امی نے سر ہلا کر اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

پھر میرے پیر گھر سے باہر نکل گئے۔ لڑکی کے قدم گھر سے باہر پڑ جائیں تو ان کی واپسی بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ کرن مجھے ایک بڑے بنگلے میں لے گئی تھی۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر میں مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسا تو میں ڈراموں میں دیکھتی آئی تھی۔ وہاں مرد بھی تھے اور بہت سی لڑکیاں بھی تھیں۔ کرن کے وہاں بہت جاننے والے تھے۔ وہ سب سے بہت بے تکلفی سے مل رہی تھی۔ مجھے وہاں موجود لڑکیوں کے لباس اور ان کے بے باکانہ انداز دیکھ کر شرم آ رہی تھی۔ وہاں بہت سے مرد لڑکیوں کو چھچھوری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب کوئی میری جانب دیکھنے لگتا تو مجھے اس کی حریصانہ نظریں اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہونے لگتی تھیں۔ میں سخت گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ کرن نے یہ

PakiBooks.site

بات محسوس کرلی تھی۔
''گھبراؤ نہیں مدیحہ، ایزی ہوجاؤ۔ اس جگہ ڈرنے والا ہی پہلے مرتا ہے اور یہ عبایا تو اتاردو۔''
''نہیں نہیں میں یہ نہیں اتاروں گی۔'' میں بوکھلا گئی۔
کرن نے مجھے غور سے دیکھا اور گہری سانس لے کر بولی۔ ''جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔'' تب میں نے اس کی بات مانتے ہوئے عبایا اتاردیا۔
''ماشاء اللہ بھئی ماشاء اللہ۔'' اچانک کہیں سے ایک جوان آدمی ہمارے سامنے آگیا۔ وہ تعریفانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''بھئی کرن، کہاں چھپا رکھا تھا انہیں۔''
''جامی صاحب! بس میری ہی دریافت ہے۔ اب سیدھا آپ کے پاس لائی ہوں۔ ایسی ہی صورت چاہیے تھی نا آپ کو اپنے نئے ڈراما سیریل کے لیے۔'' کرن فخریہ انداز میں بولی۔
جامی صاحب بغور میرا جائزہ لے رہے تھے۔
''کمال......کمال کردیا واہ بلکہ میں تو اپنی فلم میں بھی انہیں چانس دینے کو تیار ہوں۔ اگر یہ تیار ہوجائیں تو......''
ان کا جملہ ذومعنی تھا۔ میں نے کرن کو دیکھا۔
''میں اسے لائی ہی اسی لیے ہوں جامی جی۔'' کرن ہنستے ہوئے بولی۔ ''شریف بچی ہے میری پکی دوست۔''
''بس تو سمجھو آج سے میری بھی پکی دوست۔'' جامی جی نے میری طرف ہاتھ بڑھادیا۔
میں نے گھبرا کر کرن کو دیکھا۔ کرن جلدی سے بولی۔
''جامی جی! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ دوستی تو ہو ہی گئی ہے۔ باقی جو رہ گئی ہے آہستہ آہستہ ہوجائے گی۔ آپ چاہیں تو آڈیشن لے سکتے ہیں۔ میں بھی اس کا اعتماد بڑھاتی رہوں گی۔ پڑھی لکھی ہے۔ سیکھ لے گی جلد ہی۔''
جامی جی زندہ دل آدمی تھے۔ کرن کی بات پر سر ہلانے لگے۔
پھر میں تیزی سے سیکھنے لگی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی علم ہوا کہ میں اداکاری کرسکتی ہوں۔ کرن میری صلاحیتوں کو پالش کررہی تھی۔ ساتھ ہی وہ مجھے شوبز میں رہنے اور اپنی اہمیت منوانے کے گر بھی سکھانے لگی تھی۔ فی الحال کرن نے مجھے پچیس ہزار اپنی جیب سے دے دیے تھے تاکہ میں گھر کی جانب سے بالکل بے فکر ہوکر اپنے کام پر فوکس ہوجاؤں۔ پچیس ہزار میں سے میں نے امی اور ابا کو پندرہ ہزار دیے تو ان دونوں کے مردہ تنوں میں نئی روحیں حلول کرگئیں۔ امی کے تو ہاتھ کانپ رہے تھے۔
''ایک دم پندرہ ہزار اتنے سارے پیسے؟''
''یہ تو ابھی صرف ایڈوانس ہیں امی، کرن نے دلوا دیے تھے۔ تھوڑے میں نے بھی اپنے پاس رکھے ہیں۔ بس اب انشاء اللہ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔
دھیرے دھیرے گھر کے معاشی حالات بہتر ہونے لگے۔ میں صبح صبیحہ کے ساتھ آٹو رکشا میں نکلتی۔ صبیحہ کالج چلی جاتی اور میں کرن کی طرف۔ اب میرا کالج جانا کم ہوگیا تھا۔ فی الحال مجھے تعلیم کی قربانی بھی دینی پڑ رہی تھی۔ تیسرے ہی ماہ میں نے عدنان کو نئی بائیک دلوادی۔
''ارے واہ باجی! ایمان سے سوپر کمال کردیا۔''
عدنان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔
''کمال تو ہوگیا۔ اب یہ بتاؤ کہ اپنا وعدہ یاد ہے؟''
''کون سا وعدہ۔''
''وہ......جو تم نے کرنا تھا۔ انسان بننے کا۔'' میں نے یاددلایا۔
''اوہ ہاں وعدہ پکا وعدہ آپ جو کہو گی میں وہی کروں گا۔'' وہ ہنسنے لگا۔
''بس ابا کو شکایت کا موقع نہ دینا۔ باقی سب خیر ہے۔''

☆......☆

چند ماہ میں ہی گھر کے حالات بالکل بدل چکے تھے۔ امی ابا کی صحت بھی دیکھنے والی ہوگئی تھی۔ اچھی خوراک، مالی آسودگی اور خوش حالی نے ان کے چہروں کی رونقیں لوٹا دی تھیں۔ صبیحہ بھی خوش تھی۔ گھر میں سب کے پاس نئے نئے موبائل آگئے تھے۔ ابا کی دکان ختم کروادی تھی۔ اب وہ گھر میں ہی بیٹھ گئے تھے۔ صبیحہ اور عدنان نے گھر میں ٹی وی کی فرمائش کی تو ابا نے انہیں سختی سے منع کردیا۔ مگر میں نے ایک روز بڑا سا ٹی وی خریدا اور گھر لے آئی۔ مجھے ابا ایک لفظ نہ بولے۔ بس اتنا کہا کہ اگر ٹی وی چلانا ہے تو آواز کم کرکے دیکھا کریں۔ کمرے سے باہر آواز نہ نکلے۔ ابا مجھے کسی طور ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب وہ گھر میں صرف حاجت مندوں کے لیے مخصوص اوقات میں بیٹھتے تھے۔ ابھی امی اور ابا کو علم نہ تھا کہ میں شوبز کے لیے کام کررہی ہوں۔ بہت سے میگزین پر بطور ماڈل میری تصویریں آئی تھیں۔ فیسٹیول

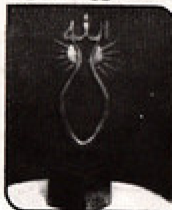
PakiBooks.Site

1987ء سے خدمت میں مصروف

پُھلبہری
LEUCODERMA-VITILIGO
تمام جلدی بیماریوں کا مؤثر اور بے ضرر علاج

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی ماہر برص کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT


AWARD
ILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مستقل پتہ
مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1 سرا پاک (قطبی چوک) اسلام آباد
فون (051)32331725
موبائل 0300-8566188

پشاور
ہوٹل امین
کیم فروری تا 11 فروری
کیم جون تا 11 جون
کیم اکتوبر تا 11-اکتوبر
قیام
جی ٹی روڈ نزد ہشتنگری چوک پشاور شہر
موبائل 0300-8566188

لاہور
گلف سینٹر
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر
قیام
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188

کراچی
فورچون سینٹر
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
قیام
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم سی بی
موبائل 0300-8566188

ملتان
ہوٹل سلور سینڈ
28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
قیام
ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

اور فیشن شو میں میری شرکت لازمی ہوگئی تھی مگر اس بات کی کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ ڈراموں کا کام بھی چل رہا تھا لیکن ابھی وہ آن ایئر نہیں ہوئے تھے۔ جامی جی بڑے شوقین مزاج تھے۔ وہ خاص طور پر لڑکیوں پر بہت پیسے لٹاتے تھے۔ میں ان کی آنکھ کا تارا بنی ہوئی تھی۔ وہ اکثر تقریبات اور محافل میں مجھے ساتھ لے جانا پسند کرتے تھے۔ پہلے میں نے ان کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ حد سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ انہیں نمود و نمائش اور دکھاوے کا شوق تھا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ ابا یہ گھر فروخت کردیں اور ہم کسی اچھے علاقے میں کوئی بہتر فلیٹ یا مکان خرید لیں، لیکن اس بات پر ابا راضی نہ ہوئے۔

''نہیں میں کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ میرا کہیں اور دل نہیں لگے گا۔'' ابا نے صاف انکار کردیا تھا۔

''ابا اس میں مسئلہ کیا ہے۔'' صبیحہ نے بھی میری حمایت کی۔

''اور کیا۔'' امی بھی بول اٹھیں۔ ''اب دیکھیں نا ہمارے اس محلے سے کتنے لوگ چلے گئے۔ جسے اللہ نے پیسا دیا وہ نکلتا گیا یہاں سے۔ اس میں برائی کیا ہے۔ ہم یہاں کے لوگوں سے تعلق تو ختم نہیں کر رہے ہیں۔ ملنا ملانا رکھیں گے۔''

''نہیں شمیم بیگم۔'' ابا بھی اڑ کر رہ گئے۔ ''اس پر میں کوئی سمجھوتا نہیں کروں گا اب میں ادھر ہی پیدا ہوا، میرے بچے بھی یہیں پلے بڑھے۔ میرے مرنے کے بعد تم لوگ جہاں چاہے چلے جانا۔ ابھی میں کہیں نہیں جاسکتا۔''

اس بات پر ابا کسی کی بات ماننے پر راضی نہیں ہوئے۔ میں نے بھی کوشش کرکے دیکھ لی تھی۔ آخر میں نے ہی امی، صبیحہ کو خاموش کروا دیا کہ مزید اس موضوع پر بات نہ کریں۔ کرن کو بھی یہ بات بتائی تو وہ بھی تھوڑا مایوس ہوئی تھی۔

''انکل راضی ہو جاتے تو اچھا تھا۔ خیر کیا کرسکتے ہیں۔''

''بس اب صبر ہی کرسکتے ہیں ہم۔'' میں نے جواب دیا۔

زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی تھی۔ کسی بھی ایک فیشن شو کے لیے مجھے کئی لاکھ روپے ملتے تھے۔ میری تمام جھجک دور ہوگئی تھی میں اب

بھی عبایا پہنتی تھی، مگر صرف اپنے علاقے کی حد تک۔ اس کے بعد میرا لباس مختلف ہوتا تھا۔ میرے علاقے کا کوئی فرد اگر مجھے دیکھتا تو پہچان نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ کسی نے میری شکل نہیں دیکھی تھی۔ میں ہمیشہ عبایا میں ہی رہتی تھی۔ یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا تھا۔ بس اب مسئلہ یہ تھا کہ جب میرے ڈرامے آن ایئر ہوں گے تو رشتے داروں کو علم ہو جائے گا مگر اب مجھے اس جانب سے بھی اطمینان تھا۔ جب سے میں نے گھر میں پیسے دینا شروع کیے تھے۔ کبھی ابا اور امی نے یہ نہیں پوچھا کہ ایک اسکول ٹیچر کی تنخواہ اس قدر زیادہ کیسے ہوسکتی ہے۔ میں صبح کی گئی رات میں گھر آتی تھی تو کبھی انہوں نے یہ سوال نہیں کیا کہ ایسا کون سا اسکول ہے جو رات تک کھلا رہتا ہے لیکن میں نے خود ہی بہانہ بنا دیا تھا کہ اسکول کی فلاں تقریب تھی جو رات میں رکھی گئی تھی۔ کبھی سیمینار کا بہانہ کیا اس طرح میں ان لوگوں کو مطمئن کرتی رہتی تھی۔ حقیقت میں تو اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی پیسے ہی انہیں اطمینان دلانے کے لیے کافی تھے۔ اس کے باوجود کہیں نہ کہیں مجھے ابا کا خوف تھا اگر انہیں میرے کام کے بارے میں علم ہوا تو لازماً وہ بڑا ہنگامہ کریں گے۔ میں جانتی تھی کہ انہیں اپنی عزت سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ شوبز کی دنیا کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خوف میرے دل میں ایک گوشے میں چھپا ہوا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ہی میری پہلی ڈراما سیریل ایک بڑے ڈراما چینل سے آن ایئر ہوگئی۔ صبیحہ کو میں بتا چکی تھی اس نے ڈرامے کا پرومو دیکھ لیا تھا۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ امی کو خبر نہ ہونے پائے۔

''امی کون سا ڈراما دیکھتی ہیں۔ عدنان بھی گھر میں نہیں ہوتا۔ تم فکر مت کرو۔'' صبیحہ نے مجھے اطمینان دلایا۔

''بس احتیاط رکھنا۔''

''مگر...... کسی نہ کسی دن تو امی ابا کو پتا لگ ہی جائے گا۔ پھر کیا ہوگا۔ پھپھو کے گھر میں تو سب ہی ٹی وی کے ڈرامے دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ بتا دیں گے۔'' کرن نے خدشے کا اظہار کیا۔

''جب کی جب دیکھی جائے گی۔'' مجھ سے ٹھیک سے جواب نہ بن پایا۔ اب گھر کے تمام اخراجات میں اٹھاتی تھی۔ ابا کی کمائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ البتہ ان کی عزت بدستور پورے علاقے میں تھی۔ عدنان کے معمولات جوں کے توں تھے۔ بس اس نے میری بات مانتے ہوئے اپنی

آوارگیاں کم کردی تھیں۔ گھر کے کام کاج بھی کرتا تھا اور اسکول بھی جانے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابا کو اس کی طرف سے قدرے سکون ہوا تھا۔ میں عدنان کو پابندی سے اس کے جیب خرچ کے پیسے دیتی تھی۔ صبیحہ کا بھی خرچا میں ہی اٹھاتی تھی۔

ایک صبح میں گھر میں تھی۔ اس روز اتوار تھا۔ ابا خط بنوانے کے لیے حجام کی دکان پر گئے ہوئے تھے۔ صبیحہ اور عدنان سو رہے تھے۔ امی کچن میں مصروف تھیں۔ میں منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئی تھی تو دروازے کی بیل بجی۔

میں نے دروازہ کھولا تو ابا اندر آگئے۔ ایک لمحے کو رک کر انہوں نے مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں کے گوشے لرز رہے تھے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں اور بول نہیں پا رہے۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی میگزین تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔

یقیناً کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ ابا کا ناقابلِ فہم اور پُراسرار رویہ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں کچھ نہ بولی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ابا کو میرے کام کے بارے میں علم ہوگیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے بتا دیا ہو۔ سوچ سوچ کر میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

''کیا ہوا، کب سے آواز دے رہی ہوں۔'' امی نے اندر آتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''ناشتا نہیں کرنا کیا؟''

''ہاں...... ہاں کرنا ہے۔'' میں چونک سی گئی۔ ''کیا ہوا۔ خیریت تو ہے نا۔''

اب امی کے چونکنے کی باری تھی۔ ''یہ تمہارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا میری بچی؟''

''ہاں ٹھیک ہے میں ٹھیک ہوں آتی ہوں میں۔''

میں ناشتے کی ٹیبل پر پہنچی تو وہاں صرف امی تھیں۔

''ابا کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں ابھی آئے تھے۔ اب پھر باہر چلے گئے۔ کچھ بتایا بھی نہیں۔ کوئی کام یاد آگیا ہوگا۔ تم کرو ناشتا آجائیں گے وہ۔'' امی نے کہا۔

جب امی برتن دھونے کچن گئیں تو میں خاموشی سے اٹھی اور ابا کے کمرے میں آگئی۔ پھر میں وہاں کی تلاشی لینے لگی۔ جلد ہی میرے ہاتھوں وہ میگزین لگ گیا جو ابا باہر سے لے کر آئے تھے۔ پھر میرے خدشے کی تصدیق ہوگئی۔

اس میگزین میں میرا باتصویر انٹرویو شائع ہوا تھا۔ اس پر درج تھا، چھوٹی اسکرین کا ابھرتا ہوا ستارہ۔ مدیحہ رشید کی باتیں۔ اس میں میری مختلف لباس و انداز میں تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ میگزین دوبارہ رکھ دیا اور جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ خوف کی لہریں میرے وجود میں سرایت کرگئی تھیں کہ اب ابا آئیں گے تو گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کریں گے۔ میں ان سے کیا کہوں گی۔ کیا ابا دوبارہ مجھے گھر بٹھا دیں گے۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اپنی عزت انہیں ہر شے پر مقدم تھی۔

میں کمرے میں بیٹھی متضاد سوچوں کے بھنور میں چکرا رہی تھی۔ دوپہر کے بعد ابا گھر میں آئے۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ؟'' امی نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''کام تھا ایک ضروری۔'' ابا نے نارمل لہجے میں کہا۔

''ناشتا کرلیا تھا آپ نے ابا؟'' میں نے آگے بڑھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ابا نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور اثباتی لہجے میں کہا۔ ''ہاں بیٹا کرلیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے آگئی۔

''وہ ابا! ایک بات ہے؟'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''ہاں...... کیا بات ہے بولو۔''

''آپ...... آپ ناراض تو نہیں ہیں نا مجھ سے؟''

ابا اپنے پلنگ پر تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ کئی منٹ گزر گئے۔ ابا سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جیسے بولنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہے ہوں۔ میں انتظار کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔

پھر ابا نے سر اٹھایا اور کہا۔ ''بیٹا میں ناراض ہونا چاہوں بھی تو نہیں ہوسکتا۔ میری مجبوری مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ میری ناراضی اس گھر کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ جا بیٹا میں ناراض نہیں ہوں۔''

میں ڈبڈبائی نظروں سے ابا کو دیکھتی چلی گئی۔ مجبوری نے ان کی انا کا بت توڑ ڈالا تھا۔

میں پلٹنے لگی تو ابا بولے۔ ''اور ہاں وہ میں کہہ رہا تھا کہ اب ہمیں کسی اور علاقے میں گھر لے لینا چاہیے کیونکہ یہاں سب میرے جاننے والے ہیں اور ٹی وی بھی دیکھتے ہیں۔''

PakiBooks.Site

بے چاری

جناب معراج رسول
السلام علیکم

یہ سچ بیانی عرصے سے لکھی ہوئی رکھی تھی۔ میں چاہ کر بھی اسے فیئر نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ بار بار میری نظروں میں اس کا چہرہ آجاتا تھا۔ اس بے چاری پر ٹوٹنے والے کوہِ الم مجھے رہ رہ کر ستانے لگتے اور میں سوچنے لگتا کہ اپنا غم کتنا کم ہے۔ دوسروں پر جو کچھ گزرتا ہے اس کے مقابلے میں ہم کتنے سکھی ہیں۔

خالد قریشی
(کوئٹہ)

ان دنوں فراغت کے کچھ ایام میسر آئے تو میں نے مقامی اخبار میں بے چاری کے نام سے کالم کا آغاز کردیا، اس کالم میں مجبور و لاچار خواتین کی معاشی بدحالی کا ذکر ہوتا۔ ان پر توڑے گئے مظالم کی روداد ہوتی میں یہ تمام کہانیاں انٹرویوز کے ذریعے حاصل کرتا۔ میرے کالم کو اللہ نے کامیابی سے ہمکنار کیا اور یہ کالم لاچار و بے سہارا عورتوں کی دردبھری آواز بن کر ابھرنے لگا۔ ایسی ہی ایک بوڑھی طوائف کی آپ بیتی میری نگاہوں میں آئی۔ طوائف کا نام بی بی جان تھا۔ عمر اسی سے نوے کے درمیان تھی لیکن قابلِ رشک صحت کی بدولت ستر سے اوپر کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بی بی جان کا نام جوانی کے دنوں میں زرغونا تھا اور زرغونا کے کہنے کے مطابق اس آپ بیتی کا آغاز دہلی کے بازارِ حسن سے ہوتا ہے۔ اس کی عمر ان دنوں سولہ سال تھی۔ اس کے آبائی کوٹھے کا نام آتش کدہ تھا۔ آبائی کا لفظ اس لیے کہا کہ اس کی ماں اور نانی نے بھی اسی آتش کدہ میں وقت گزارا۔ کسی دور میں آتش کدے کے کاروباری معاملات کا یہ عالم تھا کہ یہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ لوگ قطار کی صورت میں کوٹھے کے باہر کھڑے دکھائی دیتے تھے لیکن اب کوٹھے کے اندر ہو کا ایسا عالم طاری تھا کہ سازندے اور کارندے بھی اپنی زندگی سے عاجز دکھائی دیتے تھے۔ کوٹھے کی ساکھ اس وقت متاثر ہونی شروع ہوئی جب زرغونا نے مجرے کا باقاعدہ آغاز کیا۔

"ہم میں کوئی بھی بات ایسی نہیں پائی جاتی تھی جو طوائف زادیوں کا خاصا ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ باتیں بھی ہم میں تھیں جو کوٹھے کے اصولوں کی منافی کرتی تھیں۔ مثلاً ہم خوب صورت نہیں تھے، رکھ رکھاؤ کا ڈھنگ بھی ہمیں نہیں آتا تھا، ہماری آواز میں وہ لوچ اور سریلا پن نہیں تھا جس کی بدولت سامعین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہم میں سادگی اور معصومیت کا ایسا عنصر موجود تھا جسے دیکھنے کے بعد بچپنے کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ہم پانچ وقت کے نمازی اور تہجد گزار بھی تھے۔ ہماری والدہ محترمہ جنہیں عام وخاص تائی اماں کے نام سے مخاطب کرتے تھے انہیں ہماری عادتیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ وہ ہمارے رکھ رکھاؤ، زیب تن کپڑوں اور مصنوعی زیورات پر بہت زیادہ دھیان دیا کرتی تھیں لیکن زرق برق کپڑے اور چمکتے ہوئے زیورات پہن لینے سے اگر شکل وصورت میں تبدیلی پیدا ہوسکتی تو پھر کوئی بھی امیر وکبیر لڑکی بدصورت نہ ہوتی۔

یہی وہ المیہ تھا جس کی بدولت آتش کدے کی ساکھ میں دن بدن کمی واقع ہوتی چلی جارہی تھی۔ مجبوراً تائی اماں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ہمارے ہاتھ پیلے کرنے کے متعلق سوچنا شروع کردیا۔ وہ کسی ایسے شریف زادے کی منتظر تھیں جو خلاف توقع بازارِ حسن کا رخ کرتا اور ہمیں ہمارے معیوب ترین ماحول میں پرورش پانے کے باوجود بھی بیاہ کر اپنے گھر لے جاتا۔ ہم ایسا سوچنے کو بھی بے وقوفی قرار دیتے تھے لیکن قسمتوں کے فیصلے تو آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ ہمارے سوچنے سمجھنے کی بھلا کیا حیثیت...... ہوتا وہی ہے جو اوپر والا چاہتا ہے۔ انہی دنوں نہ جانے کیسے اور کیوں کر دہلی شہر کے ایک مشہور رئیس زادے کا کوٹھے کے سامنے سے گزر ہوا۔ ان کے رتبے اور وقار کے لحاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ان کی ستم ظریفی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے قدم بے اختیار کوٹھے کی جانب اٹھنے لگے۔ کوٹھے کی مفلوک زدہ حالت کو نظر انداز کرنے کے بعد جب رئیس زادے نے اپنے دوست کے ہمراہ ہال کمرے میں قدم رکھا تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ واپس مڑنا بدتہذیبی کے زمرے میں آتا تھا۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ایک جانب براجمان ہوگیا۔ تائی اماں اس کے آگے نہایت احترام کے ساتھ تقریباً بچھی جارہی تھیں۔ سازندے اور کارندے بلائے گئے۔ ہمیں زرق برق کپڑے زیب تن کرائے گئے پھر باقاعدہ مجرے کا آغاز کردیا گیا۔

مجرا شروع ہوتے ہی ہمیں رئیس زادے کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ ان کے چہرے پر واضح اکتاہٹ کے تاثرات موجود تھے اور جب مجرا اپنے عروج پر پہنچا تب ہال کمرا رئیس زادے کے خراٹوں سے گونجنے لگا۔ تائی اماں نے ناگوار نگاہوں کے ساتھ سامنے بیٹھے رئیس زادے اور اس کے دوستوں کی جانب دیکھا پھر سازندوں کو ساز سمیٹنے کا حکم دینے کے بعد ہمارے ہمراہ اوپری کمروں کی جانب چلی آئیں۔ انہیں دوران مجرا رئیس زادے کا یوں ماحول کو نظر انداز کرنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ انہوں نے تلخ لہجے میں ہمیں کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کہا اور خود جھنجلاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب چلی گئیں۔ آگے کی مختصر آپ بیتی رئیس زادہ عالی الدین کی زبانی سناتی ہوں تاکہ آپ کو بھی اس کنیز کی آپ بیتی میں دلچسپی محسوس ہو۔ مجھ سے جب اس رئیس زادے کا سامنا ہوا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

"رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی۔ ہال کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میرے دوست گاؤ تکیے کے ساتھ کمر لگائے اونگھنے میں مصروف تھے۔ اوپری منزل کا ایک رہائشی کمرا روشن تھا۔ کوئی دردبھری آواز میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت کررہا تھا۔ میں نے دوبارہ اپنے دوستوں کی جانب دیکھا۔ وہ باقاعدہ اونگھنے کی حالت میں اردگرد کے ماحول سے تقریباً بے گانہ تھے۔ رہائشی کمروں کی جانب جانا معیوب ترین عمل کا اختیار رکھتا تھا لیکن میں بے اختیاری کے عالم میں اوپری جانب چل دیا۔ اوپری منزل میں قطار کی صورت میں تین کمرے موجود تھے۔ دو کے دروازے بند تھے۔ تیسرا کھلا ہوا تھا۔ روشنی اسی کمرے سے باہر آرہی تھی۔ میں دبے قدموں



کمرے کی جانب چلا آیا۔ آواز کی شدت میں اضافہ ہوا۔ میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ تب رات کو مجرا کرنے والی لڑکی کو زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھا۔ اس کے سامنے لکڑی کی رحیل پر قرآن شریف کھلا ہوا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور سفید دوپٹے میں ملبوس تھی۔ اس کی نگاہیں رحیل پر موجود قرآن شریف کے اوراق پر مرکوز تھیں اور وہ نہایت دلجمعی اور بے خودی کے عالم میں تلاوت کررہی تھی۔

PakiBooks.site

میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ رات کو مجرے کے دوران رقص کرنے والی لڑکی نے مجھے تقریباً مایوس کر کے رکھ دیا تھا لیکن اس پہر قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہوئی لڑکی حیرت انگیز طور پر مجھے اپنے دل میں اترتی محسوس ہونے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہے۔ شاید ماحول کی تبدیلی میرے دل پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ مجرے کا عامیانہ ماحول پھیکا اور بے زار کن تھا۔ موجودہ ماحول میں پاکیزگی اور وقاریت کا عنصر نمایاں تھا یا پھر یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ اس عام سی لڑکی کے چہرے پر قرآن شریف کا عکس پڑ رہا تھا جو اسے عام چہروں سے ممتاز کرنے کا باعث تھا۔ جو بھی تھا اور جیسا بھی تھا میں دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو کر دروازے کی چوکھٹ کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ باقی ماندہ رات لڑکی کو تلاوت کرتے دیکھتے گزر گئی۔ صبح فجر کے قریب میں نے اپنے محل کا رخ کیا۔“

اس رات کے بعد میرے معمولات میں اس عمل کا اضافہ ہوگیا کہ میں ہر دن کو رات کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتا اور رات ہوتے ہی بے چین قدموں کے ساتھ آتش کدے کا رخ کرتا، مجرے کا آغاز ہوتا۔ میں آواز کو سننے کے بجائے زرغونا کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کو زیادہ ترجیح دیتا۔ رات کے ایک بجے مجرے کا اختتام ہوتا۔ تین بجے زرغونا تہجد کی نماز کی تیاری کرتی۔ تب میں اس کے کمرے کی چوکھٹ کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ تہجد پڑھنے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے قرآن شریف کی تلاوت کا آغاز کرتی اور میں عقل و فہم سے مبرا ہو کر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا جاتا۔ تائی اماں کی جہاندیدہ نگاہیں معاملے کی گہرائیوں کو باخوبی جانچ چکی تھیں۔ خوشی ان کے چہرے سے چھلکتی ہوئی صاف دیکھی جاسکتی تھی لیکن شاید وہ پہل کرنے سے گریزاں تھیں۔ وہ ایک لڑکی کی ماں تھیں اور ماں کو ہمیشہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ ان باتوں کے باوجود بھی انہوں نے میری غیر مہذبانہ باتوں کو محسوس کرتے ہوئے منع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ زرغونا نے بھی معاملے سے آگاہی رکھنے کے باوجود مجھے منع کرنے کی قطعی کوشش..... نہیں کی۔ شاید تائی اماں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ دن انہی معمولات کے دوران گزرنے لگے۔ مجھے جو بھی فیصلہ کرنا تھا سوچ سمجھ کر کرنا تھا لیکن سوچنے سمجھنے کی حس تو تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کٹھ پتلی کی مانند بے اختیار ہو چکا تھا اور میرے جسم پر بندھی ہوئی ڈور کا آخری سرا زرغونا کے ہاتھوں میں موجود تھا۔

دسمبر کے اوائل کا ذکر ہے، میں نے حسب معمول مجرا دیکھنے کے بعد تائی اماں سے اکیلے میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے کوئی بھی جواب دیے بغیر سازندوں کو کمرے سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔

میں مسکراتے ہوئے ہمکلام ہوا۔ یہاں پر بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اوپر کے کمرے بہتر رہیں گے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ورنہ...... تائی اماں میری بات درمیان میں کاٹتے ہوئے شرمندہ لہجے میں بولیں۔

جناب عالی! جو آپ کو مناسب لگے۔ میں جاہل گنوار عورت ان باتوں کے متعلق بھلا کیا جانوں۔ آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ہم تو آپ کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ جہاں کہیں گے وہیں بات چیت کرلیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تائی اماں کے ہمراہ رہائشی کمرے میں چلا آیا۔ گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگانے کے بعد میں نے سنجیدہ لہجے میں بات چیت کچھ یوں شروع کی۔

”مجھے اس وقت شدت کے ساتھ اپنے ماں باپ کی کمی کا احساس ہو رہا ہے، اگر وہ ہوتے تو بات چیت کو مناسب ڈھنگ کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے چونکہ وہ نہیں ہیں اس لیے مجبوراً مجھے خود ہی بات کرنی پڑ رہی ہے۔ گھما پھرا کر بات کرنا میری فطرت کے منافی ہے اس لیے صاف گوئی کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں زرغونا سے شادی کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کو اعتراض ہو تو بلا جھجک انکار کر دیجیے گا۔ اقرار کی صورت میں میں تمام عمر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ حتمی فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔“

میری بات سن کر تائی اماں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ شاید انہیں گلے میں پھندا لگتا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے ان کی حالت کو محسوس کرتے ہوئے ایک جانب رکھے ہوئے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گلاس تائی اماں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا۔ تائی اماں نے ایک ہی سانس میں گلاس کو حلق میں انڈیلا اور حواس کچھ بہتر ہو جانے کے بعد خوشی سے معمور لہجے میں بولیں۔

”جناب عالی! مجھے اپنی قوت سماعت پر یقین نہیں آرہا۔ نہ جانے آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ مجھے اس کا صحیح

جشنِ آزادی و ساون نمبر کی مناسبت سے اگست 2018ء کا خوب صورت پاکیزہ



ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ناول کی چونکا دینے والی اقساط

دردانہ نوشین خان نے چھیڑا اچھوتا موضوع اپنے نئے منی ناول صفہ میں

حیا بخاری کے پُراثر قلم سے نکلا ایک یادگار ناولٹ...... محبت لفظ ہے لیکن

تہجد...... قیام اللیل

کے موضوع پر پڑھیے...... شمع ہدایت کے سلسلے

میں اختر شجاعت کی زبردست تحقیق

اس کے علاوہ

نامور قلم کاروں کی متاثر کن تحریریں جن میں رفاقت جاوید، پروین عذرا تشنہ، اسما طاہر، نگہت غفار، افراح سکندر، فرحین اظفر و دیگر شامل ہیں

دلچسپ معلوماتی، تفریحی و اصلاحی مستقل سلسلے جن میں حسن افزا نسخے، مزیدار کھانوں کی تراکیب و مسحور کن شاعری بھی شامل ہے اور یہ سب آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے ہی تو ہے

PakiBooks Site

مفہوم سمجھائی دے رہا ہے یا پھر نہیں...... جو بھی ہے آپ ایک دفعہ پھر سنجیدگی کے ساتھ معاملے پر غور کر لیجیے تو بہتر ہوگا۔ کہاں میری لڑکی زرغونا...... ایک طوائف زادی اور کہاں آپ شہر کے رئیس...... شریف اور معتبر خاندان سے تعلق رکھنے والے...... ہمارا آپ کے ساتھ ملاپ کسی لحاظ سے بھی برابری کرتا دکھائی نہیں دیتا۔''

میں مستحکم لہجے میں بولا۔ ''معاملے پر غور کرتے ہوئے مجھے تقریباً تین ماہ سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میرا فیصلہ حتمی ہے۔ مجھے صرف آپ کی رضامندی سے سروکار ہے۔ اس کے علاوہ مزید کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا ہوں۔''

تائی اماں بولیں۔ مجھے بھلا کیوں اعتراض ہونے لگا۔ میرے لیے تو یہ بات کسی اعزاز سے کم حیثیت نہیں رکھتی کہ میری لڑکی شہر کے معتبر اور شریف گھرانے کا ایک فرد بننے والی ہے۔ اگرچہ کچھ خدشات مجھے پریشان کر رہے ہیں۔

''کیسے خدشات آپ کھل کر بات کیجیے۔ میں انہیں دور کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

تائی اماں سنجیدگی کے ساتھ ہمکلام ہوئیں۔ ''ہمیشہ سے بازارِ حسن کا دستور رہا ہے کہ پیسے والے لوگ بازارِ حسن کا رخ کرتے ہیں۔ اپنا دل بہلاتے ہیں اور صبح سب کچھ بھول بھال کر اپنی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ میری محدود زندگی کے دوران کتنے رئیس زادوں نے یہاں کا رخ کیا۔ بہت سوں نے طوائف زادیوں کے ساتھ بیاہ بھی رچایا۔ پھر دل بھر جانے کے بعد انہیں طلاق دے کر واپس بازارِ حسن میں پھینک دیا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''میں کسی حد تک آپ کی ذہنی کیفیت کے متعلق اندازہ لگا چکا ہوں لیکن پھر بھی آپ کے منہ سے سننے کو بہتر خیال کرتا ہوں۔ برائے مہربانی کھل کر خدشات کا اظہار کیجیے تاکہ ان کا سدباب کیا جاسکے۔ تائی اماں نے طویل سانس لیتے ہوئے ایک جانب پڑا ہوا گلاس اٹھایا اور آخری گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد میری جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے طوائف زادی کے بہتر مستقبل کا ثبوت درکار ہے۔''

''کیسا ثبوت؟'' میں نے پوچھا۔

''تحریری ثبوت...... اگر قاضی وقت کی مہر معاہدے نامے پر موجود ہو تب ان خدشات کا بخوبی ازالہ ہوسکتا ہے جو اس وقت میرے دماغ کو منتشر کیے ہوئے ہیں۔''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ''یعنی آپ ایک ایسے معاہدے نامے کی خواہ ہیں جس پر قاضی وقت کی مہر موجود ہو اب یہ بھی بتا دیجیے کہ معاہدہ نامے میں تحریر کیا ہو گا۔''

تائی اماں نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''جنابِ عالی! بات نہایت معیوب ترین ہے لیکن ایک طوائف زادی کی ماں ہونے کی بدولت مجبوراً مجھے گستاخی کرنی پڑ رہی ہے۔ مجھے معاف کیجیے گا لیکن معاہدے نامے کی رو کے مطابق آپ طوائف زادی کو طلاق نہیں دے سکیں گے۔ ہاں اگر طوائف زادی ایسا چاہے تب طلاق ہو سکتی ہے۔''

میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''یعنی شادی ابھی ہوئی نہیں ہے اور طلاق کی باتیں پہلے ہی ہونے لگیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے لیکن میں آپ کی ذہنی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کل ہی قاضی شہر کو آتش کدے میں لانے کی پوری کوششیں کرتا ہوں اور معاہدے نامے کی آخری رو میں اپنی جانب سے مزید اضافہ اس تحریر کی صورت میں کروں گا کہ اگر خدانخواستہ کبھی طلاق کی نوبت آتی بھی ہے تب میری جانب سے طوائف زادی اور آپ کے حق میں ایک جاگیر منسوب کردی جائے گی۔ جس پر صرف آپ دونوں کو اختیار حاصل ہوگا۔''

''تائی اماں نے مطمئن انداز میں سر ہلا کر بات چیت کا اختتام کردیا اور میں آتش کدے سے باہر نکل کر قاضی شہر کی رہائش گاہ کی جانب چل دیا تاکہ ضروری انتظامات کے لیے خصوصی کارروائی کی جاسکے۔''

اب تک آپ نے رئیس زادہ عالی الدین کی زبانی ان کی سرگزشت پڑھی۔ اب میں دوبارہ سے اپنی سرگزشت پر آجاتی ہوں کہ اگلے ہی دن رئیس زادہ عالی الدین، قاضی شہر کے ہمراہ آتش کدہ پہنچے۔ معاہدہ نامہ تحریر کیا گیا۔ تائی اماں کا انگوٹھا لگایا گیا۔ ہمارے دستخط لیے گئے اور قاضی شہر نے مہر لگا کر معاہدہ نامے کو حتمی صورت... اختیار دے دی۔ اگلے چند ایام کے دوران ہماری شادی کی مختصر تیاریاں کی گئیں پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مترادف شادی ہوگئی اور ہمارے ہمراہ تائی اماں بھی رئیس زادے کے محل میں چلی آئیں۔ تائی اماں ہماری زندگی کو مکمل صورت دینے کے لیے شطرنج کی بازی کی مناسبت سے بہت سوچ سمجھ کر چال چل رہی تھیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ ہوتا وہی کچھ ہے جو نصیب میں لکھ دیا گیا ہوتا ہے۔

رئیس زادہ عالی الدین شادی کے بعد نہایت اچھے اور باکردار شوہر ثابت ہوئے۔ ہماری ہر خواہش ابھی ہمارے دماغ میں گردش کر رہی ہوتی تھی کہ اسے پورا کر دیا جاتا۔ ایک سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا لیکن ہم ماں نہیں بن سکے۔ تائی اماں کی فراخ پیشانی پر فکرانگیز لکیروں کا جال پھیلنے لگا لیکن ہمیں اور رئیس زادے کو چنداں فکر نہیں تھی۔ ہم اپنے حال میں مست تھے تب ایک دن تنہائی میں موقع دستیاب ہوتے ہی تائی اماں ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ بے پروائی کی حد ہوتی ہے۔ شوہر پر اتنا بھی کیا اعتبار کرنا کہ آنے والے وقت کی منصوبہ بندی سے بھی انحراف کر دو یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ ہم نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔ آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں ہم اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں پائے۔

تائی اماں غصیلے لہجے میں بولیں۔ ''ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہونے کو آیا لیکن تمہاری گود ابھی تک سونی ہے اور اگر اگلے سال بھی گود ہری نہ ہو پائی تو وہ تمہارے اوپر سوتن لایا ہی لایا۔''

ہم نے پریشان نگاہوں کے ساتھ تائی اماں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر آپ ہی مشورہ دیجیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

تائی اماں بولیں۔ ''دلی کے بازار میں آج کل حکیم نجف کا بہت چرچا ہے۔ وہ نبض دیکھ کر بیماری کی تشخیص کر لیتا ہے، نوکر کو بھجوا کر نشست مخصوص کروا لو۔'' ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔'' اور نوکر کو بازار کی جانب روانہ کر دیا۔ نشست مخصوص کروائی گئی پھر دوسرے دن ہم تائی اماں کے ہمراہ حکیم نجف کے مطب میں چلے آئے۔ نشست مخصوص ہونے کی بدولت ہمیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حکیم نجف باریش اور پتلی دبلی جسامت کا بوڑھا اور کام میں کھرا انسان دکھائی دیا۔ ہمارے آنے کی وجہ دریافت کرنے کے بعد اس نے ہماری نبض چیک کی۔

پھر چند لمحے کے طبعی معائنے کے بعد داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میں مرض کے متعلق اچھی طرح جان چکا ہوں۔ آپ دونوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک مختصری جراحی کے بعد زچہ صحت یاب ہو جائے گی۔ آپریشن پیچیدہ نہیں ہوگا۔ صرف پندرہ منٹ کے قلیل عرصے پر مشتمل ہوگا جسے میری ماتحت عورتیں میری سربراہی میں تکمیل دیں گے۔ اگر آپ دونوں کو منظور ہو تب کل شام

> میں نے تاریخ کی سب سے بڑی جنگ کو کئی برس بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جتنی سیاہی جنگ کے بادلوں میں ہوتی ہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ جنگ کے اندھیرے گھپ اندھیرے ہوتے ہیں لیکن جتنی تیز اور خیرہ کرنے والی سفید روشنی سخت آزمائش کے دنوں میں زندہ قوموں اور باکردار افراد کے طرزِ عمل سے پیدا ہوتی ہے آپ اس کی طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ روشنی جب اتنی روشن ہو جائے کہ آپ اسے دیکھ بھی نہ سکیں تو اسے نور کہتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے: ''کہیں آپ مجھ سے مل کر صرف اس لیے مایوس تو نہیں ہوئے کہ میں اب کہکشاں کے رنگین جھولے پر جھولنے کو زندگی کا مقصد سمجھنے کی بجائے اس کا زیاں سمجھتا ہوں۔ بے مقصد زندگی ناشکری ہے، زندگی کا زیاں گناہ ہے، میں گناہ سے بچنا چاہتا ہوں۔''
>
> اقتباس: آوازِ دوست
>
> مرسلہ: نادر علی قزلباش۔ کراچی

پانچ بجے مطب میں تشریف لے آئیے گا۔ انشاء اللہ، اللہ بہتر کرے گا۔''

ہم دونوں واپس محل آئے۔ رئیس زادہ عالی الدین سے مشورہ کیا گیا اور رضامندی کے بعد دوسرے دن ہم اپنی والدہ کے ہمراہ مطب پہنچ گئے۔ مطب کے پیچھے حکیم نجف کی رہائش گاہ سے متصل کمرۂ جراحت موجود تھا جہاں ان کی ماتحت عورتیں کام کرتی تھیں۔ حکیم نجف کی زیرِ صدارت ان عورتوں نے ہمارا مختصر آپریشن کیا۔ جس کے بعد ہم پاؤں پر چلتے ہوئے محل واپس آگئے۔ کچھ ضروری ہدایات اور ادویات ہمراہ تھیں جنہیں ہم نے تقریباً ایک ماہ باقاعدگی کے ساتھ استعمال کرنا تھا۔ کچھ ادویات رئیس زادے کے لیے بھی تھیں۔ ہم دونوں نے تندہی کے ساتھ علاج شروع کردیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسرے مہینے ہی ہمارا پاؤں بھاری ہوگیا۔ رئیس زادہ عالی الدین اور ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ محل کے دروازے غریبوں کے لیے کھول دیے گئے۔ لنگر عام کردیا گیا۔ خیرات و زکوٰۃ کے سلسلے کی شروعات کی گئیں اور بظاہر زندگی مکمل ہوتی دکھائی دینے لگی لیکن ہماری محدود سوچ کے مطابق زندگی ابھی مکمل نہیں

PakiBooks.Site

ہوتی۔ مکمل تو صرف موت ہوتی ہے۔ ایک شام جب ہم اور تائی اماں کمرے میں اکیلے بیٹھے بات چیت کررہے تھے۔ تب ہم نے یونہی تائی اماں کو بتایا کہ ان دنوں ہم دونوں میاں بیوی کا محبوب مشغلہ فارغ اوقات کے دوران آنے والے بچے کا نام تجویز کرنا ہے اور یہ بات ہم نے حتمی طور پر محسوس کی ہے کہ رئیس زادہ ہمیشہ لڑکوں کے نام کا انتخاب کرتا ہے۔ لڑکیوں کے نام سے اسے دلچسپی محسوس نہیں ہوتی ہے۔

تائی اماں کی فراخ پیشانی پر ایک دفعہ پھر فکر انگیز لکیروں کا جال پھیلنے لگا۔ وہ پُرتفکر لہجے میں بولیں۔ ''اسے اپنی جائداد کا وارث چاہیے اور وارث ہونے کے لیے لڑکے کا ہونا ضروری ہے۔ تمہیں یقیناً ایسا ہی کرنا ہوگا۔''

ہم نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اب یہ تو ہمارے اختیار سے باہر ہے کہ ہم زبردستی لڑکے کی پیدائش کو یقینی بنائیں۔''

تائی اماں مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''میں مانتی ہوں کہ حقیقت کو بدلنا انسان کے اختیار سے باہر ہوتا ہے لیکن کوشش کرنے میں کچھ عیب نہیں۔ تم نوکر کو بھجوا کر حکیم نجف کے مطب میں نشست مخصوص کروالو۔ اس کے ہاتھوں میں خدا نے شفا رکھی ہے تو پھر دماغ میں اس مسئلے کا سبب بھی ضرور منتقل کیا ہوگا۔ ہم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نوکر کو آواز دی اور اسے بازار کی جانب روانہ کردیا۔

دوسرے دن ہم تائی اماں کے ہمراہ مطب پہنچ گئے۔ حکیم نجف نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ ہم دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب تائی اماں نے نہایت تفصیل کے ساتھ وجہ گوش گزار کردی۔ وجہ کے متعلق جاننے کے بعد حکیم نجف جھنجلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ناشکری کی انتہا ہے۔ پہلے اولاد نہ ہونے کی پریشانی تھی۔ جب خدا نے اولاد کا سبب بنانے کے بعد پریشانی دور کردی تب دوسری پریشانی اولاد نرینہ کے طور پر تم دونوں کے دماغوں پر حاوی ہونے لگی ہے۔ جاؤبی بی جاؤ۔ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے جس وجود نے دنیا میں سانس لے لی۔ اس کی صنف کو بدلنا کسی بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہوسکتا۔ خدا سے مانگنے کی عادت کو اپناؤ، جمعرات کے جمعرات قرآن خوانی کا سلسلہ عام کرو۔ اپنے گھر والوں کا صدقہ زیادہ سے زیادہ دینے کی کوششیں کرو۔ اس کے علاوہ میرے اور تمہارے اختیار میں مزید کچھ بھی نہیں ہے۔'' ہم دونوں اپنا سامان لے کر واپس محل میں چلے آئے۔ قرآن خوانی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ نماز تو ہم پانچ وقت کی پڑھتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد دو رکعت صلوٰۃ وحاجت پڑھنے کے بعد جو خدا کے حضور دعا مانگنا شروع کرتے، تب رات گئے تک مصلے پر ہی بیٹھ کر دعا مانگتے رہتے پھر وہ دن قریب آگیا جس کا رئیس زادہ عالی الدین کے علاوہ تائی اماں کو بھی شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ شہر کی مشہور دائی کو ہمارے کمرے تک محدود کردیا گیا۔ مختصر حفاظتی اقدامات کے علاوہ نوکرانیوں کی ایک فوج تھی جنہیں ہماری خدمت کے لیے کمرے کے اندر متعین کیا گیا تھا۔ دن تیزی کے ساتھ گزرنے لگے۔ پھر وہ دن آہی گیا جس کے سب منتظر تھے۔ یہاں سے آپ بیتی ایک دفعہ پھر رئیس زادہ عالی الدین کی جانب رخ کرتی ہے۔ تاکہ ہماری الجھی ہوئی داستان کو قارئین باآسانی سمجھ سکیں۔

مجھے شدت کے ساتھ اس وقت کا انتظار تھا جب میں باپ بنتا۔ مجھے اس بات سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا کہ نومولود کی ذات صنف نازک کا اختیار رکھتی ہے یا پھر صنف کرخت کی ذات کا۔ مجھے تو باپ بننے کی خوشی زیادہ تھی۔ دائی کے اندازے کے مطابق جس رات ولادت ہونا ممکن تھی اس رات تمام نوکرانیوں کو کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ میں اور تائی اماں کمرے کے باہر موجود تھے۔ تائی اماں نے ہاتھوں میں تسبیح پکڑی ہوئی تھی جس کے دانے انتہائی تیزی کے ساتھ نیچے گررہے تھے۔ میں مصلے پر بیٹھا خدا کے حضور سجدہ ریز تھا۔ کمرے میں گھمبیر خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی کو توڑنے والی ہستی کا ظہور کچھ ہی دیر میں ممکن تھا۔ رات کے ساڑھے تین بجے کا عمل رہا ہوگا۔ جب گھمبیر خاموشی کو توڑتی ہوئی بچے کی آواز سے کمرے کا ماحول گونج اٹھا۔ تائی اماں کی تسبیح کے دانے گرنے کی رفتار میں یکلخت اضافہ ہوگیا۔ میں بے اختیار سجدے میں گرتا چلا گیا۔ کمرے کے اندر کی جانب نومولود کے رونے کی آواز کے ساتھ دائی کی حیرت بھری آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ پریشان لہجے میں زرغونا سے ہمکلام تھی۔ تھوڑی دیر بعد جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دائی کا حیرت زدہ چہرہ کمرے سے باہر نمودار ہوا۔ میں نے بے تابانہ انداز میں مصلے سے کھڑے ہونے کے بعد بے اختیار قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دائی کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

پھر بے چین لہجے میں پوچھا۔ ''زچہ و بچہ دونوں خیریت سے تو ہیں ناں؟''

دائی ہراساں لہجے میں بولی۔ ''میں نہیں بتا سکتی ہوں۔ مجھے تمام زندگی کے دوران ایسے حالات سے سابقہ نہیں پڑا۔ آپ خود اندر جاکر معلوم کرسکتے ہیں۔'' میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اس کے ہاتھوں کو چھوڑا اور تیز قدموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرا کسی مقبرے کی صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ لکڑی کے خوب صورت پالنے کے درمیان نومولود سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ زرغونا سفید چادر کو سر تک اوڑھے پلنگ پر لیٹی ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر نومولود کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ ہولے ہولے سانس لے رہا تھا۔ سب کچھ توقع کے مطابق تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں خلاف توقع ماحول پر افسردگی کی چادر تنی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے زرغونا سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں خوشی کے ان لمحات کے دوران افسردگی کی وجہ دریافت کرسکتا ہوں۔''

زرغونا نے جھٹکے کے ساتھ چادر کو چہرے سے ہٹا دیا۔ اس کا چہرہ سوگوار بیوہ سے مشابہہ رکھتا تھا جس کے شوہر کو پہلی رات ہی قتل کردیا گیا ہو۔ پھر اس نے روتے ہوئے جو وجہ بیان کی۔ اس کے متعلق سننے کے بعد مجھے اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹتا محسوس ہوا اور میں سو کر دونوں ہاتھوں میں تھام کر پلنگ کے کونے میں بیٹھ گیا۔ اس لیے کہ وہ نہ تو لڑکا تھا اور نہ لڑکی ایسے بچے صرف ندامت کا باعث ہیں بلکہ تشنہ کا باعث بھی ہیں پھر اس بچے کی ہیئت بھی عجیب تھی۔ پورا جسم سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

کافی دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ''میں اس منحوس کے وجود کو حویلی میں برداشت نہیں کرسکتا اگر ہوسکے تو اسے کمرے سے دور کہیں بھجوا دو۔''

ہم زخمی لہجے میں بولے۔ ''اس کے ننھے وجود کو ماں کے دودھ کی ضرورت ہے، ہم اسے اپنے سے علیحدہ نہیں کرسکتے ورنہ یہ مرجائے گا۔''

رئیس زادہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ تمام رات اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔ وہ نومولود کے وجود کو اپنے کمرے میں برداشت کرنے سے منکر تھا اور ہم اسے اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہم روانی کے عالم میں کہتے چلے جارہے تھے۔

ایک مجبور ولاچار ماں ہونے کے باوجود بھی ہم اسے اس کی تمام کمزوریوں کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں تو پھر آپ کیوں نہیں۔ آپ تو شہر کی مشہور ہستی کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں بزدلی کا ثبوت کیوں دے رہے ہیں۔

رئیس زادہ بپھرے ہوئے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے طیش میں آکر ہمارے ہاتھوں سے بچے کو چھیننے کی کوشش کی لیکن بچے کے وجود پر ہماری گرفت مضبوط تھی۔ وہ بچے کو چھین نہیں پایا۔ جھنجلائے انداز میں اس نے ہمارے چہرے پر تھپڑوں کی برسات کردی۔ ایسا ہماری ازدواجی زندگی میں پہلی دفعہ ہوا تھا۔ ہم نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ رئیس زادے کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہاں غم و غصے کے علاوہ ہمیں نفرت کی ایسی لہر اٹھتی دکھائی دی جسے دیکھ کر بے اختیار ہمیں اپنے جسم میں جھرجھری اٹھتی محسوس ہوئی۔ رئیس زادے نے اچانک ہی ہمارے ہاتھوں سے نومولود کے ننھے وجود کو چھین لیا۔ پھر غراتے ہوئے بولا۔ ''یہاں یہ رہے گا یا پھر میں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور اگر تم نے میرے فیصلے کے خلاف اسے یہاں رکھنے کی کوشش کی تب میں اسے گلا دبا کر ہلاک کردوں گا۔''

میں نے کپڑے میں لپٹے ہوئے وجود کے ننھے گلے کو تھامنے کی کوشش کی۔ زرغونہ کا متحرک جسم اچانک ہی ساکت ہوگیا۔ آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔

پھر سپاٹ چہرے سے مری ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہمیں طلاق چاہیے۔''

میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ ہمارے چہرے کی جانب دیکھا۔ ہمارا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے بچہ اسے تھما دیا۔ پھر مطمئن لہجے میں ہمکلام ہوا۔ ''معاہدے نامے کی رو کے مطابق میں تمہیں طلاق نہیں دے سکتا ہوں۔ تم نے خود طلاق مانگ کے معاہدے نامے کی آخری رو پر اثبات کی مہر ثبت کردی ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں اور اپنے وعدے کے مطابق ایک جاگیر تمہارے اور تمہاری ماں کے نام کرتا ہوں۔ تم بچے کے ہمراہ وہاں جاسکتی ہو۔''

میں نے تلخ لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ زرغونہ نے بے اختیار بچے کے ننھے وجود کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اس نے دولت و امارت کو ٹھوکر مار کر ماں ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔

▲▲▲

PakiBooks.Site

خوش اخلاق

محترم معراج رسول
السلام علیکم
ہمارا یہ شہر کراچی اپنے آپ میں بے مثال ہے۔ اس شہر میں ایسے ایسے عجوبہ روزگار ملتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انتخاب احمد بھی ایک ایسا ہی عجیب و غریب کردار ہے جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو اس کا تاثر کچھ اور تھا مگر جب اس کے چہرے کا ملمع اترا تو میں حیران رہ گیا۔ اس کی خوش اخلاقی کا پردہ چاک ہوا تو میں دنگ رہ گیا۔ انسان ایسا بھی ہوتا ہے، یہ جان کر میرے اندر غم و غصے کا طوفان سا اٹھ گیا تھا۔
رؤف اسلم آرائیں
(کراچی)

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے کردار دیکھے ہیں۔

میں نے ان کرداروں پر کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کرداروں میں طرح طرح کے لوگ تھے جھکی، سنکی، بااصول، باکردار، بدمعاش، عجیب حرکتیں کرنے والے اور عجیب عادتیں رکھنے والے۔

یہ کردار بھی ایک ناول کی طرح تھا۔ پڑھتے جایئے اور حیران ہوتے جایئے۔ کمال کے لوگ ہوتے تھے۔ ایسے لوگ ہمیشہ یاد رہ جاتے ہیں۔

یہ لوگ ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں۔ یہ خواب دیکھنے اور خواب دکھانے والے لوگ ہوتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اب ایسے لوگ نہیں ہوں گے، یقیناً ہوں گے لیکن اب اتنی فرصت کہاں ہے کہ ایسے کرداروں کو تلاش کیا جائے۔ بقول فیض "دنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کردیا۔ تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے"

ان ہی بے شمار کرداروں میں ایک صاحب جی تھے۔

ایسے مزاج کا انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ قدرے بھاری جسم رکھنے والے۔ آواز میں نرمی، تہذیب، شائستگی سب کچھ ہوتا تھا۔

ہمیشہ کرتہ شلوار میں دکھائی دیے۔ پان کا ایک چھوٹا سا ڈبہ ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔

ان سے میری ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔

وہ ہوٹل کراچی کے بندر روڈ کا ہوٹل تھا۔ اس زمانے میں کوئٹہ ہوٹل کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا۔ چائے باقاعدہ قسم کے ہوٹلوں میں ملتی تھی اور سلیقے کے ساتھ پیش کی جاتی۔ چینی اور دودھ الگ الگ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں چھلنی بھی ساتھ ہوا کرتی۔

اب چائے خانوں میں ایسی شائستگی کہاں رہی۔ اب تو آواز لگتی ہے۔ "اوئے دودھ پتی کی چینک بھیج دے۔"

اور غلیظ چھوٹی سی کیتلی اور گندی پیالیاں سامنے لاکر رکھ دی جاتی ہیں۔ پینا ہو تو پیو ورنہ جہنم میں جاؤ۔ ہوسکتا ہے ایک دو ایسے ریستوران بچ گئے ہوں لیکن وہ کم از کم ہمارے اردگرد نہیں ہیں۔

بہرحال تو میں بات اس ہوٹل کی کر رہا تھا جس میں چائے پینے داخل ہوا تھا۔

چائے پی ہی رہا تھا کہ کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ ایک آدمی ایک دوسرے آدمی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

"یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے جناب، وہ غرض مند تھا، کوئی مجبوری اسے یہاں تک لے آئی ہوگی۔ آپ نے جھڑک کر اچھا نہیں کیا۔"

باتیں سننے والے آدمی نے بولنے والے کی طرف دیکھا۔ "ارے بھائی چکر کیوں دے رہے ہو، مدد کرنی ہو تو کردو، میں نے سب کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ نے ٹھیکا نہیں لیا لیکن کم از کم اچھی زبان اور نرمی کا ٹھیکا تو آپ کے پاس ہے۔"

"اچھا بھائی اچھا غلطی ہوگئی۔ اب پیچھا چھوڑ دو۔"

باتیں سنانے والا آدمی خاموش ہو کر ایک میز کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اس شخص میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ حقیقتاً کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی جس نے اس کو بھڑکا دیا تھا۔

میں کچھ سوچ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جناب! ایک بات بتائیں۔ آپ ان صاحب سے کیوں ناراض ہو رہے تھے۔"

"اب کیا بتاؤں۔" اس آدمی نے کہا۔ "یہ میری غلطی ہے۔ میں ایسے موقعوں پر خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ پتا نہیں کیوں بدن میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی ہے۔"

"کیا بتانا پسند کریں گے کہ ہوا کیا تھا؟"

"بھئی میرا اصول ہے کہ اگر آپ کے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو نرمی سے معذرت کردو۔ اسے جھڑکنے اور حقیر سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بات اتنی تھی کہ ایک بچہ ضرورت مند ان کی میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ انہوں نے بہت بری طرح اسے جھڑک کر بھگا دیا۔ بس یہ بات مجھے بری لگ گئی ورنہ نہ تو میں ان کو جانتا ہوں اور نہ ہی اس ضرورت مند کو۔"

"جناب! بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "آپ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں۔"

"مجھے انتخاب کہتے ہیں۔" اس نے مصافحہ کیا۔ "بات یہ ہے کہ مجھے وہ لوگ بہت برے لگتے ہیں جو ضرورت مندوں کو جھڑک دیتے ہیں۔ ارے بھائی اگر کچھ نہیں دینا ہے تو نرمی سے معذرت کرلو۔ وہ کون سا تمہارے پیچھے ڈنڈا لے کر کھڑا ہو جائے گا۔"

"یہ بات تو ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "آپ واقعی ایک نیک انسان ہیں۔"

"بھائی آپ کا نام کیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"فراز نام ہے میرا۔" میں نے اپنا تعارف کروایا۔

"فراز صاحب! بات یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک اصول بنا رکھا ہے کہ دوسروں کے کام آتے رہو۔ خوشیاں تقسیم کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ تقسیم کرتے رہو پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارے حصے کی خوشیاں تمہیں خود بخود مل جائیں گی۔"

"بہت زبردست نظریہ ہے آپ کا۔" میں نے کہا۔

"ویسے آپ کا مشغلہ کیا ہے۔"

"بھائی ایک دو این جی اوز کے ساتھ وابستہ ہوں۔" اس نے بتایا۔ "جہاں تک ممکن ہے دوسروں کے کام آیا کرتا ہوں۔"

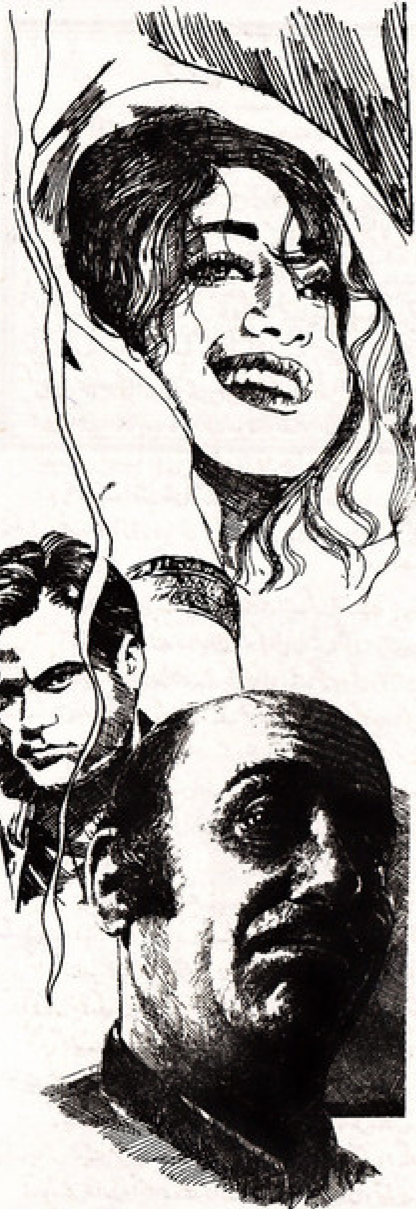
"ہاں صاحب، آپ جیسا آدمی ایسے کام کرسکتا ہے، خوش رہیں۔"

اس سے کچھ دیر گپ شپ ہوتی رہی پھر ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ سبزی منڈی کے پاس کہیں رہتا ہے۔

میں اس ملاقات کو بھول جاتا لیکن ایک دن پھر وہ صدر میں مل گیا۔

کتابیں تلاش کرنا میری ہابی رہی ہے۔ میں عام طور پر اردو بازار یا صدر کی طرف کتابوں کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔

اس دن بھی میں کسی کتاب کی تلاش میں تھا کہ انتخاب مل گیا۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملا تھا۔ "ارے بھائی فراز صاحب! کیا آپ بھی کتابوں کے بیمار ہیں؟" اس نے پوچھا۔



"جی جناب، شروع سے۔" میں نے بتایا۔

"چلیں یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ اپنا بھی یہی مشغلہ ہے چلیں کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

PakBooks.Site

دنیا کی سب سے چھوٹی سلطنت

کنگڈم آف ٹاڈلرا دنیا کی سب سے چھوٹی سلطنت ہے۔ ایک ایسی سلطنت جس میں کل 11 لوگ رہتے ہیں، وہ بھی پارٹ ٹائم۔ وہاں کا بادشاہ اپنی کشتیاں اور ایک ریستوران خود چلاتا ہے۔ یہ سلطنت اٹلی کے صوبے سارڈینیا کے پاس بحیرہ روم میں واقع ہے۔ یہ ایک انتہائی چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس کی کل طول و عرض پانچ مربع کلومیٹر ہے۔ اس سلطنت کے بادشاہ کا نام انتونیو برتلونی ہے۔ ایک بادشاہ کے طور پر انھیں صرف مفت کھانے کی سہولت میسّر ہے۔ انتونیو برتلونی کے مطابق ان کے پردادا کے پردادا، گسیپ برتلونی 1807 میں دو بہنوں سے شادی کر رکھی تھی لیکن جیسے ہی دوسری شادی کا راز کھلا وہ اٹلی سے فرار ہو گئے۔ اس وقت اٹلی کا وجود بطور ایک ملک نہیں تھا، بلکہ اس کا صوبہ سارڈینیا ایک مختلف سلطنت کے طور پر آباد تھا۔ یہاں دو شادیاں کرنا منع تھا۔ اسی لیے گسیپ برتلونی بھاگ کر اس جزیرے پر آ گئے۔ وہ جینوا شہر کے رہنے والے تھے۔ گسیپ کو جلد ہی اس جزیرے پر پائی جانے والی سنہرے دانتوں والی بکریوں کا پتا چلا کہ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کی انوکھی بکریاں ہیں۔ تو اس نے بکریوں کی تشہیر شروع کر دی ان بکریوں کا تذکرہ اٹلی تک پہنچا تو سارڈینیا کے بادشاہ کارلو البرٹو ان بکریوں کا شکار کرنے کے لیے ٹاڈلرا جزیرے پر آئے۔ سارڈینیا کے بادشاہ البرٹو ان جزائر پر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ وہ سارڈینیا کے بادشاہ ہیں۔ اس کے جواب میں تعارف کرایا پاؤلو نے کہا کہ وہ ٹاڈلرا کے بادشاہ ہیں۔ ٹاڈلرا میں تین دن گزار کر کارلو البرٹو جب اپنے ملک واپس آئے تو وہاں سے ایک فرمان جاری کر کے کہا کہ ٹاڈلارا، سارڈینیا کی سلطنت کا حصہ نہیں ہے۔ اس پاؤلو برتلونی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس جزیرے پر اس وقت کل 33 لوگ رہتے تھے۔ تو پاؤلو ان 33 لوگوں کے بادشاہ ہو گئے۔ اپاؤلو نے مرنے سے پہلے ایک شاہی قبرستان بنوایا۔ انھوں نے وصیت کی کہ انھیں جب دفنایا جائے تو ان کی قبر پر ایک تاج بھی لگایا جائے۔ دلچسپ بات یہ کہ پاؤلو برتلونی نے جیتے جی کبھی تاج نہیں پہنا تھا۔ بعد کے دنوں میں ٹاڈلرا کے بادشاہوں کے قصے پورے بحیرہ روم میں پھیل گئے۔ 1962 میں یہاں نیٹو کا فوجی اڈا بننے کے بعد اس چھوٹی سی سلطنت کی خود مختاری ختم ہو گئی۔ لیکن اٹلی نے کبھی بھی باضابطہ طور پر ٹاڈلرا کو اپنا حصہ نہیں بنایا۔ ٹاڈلرا کے بادشاہ انتونیو اور ان کے خاندان کے لوگ اٹلی سے اس جزیرے تک کے لیے فیری چلاتے ہیں۔ بڑی تعداد میں سیاح یہاں آتے ہیں۔ ان سیاح کو یہاں کی بکریاں اور نا پید ہونے والے باز کی ایک نسل کی کشش کھینچ لاتی ہے۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف، ملتان

PakiBooks.Site

ہم ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے چائے اور بسکٹ وغیرہ کا آرڈر دیا تھا۔ پھر ہمارے درمیان ادب کے حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔

اس دن پتا چلا کہ اس کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔

اس دن ہمارے درمیان کچھ ذاتی باتیں بھی ہوئیں۔

اس نے بتایا۔ ”فراز صاحب میری بیوی ایک یتیم و یسیر عورت ہے۔ ماں باپ نہیں ہیں اس کے۔ صرف دو بہنیں ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں اور میں ہی ان کی کفالت بھی کرتا ہوں۔ جو بھی میرے بس میں ہو۔“

”یہ تو بہت بڑی نیکی کا کام کر رہے ہیں آپ۔“

”جی جناب! اس قسم کی نیکیاں کام آیا کرتی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے بھی ہمارے غریب خانے بھی تشریف لائیں۔ آپ سے بے تکلفی تو ہو چکی ہے۔“

”بے تکلفی نہیں انتخاب صاحب، دوستی۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”آپ جیسے انسان کو دوست بنا کر خوشی ہوتی ہے۔“

”ارے صاحب! کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ میری کیا حیثیت ہے۔ ایک عام سا انسان ہوں۔“

”یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا، ویسے میری نظر میں آپ ایک خاص انسان ہیں۔“

”میں آپ کو اپنا ایڈریس سمجھائے دیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”بہت آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔ ویسے عام طور پر اتوار کا دن میں گھر پر ہی گزارتا ہوں۔“

اس نے اپنا ایڈریس ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔

اس نے چائے کے دوران پوچھا۔ ”فراز صاحب! آپ کی شادی تو ہو گئی ہو گی۔“

”جی نہیں ابھی تک اس سعادت سے محروم ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”چلیں وقت آنے پر وہ بھی ہو جائے گی۔“

کچھ دیر اور باتیں ہوئیں پھر ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

ایک دو اتوار گزارنے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ انتخاب کے گھر چلا جائے۔ اس اتوار کو کہیں جانا نہیں تھا اور نہ ہی کوئی کام تھا اس لیے میں نے انتخاب سے ملاقات کا پروگرام بنا لیا۔

ایڈریس واقعی بہت آسان تھا۔ اس نے بہت تفصیل سے سمجھا دیا تھا اس لیے میں کسی شواری کے بغیر اس کی گلی تک پہنچ گیا۔

اس گلی میں پہنچا تو وہاں ایک تماشا لگا ہوا تھا۔

کچھ لوگ جمع تھے اور انتخاب ان کے درمیان کھڑا ہوا چیخ رہا تھا اور ایک دوسرا آدمی انتخاب کو گالیاں دے رہا تھا۔

محلے والوں نے میرے سامنے اس جھگڑے کا خاتمہ کروا دیا۔

اسی وقت انتخاب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ ”ارے فراز صاحب، آپ کس وقت آئے۔“

”بس ابھی آیا ہوں اور یہاں آپ کا شاید جھگڑا ہو رہا تھا۔“

”جھگڑا ہی سمجھ لیں۔“ اس نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ اس محلے میں ایک پاگل عورت رہتی ہے۔ بے چاری کو اپنا ہوش نہیں ہے۔ اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔ تو آج بھی ایسا ہی ہوا تھا کہ ایک بچے نے پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا۔ یہ اتفاق ہے کہ میں بھی گلی میں تھا۔ فوراً اسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جا کر اس کی مرہم پٹی کروائی اور واپس آ کر اس بچے کو ڈانٹنے لگا کہ اس کے والد محترم لڑنے کے لیے آ گئے کہ ان کے بچے کو کیوں ڈانٹا گیا۔“

”ارے یہ تو بہت غلط سی بات ہوئی۔“

”جی ہاں خود سوچیں کیا اس پاگل عورت کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ اگر خدا کی مرضی سے اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔“

”انتخاب صاحب! آپ واقعی ایک بڑے انسان ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ارے نہیں صاحب، ایسا کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔“ اس نے کہا۔ ”میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو...... خیر چھوڑیں اب تو یہ جھگڑا ختم ہوا آئیں گھر چلتے ہیں۔“ وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔

چھوٹا سا گھر تھا لیکن بہت سلیقے سے سجا ہوا، بیٹھک میں آرائش کی ایسی چیزیں تھیں جن سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب گھر میں بنائی گئی ہیں۔

میں ستائشی نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ”فراز صاحب! یہ آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں نا، یہ میری دونوں سالیوں نے بنائی ہیں۔“

”واہ بہت خوب صورت ہیں۔“ میں نے تعریف کی۔

”یہ بہت بڑا آرٹ ہے۔“

”جی ہاں اور وہ دونوں آرٹ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ آپ تشریف رکھیں پلیز۔“

مجھے بٹھا کر وہ اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ دبلی پتلی سی، اگرچہ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن اس کے نقوش بہت تیکھے تھے۔

”فراز صاحب! یہ میری بیوی یعنی شریکِ حیات ہیں، فرزانہ۔“ اس نے تعارف کروایا۔

اس کی بیوی نے بڑے ادب سے سلام کیا تھا۔

پھر انتخاب نے اپنی بیوی سے میرا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ”فراز صاحب! بہت زبردست آدمی ہیں، شاعری بھی کرتے ہیں اور میری طرح ان کو بھی کتابوں کا شوق ہے۔“

”بھائی آپ کا کیا مشغلہ ہے۔“ میں نے پوچھ لیا۔

”کوئی خاص نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دن بھر گھر کے کاموں میں الجھی رہتی ہوں۔ البتہ میری دونوں بہنیں ہینڈ ورک کرتی رہتی ہیں۔“

”ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اتنی دیر میں ایک لڑکی ہاتھ میں ٹرے لیے داخل ہوئی۔ اس میں چائے کے ساتھ ساتھ پکوڑے بھی تھے۔ وہ بھی سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی تھی۔

”انتخاب صاحب! یہ آپ نے کیا تکلف کر دیا۔“ میں نے پکوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”بس چائے کافی تھی۔“

”ارے بھائی، یہ تکلف میں نے نہیں ریحانہ نے کیا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”یہ فرزانہ سے چھوٹی ہیں۔ ان سے

چھوٹی رضوانہ ہے۔ وہ آرہی ہوں گی۔“

وہ شخص جتنے احترام اور سلیقے کے ساتھ اپنی سالیوں کا ذکر کر رہا تھا، اس سے ہی اس کے اندر کے مہذب انسان کا پتا چل رہا تھا۔

ریحانہ کے نقوش بھی بہت خوب صورت تھے۔ شاید اپنی بڑی بہن فرزانہ سے بھی زیادہ۔ اس کے بال بھی بڑے بڑے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک جاذب نظر لڑکی تھی۔

کچھ دیر بعد دوسری سالی بھی آگئی۔ جس کا نام رضوانہ بتایا گیا تھا۔ وہ بھی کم نہیں تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں، جن میں ایک کھوئی کھوئی سی کیفیت تھی۔ ایسی آنکھیں اپنے اندر سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ان کے بنائے ہوئے پکوڑے بھی بہت مزیدار تھے۔ سچ یہ ہے کہ اس کے گھر میں جا کر گھریلو جنت کا مزہ آگیا تھا۔ ایک بیوی، دو سالیاں اور ایک مہذب اور ہر ایک سے محبت کرنے والا شخص۔ اب اور کیا چاہیے۔

اس گھر میں سب ہی کچھ تو تھا۔ گھر رقبے میں بڑا نہ سہی لیکن وسعت قلب میں بڑا تھا اور میرے لیے تو اس کی اہمیت اس لیے اور بھی ہوگئی تھی کہ برسوں کے بعد میں نے اتنی بھرپور گھریلو فضا میں کچھ وقت گزارا تھا۔ میں تو ایسے گھریلو ماحول کو ترس کر رہ گیا تھا۔

اکیلی زندگی گزر رہی تھی۔ اب اس زندگی میں کسی کی شمولیت بہت ضروری ہوگئی تھی۔ عورت تو گھر کی زینت اور رونق ہوا کرتی ہے میرا گھر ایسی لغت سے خالی تھا۔

میں بہت دیر تک بیٹھ کر واپس آگیا۔ وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ادب کا تقاضا تھا کہ میں زیادہ دیر تک ان کے سروں پر مسلط نہ رہوں۔

واپس آکر میں اس گھر کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا ایک دوست ہوا کرتا تھا مبین میں اپنے بہت سے معاملات میں اس سے مشورے بھی کرتا تھا۔

میں نے جب اسے پوری کہانی سنائی تو اس نے کہا۔ ”بے وقوف انسان اب کس بات کی پریشانی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اپنی کھوپڑی استعمال کرو، یہ سوچو کہ وہ شخص اپنی سالیوں کو تمہارے سامنے کیوں لایا۔ صرف اس لیے کہ تم ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کر کے شادی کا پیغام دے دو۔“

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”شاید نہیں، یقیناً۔“ مبین نے کہا۔ ”وہ خود تمہاری پیش قدمی کے انتظار میں ہوگا۔ اس سے بات کر کے دیکھ لو۔“

”کیا میں خود ہی بات کروں۔“

”ہاں تم خود ہی کرو، اس لیے کہ تم سے اس کی بے تکلفی بھی ہے۔ تم کو اس سے بات کرتے ہوئے جھجک نہیں ہونی چاہیے۔“

کچھ عجیب سا لگ رہا تھا لیکن یہ ہمت خود ہی کرنا تھی۔

دو چار دن کے بعد میں انتخاب کے گھر پہنچ گیا۔ میں کچھ مٹھائیاں اور پھل وغیرہ لے گیا تھا تاکہ یہ کہہ سکوں کہ کہیں سے تحفے کے طور پر آئے تھے۔

لیکن انتخاب گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوگئی تھی۔ ”آئیں فراز صاحب، آئیں اندر آجائیں۔ انتخاب صاحب تو کام سے گئے ہوئے ہیں آپ تشریف رکھیں۔“

”بھابی یہ میں آپ لوگوں کے لیے لایا تھا۔“ میں نے شاپر اس کی طرف بڑھا دیے۔

”آپ اندر تو آئیں۔“

اس کے بلانے پر میں اندر چلا گیا۔ اس بیٹھک میں بٹھایا گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس دن تو اس نے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں لیکن اس دن پتا چلا کہ وہ بھی خاصی پڑھی لکھی اور خوش گفتار تھی۔

ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔

اسی دوران اس کی چھوٹی بہن ریحانہ ٹرے لے کر آگئی جس میں چائے اور بسکٹ وغیرہ تھے۔ فرزانہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ریحانہ باتیں کرتی رہی تھی۔

پہلے دن میں نے اپنے دل میں ریحانہ ہی کو پسند کرلیا تھا۔ اس کے حسن میں ایک خاص قسم کا تیکھا پن تھا اور مجھے ایسی تیک لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔

میں نے سوچ لیا کہ میں انتخاب سے ریحانہ کی ہی بات کروں گا۔

آدھ گھنٹے کی اس دوسری ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے بہت حد تک قریب آگئے تھے اور یہ یقین ہوگیا تھا کہ اس گھر سے ریحانہ کے لیے میری درخواست رد نہیں کی جائے گی۔

بہت سرشار ہو کر واپس آیا۔

اس زمانے میں موبائل وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔ آج کا دور ہوتا تو ایک دوسرے کا موبائل نمبر لے لیا جاتا پھر رات گئے تک باتیں ہوتیں۔

موبائل تو در کنار ٹیلی فون تک بہت کم گھروں میں ہوا کرتے تھے۔ جن سے ملنا ہے یا کوئی پیغام پہنچانا ہو ان تک خود ہی جانا پڑتا تھا۔

ایک شام میں اس ارادے سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس بار بھی اس کی گرم جوشی ہمیشہ کی طرح تھی۔ معمول کے مطابق چائے اور ناشتے کا انتظام کیا گیا۔ اس کی بیوی کچھ دیر تو ہمارے ساتھ بیٹھی رہی پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں نے اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے انتخاب سے کہا۔ ”جناب آج میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں لیکن میری ہمت نہیں پڑ رہی۔“

”ہاں، ہاں فراز صاحب بتائیں۔“

”آپ کو میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ایک تنہا انسان ہوں اور یہ زندگی اب دشوار معلوم ہونے لگی ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے اپنی گردن ہلائی۔

”وہ بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہوں۔“

”ارے بھائی کہہ دیں جو کہنا ہے۔“

”انتخاب صاحب! آپ کی سالی مجھے اچھی لگی ہے۔ وہی ریحانہ۔ میں اس سے شادی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

”چلیں یہ تو بہت اچھی بات ہوئی کہ آپ نے ریحانہ کو پسند کرلیا اور جہاں تک شادی کا سوال ہے تو میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

”جی!“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔

”فراز صاحب! ریحانہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ وقت گزارنے والا خوش ہوجاتا ہے۔ تو آپ شادی کر کے دوسروں کو اس خوشی سے محروم کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ریحانہ کی قربت چاہیے وہ مل جائے گی۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ، گھماؤ پھراؤ، انجوائے کرو۔ کہاں شادی وادی کے چکر میں پڑے ہو۔“

اب تو میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔ یہ کیسا آدمی تھا کیسی باتیں کر رہا تھا۔ ”انتخاب صاحب! میں ابھی بھی کچھ نہیں سمجھ سکا۔ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

”فرمان صاحب! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے لوگوں کی خدمت کر کے خوشی ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں خوشیاں تقسیم کرنے والا آدمی ہوں کسی خوشی کو اپنے آپ تک نہیں رکھتا، اگر فرزانہ میری بیوی بھی آپ کو اچھی لگی ہے تو آپ اسے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ بس اتنا خیال رکھیے گا کہ کچھ معاوضہ ضرور دے دیجیے گا۔ دیکھیں ناں مجھے بھی تو گھر چلانا پڑتا ہے ناں، آپ کی طرح دو چار مہربان اور بھی ہیں مہینے میں تین چار بار وہ لوگ آجاتے ہیں اور کسی ایک کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہ بھی خوش اور ہم بھی خوش۔ اس کو کہتے ہیں پیار بانٹنے کا عمل۔ وہ میرے لیے دعائیں کرتے ہوں گے اور میں اس طرح اپنی نیکی بڑھاتا چلا جا رہا ہوں۔“

ایک دم میری سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ کون ہے، کس کردار کا آدمی ہے، وہ اپنی بیوی اور سالیوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ لاحول ولاقوۃ۔

میں وہاں سے اس پر لعنت بھیج کر واپس آگیا۔ حالانکہ اس نے آوازیں بھی دیں لیکن مجھ میں اتنی ہمت کہاں رہی تھی کہ اس کی طرف دیکھ بھی سکتا۔ انسان کا ایک نیا روپ سامنے آگیا تھا۔ ایک مختلف کردار۔

قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتاً سادہ اور وقت ترتیب کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہند نے اس معاملے کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، حسن تقسیم اور وقت ترتیب یہاں کی ہر فنی شاخ کی عام خصوصیت رہی ہے لیکن جہاں تک نفس فن کی دقیقہ سنجیوں کا تعلق ہے اس میں بھی کوئی خبر نہیں کہ یورپ کا موجودہ فن موسیقی جس کی بنیاد نشاۃ ثانیہ کے جنوبی باکمالوں نے رکھی تھی۔ منتہا کمال تک پہنچا دیا گیا اور گو ذوق سماع کے اختلاف سے ہمارے کان اس کی پوری قدر شناسی نہ کرسکیں لیکن دماغ اس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل اشیاء و معانی کے تمام مرکب مزاجوں کی طرح موسیقی کا مزاج بھی ترکیبی واقع ہوا ہے اور سارا معاملہ مفرد اصوات والحان کی تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ان مفرد اجزاء کی ترکیب کا تسویہ اور تناسب جس قدر دقیق اور نازک ہوتا جائے گا۔ موسیقی کی گہرائیاں اتنی ہی بڑھ جائیں گی۔ اس اعتبار سے اظہار ہویں اور انیسویں صدی کے یورپ کا فن موسیقی فکرِ انسانی کی وقت آفرینیوں کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے اور جرمنی کے باکمالان فن نے تو اس باب میں بڑی ہی سحر کاری کی ہے۔ اقتباس: غبار خاطر از مولانا ابوالکلام آزاد

مرسلہ: فصیح الدین۔ لاہور

PakiBooks.Site

انمول

مکرمی ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

یہ کچھ عجیب سی سچ بیانی ہے لیکن سبق بھری ہے۔ انسانی زندگی میں عروج و زوال ضروری ہے۔ ہر ایک پر آتا ہے پھر بھی انسان سمجھ نہیں پاتا..... حقیقت کو سمجھنے کی بجائے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ یہ بھی سمجھ نہیں پاتا ہے کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ مکافاتِ عمل سامنے آکر رہتا ہے، یہی کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا جو میں اسے اس حال میں دیکھ رہا تھا۔

اطہر ندیم
(لاہور)

بہت دنوں کے بعد بھی میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ حالانکہ اس کے خدوخال بگڑ چکے تھے۔ بال بے تحاشا الجھے اور بڑھے ہوئے تھے، کپڑے پھٹے ہوئے تھے پھر بھی وہ پہچان میں آگیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں اسے دس برسوں کے بعد دیکھ رہا تھا۔

دس برس پہلے کی بھی کیا زندگی تھی بے فکری کی۔ ہم چار پانچ دوست تھے اور ہم سبھوں پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح باہر نکل جائیں۔ کہیں بھی کسی بھی ملک میں جو کام بھی مل جائے وہ ہم کرنے کو تیار تھے۔

ہم یہاں نوکریاں تو کررہے تھے لیکن وہ ایسی نہیں تھیں کہ ہم اپنا شاندار مستقبل تعمیر کرسکتے بس گزارا ہورہا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی صرف گزارا نہیں چاہتا تھا۔

ہم ایک آرام دہ زندگی گزارنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔

ہم چاروں دوستوں کی پچویشن تقریباً ایک جیسی تھی۔ خالد کو ہمیشہ اس بات کا شکوہ رہتا کہ اس کا ماموں اس کے لیے کچھ نہیں کررہا۔ حالانکہ وہ کینیڈا میں کسی اچھے عہدے پر تھا اگر چاہتا تو خالد کو بھی بلا سکتا تھا لیکن اس نے کبھی خالد کو آفر ہی نہیں کی تھی۔

خالد اس بات پر جز بز کرتا رہتا تھا۔ ''یارو! وہ ماموں صرف نام کے ہیں۔ ان کو اپنے بیٹے کی تو فکر ہے جو بالکل ناکارہ اور نکھٹو ہے جس نے دو بار فیل ہوکر بی اے کیا ہے۔ اس کو بلانے کی کوششیں تو ہورہی ہیں لیکن اپنے بھانجے کی طرف دھیان نہیں جاتا جو ماسٹر کرکے جھک مار رہا ہے۔''

''پیارے، اولاد اور بھانجے میں یہی تو فرق ہوا کرتا ہے۔'' اسلم کہتا۔

اسلم نے یہ راستہ نکالا تھا کہ وہ باہر کی کسی لڑکی سے شادی کرلے گا۔ چاہے کیسی بھی ہو پھر اس کے ذریعے گرین کارڈ حاصل کرلے گا۔ اس کے جاننے والوں میں سے دو تین نے اس ترکیب پر عمل کیا تھا اور آج وہ باہر بیٹھے آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔

اسلم اس لیے باہر کے رشتے کی تلاش میں رہتا تھا۔ دس سال پہلے بھی انٹرنیٹ وغیرہ شروع ہوچکا تھا۔ وہ دن بھر نیٹ پر رشتوں کی چھان بین کرتا رہتا۔ اس نے کئی جگہ کوشش بھی کی تھی لیکن ابھی تک اسے کوئی کامیابی نہیں ملی تھی۔

ان دوستوں میں ایک فیاض بھی تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویزے کے چکر میں تھا۔ اس کے والدین نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے باہر پڑھنے کے اخراجات برداشت کرلیں گے۔ اس کے بعد سے اس کا کام جگہ جگہ اپلی کیشن بھیجنا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی انگریزی بہت کمزور تھی۔ وہ ایک دو بار انٹرویو کے لیے نیٹ پر بیٹھا بھی تھا لیکن ناکام ہوگیا تھا۔ لہٰذا اس نے انگلش سکھانے کا ایک ادارہ جوائن کرلیا تھا۔

ایک حمید تھا جو صرف ہنرمند تھا۔ اس کی تعلیم انٹر ہی تھی لیکن آٹو موبائل کا کام جانتا تھا۔ اس کے پاس یہ ایک ایسا ہنر تھا کہ وہ اپنے ملک میں بھی کچھ نہ کچھ کرلیتا لیکن باہر جانے کی دھن سوار ہوگئی تھی اس لیے کچھ اور کرنے پر تیار نہ تھا۔

ایک میں تھا یعنی اطہر۔ اطہر ندیم مجھے باہر نہیں جانا تھا۔ میرا نظریہ کچھ اور تھا کہ اگر اپنے ملک میں عزت کی روٹی مل رہی ہے تو پھر باہر جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں کوئی چانس لگ جائے تو اور بات ہے ورنہ اس طرح اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے کھپا دینا مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔

میں جہاں نوکری کررہا تھا، وہاں تنخواہ وغیرہ تو زیادہ نہیں تھی لیکن یہی بہت تھا کہ گزارا ہورہا تھا۔ میرا ارادہ جرنلزم میں ایم اے کرنے کا تھا کیونکہ مجھے شروع سے لکھنے لکھانے کا شوق رہا ہے۔ ابھی بھی میرے مضامین اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ہم سب جہاں بیٹھا کرتے تھے وہ ایک کوئٹہ ہوٹل تھا۔ اس کی چائے بہت اچھی ہوتی تھی۔ یہ ہوٹل ایک محلے میں تھا۔ اس کے آس پاس فلیٹس تھے۔ دکانیں تھیں۔ ہر وقت چہل پہل رہا کرتی۔

دکان والے نے فٹ پاتھ کے ساتھ کرسیاں لگا رکھی تھیں جس پر لوگوں کی بیٹھک رات گئے تک جاری رہا کرتی۔ ہمارے گروپ کے علاوہ اور بھی کئی لوگ تھے جو تقریباً روزانہ ہی اس ہوٹل میں آیا کرتے تھے۔

ایک گروپ ایسے لوگوں کا تھا جو شاید پراپرٹی وغیرہ کے کاموں سے وابستہ تھے۔ ان میں سے ایک خاص طور پر میری توجہ کا مرکز رہتا تھا۔

وہ ایک موٹا آدمی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔ بڑھا ہوا پیٹ، بھرا ہوا چہرہ۔ چلیں یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ بہت سے لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں لیکن اس کی طرف میری توجہ اس لیے تھی کہ وہ بہت زور زور سے قہقہے لگاتا۔

ہنستے ہوئے اس کا پورا جسم ہلتا تھا اور اس کی دوسری خاص بات یہ تھی کہ اس نے تقریباً ہر انگلی میں ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی، قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں۔ ان کے علاوہ اس کے گلے میں سونے کی ایک موٹی سی زنجیر بھی پڑی رہتی تھی۔

جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ اس کا کاروبار اچھا چل رہا ہے اور کھاتا پیتا آدمی ہے۔ میں اس کو زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اسلم ہی نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ پراپرٹی کا کام کرتا ہے اور بہت کامیاب پراپرٹی ڈیلر ہے۔ ویسے بھی اس کی کامیابی اس کی انگوٹھیوں اور سونے کی زنجیر سے پتا چل رہی تھی۔

ایک دو گروپ اور بھی تھے۔ لیکن ان کے الگ الگ مشاغل تھے۔ مجھے ان کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم اور نہ ہی کبھی ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہوگی۔

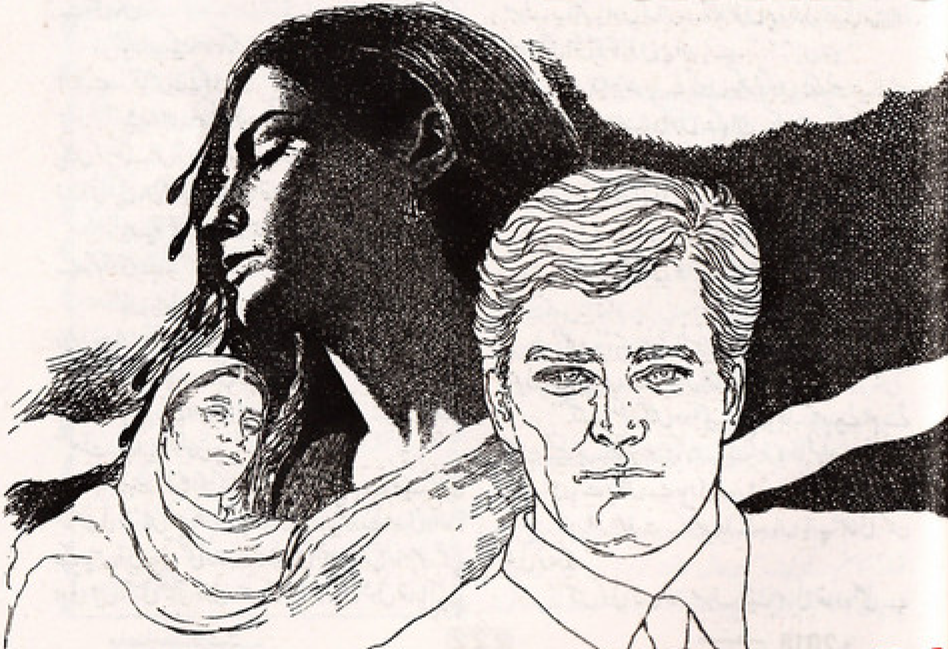
ہماری بیٹھک تقریباً روزانہ ہی ہوا کرتی تھی۔ ہم رات گئے تک بیٹھے رہتے۔ ہمارے گھر بھی قریب ہی تھے اس لیے ہم اٹھتے اور اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوجاتے۔

ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔

ہم بیٹھے تھے کہ ایک عورت ہمارے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ انتہائی دبلی پتلی، بے بس اور خوف کے تاثرات اس کے چہرے پر منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔

''بیٹا ایک کپ چائے پلا دو۔'' اس نے ہم سے سوال کیا۔

اس کو دیکھ کر ہی افسوس ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی کہا۔



PakiBooks.site

"اماں آپ سامنے جا کر بیٹھ جائیں، میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں، کچھ کھائیں گی بھی؟"

"نہیں بیٹا صرف چائے۔" اس نے شائستہ لہجے میں کہا اور سامنے کچھ دور پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے بیرے کو آواز دے کر اس سے کہا کہ وہ اس عورت کو چائے دے دے۔

اس وقت نہ جانے کیوں اسلم بہت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ "حرامزادی، کمینی میرا بس چلے تو گولی ماردوں اس کو۔"

"کیا ہو گیا بھائی۔" خالد نے پوچھا۔ "تم اچانک کیوں شروع ہو گئے۔"

"تم لوگ جانتے ہو یہ عورت کون ہے۔"

"نہیں ہم تو نہیں جانتے۔"

"یہ اس پراپرٹی ڈیلر کی ماں ہے۔" اسلم نے انکشاف کیا۔

"کیا؟" ہم سب چونک پڑے تھے۔

"اس موٹے کی بات کر رہے ہو جس نے زنجیر اور انگوٹھیاں پہن رکھی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ میرے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی رہتا ہے۔ میں گلی نمبر بارہ میں ہوں، وہ گلی نمبر اٹھارہ میں ہے، اس لیے میں اس کو جانتا ہوں، یہ اس کی ماں ہے، سگی ماں۔"

"یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو خود کھاتا پیتا بندہ معلوم ہوتا ہے۔" فیاض نے کہا۔

"پیسے والا ہے کم بخت، لیکن ایک ماں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں تو پوری کہانی جانتا ہوں۔ ایک بار تو اس نے زبردستی اپنی ماں کو گنجا بھی کر دیا تھا۔"

"یار یہ تو عجیب بات بتائی تم نے۔" میں نے کہا۔ "ایسا بے رحم آدمی ہے۔"

"ہاں یار! اس بے چاری کو قید کر کے رکھا ہوا ہے دونوں میاں بیوی نے۔ لگتا ہے بے چاری کسی طرح آج گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔"

"یار تم مجھے اس کی پوری کہانی سناؤ۔" میں نے کہا۔

"لعنت ہے ایسے لوگوں پر۔"

"بہت دکھ بھری کہانی ہے یار۔" اسلم نے ایک گہری سانس لی۔ "میں اس طرح جانتا ہوں کہ یہ عورت میری والدہ کے پاس آتی جاتی تھی۔ بہت نارمل تھی جس طرح عام عورتیں ہوتی ہیں، ہنستی کھیلتی ہوئی، اس کو صرف ایک شوق تھا یا ایک خواہش تھی کہ بیٹے کی شادی ہو جائے۔ یہ سب میری امی بتاتی ہیں کہ بیٹے کی شادی کی خواہش اس کو اتنی شدید تھی کہ بے چاری دور دور رشتہ دیکھنے چلی جاتی، جہاں پتا چلتا کہ فلاں گھر میں کوئی اچھی لڑکی ہے۔ بس اس کو دیکھنے پہنچ جاتی۔"

"یار! یہ تو کوئی ان نیچرل بات نہیں ہے۔" حمید نے کہا۔ "یہ خواہش تو ہر ماں کی ہوا کرتی ہے۔"

"ہاں ہوتی تو ہے لیکن جنون کی کیفیت نہیں ہوتی۔ اس بے چاری کو جنون کی کیفیت تھی۔" اسلم نے بتایا۔

اسلم کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ عورت چائے ختم کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ چلتے ہوئے وہ لنگڑا بھی رہی تھی، اس کے دائیں تلوے میں ایک بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"لگتا ہے بے چاری کے پیر میں زخم ہو گیا ہے۔" فیاض نے تبصرہ کیا۔ "اس لیے پٹی باندھ رکھی ہے۔"

"اور یہ پٹی ڈاکٹر کے یہاں کی نہیں معلوم ہوتی۔ خود ہی باندھی ہوگی۔" میں نے کہا۔

اس عورت نے جاتے جاتے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور شکریہ ادا کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلا کر آگے چلی گئی۔

"یار یہ تو ذہنی طور پر بالکل نارمل ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں تو میں کب اسے پاگل کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ اس نے کانٹوں پر زندگی بسر کی ہے اور انجام بھی اس کا کانٹوں پر ہو رہا ہے۔"

"ہاں یار! نہ جانے کیوں کچھ لوگوں کے نصیب ایسے ہوتے ہیں کہ سوائے دکھوں کے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

اسلم نے پھر اس کی کہانی شروع کی۔ "میں نے ابھی یہ کہا ہے کہ اس بے چاری نے کانٹوں والی زندگی گزاری ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا شوہر بھی ایسا ہی تھا ظالم اور بے رحم۔"

"اوہ۔" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ "یعنی شوہر کی زندگی میں بھی اس نے خوشیاں نہیں دیکھیں۔"

"نہیں بالکل نہیں وہ ایک ٹھیکیدار تھا۔ چھوٹے موٹے مکان ٹھیکے پر لے کر بنوایا کرتا۔ ایک نمبر کا ظالم اور بے رحم۔ ذرا ذرا سی بات پر اس بے چاری کو مارنا شروع کر دیتا۔"

"اور اس عورت کے گھر والے، ماں باپ بھائی بہن کوئی تو ہوگا۔"

"نہیں کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک بھائی تھا وہ بھی بے

چارہ کسی فیکٹری میں معمولی سا مزدور تھا۔ دیکھنے ہی سے مظلوم لگتا تھا۔ میں نے بھی ایک دو بار اس کو دیکھا ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں تھا جو اپنی بہن کی حمایت میں کھڑا ہو سکتا یا اس ٹھیکیدار کے خلاف آواز اٹھا سکتا۔ چپ چاپ آنسو بہا کر رخصت ہو جاتا تھا۔"

اس دوران وہ پراپرٹی والا بھی معمول کے مطابق اپنے دوستوں کے ساتھ قہقہے لگاتا ہوا آ گیا۔ اس کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ اس بے غیرت کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اس کی ماں کیسی زندگی گزار رہی ہے۔

آج بھی اس نے کڑک دار لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے غلیظ مکار چہرے سے بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ کرسیاں لگا کر بیٹھ گیا۔

"یار! تم تو اس طرح اس کو دیکھ رہے ہو جیسے پھاڑ کر رکھ دو گے۔" فیاض نے کہا۔

"ہاں یار! دل تو یہی چاہ رہا ہے لیکن افسوس کچھ کر نہیں سکتا۔"

"تم دیکھ لینا اس کا حشر بہت برا ہوگا۔" وہ بولا۔ "میں نے اپنی زندگی میں ماں باپ کو دکھ دینے والوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔"

"یار! تم اس کم بخت کی بقیہ کہانی تو سن لو۔" اسلم نے کہا۔

"چلو سناؤ۔"

"بہرحال! اس بے چاری نے بڑی مشکلوں سے اس کی پرورش کی۔" اسلم نے بتایا۔ "ٹھیکیدار کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ عورت پڑھی لکھی تھی اس نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی۔ دن میں اسکول اور شام کے وقت ٹیوشنز اس طرح اس کم بخت کو جوان کیا ہے۔"

"یہ آدمی شروع ہی سے کاروباری ذہن کا تھا۔ میری امی بتاتی ہیں کہ جب یہ اپنی پڑھائی کر رہا تھا اس وقت بھی غریب ماں پر سختیاں کیا کرتا، باپ تو تھا نہیں، جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ماں پر چڑھائی کر دیتا اور وہ بے چاری کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی دیتی تھی۔"

"کیا یہ شخص شرم نہیں کرتا تھا کہ ماں محنت کیے جا رہی ہے اور وہ فرمائشیں کر رہا ہے۔"

"شرم تو بہت دور کی بات ہے یہ تو ناراض ہو جایا کرتا تھا۔" اسلم نے کہا۔ "بہرحال وقت گزرتا گیا اور اس نے پراپرٹی کا کام شروع کر دیا۔ جوڑ توڑ اس کی فطرت میں شامل

کسی نظام میں تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی دیس کے باسیوں کے باطن میں موجود تخلیقی قوت کو بیدار نہ کیا جائے۔ برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کو اس تناظر میں دیکھیں تو یہاں ایک عرصہ طویل سے تخلیقی سوتوں کو خشک کیا جا چکا ہے۔ اس عرصہ جمود میں کوئی نئی بات، نیا پیغام، ذہنوں کو نہ صرف اجنبی محسوس ہوتا ہے بلکہ اکثر حالتوں میں ناقابل قبول ہوتا ہے۔

مرسلہ: احمد علی سید۔ کراچی

اسکردو پاکستان کے پانچویں صوبہ گلگت بلتستان کا ایک اہم شہر اور ضلع ہے اور سلسلہ قراقرم کے پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک خوب صورت شہر ہے۔ صوبہ گلگت بلتستان کا دارالخلافہ بھی ہے۔ یہاں کے خوب صورت مقامات میں شنگریلا، سدپارہ جھیل اور کت پناہ جھیل وغیرہ شامل ہیں۔ ہر سال لاکھوں ملکی و غیر ملکی سیاح اسکردو کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں لوگ بلتی زبان بولتے ہیں جو تبتی زبان کی ایک شاخ ہے۔ جب کہ اسکردو کے لوگ انتہائی ملنسار، خوش مزاج، پرامن اور مہمان نواز ہیں۔ اسکردو جانے کا آسان ترین راستہ ہوائی جہاز ہی ہے جو کہ اسلام آباد سے اسکردو اور واپسی اسلام آباد ہے۔ اس کے علاوہ سڑک کے راستے اسکردو جانے کا اپنا الگ ہی ایک مزہ ہے۔ دنیا کے خطرناک ترین دشوار راستوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ راستے میں بہت خطرناک اور دشوار موڑ آتے ہیں جس کے لیے ڈرائیور کا ان راستوں سے واقف اور ماہر ہونا ضروری ہے۔ عام گاڑی یا پرانی گاڑی میں جانے سے مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ ان علاقوں میں فور ویل گاڑیاں ہی چلائی جاتی ہیں۔

مرسلہ: علی شاہ۔ نگر گلگت

برصغیر پاک و ہند کے سیاسی و سماجی حالات کی اگر صحیح تصویر دیکھنی ہو تو اردو غزل کی اشارتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ میر و سودا نے جس طرح مغلوں کے زوال کی ابتداء کی تصویر کشی اپنے اشعار میں کی ہے شاید شہر آشوبوں میں بھی نہیں کی جا سکی۔ غالب نے مغلوں کے انحطاط کی انتہا اور اس کے نتیجے میں نئی انسانی نفسیات اور حسیات کی مصوری منفرد الفاظ میں کی اور آخر میں داغ دہلوی نے غزل کے پردے میں جو فرنگی سامراج پر طنز و تعریض کی ہے اس نے تو بالکل واسوخت کا رنگ اختیار کر لیا۔ داغ کی اس محبت کو بھی اردو تنقید نے دریافت کرنا ہے۔

مرسلہ: مظہر علی۔ لاہور

PakiBooks.Site

تھا۔ دو نمبر کے کام کیا کرتا، کبھی کسی کو کوئی پلاٹ دلوا دیا، کبھی کسی کو زبردستی قبضہ دلوا دیا۔ بہرحال اس کے پاس پیسے آتے چلے گئے۔ اس کے بعد اس کو شادی کی فکر سوار ہوئی۔"

"اور ماں بے چاری مناسب رشتے کے لیے ماری ماری پھرتی ہوگی۔" فیاض نے لقمہ دیا۔

"ہاں اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا پھر مختصر یہ کہ اس کی شادی ہوگئی۔ لڑکی والے امیر تھے۔ لڑکی کا باپ بھی ایک ٹھیکیدار تھا۔ ماں بے چاری بڑے ارمانوں سے بہو کو گھر میں لائی تھی۔ بہو نے کچھ دن تو شرافت سے گزارے پھر اس نے شوہر کا رویہ دیکھ کر اپنے آپ کو بدل لیا۔ اب اسے ساس کا وجود کھلنے لگا۔ اس نے اس عورت پر سختیاں شروع کردیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ بدبخت بھی اپنی بیوی کا ساتھ دیتا رہا۔ کہانی اس کے بعد کی کچھ یوں ہے کہ ماں بے چاری نفسیاتی مریض ہوگئی ہے اور یہ عیش کرتا پھر رہا ہے۔"

"ایسے آدمی کو تو گولی ماردینی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کون مارے گا اس کا انصاف تو خدا ہی کرسکتا ہے۔"

اس دن کی گفتگو ختم ہوگئی۔ ہم اس کے بعد بھی ہوٹل میں آتے رہے وہ دوسرا گروپ بھی آتا رہا پھر میں کچھ دنوں کے لیے دوسرے شہر چلا گیا۔

واپس آیا تو اماں ایک کہانی لیے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے میری شادی کے لیے ایک لڑکی دیکھ لی تھی۔ میں نے شاید اپنا بیک گراؤنڈ نہیں بتایا اطہر ندیم نام ہے میرا۔ جرنلزم میں ماسٹر کررہا تھا لکھنے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنی اماں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

بس ہم دو ہی تھے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ابو کا انتقال ہوچکا تھا۔ ہم دو ماں بیٹے تھے اور رشتے دار بھی تھے لیکن ان سے ہمارا زیادہ واسطہ نہیں تھا۔

اماں بے چاری بیمار رہا کرتی تھیں۔ شاید ان کی بھی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ وہ میری شادی دیکھ لیں۔

میرا معاملہ یہ تھا کہ میں فی الحال شادی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا، اس کے علاوہ اس پراپرٹی ڈیلر اور اس مظلوم عورت کی کہانی سننے کے بعد تو شادی سے دھیان ہی ختم ہوگیا تھا۔

خدا جانے آنے والی کیسی ہو۔ اماں کا خیال رکھے یا نہ رکھے۔ میں اس پراپرٹی ڈیلر کی طرح تو نہیں تھا کہ اگر بیوی نے ماں پر سختیاں شروع کیں تو خاموشی سے دیکھتا رہوں۔ میں تو جان عذاب ہی کردیتا۔

لیکن اماں تو پوری پلاننگ کرکے بیٹھی تھیں۔

"بیٹا میں نے لڑکی دیکھ لی ہے بہت اچھی ہے۔"

"اماں ہوتا یہ ہے کہ شادی سے پہلے ہر عورت کو اپنی ہونے والی بہو اچھی دکھائی دیتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن شادی کے بعد جب بہو کے ہنر سامنے آنے لگتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔"

"نہیں بیٹا، ایسی بات نہیں ہے۔ راحیلہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت فرمانبردار سگھڑ، میں تو اس کو ہر طرح دیکھ چکی ہوں۔ انٹر کرچکی ہے اور اب آگے پڑھ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے اماں، جو آپ کی مرضی، لیکن میں اندھے کنویں میں چھلانگ نہیں لگاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "میں ایک نظر خود بھی اس لڑکی کو دیکھوں گا ویسے اس کا پورا جغرافیہ کیا ہے۔ میرا مطلب ہے اس کے ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ۔"

"سب ہی ہیں۔ باپ کا اپنا کاروبار ہے۔ ایک بیٹا ہے۔ جس کی شادی ہوچکی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لڑکی بہت اچھی ہے۔"

"اگر آپ مطمئن ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

چونکہ اماں نے ساری بات طے کررکھی تھی اور اب ان کی صحت اس قابل نہیں رہی تھی کہ میں ان کو انتظار کرا سکتا اس لیے میں نے ہاں کردی تھی اور میں نے اپنے طور پر بھی کوئی چھان بین نہیں کی۔

میرا دماغ تو شادی والے دن خراب ہوا تھا۔ جب میں نے شادی کی تقریب میں اس پراپرٹی ڈیلر کو دیکھا۔ میں دولہا بنا ہوا اسٹیج پر تھا اور وہ پورے ہال میں بھاگ دوڑ کررہا تھا۔ یقیناً وہ لڑکی والوں کے بہت قریب تھا۔

کچھ دیر میں وہ خود اسٹیج پر آگیا۔ اس نے بھی اس رشتے کے کم ہوجانے کے بعد مجھے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔ "ارے بھائی یہ آپ ہیں ہم تو روزانہ ایک دوسرے کو ہوٹل میں دیکھا کرتے ہیں۔"

"جی ہاں۔" میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ "روزانہ دیکھتے ہیں۔"

"چلیں یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔" اس نے کہا۔

"اب ہم ایک دوسرے کے ہم زلف ہوگئے۔"

"ہم زلف؟" میں چونک گیا تھا۔

"ارے جناب آپ کی بیگم میری سالی ہوتی ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں بلقیس کی بڑی بہن ارم کا شوہر ہوں۔"

"یا خدا!" میں بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ جس آدمی سے مجھے اتنی شدید نفرت تھی وہ میرا ہم زلف ہوگیا تھا اور جس کی بیوی نے اپنی ساس کو دکھ دے دے کر پاگل بنا دیا تھا اس کی بہن میری بیوی بن چکی تھی۔ یہ کیا ماجرا تھا کیسا اتفاق تھا!

اماں نے یہ سب کیوں نہیں بتایا تھا۔ کیا ان کو یہ سب نہیں معلوم تھا؟ یا ان سے یہ باتیں چھپائی گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں شاک میں آگیا تھا۔

شادی میں میرے وہ دوست بھی شریک تھے جو ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔ اس پراپرٹی ڈیلر کے اسٹیج سے جانے کے بعد اسلم اور فیاض اسٹیج پر آگئے۔

"یار یہ بدمعاش یہاں کیا کررہا ہے۔" اسلم نے پوچھا۔

"یار و قسمت کی ستم ظریفی دیکھو۔" میں نے بتایا۔

"یہ میرا ہم زلف ہے۔"

"کیا!" دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ "یہ ظالم انسان تمہارا ہم زلف ہے؟"

"ہاں یار اور میری بیوی کی بڑی بہن اس کی بیوی ہے۔"

"خدا خیر کرے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بہن کا بھی وہی مزاج ہو۔"

"چاہے اس کا جو بھی مزاج ہو لیکن ایسے حالات میں عام طور پر کمزوری مرد کی ہوتی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ مجھے اپنی ماں بہت عزیز ہے اگر میں نے ذرا بھی گڑبڑ دیکھی تو ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کروں گا رخصت کردوں گا اس کو، ماں کے مقابلے میں کسی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

لیکن میرے ساتھ ایسی کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔ بلقیس واقعی بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ انتہائی محبت کرنے والی پُرخلوص۔ اس نے میری ماں کا اتنا خیال رکھا تھا کہ میں اس پر فخر کرنے لگا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر ہی اس کی فطرت اور اس کے سلجھے ہوئے مزاج کا اندازہ ہوگیا تھا۔

ایک دن میں نے اس سے وہ گفتگو چھیڑ دی۔ "ایک بات بتاؤ تمہاری آپا ارم کس مزاج کی عورت ہے۔"

"کیوں؟"

"میں نے کچھ کہانیاں سنی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: مرزا ثمر عباس فون نمبر: 0301-2454188
سرکولیشن منیجر...... سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

PakiBooks.Site

سانس کے حوالے سے۔‘‘
’’ہاں تو آپ کو بھی معلوم ہے۔‘‘
’’ہاں اس لیے کہ میں خود اس عورت کو ایک دو بار لوگوں سے بھیک مانگتے دیکھ چکا ہوں۔‘‘ میں نے بتایا۔
’’آپ ٹھیک کہتے ہیں۔‘‘ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ’’پتا نہیں ان کا نیچر ایسا کیوں ہو گیا ہے۔ دونوں میاں بیوی اس عورت کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ اس پر بہت ظلم کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپا سے نہیں ملتی۔ شادی میں بھی اس لیے بلانا پڑا کہ سگی بہن ہیں ورنہ وہ دونوں میاں بیوی اس قابل نہیں ہیں۔‘‘
بلقیس نے صاف صاف بتا دیا تھا۔ اس سے اس کی نیت کے صاف ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔
’’کیا تم لوگ سمجھاتے نہیں ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’درجنوں بار سمجھا چکے ہیں۔‘‘ بلقیس نے بتایا۔ ’’لیکن وہ جھڑک دیتی ہیں کہ یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ ہم اس میں دخل نہیں دے سکتے پھر میں بھی خاموش ہو جاتی ہوں کیا کروں، اس عورت کے لیے افسوس ہوتا رہتا ہے۔‘‘
’’پھر تو مجھے اس بات پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تم اپنی بہن سے مختلف ہو۔‘‘ میں نے کہا۔
’’ہاں میں تو ہمیشہ ایسی ہوں اور وہ ہمیشہ سے اسی مزاج کی رہی ہے۔ بہت فرق ہے ہم دونوں میں۔‘‘
ارم اور اس کے شوہر نے ایک بار ہم دونوں کی دعوت کی۔ میں جانا تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بلقیس کے کہنے پر چلا گیا۔
اس شخص نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔
اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بہت کوفت ہو رہی تھی کیونکہ اس کو باتیں کرنے کا سلیقہ نہیں تھا، بہت عامیانہ سی باتیں تھیں اس کی وہی اپنی کامیابیوں کے تذکرے۔ میں نے یہ کر دیا، فلاں مکان اتنے میں بنا کر اتنے میں بیچ دیا۔ فلاں جگہ پلاٹ خرید لیا۔
باتوں کے دوران میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ’’یار فیروز بھائی آپ کی والدہ نظر نہیں آ رہی ہیں۔ کیا وہ گھر پر نہیں ہیں۔‘‘
فیروز بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔ اس وقت بلقیس کی بہن ارم بول پڑی۔ ’’ارے وہ آج اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہیں، کل آئیں گی۔‘‘
ہو سکتا تھا کہ میں اس کی بات پر یقین کر لیتا، لیکن اس وقت اندر کمرے سے کسی عورت کے ہسٹریائی انداز میں چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔
ارم اور فیروز کے چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔
’’لگتا ہے بے چاری کو پھر دورہ پڑا ہے۔‘‘
’’کس کی بات کر رہے ہیں فیروز بھائی۔‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ارے وہ پڑوس کی عورت ہے۔‘‘ فیروز نے کہا۔ ’’برابر ہی میں گھر ہے۔ اس پر پاگل پنے کے دورے پڑتے ہیں۔ وہ برابر والے گھر میں ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ہمارے ہی گھر میں ہو۔‘‘
بہت بھونڈا بہانہ تھا اس کا، پھر بھی میں خاموش رہا۔
ارم نے کھانا لگا دیا لیکن کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ رہ رہ کر کانوں میں اس عورت کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ اب وہ خاموش ہو گئی تھی۔ فیروز ایک بار اٹھ کر اندر گیا تھا شاید اسے چپ کرانے کے لیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے جا کر دھمکی وغیرہ دی ہو اس لیے اب اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔
بہر حال جیسا تیسا کھا کر ہم اپنے گھر واپس آ گئے۔ طبیعت بہت مکدر ہو گئی تھی۔ اس موقع پر بلقیس بہت افسردہ اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔
میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ’’تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔‘‘
’’میں پریشان نہیں، شرمندہ ہوں کہ میری اپنی بہن ایسی ہے۔‘‘ وہ اداسی سے بولی۔ ’’یہ تو معلوم تھا کہ اس کے مزاج میں سختی ہے لیکن اتنا بھی اندازہ نہیں تھا۔‘‘
’’جانے دو اس کو۔ سوچ سوچ کر اپنی صحت مت خراب کر لینا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہاری بہن جو کچھ کر رہی ہے اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ اس کا اپنا فعل ہے، خدا اس کے حال پر رحم کرے۔‘‘ اس کے بعد ہم پھر اس کے گھر کی طرف نہیں گئے۔
اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے اس ہوٹل میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں اس سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ میں ایسے آدمی سے بات تک کرنا پسند نہیں کر سکتا تھا۔
پھر یہ ہوا کہ مجھے دبئی میں ایک بہت اچھا چانس مل گیا اور میں اپنی امی اور بلقیس کو لے کر دبئی چلا گیا۔ وہاں قیام کے دوران ارم اور اس کے شوہر کے بارے میں معلوم ہوتا

رہتا تھا۔
بلقیس نے بتایا کہ ان لوگوں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ اس کا بہنوئی فراڈ کے کسی کیس میں پکڑا گیا ہے۔ میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا ان دونوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
ہم تین برس کے بعد کچھ دنوں کے لیے پاکستان آ گئے۔ دبئی میں ہمارا بچہ پیدا ہوا تھا۔ یہاں آئے تو پتا چلا کہ ارم کا شوہر تو بالکل تباہ ہو چکا ہے۔
وہ فراڈ کے ایک کیس میں پکڑا گیا تھا لیکن فراڈ پر فراڈ نکلتا چلا گیا۔ اس کی جائداد وغیرہ سب ضبط ہو گئی ہے۔ وہ دو سال کی جیل کاٹ کر باہر آیا ہے۔
اب وہ لوگ کسی معمولی سے گھر میں زندگی گزار رہے تھے۔ وہ عورت یعنی میرے ہم زلف کی ماں ان کے ساتھ ہی تھی۔ پتا نہیں اب اس بے چاری کے ساتھ کیا ہو رہا ہو گا۔ اس کی زندگی کیسی گزر رہی ہو گی۔ میں اور بلقیس دونوں جانتے تھے کہ یہ سب مکافاتِ عمل ہے۔ خدا نے اس آدمی پر اپنی گرفت کر لی ہے لیکن میں بلقیس کی شرمندگی کی وجہ سے اس سے کچھ نہیں کہتا تھا۔
اور ایک شام ہم پھر اس ہوٹل میں تھے۔ دوستوں کا وہی ٹولہ، پھر مجھے وہ دکھائی دے گیا۔ وہی میرا ہم زلف، پراپرٹی ڈیلر۔ اس کے خدوخال بگڑ گئے تھے۔ لباس جھول رہا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ اس کے حالات خراب ہو گئے ہیں لیکن اتنے خراب ہونے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ تو بالکل تباہ ہو گیا تھا۔
وہ ایک کرسی لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا یا وہ اپنے ہوش ہی میں نہیں تھا۔ اس کا وہ گروپ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جو اس کے ساتھ قہقہے لگایا کرتا تھا۔
ہم سب دوست اس کی حالت پر افسوس بھی کر رہے تھے اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ خدا نے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ یہ شخص کسی ہمدردی کے قابل نہیں ہے۔
اس وقت ایک عورت ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ وہی عورت تھی اس کی ماں، اس کی وہی حالت تھی جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔
’’بیٹا چائے پلا دو۔‘‘ اس نے ہم سبھوں سے کہا۔
’’آپ بیٹھ جائیں میں چائے بھجواتا ہوں۔‘‘
’’بیٹا دو چائے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ایک اس کے لیے۔‘‘ اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ’’خدا جانے اس نے چائے پی ہے یا نہیں پی ہے۔‘‘
اور اس وقت اس کی بات سن کر ہم سبھوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ ایک ماں تھی اور ہزار آفتوں کے باوجود اس ماں کو اپنے بیٹے کا خیال رہا تھا۔ ماں ایسی ہی ہوتی ہے۔
خدا کے لیے اگر آپ کی ماں آپ کے ساتھ ہے تو اس کا خیال کریں ورنہ خدا کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔
یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے کا ہے۔
اس واقعے سے دو باتیں سامنے آئی ہیں۔
ایک خدا کی گرفت اور دوسری ماں کی لازوال ممتا۔

شیخ قلندر بخش جرأت

(1163ھ۔1225ھ)

اردو شاعر۔ اصلی نام یحییٰ امان۔ والد حافظ امان دہلی کے باشندے تھے۔ سلسلہ خاندان رائے امان سے ملتا ہے جو شاہ محمد شاہ کے زمانے میں شاہی دربان تھے۔ ولادت دہلی میں ہوئی۔ صغر سنی ہی میں فیض آباد چلے گئے۔ جعفر علی حیرت سے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ علم نجوم اور موسیقی میں مہارت تھی۔ ستار خوب بجاتے تھے۔ پہلے حافظ رحمت خاں کے لڑکے نواب محبت خان کی رفاقت میں رہے پھر 1800ء میں لکھنو آئے اور شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ چیچک یا کسی حادثے سے نابینا ہو گئے۔ لکھنو میں فوت ہوئے۔ تصانیف میں ایک دیوان ہے جس میں غزلیں، رباعیاں، مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند، فردیات، واسوخت، تاریخیں، ہجویات، سلام، مرثیے اور فالنامہ سب کچھ شامل ہے۔ ایک مثنوی برسات کی ہجو میں 1781ء میں لکھی۔ مثنوی حسن و عشق 1811ء میں مرتب ہوئی۔ اس میں ایک بزرگ خواجہ حسن اور لکھنو کی ایک طوائف بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔

مرسلہ: ناہید فرزانہ۔ سیالکوٹ

PakiBooks.Site

انجام

مکرمی مدیر
السلام علیکم

جو بھی کام ہو اس کا ایک انجام ضروری ہے۔ اسی طرح یہ زندگی جو ہمیں خدا نے بخشی ہے ایک دن اس کا بھی انجام ہونا ہے۔ ہر کام کا انجام اس کے ادا کرنے، اس کے انداز تکمیل پر منحصر ہے۔ میں جو سچ بیانی بیان کررہا ہوں یہ بھی اندازِ تکمیل کے گرد گردش کررہی ہے۔ یہ میرے دوست کا زندگی نامہ ہے۔ بس اس نے غور و فکر نہ کیا اور اپنے لاابالی پن کی وجہ سے اپنی زندگی جہنم بنا لی۔ حیرت تو مجھے اس بات کی ہے کہ دوسروں نے بھی، اس کے گھر والوں نے بھی، اس پر توجہ نہ دی۔ کاش اس کے گھر والے بھی عقل سے کام لیتے تو میرے دوست کا یہ انجام نہ ہوتا۔

ارشد کریم
(لاہور)

راشد میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم نویں جماعت سے ساتھ تھے، میٹرک بھی اسی اسکول سے کیا اور کالج میں بھی ہم ساتھ رہے۔ البتہ انٹر کے بعد ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ میں نے ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لے لیا اور اس نے بی ایس سی کرنے کے بعد آئی بی اے میں چلا گیا۔ وہاں سے وہ کمپیوٹر میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کررہا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں کمپیوٹر نیا نیا متعارف ہوا تھا اور مارکیٹ میں کمپیوٹر پر کام کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، چنانچہ اسے بھی ڈپلوما کرتے ہی ایک کمپیوٹر فرم میں جاب مل گئی جسے اس وقت کے لحاظ سے معقول ہی کہا جاسکتا تھا۔

ہمارے گھر بھی ایک ہی کالونی میں تھے کیونکہ اس کے والد اور میرے ابو ایک ہی سرکاری محکمہ میں کام کرتے تھے اور ہماری دوستی کی وجہ سے دونوں گھروں میں بھی تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کی پانچ بہنیں تھیں اور وہ ان کا اکلوتا بھائی تھا لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ گھر میں اس کی وہ پوزیشن نہیں تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ والدین کا لاڈلا اور بہنوں کی آنکھ کا تارا ہوتا لیکن وہاں اس کے برعکس معاملہ تھا۔ ہر معاملہ میں بیٹیوں کو ترجیح دی جاتی اور اسے نظر انداز کیا جاتا۔ یہاں تک کہ پوری فیملی سنیما دیکھنے جاتی اور وہ گھر میں رہتا۔

میں نے کبھی اس کے والدین سے اس کے لیے کوئی اچھی بات نہیں سنی بلکہ وہ ہمیشہ اس کی برائی کرتے تھے اور اس کے ہر فعل کو شک کی نگاہ سے دیکھتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ گھر والوں سے دور ہوتا گیا اور اس نے برے دوستوں کی صحبت اختیار کرلی۔ پہلے اس نے سگریٹ پینا شروع کی پھر خواب آور گولیوں کا سہارا لیا۔ جب گھر میں کوئی جھگڑا ہوتا تو وہ ان گولیوں کی زیادہ مقدار حلق میں انڈیل لیتا اور دو دو دن تک سوتا رہتا۔

مجھے جب اس بات کا علم ہوا تو میں زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنے لگا لیکن میرے اپنے بھی مسائل تھے۔ میری شادی ہو چکی تھی اور دفتر سے آنے کے بعد مجھے گھر کے معاملات بھی دیکھنا ہوتے تھے۔ انہی دنوں میرا مکان بھی بن رہا تھا۔ اس کے سلسلے میں بھی بھاگ دوڑ کرنا پڑ رہی تھی۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود میں ایک دن چھوڑ کر اس سے ضرور ملتا۔ ہم گھر کے باہر پلیا پر بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے لیکن وہ اتنا اعلیٰ ظرف انسان تھا کہ اس نے کبھی اپنے گھر والوں کی زیادتیوں کا شکوہ نہیں کیا لیکن نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ اگر اس کے پاس پیسا ہوتا تو اس کے ساتھ یہ سلوک نہ ہورہا ہوتا۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی اور میں نے اسے سمجھانے کی خاطر کہا۔ ''تم ایسا کیوں سوچتے ہو تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ اچھا کھاتے ہو، اچھا پہنتے ہو، برسر روزگار ہو۔ تمہارے سامنے ترقی کے مواقع ہیں۔ اپنی سواری ہے۔ عمدہ برانڈ کے سگریٹ پیتے ہو۔ تمہاری شامیں شہر کے بہترین ہوٹلوں اور ریستورانوں میں گزرتی ہیں۔ تمہارے اوپر کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ اس کے برعکس مجھے دیکھو، میرا باپ مرگیا ہے۔ مجھ پر ماں کے علاوہ چار بہنوں، بیوی اور بچی کی ذمہ داری بھی ہے۔ میری تنخواہ تم سے کم ہے۔ اس کے باوجود گزارہ ہورہا ہے۔''

''یار تم میرا مسئلہ نہیں سمجھو گے۔'' وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ میرے ساتھ گھر والوں کا کیا رویہ ہے۔ والدین کی بات تو جانے دو چھوٹی بہنیں بھی ہر وقت طنز کے تیر برساتی ہیں۔ ہاں اگر میں ان کا کوئی کام کردوں یا کوئی چھوٹی موٹی چیز لے آؤں تو دو چار دن کے لیے ان کا رویہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ سارا مسئلہ پیسے کا ہے۔ اگر میں ہر مہینے گھر کے خرچ کے لیے امی کے ہاتھ پر ایک ٹھیک ٹھاک رقم رکھ دوں۔ بہنوں کو وقتاً فوقتاً جوڑے بنا کر دیتا رہوں۔ انہیں فلمیں دکھاؤں۔ آئس کریم کھلانے کے لیے لے جاؤں تو سب مجھ سے خوش رہیں گے۔''

''تم غلط سوچ رہے ہو۔'' میں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ''خونی رشتوں میں پیسے کا کوئی رول نہیں ہوتا۔ میری بھی ماں ہے۔ چار بہنیں ہیں لیکن میں ان کے لیے الگ سے کچھ نہیں کرتا۔ ہاں انہیں وقت ضرور دیتا ہوں۔ دفتر سے آنے کے بعد پہلے امی کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کرتا ہوں پھر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ اسی طرح بہنوں سے بھی گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلقات مثالی ہیں۔''

''یار تم اپنی بات رہنے دو۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''تمہارے گھر کا ماحول بالکل مختلف ہے، تمہیں اپنے گھر میں جو عزت و احترام ملتا ہے میرے حصے میں اس کا دسواں بھی نہیں آتا۔''

''تم نے کبھی غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟''

''ہاں اس کی وجہ میری بہنیں ہیں۔ انہوں نے میرے ماں باپ کو مجھ سے بری طرح بدظن کردیا ہے۔ ہر وقت امی کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ میں تو پہلے ہی ان کی نظروں میں برا تھا لیکن اب تو میں بالکل ہی ان کے دل سے اتر گیا ہوں۔''

''اگر یہ مان لیا جائے کہ تم ان کی نظروں میں برے تھے تو کیا تم نے خود بھی اچھا بننے کی کوشش کی؟''

''ہمارے درمیان فاصلے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اب کوئی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی۔ اب ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ میں ان کا منہ پیسوں سے بند کردوں تاکہ ہر وقت کے طعنوں سے جان چھوٹ جائے۔''

وہ ایک بار پھر گھوم پھر کر پیسوں پر آگیا تھا۔ میں نے جل کر کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ پیسے آئیں گے کہاں سے؟ تم جس فیلڈ میں کام کررہے ہو وہاں تو اتنا بڑا جمپ ملنا بہت مشکل ہے۔ یہی ہوسکتا ہے کہ تم کسی ایسے سرکاری محکمے میں ملازمت کرلو جہاں بے حساب اوپر کی آمدنی ہو۔ اسی طرح تمہارے پیسے کمانے کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔''

''مشکل ہے۔ وہاں بھی پیسا چلتا ہے۔ پہلے پیسے دے



کر جاب خریدو پھر کماؤ۔''

''پھر تم نے کیا طریقہ سوچا ہے پیسے کمانے کا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت سوچنے کے بعد میرے ذہن میں ایک ہی ترکیب آئی ہے اور وہ یہ کہ میں ملک سے باہر چلا جاؤں۔ سنا ہے کہ دبئی میں کمپیوٹر والوں کو بہت اچھے پیسے ملتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن اس میں بھی کافی خرچا آئے گا۔ دو تین لاکھ تو ایجنٹ ہی لے لے گا۔ پھر ٹکٹ، پاسپورٹ، ویزا

PakiBooks.site

دں بکھیڑے ہیں۔"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔" اس نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ادھار قرض کروں گا یا کوشش کروں گا کہ ابا کے دل میں رحم آجائے اور وہ اپنی جمع پونجی میں سے کچھ پیسے مجھے دے دیں۔"

مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ اس کے ابا تو یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ گھر کی ذمہ داریوں میں اپنا حصہ ڈالے۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ راشد گھر میں کچھ نہیں دیتا۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے اپنا پیسا بیٹیوں کی شادیوں کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ وہ بھلا اپنی رقم کیوں توڑتے۔

میں نے راشد کو سمجھایا کہ فی الحال وہ باہر جانے کا خیال دل سے نکال دے اور دل لگا کر کام کرے۔ دو تین سال میں اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو جائیں گے کہ اسے کسی سے کچھ مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور وہ اپنے پیسوں سے ہی باہر جانے کا انتظام کرلے گا۔ اس نے میری بات سن تو لی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا عادی ہے شاید وہ اتنا انتظار نہ کر سکے۔

میرے مسلسل سمجھانے اور نصیحتیں کرنے کا اتنا اثر تو ہوا کہ اس نے وقتی طور پر ملک سے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پوری سنجیدگی سے اپنے کام پر توجہ دینے لگا تھا۔ وہ باقاعدگی سے دفتر جا رہا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے خواب آور گولیاں لینا چھوڑ دی ہیں۔ وہ بظاہر ہشاش بشاش لگ رہا تھا لیکن اس کے گھر والوں کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اب بھی اس سے اسی بے رخی سے پیش آرہے تھے۔

ایک دن میں اس سے ملنے گیا تو وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے والد نے مجھے اندر بلا لیا اور مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اس کی امی میرے لیے چائے بنا کر لائیں اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔ "تمہیں معلوم ہے کہ اسے کیا تنخواہ ملتی ہے۔"

مجھ سے اس کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی اور مجھے پتا تھا کہ وہ کتنی تنخواہ لے رہا ہے لیکن میں نے بتانا مناسب نہ سمجھا البتہ مجھے حیرت ضرور تھی کہ اس کے گھر والوں کو یہ بات معلوم نہیں اس لیے میں نے ڈھیٹ بن کر پوچھ لیا۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں۔" وہ طنزیہ انداز میں بولیں۔ "جوان اولاد ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے لیکن ہمیں اس کی ملازمت سے کوئی فیض نہیں پہنچ رہا۔ وہ گھر میں ایک پیسا نہیں دیتا بلکہ مہینے کے آخری دنوں میں اس کی جیب بالکل خالی ہوتی ہے اور موٹر سائیکل میں پیٹرول ڈلوانے کے لیے بھی مجھ سے پیسے مانگتا ہے۔"

ان کی بات سن کر میں سمجھ گیا کہ وہ باہر جانے کے لیے پیسے جمع کر رہا ہے پھر بھی میں نے اس کی امی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت بری بات ہے۔ اسے اپنی ذمے داری کا احساس ہونا چاہیے۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ آگیا اور ہم دونوں اپنے معمول کے مطابق ٹہلنے کے لیے باہر چلے گئے۔ اپنی مخصوص پلیا پر پہنچ کر اس نے سگریٹ سلگائی اور بولا۔ "یار! تیرے پاس کچھ پیسے ہوں گے۔"

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اسے میرے مالی وسائل اور ذمے داریوں کا بخوبی علم تھا۔ یہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ کس طرح مہینا پورا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا پھر بھی میں نے صاف انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور شرمندگی کے انداز میں کہا۔ "زیادہ تو نہیں البتہ سو دو سو دے سکتا ہوں۔"

"وہی دے دو، بائیک میں پیٹرول ڈلوانا ہے گھر والوں سے مانگوں گا تو دس باتیں سننے کو ملیں گی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری تنخواہ کہاں چلی جاتی ہے جب کہ تم گھر میں بھی کچھ نہیں دیتے کیا جمع کر رہے ہو؟"

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "اچھا تو انہوں نے تمہارے کان میں یہ بات بھی پھونک دی۔ میرے پاس کچھ ہو تو گھر میں دوں۔ جمع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کیا تم ساری تنخواہ اپنی ذات پر خرچ کر دیتے ہو جب کہ......"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب تم اپنی مثال دینے مت بیٹھ جانا۔ میرے اور تمہارے اخراجات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم کمپنی کی گاڑی میں آتے جاتے ہو۔ کھانا گھر والی دے دیتی ہے۔ دفتر میں کمپنی کی یونیفارم پہنتے ہو اس لیے کپڑوں کا بھی کوئی خرچا نہیں۔ تم سگریٹ بھی نہیں پیتے۔ میری تو ساری تنخواہ اسی میں نکل جاتی ہے پھر دفتر میں آئے دن پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ اب تمہی بتاؤ میں کیا گھر میں دوں اور کیا بچاؤں۔"

اس نے مجھے پوری بات نہیں بتائی۔ وہ بے حد فضول خرچ بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کبھی لنچ کرنے اکیلے نہیں جاتا۔ دفتر کا کوئی نہ کوئی کولیگ اس کے ساتھ ہوتا اور ظاہر ہے کہ اس کے لنچ کا بل بھی وہی ادا کرتا ہوگا۔ اسے چائے پینے کا بہت شوق تھا۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کے پاس دن بھر لوگ آتے رہتے اور وہ ہر ایک کی خاطر تواضع چائے، بسکٹ اور پیسٹری سے کیا کرتا۔ اس کے علاوہ اس کے کچھ اور شوق بھی تھے جن کا مجھے بعد میں پتا چلا۔

ہوا یوں کہ ایک دن ہم دونوں نے صدر میں واقع کیفے جارج میں کھانے کا پروگرام بنایا، مجھے کمپنی سے بونس ملا تھا اور یہ دعوت میری طرف سے تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ پہلے ہم اوڈین میں فلم دیکھیں گے۔ اس کے بعد جارج میں کھانا کھا کر گھر واپس آجائیں گے۔ میں ٹھیک پانچ بجے جارج پہنچ گیا کیونکہ راشد نے وہیں ملنے کے لیے کہا تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ بھی آگیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی فلم شروع ہونے میں دیر ہے۔ تو میرا ایک کام کر دے۔"

میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہنے لگا۔ "ایک مصیبت میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"یار وہ پائینر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ آج ہمارا ملنے کا پروگرام تھا لیکن رات کو یہ سیٹنگ ہوگئی اب اگر میں اس سے ملنے چلا گیا تو ہمارا سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا۔"

"اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مت جاؤ۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد خود ہی چلی جائے گی۔"

یہاں میں یہ وضاحت کردوں کہ اس وقت موبائل فون نہیں آیا تھا اور لینڈ لائن فون بھی کسی کسی گھر میں ہوتا تھا۔ اس لیے فون پر اس سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسے میرا مشورہ پسند نہیں آیا۔ وہ کہنے لگا۔ "نہیں یار یہ بداخلاقی ہوگی۔ میں اسے انتظار کی اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے بے زاری کے عالم میں کہا۔

"بس تو وہاں جا کر اس سے کہہ دے کہ راشد کو اچانک ایک ضروری کام سے حیدرآباد جانا پڑ گیا اس لیے وہ آج نہیں آسکے گا۔"

"لیکن میں اسے پہچانوں گا کیسے؟"

"وہ عام طور پر سیاہ دوپٹا سر پر اوڑھتی ہے اور سب سے آخر میں کونے والی میز پر بیٹھی ہوگی۔"

مجھے بادلِ ناخواستہ جانا پڑا۔ واقعی وہ سیاہ دوپٹا اوڑھے اسی میز پر بیٹھی تھی جو راشد نے بتائی تھی پھر بھی میں نے احتیاطاً تصدیق کرنا ضروری سمجھا اور اس کے قریب جا کر بولا۔ "ایکسکیوزمی! کیا آپ راشد کا انتظار کر رہی ہیں؟"

اس نے مجھے چونک کر دیکھا اور بولی۔ "جی لیکن آپ کون ہیں؟"

"میں راشد کا دوست ارشد ہوں اور اسی نے مجھے بھیجا ہے۔"

"بیٹھیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ خود کیوں نہیں آئے؟"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دراصل اسے رات ایک ضروری کام سے حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ میں یہی بتانے آیا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے ایک ادا سے کہا۔ "اچھا ہوا، آپ آگئے ورنہ میں بلاوجہ انتظار کرتی رہتی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹھیں۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔ "ہمارے ساتھ ایک پیالی چائے ہی پی لیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی فلم شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ [illegible]

[illegible]

ہیں اور یہ تو آپ کو معلوم [illegible] اور جاتا میزبان کی مرضی [illegible]

مجھے اس کی شوخی اور [illegible] ہوئی۔ ایسی دو نمبر لڑکیوں کی کمی نہیں جو مردوں [illegible] بنانے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ راشد نہیں آیا تو اس نے مجھ پر ہی ڈورے ڈالنا شروع کر دیے۔

اس نے چائے بنائی اور میری طرف کپ بڑھاتے

ہوئے بولی۔ ’’آپ کی کوئی گرل فرینڈ ہے؟‘‘

’’جی نہیں۔‘‘ میں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ ’’ابھی تک اس نعمت سے محروم ہوں۔‘‘

’’حیرت ہے۔‘‘ وہ قدرے آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ’’آج کل تو ہر کسی کی گرل فرینڈ ہوتی ہے۔‘‘

’’اسے میری بدقسمتی سمجھ لیں۔‘‘

’’کوئی بات نہیں، میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں۔ میری ایک دوست ہے۔ میں اس سے آپ کا تعارف کروا دیتی ہوں۔ وہ بھی سنگل ہے۔ آپ دونوں کی جوڑی خوب جچے گی۔‘‘

میں نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا۔ ’’سوری لیکن میں ڈبل ہوں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ وہ چونکتے ہوئے بولی۔

’’مطلب یہ کہ میری شادی ہوچکی ہے اور میں ایک بچی کا باپ ہوں۔‘‘

’’اوہ!‘‘ اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی شدہ مردوں کی بھی گرل فرینڈ ہوتی ہیں۔‘‘

’’معاف کیجیے، میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر منہ مارتے پھرتے ہیں۔ میں اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔‘‘ یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ گیا اور بولا۔ ’’اب میں اجازت چاہوں گا۔ آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔‘‘

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ’’دور فٹے منہ، لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور تیز تیز قدموں چلتا ہوا ہوٹل سے باہر آگیا۔‘‘ راشد بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ’’کہاں رہ گئے تھے یار، فلم کا وقت نکلا جارہا ہے۔‘‘

’’میں کیا کرتا۔‘‘ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ’’تمہاری چھمک چھلو جان ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے رسی تڑا کر آیا ہوں۔‘‘

’’سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ انہیں تو بس بات کرنے کا بہانا چاہیے۔‘‘

فلم دیکھنے کے بعد ہم ہوٹل میں کھانا کھانے آئے تو میں نے اس سے پوچھا۔ ’’یہ لڑکی کون ہے اور تم اسے کب سے جانتے ہو؟‘‘

’’یہ نوکری کی تلاش میں ہمارے دفتر آئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ فی الحال ہمارے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس پر وہ رونے لگی اور بولی کہ اسے ملازمت کی سخت ضرورت ہے ورنہ اس کے گھر میں فاقوں کی نوبت آجائے گی۔ اس پر مجھے ترس آگیا۔ میں نے کہا اپنی سی وی دے جاؤ۔ میں تمہارے لیے کسی اور جگہ کوشش کرتا ہوں۔ بس اس دن سے یہ میری جان کو اٹک گئی ہے۔ روزانہ فون کرکے تنگ کرتی رہتی ہے۔ بہانے بہانے مجھے ہوٹل بلالیتی ہے اور اتنے معصومانہ انداز میں اپنی ضرورتیں بیان کرتی ہے کہ مجبوراً مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔‘‘

’’وہ ٹھیک لڑکی نہیں ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس سے فوراً جان چھڑاؤ ورنہ تمہاری ساری تنخواہ اس پر خرچ ہو جائے گی۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اب یہی کرنا پڑے گا۔‘‘

اس کی دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور اب اس کا نمبر تھا لیکن گھر میں کسی کو اس کی شادی کی فکر نہیں تھی۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا لیکن میری شادی ہوئے بھی پانچ سال ہوچکے تھے۔ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں اسے شادی کرنے کا مشورہ دیا تو وہ بولا۔ ’’یہ تو میرے گھر والوں کو سوچنا چاہیے۔ میں اپنے منہ سے تو نہیں کہہ سکتا کہ میری شادی کردو۔‘‘

’’بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ تیس کے ہوچکے ہو۔‘‘

’’میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ پہلے باقی تینوں بہنوں کی شادیاں ہو جائیں ورنہ یہ سب مل کر آنے والی کا برا حشر کردیں گی اور میری زندگی جہنم بن کر رہ جائے گی۔‘‘

اس کی بات میں وزن تھا لیکن صرف اس وجہ سے تو شادی میں تاخیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ نہ جانے بہنوں کی شادیوں میں کتنا وقت لگے۔ تب تک تو وہ بوڑھا ہو جائے گا۔ میں نے اسے سمجھانے کی خاطر کہا۔ ’’یہ سب بے کار کی باتیں ہیں ضروری نہیں کہ ویسا ہی ہو جو تم سوچ رہے ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔‘‘

’’دیکھا جائے گا۔‘‘ وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے شادی کی کوئی جلدی نہیں۔ اس سے پہلے میں کچھ بننا چاہتا ہوں۔‘‘

کچھ بننے سے اس کی مراد باہر جاکر پیسے کمانا تھی لیکن اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے عملاً اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا پلاننگ تھی۔ ایجنٹ کو دینے کے

لیے وہ پیسوں کا انتظام کہاں سے کرے گا۔ میں جانتا تھا کہ اگر یہی حالات رہے تو اس کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا اس لیے میں نے اس سے اس موضوع پر گفتگو کرنا ضروری نہ سمجھا۔

’’میرا خیال تھا کہ کسی دن اس کی غیر موجودگی میں اس کے والدین کے سامنے شادی کا ذکر چھیڑوں گا۔ معلوم تو ہو کہ اس بارے میں وہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ شادی کے بعد اس کے حالات کافی حد تک بہتر ہو جائیں گے اور اسے گھر میں وہی مقام درجہ حاصل ہو جائے گا جو اکلوتے بیٹے کو ہوتا ہے۔ شادی کے بعد اسے خود بھی اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوگا اور وہ گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس طرح اس کے والدین کی شکایت دور ہو جائے گی اور وہ اسے لعن طعن کرنا چھوڑ دیں گے۔‘‘

چند دن بعد ہی مجھے یہ موقع مل گیا۔ وہ کمپنی کے کام کے سلسلے میں دو روز کے لیے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ میں خیریت معلوم کرنے کے بہانے اس کے گھر گیا اور اس کے والدین کے سامنے شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کی امی منہ بناتے ہوئے بولیں۔ ’’کس برتے پر کروں شادی۔ یہ کچھ کرتا ورتا تو ہے نہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’خالہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ اچھی خاصی جاب ہے اس کی۔ ہزاروں سے اچھا ہے۔ پھر آپ نے کیسے کہہ دیا کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا۔‘‘

اس کے ابا بولے۔ ’’ہم کیسے یقین کرلیں۔ اس نے تو آج تک ہمارے ہاتھ پر کچھ نہیں رکھا۔ نہ کبھی گھر کے لیے کوئی چیز لے کر آیا۔ ایسی کمائی کا کیا فائدہ جو سب اپنے اوپر خرچ ہو جائے۔‘‘

’’شادی کردوں گی تو اس کی بیوی کی ذمے داری بھی ہم پر آجائے گی۔ وہ تو اسے کبھی ایک جوڑا بنا کر بھی نہیں دے گا۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ شادی کے بعد اسے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوگا اور وہ اپنے اخراجات میں کٹوتی کرکے گھر کو سپورٹ کرے گا۔‘‘

’’سچ پوچھو تو میری بڑی آرزو ہے کہ اس کے سر پر سہرے کے پھول دیکھوں۔‘‘ اس کی امی بولیں۔ ’’میں نے تو اس کے لیے ایک دو لڑکیاں بھی دیکھ رکھی تھیں لیکن اس کے لچھن دیکھ کر بات نہیں چلاتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی بھی اپنی قسمت کو روئے اور نہیں دن رات کوسنے دے۔‘‘

’’ایسا کچھ نہیں ہوتا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’آپ اللہ کا نام لے کر اس کی شادی کردیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

ان کی باتوں سے مجھے لگا کہ وہ خود بھی راشد کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں لیکن اس کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں تھی۔ وہ دونوں اسے نکما، غیر ذمے دار، بے پروا اور فضول خرچ سمجھتے تھے پھر ایک دن راشد نے بتایا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کی ہونے والی بیوی ساجدہ ان کی دور پرے کی

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
مرزا ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

PakiBooks.Site

رشتے دار تھی۔ اس کے والد ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے اور اب اپنے علاقے میں ایک کمیونٹی سینٹر چلا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی بڑی عزت تھی اور لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سب بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ایک بھائی امریکا اور دوسرا بینک میں آفیسر تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ راشد کی امی نے اسے ایک شادی میں دیکھا تھا۔ وہ لڑکی انہیں پسند آئی اور انہوں نے بیچ میں ایک رشتہ دار خاتون کو ڈال کر پیغام بھیج دیا۔

راشد میں بظاہر ایسی کوئی خامی نہیں تھی جس کی بنیاد پر اسے مسترد کیا جاتا چنانچہ اس کا رشتہ قبول کر لیا گیا اور شادی کی تاریخ طے پا گئی۔ اب شادی کے اخراجات کا مسئلہ سامنے تھا۔ راشد کی امی نے صاف کہہ دیا کہ وہ صرف اس کی بری بنائیں گی۔ ولیمہ کا انتظام اسے خود کرنا ہوگا۔ یہ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ میرا ہاتھ ویسے ہی تنگ تھے۔ میں اس کی کیا مدد کرتا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دفتر سے کچھ رقم ایڈوانس کے طور پر لے لے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی کمی رہ گئی تو ہم سب دوست مل کر پورا کر دیں گے۔

ایسا ہی ہوا اور راشد کی شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ اس کی دلہن ساجدہ بلاشبہ بہت حسین تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خوب صورت لڑکیاں بہت کم دیکھی تھیں۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، بھرے بھرے ہونٹ اور لمبے سیاہ بال۔ راشد تو اس پر سو جان سے فدا ہو گیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے کمرے میں بند رہتا اور اس کی صبح بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر کمرے میں بند ہو جاتا۔ شام کو دونوں میاں بیوی گھومنے نکل جاتے اور ان کی واپسی رات گئے ہوتی۔

اس کا جو ردِ عمل سامنے آیا۔ اس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن میں اس سے ملنے گیا تو وہ حسبِ معمول اپنی بیوی کے ساتھ گھومنے گیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی امی پھٹ پڑیں اور بولیں۔ ''تم دیکھ رہے ہو اس کے چھن۔ جس دن سے اس کی شادی ہوئی ہے ہم اس سے بات کرنے کو ترس گئے۔ چوبیس گھنٹے میں بمشکل ایک دو مرتبہ ہی اس کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔''

میں نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب وہ دفتر جانے لگے گا تو حالات معمول پر آ جائیں گے۔''

''کیا خاک معمول پر آئیں گے۔'' اس کے ابا ترخ کر بولے۔ ''اس کی چھٹی ختم ہو چکی ہے لیکن اسے کوئی پروا نہیں۔ اگر یہی حال رہا تو اسے نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائیں گے۔''

یہ سنتے ہی میرے قدموں تلے زمین نکل گئی۔ ''اگر خدانخواستہ اس کی نوکری ختم ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اسے سمجھاؤں گا اور زبردستی کام پر بھیجوں گا۔''

''تم کیا سمجھاؤ گے، کیا اس میں اتنی عقل نہیں ہے کہ اگر نوکری چلی گئی تو اپنا اور بیوی کا خرچا کیسے پورا کرے گا۔ دنیا کی شادیاں ہوتی ہیں لیکن ہم نے کسی کو اس طرح بیوی پر فدا ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے حور پری مل گئی ہے۔ بس اسے لیے لیے اڑتا پھروں۔'' اس کی امی بولیں۔

ان کے آخری جملے سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ انہیں راشد کا اپنی بیوی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا پسند نہیں۔ یہ مسئلہ اکثر گھروں میں ہوتا ہے۔ جب بھی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ گھر سے باہر جانے لگتی ہے تو ساس نندوں کو تکلیف ہونے لگتی ہے، خود میرے اپنے گھر میں بھی یہی صورتِ حال تھی لیکن میری بیوی نے کبھی اسے سنجیدہ نہیں لیا اور ہمیشہ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کی۔ میں نے بھی انہیں چھیڑنے کے لیے کہہ دیا۔ ''خیر باہر گھومنا تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں لیکن اسے دفتر ضرور جانا چاہیے۔''

وہ برہم ہوتے ہوئے بولیں۔ ''دوست ہو نا اس کے، اس لیے اسی کی زبان بولو گے لیکن مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں۔ عورت کو گھر میں رہنا چاہیے۔ کبھی کبھار میکے جانے میں کوئی حرج نہیں۔''

دوسرے دن میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور دفتر نہ جانے پر خوب لعن طعن کی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔ ''تم بھی ان لوگوں کی باتوں میں آ گئے۔ انہیں کچھ پتا تو ہوتا نہیں ہے بس الٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہیں۔''

''تو کیا وہ غلط ہے کہ تم دفتر نہیں جا رہے؟''

''نہیں یہ سچ ہے اس لیے کہ میں نے ایک ہفتہ کی چھٹی بڑھوائی تھی۔ دراصل ہمارا ارادہ شمالی علاقوں کی سیر کے لیے جانے کا تھا لیکن پیسے کم پڑ گئے اس لیے اس پروگرام پر عمل نہ ہو سکا۔ اب میری چھٹی ختم ہو گئی ہے۔ کل سے کام پر جاؤں گا۔''

میں یہ سن کر مطمئن ہو گیا۔ انہی دنوں خالہ زاد بھائی اسد ملازمت کی تلاش میں راولپنڈی سے کراچی آیا۔ اس نے

کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا تھا لیکن اسے اپنے شہر میں جاب نہیں مل رہی تھی۔ میں نے راشد سے ذکر کیا تو وہ بولا۔ ''جگہ تو نکل آئے گی دیکھو میں باس سے بات کرتا ہوں۔''

راشد کی کوشش سے اسد کو اس کی کمپنی میں جاب مل گئی۔ وہ ماموں کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ البتہ اس کا اتوار کا دن ہمارے یہاں گزرتا۔ وہ جاب ملنے پر بہت خوش تھا اور راشد کی بڑی تعریفیں کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ راشد جیسا ذہین اور قابل شخص پوری کمپنی میں کوئی نہیں اسی لیے تمام اہم پروجیکٹ ان کے حوالے کیے جاتے ہیں لیکن ان میں ایک خرابی ہے کہ یہ کسی بات پر سمجھوتا نہیں کر سکتے اور نہ ہی باس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اسی لیے ہر وقت کسی نہ کسی سے ان کا جھگڑا چلتا رہتا ہے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے لیکن میری غلط فہمی اس وقت دور ہو گئی جب ایک دن راشد میرے پاس آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''سلیم! ایک بات تو بتاؤ۔ کیا شادی اسی کا نام ہے کہ دفتر سے آؤ۔ کچھ دیر ماں بہنوں کی جلی کٹی باتیں سنو اور پھر کمرے میں بند ہو جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''خیریت تو ہے۔ کمرے میں بند ہونے کی نوبت کیوں آ گئی؟''

''یار گھر والوں نے میری زندگی عذاب کر دی ہے۔ اس سے تو میں کنوارا ہی اچھا تھا۔''

''آخر پتا تو چلے بات کیا ہے؟''

''دیکھو سلیم ہر لڑکی کچھ خواب لے کر شوہر کے گھر آتی ہے۔ اس کے بھی کچھ ارمان ہوتے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ شوہر اس کی ناز برداری کرے۔ اسے گھمائے پھرائے۔ اس کے [illegible]

علی خان (جمال ابڑو کے والد) جونا گڑھ کالج میں پڑھنے کے لیے گئے تھے۔ ان دنوں وہاں نواب مہابت خان کی حکومت تھی اور تعلیم مفت تھی۔ وہاں بھی علی خان پوری یونیورسٹی میں اوّل نمبر آئے۔ انٹر میں اوّل نمبر، بی اے میں اوّل نمبر۔ اس طرح ایم اے تک اوّل نمبر آتے رہے۔ انہوں نے یہ ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا کہ اس سے پہلے کسی نے بھی یہ کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ اس طرح علی خان وہ پہلے شخص تھے جس نے ایسی حیرت انگیز کامیابی سرانجام دی۔ وہ پہلے سندھی مسلمان تھے جنہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔

اقتباس: پاکستانی ادب کے معمار
از: منظور علی ویسریو

تم ہی اس کے وارث ہو۔ بہنوں کا کیا ہے وہ آج نہیں تو کل اپنے گھروں کو چلی جائیں گی۔''

''یار بہت مشکل ہے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''بہر حال میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا اور وہ ایک بچی کا باپ بن گیا۔ وہ پوری توجہ اور محنت سے کام کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے بھی نباہ کرنے کی بڑی کوشش کی۔ وہ بڑی صابر شاکر عورت تھی۔ دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ پندرہ بیس دن میں ایک مرتبہ میکے چلی جاتی۔ وہ بھی اس کی ساس کو ناگوار گزرتا تھا۔

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ اس کی تینوں بہنوں کی یکے بعد دیگرے شادیاں ہو گئیں۔ اس کے یہاں دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو ماں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ان کے دل میں پوتا کھلانے کی آرزو مچل رہی تھی۔ دوسری بیٹی کی پیدائش پر انہوں نے خوب باتیں سنائیں۔ پانچوں بیٹیاں بھی ان کی ہمنوا تھیں۔ راشد نے جب مجھے یہ بات بتائی تو میں بھی پریشان ہو گیا تاہم میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ صبر سے کام لے اور سب باتوں کو نظر انداز کر کے اپنی بچیوں پر توجہ دے۔

حالات جب قابو سے باہر ہو گئے تو اس نے ایک بار پھر خواب آور گولیوں کا سہارا لیا۔ وہ دفتر سے تھکا ہارا گھر آتا تو اس کی ماں دن بھر کا کچا چٹھا لے کر بیٹھ جاتی۔ بہو کی چھوٹی

PakiBooks.Site

چھوٹی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی اور وہ چپ کر رہ جاتا۔ رات کو اس کی بیوی شکایتوں کا دفتر لے کر بیٹھ جاتی اور رو رو کر ظلم کی داستان بیان کرتی۔

راشد کے پاس اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا۔ وہ خواب آور گولیاں کھا کر سو جاتا اور پھر دو دن تک سوتا رہتا۔ اس کی آئے دن کی غیر حاضری سے اسد بھی پریشان ہو گیا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ راشد صاحب کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ شام کو اچھے بھلے گھر جاتے ہیں اور پھر دو تین دن کے لیے غائب۔ اب تو دفتر والے بھی ان کی اس عادت سے پریشان ہو گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں انہیں فارغ نہ کر دیا جائے۔“

اسد کا خدشہ درست ثابت ہو گیا۔ دفتر والوں نے کچھ عرصہ تو اس کی غیر حاضریوں کو برداشت کیا لیکن ایک دن اس کی ملازمت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد راشد کی زندگی کا مشکل ترین دور شروع ہوا۔ ایک طرف مالی پریشانی تو دوسری جانب گھر والوں کے طعنے تشنے۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ اس کے پاس بچیوں کے دودھ اور اپنے لیے سگریٹ کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔

اس صورتِ حال سے تنگ آ کر اس کی بیوی نے ایک اسکول میں ٹیچر کی ملازمت کر لی۔ تنخواہ تو اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن کم از کم وہ اپنی بچیوں کی ضرورتیں پوری کر سکتی تھی۔ بڑی بیٹی نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی فیس، کاپیوں اور کتابوں کا خرچ الگ تھا۔

راشد نے اس کے بعد دو تین جگہ ملازمت کی لیکن کہیں بھی وہ دو تین مہینے سے زیادہ نہ ٹک سکا۔ اسے نشے کی لت پڑ گئی تھی اور خواب آور گولیوں کے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ دن بھر سوتا، شام کو دو چار گھنٹے کے لیے اس کی آنکھ کھلتی۔ وہ باہر جا کر دو چار سگریٹ پھونکتا۔ پیسے نہ ہوتے تو پنواڑی سے ادھار لیتا پھر ایک دن ایسا آیا کہ ادھار ملنا بھی بند ہو گیا تو اس نے بیوی سے پیسے مانگنا شروع کر دیے۔

ساجدہ بے چاری بہت مشکل میں پھنس گئی تھی۔ صبح اسکول جاتی۔ وہاں سے واپس آ کر گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ساس کی جلی کٹی باتیں اور نکھٹو شوہر کی ناز برداریاں برداشت کرنا پڑتیں، ایک رات وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اسکول کے بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی کہ راشد نے اس سے سر دبانے کی فرمائش کی۔ اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی وہ کام کر رہی ہے۔ صبح اسے وہ کاپیاں واپس کرنی ہیں۔ یہ سنتے ہی راشد کو طیش آ گیا۔ وہ غصے کے عالم میں بستر سے اٹھا اور اس کے ہاتھ سے کاپی چھین کر پھاڑ دی اور ساتھ ہی یہ نادر شاہی حکم بھی صادر فرما دیا کہ کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی۔

ساجدہ نے کاپیاں سمیٹ کر میز پر رکھیں اور منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔ دوسرے دن وہ معمول کے مطابق اٹھی۔ بچیوں کو ناشتا کرایا اور اسکول چلی گئی۔ راشد کو جب معلوم ہوا تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پی سی او جا کر اپنے سسر کو فون کیا کہ وہ ابھی اور اسی وقت اپنی بیٹی کو آ کر لے جائیں۔

وہ بے چارے دوڑے ہوئے آئے۔ گھر میں کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا اس لیے انہیں دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ اس کے سسر بہت معاملہ فہم اور سنجیدہ انسان تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ اس وقت راشد طیش میں ہے اس لیے اس سے کوئی بات کرنا ٹھیک نہ ہو گا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو تیار ہونے کے لیے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

راشد کے گھر والے حیران پریشان یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب انہوں نے ساجدہ کے جانے کی وجہ جاننا چاہی تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ یہ آپ اپنے بیٹے سے پوچھیں جب راشد کے گھر والوں کو اصل وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اسے برا بھلا کہنے لگے۔

دو تین دن بعد ہی راشد کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ ساجدہ کو لینے پہنچ گیا لیکن اس نے راشد کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ اس کے سسر نے بھی یہی کہا کہ پہلے وہ اپنے آپ کو ٹھیک کرے۔ اس کے بعد ہی وہ ساجدہ کو اس کے ساتھ بھیجیں گے۔

”ٹھیک کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ راشد نے انتہائی گستاخانہ انداز میں کہا۔

”تم کام پر جانا شروع کر دو اور خواب آور گولیاں کھانا چھوڑ دو۔“

اس پر راشد نے ان سے بھی بدتمیزی کی۔ ساجدہ کا بھائی بھی بیچ میں آ گیا اور دونوں میں ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ راشد کے سسر نے اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور کہا کہ اگر وہ آئندہ کبھی ادھر آیا تو وہ پولیس میں اس کی رپورٹ کر دیں گے۔

بات اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ جب راشد کے والدین صلح صفائی کے لیے گئے تو ساجدہ نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے والد نے بھی پرانی شرطیں دہرائیں۔ ان میں ساجدہ نے ایک اور شرط کا اضافہ کر دیا اور کہا کہ جب تک راشد اس کے باپ سے معافی نہیں مانگے گا وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھے گی۔

راشد کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بے روزگاری، نشہ آور دواؤں کا استعمال اور بچیوں کی جدائی نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گیا تھا۔ اب تو وہ چلتے ہوئے بھی لڑکھڑانے لگا تھا۔ اس کے باوجود اس کے گھر والوں کو رحم نہ آیا۔ وہ ہر وقت اسے برا بھلا کہتے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس کے باپ نے اسے گھر سے نکل جانے کا کہہ دیا۔ بڑی مشکل سے اس کی بہنوں نے سمجھا بجھا کر انہیں ٹھنڈا کیا اور بھائی کی منت سماجت کرنے لگیں کہ وہ اپنے آپ کو سدھار لے۔

ایک دن میں اس سے ملنے گیا تو وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور مجھے ایک کاغذ پکڑا دیا۔ وہ وکیل کی جانب سے نوٹس تھا۔ ساجدہ نے اس سے خلع مانگی تھی۔ وہ روتے ہوئے کہنے لگا کہ ”کاش میرے پاس اتنے پیسے ہوتے کہ میں کوئی اچھا وکیل کر سکتا۔ میں مر جاؤں گا لیکن اسے خلع نہیں دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”ضد چھوڑ دو اور اس کے باپ سے معافی مانگ لو۔ یہی ایک آسان راستہ ہے۔“

اس نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ”مر جاؤں گا لیکن خلع نہیں دوں گا۔ اچھا ہے کہ وہ عدالت میں جائیں، کم از کم اس طرح مجھے بچیوں سے ملنے کی اجازت تو مل جائے گی۔“

یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے تین دن بعد اس کے انتقال کی خبر آ گئی۔ گھر والوں نے یہی بتایا کہ وہ رات میں کسی وقت پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ شاید اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے زیادہ مقدار میں گولیاں کھا لیں اور وہ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

کچھ عرصہ رو دھو کر سب لوگ اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ اس کی بچیاں جوان ہو گئیں۔ ماں نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور اچھے گھروں میں ان کی شادیاں کر دیں۔ راشد کے ماں باپ ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔ صرف میرا دوست اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے کسی کو دوست نہیں بنایا۔ اب یہ خلا کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ میری ان تمام لوگوں سے جو مشترکہ خاندانی نظام میں رہتے ہیں ایک ہی التجا ہے کہ وہ اپنے اندر صبر، برداشت اور حوصلہ پیدا کریں ورنہ ان کا انجام بھی میرے دوست جیسا ہو گا۔

بہشتی دروازہ

روایت ہے کہ بابا فرید کے ایک سجادہ نشین کو خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی اور آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص مزار فرید کے اس دروازے سے گزر کر اگلے دروازے سے باہر نکل جائے گا اس کے سابق گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ راوی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض آثار میں ایک نام لکھا ہے اور بعض میں دوسرا لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس روایت کو پورے برصغیر میں پذیرائی حاصل ہے۔ 5 اور 6 محرم الحرام کو لاکھوں لوگ فرید فرید کا نعرہ لگا کر اس دروازے سے گزرتے ہیں۔ ان میں ناخواندہ، نیم خواندہ اور پڑھے لکھے بھی لوگ شامل ہوتے ہیں۔

مرسلہ: انور حسن۔ لاہور

امریکی ایئرفورس کا سابق ملازم 44 سالہ جیف رائٹر مسلسل 5 سال سے ہر صبح ڈزنی لینڈ جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ وہ یکم جنوری 2012 کو ڈزنی لینڈ گیا اور انہیں پورے سال کا پاس بطور تحفہ ملا تھا۔ اس کے بعد بلا ناغہ وہ اب تک ڈزنی لینڈ جا رہا ہے۔ اس دوران اسے ملازمت بھی مل گئی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنی پسندیدہ تفریح گاہ ضرور جاتا۔ جیف رائٹر کی پسندیدہ رائیڈز میں ”میٹرہارن بوب سلیڈز“ شامل ہیں لیکن وہ پارک میں گھومتا پھرتا رہتا ہے اور پارک کے عملے اور سیاحوں سے باتیں کر کے یا چھوٹے بچوں کو خوش دیکھ کر خود بھی سکون محسوس کرتا ہے۔ جیف کا کہنا ہے کہ میرا یہاں آنا ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں جیف نے کہا کہ میں اب بھی اس سے لطف اندوز ہو رہا ہوں، میں کسی ریکارڈ کے لیے نہیں آتا بلکہ پارک کی جادوگری سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ جیف مسلسل 2000 روز تک ڈزنی جانے والے دنیا کے واحد شخص بن گئے ہیں۔ ان کا ڈزنی پاس جنوری 2018 میں ختم ہو گا اور وہ جب تک یہاں آتے رہیں گے۔ ان کے مطابق ڈزنی نے ان کی زندگی بدل دی ہے اور یہیں ان کی ملاقات اپنی نئی دوست کیرن سے بھی ہوئی ہے اور اس دوران وہ اپنا 40 پاؤنڈ وزن بھی کم کر چکے ہیں۔

مرسلہ: یوسف وسیم۔ ملتان

PakiBooks.Site

شہ مات

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم

اس بار جو سچ بیانی لے کر آئی ہوں اس نے لکھتے ہوئے بار بار مجھے آبدیدہ کیا۔ بار بار میں نے آنسو پونچھے۔ پہلے میں نے اسے عام انداز میں لکھا لیکن مجھے کہانی پسند نہیں آئی اس لیے بالکل افسانوی انداز میں اسے تبدیل کردیا ہے۔ یعنی واقعات کو من پسند انداز میں موڑا ہے۔ مجھے اُمید ہے قارئین میرا یہ انداز بھی پسند کریں گے۔

آصفہ ضیاء احمد

(حیدرآباد)

گلریز خان نے پورچ میں کار رکنے کی آواز سنی تو خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ ”یہ لڑکی نہیں مانے گی۔ اپنے شوہر کو اور بچوں کو ملازمین کے حوالے کر کے میری خدمت اور تیمارداری کے لیے حاضر ہو جاتی ہے۔ بارہا سمجھایا لیکن......“ ان کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا ان کی بہن حرمت نے پردہ ہٹا کر جھانکا اور مسکراتے ہوئے بھائی کو سلام کیا۔ گلریز خان نے شفقت آمیز لہجے میں سلام کا جواب تو دیا لیکن چہرے پر خفگی کے آثار باقی رہے۔

حرمت نے فوراً بھانپ لیا کہ بھائی کا موڈ آف ہے اور موڈ بگڑنے کی وجہ بھی وہ خوب جانتی تھی لیکن اس نے انجان بنتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا بات ہے بھائی جان آپ کو شاید میری آمد اچھی نہیں لگی۔ کہیں تو واپس چلی جاؤں۔“

حرمت کی بات پر گلریز خان کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ بے ساختہ ہنس دیے اور محبت سے اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ ”میری جان بہنوں کی آمد بھی کہیں بھائیوں کو بری لگی ہے۔ جیسے ہی تو اس گھر میں قدم رکھتی ہے میں پھر سے جی اٹھتا ہوں۔ ساری بیماری رفع ہو جاتی ہے لیکن مجھے کوفت اور الجھن اس بات سے ہوتی ہے کہ تم اپنی گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر یہاں آجاتی ہو۔ تمہارے سسرال والے کیا سوچتے ہوں گے کہ ابھی تک اس لڑکی کا دل میکے سے نہیں بھرا اور پھر تمہارا شوہر اصغر، لاکھ وہ زبان سے کچھ نہ کہے لیکن میری بھنو کسی کی نرمی سے ناجائز فائدہ بھی نہ اٹھاؤ۔ بچوں کو بھی دادا دادی کے سر مار آتی ہو۔ کسی سگھڑ اور سلیقہ مند بہو کے یہ پھن نہیں ہوتے۔ تم نے تو ان لوگوں کو میٹھا گنا سمجھ لیا ہے۔ جڑ سے پیڑ تک کھانے میں لگی پڑی ہو۔“

چند لمحوں توقف کے بعد پھر انہوں نے نپے تلے انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میری طبیعت اب پہلے سے قدرے بہتر ہے، مناسب علاج اور پرہیز سے کافی افاقہ ہوا ہے۔ تم مطمئن رہو۔ میری بیماری اور تنہائی سے تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ رمضو بابا اپنا بڑھاپا اور بیماریوں کو ایک طرف رکھ کر میری دیکھ ریکھ میں لگے رہتے ہیں۔ تم میری فکر کرنے کی بجائے اپنا گھر بار سنبھالو۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ تمہاری کوئی شکایت لے کر میرے پاس آئیں تم اپنے رنگ ڈھنگ میں تبدیلی پیدا کرو ورنہ کل کلاں کو......“

حرمت نے فوراً جملہ اچک لیا اور تیوری چڑھا کر بولی۔ ”کل کلاں کو کچھ نہیں ہوگا اور جو ہوگا وہ اچھا ہی ہوگا۔ آپ فضول پریشان ہو رہے ہیں۔ اگر آج بھابی حیات ہوتیں اور گڑیا بیاہ کر پردیس نہ چلی جاتی تو میں اس قدر بے کل و بے قرار نہیں رہتی۔ کم از کم یہ تو اطمینان رہتا کہ بیوی نہ سہی بیٹی تو آپ کے پاس ہے۔ آپ بیمار اور کمزور انسان اور پھر مرے پر سو درے، دور دور تک اپنا پرایا کوئی نہیں۔ جب بھی آپ کا خیال آتا ہے میری تو راتوں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ رہے رمضو بابا تو وہ بے چارے خود چراغ سحر ہو رہے ہیں۔ آپا سلطنت اور باجی الفت اپنے اپنے گھروں میں ایسی مگن ہیں کہ ان کے پاس آپ کے لیے اور میرے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ اب لے دے کر آپ کی یہ بہن ہی رہ جاتی ہے جو آپ کی محبت میں نہ دن دیکھتی ہے نہ رات، نہ وقت دیکھتی ہے نہ گھڑی۔ بس دیوانہ وار دوڑی چلی آتی ہے۔ واہ بھائی جان واہ خوب صلہ دیتے ہیں آپ مجھے میری محبت اور خلوص کا۔“ یہ کہہ کر حرمت نے اپنا منہ پھلا لیا اور بھائی کی جانب پشت کر کے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

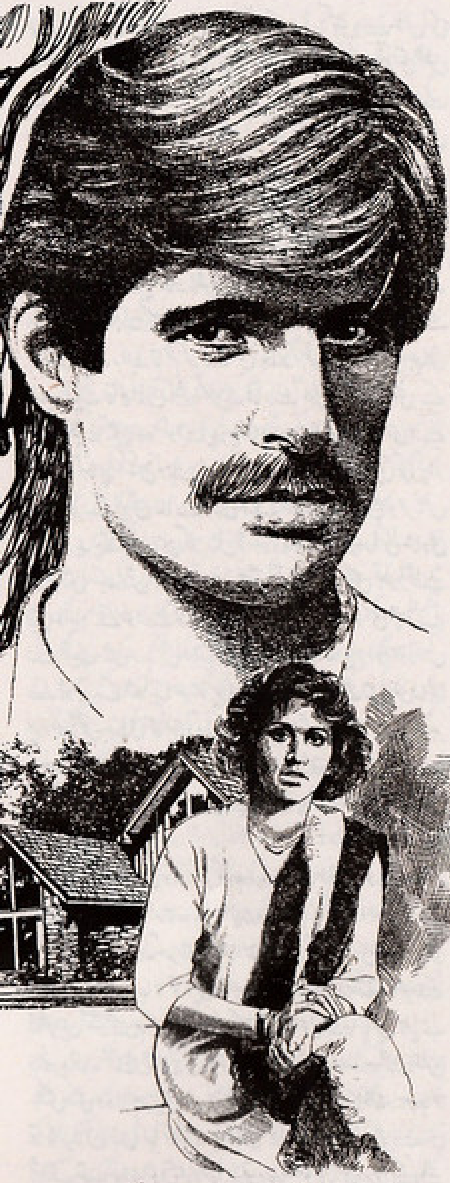
گلریز خان خفیف سا مسکرائے اور پھر کہا۔ ”اچھا بھئی معاف کروا اپنے بھائی کو، میں کچھ زیادہ ہی سخت سست کہہ گیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔

حرمت لہجے سے بھائی کی افسردگی بھانپ گئی۔ وہ تڑپ کر پلٹی اور گلریز خان کے سینے پر سر رکھ کر گلوگیر آواز میں بولی۔ ”نہیں بھائی جان آپ درست کہہ رہے ہیں۔ آپ مجھ سے کیوں معافی مانگ رہے ہیں۔ معافی تو دراصل مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ آپ سے بات کرتے ہوئے میرا لہجہ کافی گستاخانہ ہو گیا تھا۔ آئندہ میں خیال رکھوں گی۔“

گلریز خان نے ہنستے ہوئے بہن کے سر پر دست شفقت پھیرا۔ اسی اثناء میں رمضو بابا نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو دونوں کھانے کی میز پر آ گئے۔ کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ وہ باتوں میں اس طرح گم ہوئے کہ گزرتے ہوئے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ دیوار گیر کلاک پر نظر پڑتے ہی حرمت اٹھ کھڑی ہوئی اور اجازت طلب نگاہوں سے گلریز خان کی جانب دیکھنے لگی۔ انہوں نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر اللہ حافظ کہا اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حرمت کو رخصت کر کے وہ ملول اور افسردہ سے ہو گئے تھے۔ پھر تھکے تھکے سے قدموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور بیڈ پر لیٹ گئے۔

☆......☆

گلریز خان بظاہر تو انتہائی مستعد، صحت مند اور تروتازہ نظر آنے والا شخص تھا لیکن اندر سے وہ بیٹھا جا رہا تھا۔ اپنے طویل و عریض بنگلے میں اپنے بوڑھے ملازم رمضو بابا کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ چاہتا تو ملازموں کی ایک فوج اس کے اردگرد ہوتی لیکن زیادہ شور شرابہ اور ہلا گلا اسے پسند نہیں تھا۔ آدم بیزار تو خیر نہیں تھا لیکن ہرایرے غیرے سے ملنا پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں سیلز منیجر کے عہدے پر فائز رہا تھا۔ کمپنی کی جانب سے معقول تنخواہ، رہائش کے لیے لگژری فلیٹ، جدید ماڈل کی کار، پیٹرول، مرمت کے اخراجات اور اس کے علاوہ بے شمار مراعات اسے حاصل تھیں۔ مارکیٹنگ میں اسے بے پناہ مہارت حاصل تھی اور اس کی قابلیت کی وجہ سے کمپنی لاکھوں روپے منافع کما چکی تھی۔ بہتر ٹارگٹ حاصل کرنے پر کمپنی کی طرف سے اسے جو اضافی بونس دیا جاتا تھا وہ بھی لاکھوں پر مبنی ہوتا تھا اس لیے مالی طور پر ہمیشہ مستحکم اور آسودہ حال رہا۔ بھری جوانی میں اپنی حسین بیوی کا غم اٹھانا پڑا جو کہ ایک حادثاتی موت کا شکار ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد وہ مزید تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ اپنی ساری توجہ اس نے



اپنی اکلوتی بیٹی زارا پر مرکوز کردی تھی۔ زارا کی تعلیم و تربیت میں اپنے آپ کو اس طرح غرق کرلیا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا اور وقت ہوا کے دوش پر سوار گزرتا چلا گیا، دیکھتے ہی دیکھتے زارا نے بچپن اور لڑکپن کو خیرباد کہہ کر جوانی میں قدم رکھ دیا اور اس کے اپنے دروازے پر بڑھاپے اور گونا گوں

PakiBooks.Site

بیماریوں نے دستک دینا شروع کردیا۔ کمپنی نے اس کی ریٹائرمنٹ پر اس کی خدمات کا معاوضہ ایک خطیر رقم کی شکل میں دیا۔ آدمی جہاندیدہ اور تجربہ کار تھا۔ دوران ملازمت خود بھی کافی کچھ پس انداز کرلیا تھا۔ ورثے میں باپ کی چھوڑی ہوئی زمینوں کے علاوہ بازار کے بارونق ایریے میں دوتین دکانیں تھیں جو اس نے کرائے پر اٹھا رکھی تھیں۔ ہاں البتہ اپنا آبائی گھر جو کہ کافی گنجان آبادی میں واقع تھا وہ اس نے فروخت کردیا تھا۔ بقول اس کے اس گھر سے اس کی کچھ تلخ یادیں وابستہ تھیں اس لیے اس نے اپنا یہ گھر ایک اسٹیٹ ایجنسی سے رابطہ قائم کرکے کسی بلڈر کو فروخت کردیا جہاں اب ایک عالیشان کثیرالمنزلہ عمارت کھڑی تھی۔ کمپنی کے جس فلیٹ میں وہ سکونت پذیر تھا وہ ریٹائرڈ ہوتے ہی اسے خیرباد کہنا پڑا لیکن وہاں سے نکلنے سے پہلے ہی وہ بیٹی کی پسند سے شہر کے پوش علاقے میں ایک کشادہ اور وسیع وعریض بنگلا خرید چکا تھا۔ اس گھر میں آکر وہ فوراً ہی زارا کی شادی سے بھی سبکدوش ہوگیا اور یہ بیش قیمت بنگلا بھی بطور گفٹ بیٹی داماد کے حوالے کردیا۔ رمضو بابا سمیت وہ کسی چھوٹے سے فلیٹ میں رہائش اختیار کرنا چاہتا تھا لیکن زارا اور اس کے شوہر کے شدید اصرار پر اسے ان کے بنگلے میں ہی رہنا پڑا اور نقل مکانی کا ارادہ ترک کرنا پڑا کیوں کہ زارا کا شوہر بسلسلہ ملازمت امریکا میں مقیم تھا اور نکاح کے فوراً بعد وہ بیوی کو بھی لے کر چلا گیا اس لیے اتنے بڑے گھر میں یہ دو ہی نفوس تھے۔

گلریز خان تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق زیادہ وقت اپنے بیڈ پر ہی گزارتا۔ ہاں البتہ رمضو بابا کسی آوارہ بگولے کی طرح سارے گھر میں چکراتا پھرتا۔ جب گلریز خان بھی لیٹے لیٹے تھک جاتا تو اپنی لائبریری میں جا بیٹھتا۔ دنیا کے بہترین مصنفین کی تحریر کردہ کتب کا اس کے پاس نایاب ذخیرہ تھا۔ کتابیں اس کی بہترین ساتھی اور دوست تھیں لیکن کبھی کبھی وہ لائبریری میں بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہوجاتا تو پھر لان میں جا نکلتا۔ باغبانی سے اسے شروع سے ہی شغف تھا۔ پرانا شوق عود کر آتا تو وہ رمضو بابا کی پروا کیے بغیر پودوں کی تراش خراش، کیاریوں کی صفائی، درختوں اور پودوں کو سیراب کرنے لگتا۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی دیتا جب کہ طبی نکتہ نظر سے اس قسم کی محنت مشقت بھی اس کے لیے خطرناک تھی۔ ڈاکٹرز اسے خبردار کرچکے تھے کہ اس کے دل کے مسلز بہت کمزور ہوچکے ہیں۔ آئے دن اسے اسپتال جانا پڑتا تھا۔ رمضو بابا کے منع کرنے کے باوجود نہ وہ موسم کی پروا کرتا اور نہ ہی اپنے مرض کا اسے خیال رہتا۔ انتھک محنت کے بعد جب حالت بگڑتی تو رمضو بابا گھبرا کر گلریز کی چھوٹی بہن حرمت کو فون کرتا اور وہ دوڑی چلی آتی لیکن رمضو بابا کا نام ہمیشہ صیغہ راز میں رکھتی، ورنہ گلریز خان کا سارا غصہ اس غریب پر اترتا۔

آج بھی گلریز اپنے باغبانی کے شوق کو پھر سے مہمیز کرنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ رمضو بابا نے فوراً حرمت کو مطلع کیا اور حرمت کی آمد سے گلریز کے سارے کاموں کو بریک لگ گیا اور سارا وقت دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ گلریز بظاہر تو حرمت کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا کہ وہ اپنا گھر دار چھوڑ کر کیوں اس کے پاس دوڑی چلی آتی ہے لیکن دل ہی دل میں بہن کی آمد کا منتظر رہتا۔ ہر گھڑی ہر لمحہ اس کی راہ تکتا۔ بیوی کی بے وقت موت اور بیٹی کی شادی کے بعد تنہائی اور بیماری اسے دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ سلطنت اور الفت کی آمدورفت گلریز کے پاس کم ہی ہو پاتی تھی کیونکہ دونوں بھرے پرے کنبوں میں بیاہی گئی تھیں اس لیے ان کے اپنے مسائل تھے۔ گلریز ان سے موبائل پر ہی باتیں کرکے خیر خیریت دریافت کرلیتا۔ حرمت سب بھائی بہنوں میں چھوٹی تھی اور سب کی چہیتی بھی۔ شوہر بھی نہایت بااخلاق اور ملنسار تھا۔ آنے جانے پر سسرال والوں کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی اس لیے وہ گاہے بگاہے کبھی دونوں بہنوں کی طرف راؤنڈ لگا لیتی یا پھر بیمار بھائی کے اکیلے پن کا خیال آجاتا تو ہوا کے گھوڑے پر سوار بھائی سے آکر یوں بغلگیر ہوتی جیسے برسہا برس سے بچھڑی ہو۔ خود گلریز خان بھی اسے دیکھ کر نہال ہوجاتا۔ چہرے پر سرخی دوڑ جاتی۔ اپنا دکھ درد بھول کر بہن کی سنگت پاکر وہ یوں شاداں وفرحاں نظر آتا جیسے کہ کوئی مرض اسے چھو کر ہی نہیں گزرا۔

طلوع آفتاب کے بعد نماز فجر ادا کرکے گلریز خان اپنے لان میں چلا آیا اور سوکھ جانے والے درخت نکال کر ان کی جگہ نئے پودے لگانے کے لیے مٹی برابر کرنے لگا۔ رمضو بابا نے کچن کی کھڑکی سے دیکھا تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گلریز خان کو دیکھتا رہ گیا کیونکہ ڈاکٹر نے پچھلی رات اسے مکمل تین دن کے بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی تھی۔

رمضو بابا نے پھر اپنا پرانا حربہ آزمایا اور حرمت کو ارجنٹ آنے کا نیوتا دے دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد حرمت اپنے

PakiBooks.site

ڈرائیور کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ گلریز نے بہن کو متعجب نظروں سے دیکھا اور پھر معنی خیز انداز میں اپنی گردن ہلائی پھر رمضو بابا کو پکارا اور یقینی لہجے میں بولا۔ ”بابا آپ نے بلایا ہے ناں اسے اتنی صبح۔“

رمضو بابا بھونچکا بنا کھڑا رہا۔ اس کی زبان پر نہ اقرار تھا نہ انکار۔ اس کی اس حالت پر دونوں بہن بھائی بے اختیار ہنس پڑے رمضو نے موقع غنیمت جانا اور اپنی جان بچا کر پھر سے کچن کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کے وہاں سے جاتے ہی متبسم نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے گلریز نے استفسار کیا۔ ”کیا آج گھر میں کوئی کام کوئی مصروفیت نہیں ہے جو تم صبح ہی صبح یہاں آدھمکی ہو۔“

حرمت نے بھائی کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے شکایت آمیز انداز میں جواباً کہا۔ ”بھائی میرے پاس کام کاج کی ایک طویل فہرست ہے جسے اگر سنانے بیٹھ جاؤں تو سارا دن ختم ہوجائے گا اور کام جوں کے توں رہیں گے۔ آج تو میں صرف آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ میرے دیور کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے علاوہ ماں باپ کو بھی ساتھ لے جارہا ہے۔ اب تو حقیقتاً مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔ اصغر کی اور بچوں کی تمام تر ذمہ داریاں اب میرے سر ہیں۔ مشترکہ فیملی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہر کام مل بانٹ کر کرلیتے تھے اور کم وقت میں سارے کام نمٹ جاتے تھے لیکن اب میں آپ سے یہ کہنے آئی ہوں کہ خدارا آپ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی صحت پر بھرپور توجہ دیں۔ ابھی نہ صرف زارا کو بلکہ ہم تینوں بہنوں کو بھی آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے ڈاکٹر سے بھی کل رات میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا بلکہ تشویش کا اظہار کیا ہے۔ آپ برائے مہربانی نقل وحرکت سے پرہیز کیا کریں۔“

گلریز کے لیے یہ خبر کوئی دل خوش کن نہیں تھی کہ حرمت بھی ان کے لیے وقت نہیں نکال پائے گی لیکن اپنی اداس اور افسردگی کو کمال خوبی کے ساتھ مصنوعی مسکراہٹ میں دبا کر ہولے ہولے بہن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں مزید گفتگو ناشتے پر ہو تو بہتر ہے۔“

ناشتے کی میز پر حرمت نے ناصحانہ انداز میں وہی کچھ دہرایا۔ مزید ہدایات دیں پھر اچانک چونکتے ہوئے اس نے گلریز کی ناشتے کی پلیٹ کو بغور دیکھتے ہوئے رمضو بابا کو آواز لگائی اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ”بابا، بھائی جان کے سامنے سے یہ بریڈ، جام جیلی سب ہٹادیں ان کے لیے دودھ دلیا لے آئیے۔ میں اپنے سامنے انہیں ناشتا کرواؤں گی۔“

گلریز نہیں نہیں کی گردان کرتا رہا لیکن حرمت نے ایک ماں کی طرح اسے ناشتا کروایا۔ کبھی ممتا بھری جھاڑ پلاتی کبھی لاڈ دلار کرکے نوالے منہ میں ڈالتی رہی۔ ناشتا کرتے ہی گلریز پر عجیب سی رقت طاری ہوگئی۔ آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں۔ حرمت نے جلدی سے میز کے برتن سمیٹے اور گھبرا کر سوال کیا۔ ”کیا ہوا بھائی جان یہ اچانک آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔“

گلریز اشکبار آواز میں بولا۔ ”اس تنہائی میں تمہارے قدموں کی چاپ سن کر مجھے زندگی کا احساس ہوتا تھا لیکن آخر تم بھی اس ویران سفر میں کب تک میرا ساتھ دو گی۔“

بھائی کی بات سن کر بے اختیار حرمت کا دل بھر آیا۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ ”اب بھائی جان ایسا بھی نہیں ہے کہ میں قطعاً آپ کے پاس آنا جانا ہی چھوڑ دوں گی۔ ہاں البتہ کم ضرور کردوں گی کیونکہ اب گھر کا ہر چھوٹا بڑا کام مجھے ہی کرنا ہوگا۔ ملازمہ بھی جز وقتی طور پر کام کرکے اپنے گھر کی راہ لے گی۔ گھر میں جو نوکروں کا ہجوم ہوتا تھا وہ بھی میں نے کم کردیا ہے کیونکہ میرے دیور کی آمدنی اصغر سے کئی گناہ زیادہ ہے اس لیے ابھی تک کوئی مسئلہ نہیں بنا لیکن اب یہ اضافی اخراجات ہم افورڈ نہیں کرسکتے۔“ چند لمحاتی توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ ”البتہ بھائی جان ایک حل ہے میرے پاس۔ میرے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی ہے ملکہ نام ہے اس کا، میرے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی ہے۔ بہت کوآپریٹو نیچر کی لڑکی ہے۔ اگر میں اس سے تعاون کے لیے کہوں گی تو شاید وہ کبھی بھی انکار نہیں کرے گی۔“

حرمت کی بات پر گلریز خان یوں اچھلا جیسے اسے کئی والٹ پاور کا برقی جھٹکا لگا ہوا۔ وہ تشویش بھری نظروں سے بہن کو دیکھنے لگا اور نہایت درشت اور قطعیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”تم ایسا کوئی کام نہیں کرو گی، کسی غیر یا اجنبی لڑکی کو اپنے گھر کی ذمہ داری دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں پتا نہیں لیکن میں نے دنیا دیکھی ہے۔ چاہے تمہاری کتنی بھی عزیز ترین دوست ہو یا جان سے پیاری سکھی سہیلی ہو، کبھی اسے اپنا گھر مت سونپنا ورنہ سر کو ہاتھ لگا کے روؤ گی۔ آئندہ اس قسم کا خیال بھی اپنے دل میں مت لانا۔ شوہر کے گھر کی چار دیواری عورت کے لیے جنت ہوتی ہے کبھی اپنی اس

جنت کو اجاڑنے کی کوشش مت کرنا۔“

حرمت ٹکٹکی لگائے حیران کن نظروں سے بھائی کا متغیر چہرہ دیکھ رہی تھی۔ گلریز کا بدلتا ہوا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا، شدید حیرانی کے عالم میں اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان ملکہ بہت اچھی بڑی سادہ لوح اور معصوم سی لڑکی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ غریب ضرور ہیں لیکن انتہائی شریف، سادہ اور معقول خاندان ہے۔“

گلریز نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا مقصد کسی کو برا کہنا یا تنقید کرنا نہیں ہے لیکن زندگی کی کتاب سے جتنے اسباق میں پڑھ چکا ہوں وہ ابھی تم نے نہیں پڑھے۔ زندگی تجربات کا نام ہے۔ اس وقت تمہیں اپنے گھر واپس جانا ہے، ورنہ اپنی زندگی کا ایک تلخ ترین تجربہ تمہیں سناتا۔ بہرحال کسی دن فرصت سے آنا تب میں سناؤں گا۔ اس وقت تم جاؤ اصغر اور بچے تمہارے منتظر ہوں گے۔ تمہیں اس وقت ان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ میرے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آیندہ احتیاط کروں گا۔“ گلریز نے ہتھیار ڈالتے ہوئے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ مزید کہا۔ ”تم تینوں بہنوں کا پیار اور بیٹی کی محبت میرے پیروں کی زنجیر ہے ورنہ اب جینے کی تمنا کسے ہے؟“

حرمت نے روٹھنے والے انداز میں تیوریاں چڑھائیں اور بولی۔ ”آپ پھر مایوسی کی باتیں کرنے لگے۔ مقام شکر ہے کہ آپ کو ہم بہنوں کا اور بیٹی کا اتنا خیال ہے۔ پلیز اپنی خاطر نہ سہی ہم لوگوں کی خاطر ہی آپ اپنا خیال رکھیے۔“ یہ کہتے ہوئے حرمت گاڑی میں بیٹھی اور ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

بہن کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے گلریز مکمل طور پر اپنی ڈائٹ پرہیز اور میڈیسن کا خیال رکھنے لگا تھا۔ زیادہ چلت پھرت سے بھی گریز کرتا اسی وجہ سے چند روز میں ہی اسے افاقہ محسوس ہوا۔ چہرے پر بھی سرخی دوڑ گئی۔ رمضو بابا کی بھی جان میں جان آئی کیونکہ اسے گلریز سے دلی عقیدت اور محبت تھی۔ اس نے یہ خوش خبری حرمت کے گوش گزار کردی تھی۔

حرمت نے مسرت انگیز لہجے میں جواب دیا تھا۔ ”بابا، اصغر اپنے خاندان کے ساتھ چند دن کے لیے جارہے ہیں میں اور بچے تیار ہیں گے۔ انشاء اللہ یہ چار دن ہم لوگ آپ کے ساتھ گزاریں گے۔ بھائی جان کو بتا دیجیے گا۔“

”ضرور بیٹا ضرور گلریز میاں تو خوش ہو جائیں گے۔ اچھا ہے تمہارے اور بچوں کے آنے سے گھر میں رونق ہو جائے گی اور ہمارا بھی دل بہل جائے گا۔“ حرمت کو بہت سی دعائیں دے کر بابا نے سلسلہ منقطع کردیا تھا۔

☆......☆

اصغر کے جاتے ہی حرمت نے اپنا اور بچوں کا سوٹ کیس تیار کیا اور بناء کسی اطلاع کے آدھمکی۔ رمضو بابا اور گلریز اسے اور بچوں کو دیکھتے ہی نہال ہوگئے۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے اجڑے گلشن میں بہار آگئی ہو۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا اور کراچی کی قیامت خیز گرمی سے سب کو نجات مل گئی اس لیے سب انتہائی خوشگوار موڈ میں تھے۔ رمضو بابا نے پہلے سب کو گرما گرم سوپ پلایا اور پھر برق رفتاری سے ڈنر کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ سب نے مل جل کر کھانا کھایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ موضوع گفتگو بچوں کی شرارتیں تھیں اس لیے حرمت کے دونوں بچے دلچسپی بھی لے رہے تھے اور لطف اندوز بھی ہورہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر حرمت نے فوراً بچوں کو کمرے میں لے جاکر سلا دیا اور پھر آکر اطمینان سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ گلریز نے بہن کو شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی آرام کرو۔ میں تو دیر تک جاگنے کا عادی ہو چکا ہوں۔“

حرمت نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔ ”آج اس رتجگے میں، میں بھی شامل ہوں۔“

گلریز نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”مطلب میں تو ساری ساری رات آنکھوں آنکھوں میں کاٹ دیتا ہوں لیکن تم اپنے آپ کو کس بات کی سزا دے رہی ہو۔ شب بیداری صحت کے لیے مضر ہے۔“

حرمت نے بھائی کی نصیحت کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اس روز آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ماضی کا ایک تلخ تجربہ مجھ سے ضرور ڈسکس کریں گے تاکہ میں اپنے گھر میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہ کروں۔ آج دیکھیے پورے ماحول پر ایک پُرسکون خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ آج تو اگر نیند کی دیوی آپ پر مہربان بھی ہوتی ہے تو میں اسے مار بھگاؤں گی۔ میری چھٹی حس مجھے کہہ رہی ہے کہ ضرور وہ واقعہ آپ کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے ورنہ......“

گلریز نے قطع کلامی کرتے ہوئے فوراً حرمت کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ یکایک گلریز کی ہنستی مسکراتی آنکھوں

PakiBooks.site

کی چمک غائب ہوگئی تھی اور چہرے پر اداسی کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ ایک مختصر سے وقفے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ حرمت کے لبوں پر سے ہٹایا اور تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ”یہ واقعہ میری زندگی کا سیاہ ترین باب ہے۔ خدارا اسے پڑھنے کی کوشش نہ کرو...... ورنہ یہ بھائی تم سے آنکھ نہ ملا سکے گا۔ سب کچھ سننے کے بعد شاید میرے در پر آنا بھی گوارا نہ کروگی۔ یہ ایک ناسور ہے جو مجھے گھن کی طرح کھائے جارہا ہے۔ میرا رب ستار العیوب ہے اس لیے آج تک سب ڈھکا چھپا ہے لیکن اگر کوئی انسانی آنکھ اس کی گواہ ہوتی تو شاید ابھی تک پھانسی چڑھ چکا ہوتا۔“

حرمت ہکابکا گلریز کو دیکھے جارہی تھی۔ بھائی کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر اس نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔ ”بھائی جان آپ جو بھی کہیں گے وہ میری سماعتوں سے ٹکرانے کے بعد میرے ساتھ قبر میں جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے پھر آگے آپ کی مرضی۔“ حرمت نے گلریز کے کمزور اور استخوانی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

گلریز کا چہرہ خوف، دہشت اور پچھتاوے کا آئینہ دار تھا۔ شاید وہ اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب انجانے میں اس کی زبان پھسل گئی تھی اور اپنے پوشیدہ راز کو اجاگر کر بیٹھا تھا۔ اب حرمت اس کے سر ہوگئی تھی۔ اپنی تمام بہنوں میں حرمت اس کی چہیتی بہن تھی۔ اس کے ناز اٹھانے میں اسے لطف آتا تھا لیکن اس وقت اس کی ضد اور ہٹ دھرمی اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی جب کہ حرمت کا مسلسل اصرار اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کافی دیر تک گلریز خالی خالی نظروں سے بہن کو گھورتا رہا۔ قدرے ٹھہر کر اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کھوکھلی آواز میں بولا۔ ”خدائے ذوالجلال کے بعد تم ہی ہو جس پر میں یہ راز آشکارا کررہا ہوں۔“

حرمت نے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے استفسار کیا۔ ”بھائی ماضی میں کیا کوئی جرم سرزد ہوا تھا آپ سے میرا مطلب ہے کوئی چوری ڈکیتی یا اغوا؟“

گلریز نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے مضمحل لہجے میں کہا۔ ”نہیں کوئی چوری ڈکیتی نہیں بلکہ......“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اس کی زبان پتھر کی ہوگئی ہو۔ بدقت تمام اس نے الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے منمناتی آواز میں کہا۔ ”میری بہن میرے ہاتھ انسانی خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک نہیں

معروف قاتل ریسلر

اکیتوشی سائیتو (Akitoshi Saito)

میٹسوارو مساوا جاپانی ریسلنگ کے چند بڑے ناموں میں سے ایک ہیں اور تین بار ریسلر آف دی ائیر بھی رہے، مگر برسوں تک ریسلنگ کا حصہ رہنے پر ان کی جسمانی حالت کافی خراب ہوچکی تھی جب ان کا میچ اکیتوشی سائیتو سے ہوا اور مقابلے کے دوران میٹسوارو ایک داؤ کے نتیجے میں بے ہوش ہوئے اور اسپتال جانے پر چل بسے اس کے بعد اکیتو کو متعدد افراد کی جانب سے موت کی دھمکیاں بھی ملیں تاہم وہ سزا سے بچ گئے کیونکہ دوسرے ریسلر کی موت حادثاتی طور پر ہوئی تھی۔

برائن مائیکل میکلی

ہوسکتا ہے کہ بیشتر افراد کے لیے یہ نیا نام ہو، تاہم جو لوگ ڈبلیو ڈبلیو ای کے نئے ریسلرز کو فالو کرتے ہیں وہ ضرور اس سے واقف ہوں گے جو کہ 2010 سے 2012 تک ڈبلیو ڈبلیو ای کا حصہ رہا، اگرچہ وہ ریسلنگ میں تو زیادہ شہرت حاصل نہیں کرسکا مگر اپنی گرل فرینڈ کو قتل کرکے ضرور شہ سرخیوں کا حصہ بنا۔

جمی سنوکا (Jimmy Snuka)

ڈبلیو ڈبلیو ای کے یہ لیجنڈ ریسلر اپنی گرل فرینڈ نینسی ارجینٹیو کے قتل کے ملزم قرار پائے تھے مگر ان کے خلاف فرد جرم عائد نہیں ہوسکی اور فیصلہ ناکافی شواہد کی بنا پر ریسلر کے حق میں رہا۔ ڈبلیو ڈبلیو ای نے بھی اس موقع پر جمی سنوکا کا دفاع کیا تھا کیونکہ وہ کافی مقبول تھے اور کمپنی کے لیے فائدہ مند بھی۔

جوز گوانزلز

یہ پیورٹو ریکو کے بڑے ریسلر تھے مگر وہ بریزیر بروڈی کے قاتل کی حیثیت سے بھی جانے گئے، جس کی وجہ دونوں کے درمیان کسی بات کو لے کر منہ ماری ہونا تھی جس کے بعد جوز نے خنجر کے وار کرکے بروڈی کو قتل کردیا۔ مگر ریسلر کے اثر رسوخ کی بنا پر گواہوں نے گواہی نہیں دی اور وہ سزا سے بچ گئے۔

مرسلہ: یوسف وسیم۔ ملتان

بلکہ دو قتل کیے ہیں۔"

حرمت کے لیے بھائی کا اعترافِ جرم انتہائی غیر متوقع اور دھماکا خیز تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "نہیں میں نہیں مان سکتی، آپ یقیناً میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ میرا فرشتہ صفت بھائی کسی چیونٹی کو نہیں مار سکتا تو بھلا وہ انسانوں کو کس طرح قتل کرسکتا ہے۔" اس کے لہجے میں سو فیصد یقین کا عنصر شامل تھا۔

گلریز نے ایک سرد آہ کھینچی اور حسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "حرمت تمہاری خام خیالی اس وقت دم توڑ جائے گی جب زہر میں بجھا ہوا یہ واقعہ سنو گی۔ مجھے یقین ہے پھر تم میری پرچھائیں سے بھی نفرت کرنے لگو گی۔"

حرمت ہمہ تن گوش تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ گلریز کبھی دروغ بیانی یا غلط بیانی سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ ہمیشہ کھری اور سچی بات کہتا ہے لیکن اس کا بھائی قاتل ہے۔ یہ تلخ حقیقت ماننے کے لیے وہ کسی طور تیار نہیں تھی۔ اس نے وحشت بھری نگاہوں سے گلریز کی طرف دیکھا اور متفکر ہوئی۔ "بھائی جان کہیں آپ کسی کی سازش یا اسکینڈل کا تو شکار نہیں ہوگئے تھے؟"

ایک لمحے کے لیے گلریز کے منہ سے کوئی آواز ہی نہیں نکلی۔ کافی توقف کے بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ "ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس واقعے کا تعلق اس وقت سے ہے جب الفت اور سلطنت بھی بہت چھوٹی، نادان اور ناسمجھ تھیں اور تم گہوارے میں تھی۔ ہاں البتہ میں شعور و آگاہی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ ہمارا گھرانا جو کہ چھ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک آسودہ اور خوش حال گھرانا تھا۔ رہتے تو حیدرآباد میں تھے لیکن گوٹھ سے رشتہ قائم تھا۔ پاپا کو ورثے میں کھیت، زمینیں اور باغات ملے تھے جن کی فصلیں منہ مانگے داموں پر فروخت ہوتیں اس لیے گھر میں ہمیشہ روپے پیسے کی ریل پیل رہی۔ پاپا کا رویّہ اپنے ملازمین اور ہاریوں کے ساتھ بھی انتہائی مشفقانہ اور خوشگوار ہوتا تھا۔ ان کی نیک دلی اور خوش مزاجی کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ پاپا جسمانی طور پر بھی اچھے ڈیل ڈول اور قابلِ رشک صحت کے مالک تھے، چستی اور پھرتی بھی نوجوانوں والی تھی اس لیے کسی کو بھی ان کی صحیح عمر کا کبھی پتا ہی نہیں چلا۔ ہماری ماں بھی بلا کی حسین تھیں نرم دل طبیعت کی مالک تھیں۔ ماں کا سرو قد درمیانہ جسم سرخ و سفید رنگت اور سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ان کے لمبے سیاہ گھنیرے بال تھے۔ رب نے جس فراخ دلی سے انہیں حسن بخشا وہ مزاجاً اتنی ہی بے پروا، سست اور کم گو تھیں۔ اپنے آپ میں گم رہنے والی، الجھی الجھی سی، پاپا نے ان کے لیے قیمتی سے قیمتی ملبوسات کا ڈھیر لگا رکھا تھا لیکن ان کا لباس ہمیشہ ملگجا اور پُرشکن ہوتا۔ کئی بار تنبیہ کرنے کے بعد پاپا نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اوپر تلے ہم چار بھائی بہنوں کی پیدائش کے بعد ان کا جسم بھی کچھ اس قدر پھیل گیا تھا کہ ان کے لیے اٹھنا بیٹھنا عذاب ہوگیا تھا۔ سونے پر سہاگا گھر میں ہر کام کے لیے نوکر موجود تھے لیکن پاپا کی خواہش تھی کہ ان کے ذاتی کام اماں اپنے ہاتھوں سے کریں۔ اماں چاہتے ہوئے بھی یہ نہیں کرپاتیں، اسی بات کو لے کر گھر میں دونوں کی تو تو میں میں ہوتی رہتی اور گھر کی فضا مکدر ہو جاتی۔

ان دنوں ہمارے گھر میں ستارہ آنٹی کی آمد ہوئی۔ ستارہ آنٹی ماں جیسی حسین و جمیل تو نہیں تھیں لیکن بڑی رکھ رکھاؤ والی خوش پوش اور پُرکشش چہرے کی مالک تھیں۔ رنگ بھلے ہی گہرا سانولا تھا لیکن نقوش تیکھے اور سحر انگیز تھے۔ محلے پڑوس کی کسی تقریب میں اماں سے ان کی ملاقات ہوئی اور پھر اکثر و بیشتر وہ ہمارے گھر آنے جانے لگیں۔ ہم چاروں بھائی بہنوں کو بھی خوب لپٹا لپٹا کر پیار کرتیں۔ ماں سے بھی میٹھی میٹھی باتیں کرتیں۔ ماں نے بھی اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ وہ ہر چھوٹی بڑی بات ان کے گوش گزار کردیتیں۔ انہوں نے اپنی ہمدرد اور غمگسار دوست کو یہ تک بتا دیا کہ ان کے میاں ہمیشہ ان میں کیڑے نکالتے ہیں۔ ستارہ آنٹی کی محبت ٹوٹ کر برسی۔ انہوں نے روتی بلکتی اماں کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اب ان کی آمد و رفت میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ اماں کو انہوں نے یقین دلا دیا کہ وہ بالکل مطمئن ہو جائیں۔ اب آپ کے میاں کے سارے کام میں انجام دوں گی لیکن آپ یہ ظاہر کرنا کہ میں ابھی ابھی اس کام سے فارغ ہوئی ہوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، قربت اور محبت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ آؤ جاؤ بہت بڑھ گئی۔ ماں بھی ان کے گھر نہیں گئیں لیکن وہ گاہے بگاہے پھیرے لگاتی رہتیں۔ اپنے بارے میں اس عورت نے صرف یہ بتایا کہ شوہر کسی مالیاتی ادارے میں کلرک ہے۔ تنخواہ انتہائی قلیل ہے اور کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی بھی نہیں، اولاد میں صرف ایک بیٹی ہے وہ بھی ننھی سی جان ہے اس لیے اڑوس پڑوس کے حوالے کر آتی ہیں۔ اماں کا رحم و کرم اس پر ایسا ٹوٹ کر برسا جیسے موسلا دھار بارش۔ ستارہ آنٹی آکر مختلف النوع کے کام تو انجام دیتیں لیکن ساتھ ہی ساتھ پاپا کے کاموں میں خاص دلچسپی لیتی تھیں کبھی ان کا صاف ستھرا استری شدہ لباس ہینگر میں لٹکا کر ان کے کمرے میں رکھ رہی ہیں، کبھی گھر کی صفائی ستھرائی پر توجہ دے رہی ہیں۔ پاپا کے کمرے کی سجاوٹ میں تو گھنٹوں لگا دیتی تھیں۔ پالش لگے ہوئے جوتوں کو مزید چمکاتیں۔ پہلے پہل تو پاپا اس خوشگوار تبدیلی کو اماں کا کارنامہ سمجھے لیکن پھر رفتہ رفتہ انہیں پتا چل گیا کہ یہ ساری کارستانی ستارہ آنٹی کی ہے۔

ستارہ آنٹی کا جو کا نا پردہ پاپا کے ساتھ تھا وہ چند ہی دنوں میں دم توڑ گیا کیونکہ بقول اماں کے پردہ تو غیروں سے ہوتا ہے۔ ستارہ تو ہماری اپنی ہے اور انہوں نے بھی ایسی اپنائیت دکھائی کہ ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر پاپا سے ہر موضوع پر نہ صرف گفتگو کرتیں بلکہ ہنسی ٹھٹھے لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ آنٹی کو خوش و خرم دیکھ کر نہ صرف اماں خوش ہوتیں بلکہ پاپا بھی مسرور اور شاداں نظر آتے لیکن پتا نہیں مجھے کیوں اس عورت سے چڑ پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے سامنے آتے ہی ایک عجیب سی کوفت کا احساس ہوتا لیکن کبھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ بیک وقت وہ اماں اور پاپا کی نورِ نظر بنی ہوئی تھی۔ میری اس سرد مہری کو اس نے بھی بھانپ لیا تھا اس لیے مجھ سے لیے دیے بات کرتی۔ میں بھی اپنے آپ کو دور دور رکھتا۔ میں نے سنا کہ ایک دن وہ اماں سے کہہ رہی تھیں۔ "آپ کے گھر میں سب بہت اچھے ہیں لیکن آپ کا بیٹا بڑا انک چڑھا اور بد دماغ ہے۔"

دل تو چاہا کہ اس وقت جا کر دو بدو سنا دوں لیکن جن ہاتھوں نے میری تربیت کی تھی انہوں نے بڑوں سے بدتمیزی کرنا نہیں سکھایا تھا اس لیے میں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔

اتنے بڑے سارے گھر میں میرے لیے میرا گوشۂ عافیت تھا اوپر چھت پر تعمیر کردہ وہ کمرا جسے اماں نے اسٹور روم بنا رکھا تھا تمام کاٹھ کباڑ اور غیر استعمال شدہ سامان وہاں بھرا پڑا تھا۔ وہ کمرہ زیادہ تر مقفل رہتا لیکن چونکہ میں اپنا بیٹ بال، کنچے، ہاکی، کیرم بورڈ اور لوڈو اس کمرے میں رکھتا تھا اس لیے اماں سے چابی لے کر اپنے مطلب کا سامان نکالتا۔ استعمال کرتا اور پھر احتیاط سے رکھ دیتا۔ پاپا اگر گھر میں موجود ہوتے تو میں چپکی سادھ کر دم مار کر بیٹھا رہتا کیونکہ ان کا حکم تھا کہ اوپر کی چھت مکمل طور پر کھلی ہے کوئی منڈیر یا مزاحمتی دیوار نہیں ہے اس لیے محتاط رہنا چاہیے۔ ہمارے گھر اگر کوئی مہمان بچے آتے تو پاپا انہیں بھی اوپر جانے کے لیے سختی سے روکتے تھے۔ اماں بھی شاذ و نادر ہی اوپر چڑھتی تھیں۔ ہاں البتہ ستارہ آنٹی کسی نہ کسی بہانے ضرور اوپر جاتیں اور اطراف کا نظارہ کر کے نیچے تشریف لاتیں۔ ایک دن اسٹور روم میں گھس کر میرے سامان کو الٹ پلٹ کرنے لگیں۔ میں نے بغیر کسی حیل و حجت کے نہایت درشت لہجے میں انہیں تنبیہ کی کہ آئندہ وہ یہاں آکر میری کسی چیز کو نہ چھیڑیں۔ وہ پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں۔ اس روز پاپا اور اماں نے مجھے زبردست جھاڑ پلائی کہ وہ ہمارے خاندان کی خیرخواہ ہے اس لیے اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آنا چاہیے۔ اماں نے تو تیکھی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اضطراب آمیز لہجے میں کہا۔ "میرے بچے میں تجھے کس طرح سمجھاؤں کہ اس عورت کے آنے کے بعد میرے کندھوں کا بوجھ کتنا ہلکا ہوگیا ہے۔ ایک ماشاء اللہ تم ہی سمجھ دار ہو۔ ابھی تمہاری بہنیں تو ننھی ننھی جانیں ہیں۔ نوکروں کو تو دس بار کہا جائے تب جا کر ایک کام کرتے ہیں۔ مستقل ان کے سر پر سوار رہنا پڑتا ہے جب کہ ستارہ تو بغیر کسی تنخواہ کے بغیر کسی معاوضے کے خود ہی گھر کا ہر کام اس طرح سمیٹتی ہیں جیسے ہماری فیملی ممبر ہو۔ مجھے دیکھ رہے ہو دائم المریض ہوں۔ چربیلی کاٹھی ہے۔ موا جسم بغیر کسی رکاوٹ کے پھیلے چلا جا رہا ہے۔ اب تو چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا ہی میرے لیے مسئلہ بن گیا ہے۔ ستارہ کی آمد کے بعد گھر میں کتنا سکون اور امن ہے ورنہ تیرے پاپا کی چیخ و پکار سے میرا اپنا پانی ہو جاتا تھا۔ میں چوبیس گھنٹے سولی پر لٹکی رہتی تھی۔ میری اپنی سگی بہن بھی ہوتی تو شاید اتنا خیال نہیں رکھ سکتی تھی جو ستارہ رکھ رہی ہے۔ آئندہ میں تمہاری شکایت نہ سنوں۔ نہ ستارہ کی زبان سے اور نہ کسی اور کی زبان سے۔"

میں نے تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلایا اور چپ چاپ آکر اپنے بستر میں دبک گیا۔ پاپا اور اماں کافی دیر تک اس مسئلے میں الجھے رہے کہ جیسے جیسے میری عمر بڑھ رہی ہے میرے لب و لہجے، رویے اور حرکات و سکنات میں ناخوشگوار تبدیلیاں آرہی ہیں۔ یہ ان دونوں کے لیے لمحۂ فکریہ تھا جب کہ میری دانست میں ایسی کوئی بات نہیں تھی اگر ایسا ہوتا تو میرے اساتذہ اور دوستوں کی جانب سے بھی انہیں شکایات موصول ہوتیں۔ دونوں پتا نہیں کون سی عینک لگا کر مجھے دیکھ

PakiBooks.Site

رہے تھے کہ سارے کیڑے مجھ میں ہی نظر آرہے تھے۔ میں کافی رات تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ویسے بھی غور وفکر میری فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ دراصل بڑھتی ہوئی عمر میں انسان مختلف النوع کے معمولی غیر معمولی واقعات، ماحول اور متفرق احوال کو جانچنا اور پرکھنا شروع کردیتا ہے۔ مجھے بھی سوچ بچار میں لطف آتا تھا۔ باریک بینی سے ہر چیز کا مشاہدہ کرتا اور اپنے طور پر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ ستارہ آنٹی کی شکایت پر پہلی بار اماں اور پاپا نے میری کھنچائی کی تھی اس لیے رہ رہ کر مجھے اس عورت پر غصہ آرہا تھا، کیوں؟ وجہ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھی کہ اس کا وجود مجھے کیوں زہر لگتا ہے۔ اس دن کے بعد میں بھی ٹوہ میں لگ گیا کہ آخر اس عورت کو ہمارے گھر سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ پہلے پہل اماں کی دوستی کا دم بھرتی تھی پھر رفتہ رفتہ پاپا کے بھی قریب آتی جارہی ہے۔ تم تینوں بہنوں کو بھی اس نے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ گھر میں فرد واحد میں تھا جسے وہ ابھی تک رام نہیں کرسکی تھی بلکہ ہم دونوں کے درمیان مسلسل سرد مہری تھی۔ دن اسی کشش وپیچ میں گزر گئے۔ میرے دل ودماغ میں جو جنگ تفریق چل رہی تھی اس کا جواب مجھے نہیں مل پارہا تھا لیکن گرمیوں کی ایک تپتی جھلستی دوپہر جب اماں تم تینوں کے ساتھ اپنے اے سی والے بیڈ روم میں آرام فرما تھیں، پاپا لائبریری میں بیٹھے مطالعہ میں غرق تھے۔ میں نے ستارہ آنٹی کو دبے قدموں سے چلتے ہوئے لائبریری کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھبرائی سی سہمی ہوئی مشکوک انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ پاپا اپنے اسٹڈی روم میں کسی کو قدم نہیں رکھنے دیتے تھے پھر بھلا یہ کیوں وہاں جارہی ہے؟ یہ سوال سانپ بن کر میرے دماغ میں سرسرایا اور میں کچھ توقف کے بعد بھی اس کے تعاقب میں ہولیا اور پھر اس روز میری آنکھوں نے وہ دیکھا جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ شدت غم سے میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ دونوں قابل اعتراض حالت میں تھے۔ اس فاحشہ عورت کا تو ذکر ہی کیا میرے اپنے پاپا کا سارا تقدس، پاکیزگی اور وقار ایک لمحے میں میرے دل سے فنا ہوگیا۔ میں اماں سے زیادہ پاپا کو چاہتا تھا اور وہ بھی اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے میرے ناز نخرے اٹھاتے تھے اور مجھے ٹوٹ کر چاہتے تھے لیکن آج اس محبت اور پیار کی دھجیاں اڑ چکی تھیں۔ پاپا نے اسی سال سالگرہ پر مجھے میری خواہش پر اگفا کا جدید کیمرا گفٹ کیا تھا۔ اسکول ٹائم کے علاوہ میں اسے اپنے گلے کا ہار بنا کر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے ان دونوں کا پوز کیمرے میں محفوظ کرلیا اور بغیر کوئی آہٹ کیے چوکنا انداز میں چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کافی دیر سے اپنی سانس روکے ہوئے تھا اس لیے کمرے میں پہنچ کر ایک طویل سانس خارج کی اور اپنے بستر پر گر گیا۔ چوہا بلی کا سارا کھیل سمجھ میں آگیا تھا لیکن بلی کہیں چوہے کو اور اس کے سارے خاندان کو ہلاک نہ کردے یہ سوچ کر میرا دل دہل گیا۔ تنفس پھر سے بے ترتیب ہوگیا۔ حسب سابق پھر میں اپنی سوچوں میں مستغرق ہوگیا۔ رات کے کھانے پر بڑی مشکل سے میں نے کھانا زہر مار کیا۔ اپنا ہوم ورک بھی انتہائی بے دلی سے کرکے جان چھڑائی اور پھر سے اپنے بیڈ پر لیٹ کر اپنے خیالوں میں غرق ہوگیا۔

میرا ذہن تیزی سے آنے والے خطرے سے نمٹنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے ذہن کے پردے پر وہ بے ہودہ منظر چپک کر رہ گیا تھا۔ میں اسے کھرچنے کی کوشش کرتا لیکن لاکھ کوشش کے باوجود فراموش نہیں کر پارہا تھا۔ پاپا جیسے بھی تھے بالآخر میرے باپ تھے اور حلوائی پاگل بھی ہوجائے تو اپنے والے کو لڈو ہی کھینچ کر مارتا ہے اس لیے پاپا کو میں نے دل کی گہرائیوں سے معاف کردیا تھا لیکن اس زہریلی ناگن کا پھن کس طرح کچلا جائے۔ اس کا حل میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سوچ سوچ کر میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔

دوسری صبح میں بغیر ناشتا کیے اسکول سدھارا۔ اسکول میں بھی دن انتہائی بے کیف اور اکتاہٹ بھرا تھا۔ میری اس کیفیت کو میرے ٹیچر اور ساتھیوں نے خرابی طبیعت پر محمول کیا، گھر پر صورت دیکھتے ہی ماں کی ممتا تڑپ اٹھی۔ دل میں آئی اماں کو وہ سب بتادوں جو میں نے دیکھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اماں سب کچھ سننے کے بعد انتہائی طیش کے عالم میں میری ہی درگت بنادیں گی۔ دفعتاً دماغ میں کرنٹ دوڑا کہ میرے پاس تو بہت مضبوط اور ٹھوس ثبوت موجود ہے بس رول دھلوانے کی دیر ہے ابھی میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اماں کے علم میں یہ بات لاؤں یا نہیں۔ تب ہی اچانک پاپا وارد ہوگئے۔ اس وقت میں نے صبر کا تلخ گھونٹ لیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ اماں، پاپا کو میری گرتی ہوئی صحت کے بارے میں بتانے لگیں اور میں دونوں کو محو گفتگو چھوڑ کر اپنے

کمرے میں چلا آیا۔ میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس عورت کو اپنے گھر سے دفع کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ حالات کی ستم ظریفی میرے معصوم جذبے میری سادہ لوحی سب فنا ہوگئی تھی۔ میرے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ ستارہ نامی اس عورت کا کس طرح قلع قمع کروں۔ دل ودماغ میں ایک جنگ برپا تھی۔ ذہنی طور پر بری طرح تھکان محسوس کررہا تھا اس لیے آنکھیں موندھے لیٹا رہا۔ کب نیند نے اپنی آغوش میں لیا پتا ہی نہیں چلا۔ بھرپور نیند کا یہ فائدہ ہوا کہ میں بالکل تازہ دم اٹھا۔ کافی حد تک اپنی ذہنی کشمکش پر قابو پالیا تھا اس لیے اسکول میں بھی ہنستا بولتا رہا۔ اسکول سے واپسی پر میں چھت پر چلا آیا اور اسٹور روم میں گھس کر اپنے سامان میں سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ معاً میری نگاہ ستارہ آنٹی پر پڑی وہ پرندوں کی کونڈی کا پانی بدل رہی تھی۔ پلاسٹک کی کین میں وہ نیچے سے پانی لے کر آئی تھی۔ پانی بدلنے کے بعد وہ جھاڑو سے پرندوں کی بیٹ جھاڑنے لگی۔ صفائی کرتے کرتے وہ چھت کے کنارے پر پہنچ گئی۔ بس یہی ایک لمحہ تھا جب میں نے سوچا کہ اس فتنہ پرور عورت کے لیے میرا ایک دھکا ہی کافی ہے۔'' اتنا کہہ کر گلریز خاموش ہوگیا۔

حرمت نے لرزیدہ آواز میں استفسار کیا۔ ''بھائی جان پھر کیا ہوا؟''

گلریز نے خاموش نظروں سے واٹر کولر کی جانب دیکھا۔ حرمت نے فوراً پانی کا لبالب گلاس گلریز کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا اور ایک گہری سانس لے کر بہن کی جانب تشکرانہ انداز سے دیکھا۔ حرمت نے ٹشو پیپر سے اس کا منہ صاف کیا اور استفسارانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی لیکن خاموشی کی چادر ابھی بھی تنی رہی۔ حرمت نے تھرتھراتی آواز میں اپنا سوال دہرایا۔

گلریز نے ایک طویل ہچکچاہٹ کے بعد پشیمان لہجے میں کہا۔ ''ہاں میں نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔''

حرمت نے اپنا دل پکڑ لیا۔ اس کے دل ودماغ میں سنسنی دوڑنے لگی۔ تھوک کا بڑا سا گولا نگلتے ہوئے خوفزدہ آواز میں کہا۔ ''آپ تو اسے اس کی غلطی کی پاداش میں گھر سے نکالنا چاہتے تھے لیکن آپ نے تو اسے دنیا سے ہی نکال دیا۔ اف میرے خدا مجھے تو آج تک اس واقعے کی ہوا بھی کسی نے نہ لگنے دی۔ نہ اماں نے نہ دونوں بڑی بہنوں نے۔''

ماضی کا یہ واقعہ سناتے ہوئے گلریز کے چہرے پر بھی دہشت اور خوف کی پرچھائیاں لہرارہی تھیں۔ حالانکہ اس کی اس بچ بیانی کا تعلق اس کے لڑکپن سے تھا لیکن اسے بیان کرتے ہوئے وہ اس دور میں پہنچ گیا تھا۔ حرمت کے چہرے پر دکھ اور کرب کے آثار تھے۔ اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے اس نے پھر سوال داغ دیا۔ ''بھائی جان اماں کو اس واقعے کی کچھ سن گن ملی یا وہ آخر تک بے خبر رہیں۔''

گلریز نے جواباً کہا۔ ''میں نے اماں کو سب کچھ بتادیا تھا کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ اللہ کے بعد اماں ہی اس راز سے واقف تھیں کہ اس عورت کا قاتل میں ہوں۔ اسے دھکا دیتے ہوئے میں نے اپنی پوری جسمانی قوت استعمال کی تھی۔ وہ جھکی ہوئی پوزیشن میں تھی اس لیے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔ وہ سر کے بل گری تھی۔ بھیجا باہر نکل گیا تھا۔ اس کی فلک شگاف چیخ دور دور تک سنی گئی۔ سڑک پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ لوگ بھاگ بھاگ کر اس ایکسیڈنٹ کو دیکھنے کے لیے آرہے تھے۔ اس خوش جمال اور خوش بدن عورت کا جسم تڑپنے پھڑکنے کے بعد ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ اماں کچن میں تھیں چیخ کی آواز پر وہ بھی داخلی دروازے کی طرف دوڑیں اور پردہ ہٹا کر جھانکنے لگیں۔ ستارہ کی لاش دیکھتے ہی وہ رونے پیٹنے لگیں۔ وہ تو پردے کا انہیں خیال نہ ہوتا تو حواس باختہ سڑک پر چلی جاتیں اور وہاں جا کر بین کرتیں لیکن چونکہ وہ بہت سختی سے پردہ کرتی تھیں اس لیے گھر میں ہی بے تحاشا چیخ رہی تھیں۔ میں دیوانہ وار زینے سے اتر کر سڑک پر لگی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ اماں کے علاوہ کسی اور نے مجھے زینے سے اترتے نہیں دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آگئی۔ ستارہ کی لاش کو ضروری ابتدائی کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردیا گیا۔ پاپا بھی کہیں باہر گئے ہوئے تھے اسی دوران وہ بھی چلے آئے۔ ایکسیڈنٹ اسپاٹ چونکہ ان کا اپنا گھر تھا اس لیے پولیس والوں نے ان کا مختصر بیان لیا۔ پاپا نے اپنے بیان میں صرف یہ کہا کہ ''ستارہ ان کے گھر کی نوکرانی یا ملازمہ نہیں تھی بلکہ ان کی بیوی کی دوست تھی اور پرندوں سے اسے خاص شغف تھا اس لیے انہیں دانہ ڈالنے کونڈی کا پانی بدلنے اور پرندوں کی گندگی صاف کرنے وہ اوپر جاتی تھی۔ اس کی یہ اچانک موت انتہائی اندوہناک اور قطعی غیر متوقع ہے۔''

PakiBooks.site

پولیس نے اماں سے بھی چندرسمی سوالات کیے مجھ سے کچھ پوچھنے کی کسی نے بھی زحمت نہیں کی اور پھر اس واقعے کو ایک عام اور اتفاقی واقعہ قرار دیا گیا۔ ستارہ کی ہلاکت کے موقع پر میں نے پہلی بار اس کے شوہر شاہ نواز کو دیکھا۔ وہ بیوی کی خون آلود لاش کے قریب بیٹھا اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا اور چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ لوگوں نے بہت مشکل سے اسے سنبھالا اور گھسیٹ کر وہاں سے لے گئے۔ وہ شدید صدمے اور دکھ کا شکار تھا۔ پولیس نے خانہ پری کے لیے اس سے بھی ایک بیان لیا اور بالآخر ستارہ کی موت کو حادثاتی موت قرار دے کر فائل بند کردی لیکن میری بہن حقیقت تو یہ تھی کہ میں اسے اپنے گھر سے ضرور نکالنا چاہتا تھا۔ اسے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اسے دھکا دیا تو یہ سمجھو یہ میرا ایک اضطراری عمل تھا۔ بغیر سوچے سمجھے میں یہ کر گزرا۔ اس وقت میری نظروں کے سامنے صرف اور صرف اپنی ماں کی زندگی تھی کیونکہ اس عورت کی لگاوٹ اور التفات پاپا کے ساتھ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ پاپا کو اس نے اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا پھر بتاؤ میں، اماں اور تم تین بہنیں ہم سب کہاں جاتے۔ پاپا کی نظریں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ چونکہ اماں مجھے زینے سے اترتے ہوئے دیکھ چکی تھیں اس لیے وہ مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھتیں اور پھر خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتیں۔ پولیس کو بیان دیتے وقت بھی وہ اس بات کو حذف کر گئیں کہ جب ستارہ اوپر چھت سے گری تو میں بھی وہیں موجود تھا۔ میری موجودگی اور غیر موجودگی کا پولیس نے بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس حادثے کے بعد میں بھی اپنا زیادہ وقت باہر گزارنے کی کوشش کرتا تاکہ اماں کی پوچھ گچھ سے بچا رہوں لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ ایک دن اماں نے موقع دیکھ کر مجھے دبوچ لیا اور سراغ رسانی شروع کردی۔ پہلے پہل تو میں ان کی تمام باتوں کو جھٹلاتا رہا لیکن میری اپنی ماں نے مجھ پر الزام لگایا کہ ”تم روز اوّل سے اس غریب عورت سے خار کھاتے تھے حالانکہ وہ شدت سے تمہیں چاہتی تھی اور محبت کرتی تھی۔“

اماں کی اس بات پر میں تلملا اٹھا۔ محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں نے اماں کو ساری روداد سنا ڈالی اور ایک اسٹوڈیو والے دوست سے فلم دھلوا کر جو تصویر تھی وہ بھی دکھا دی۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخیں۔ ان کی آواز سن کر دفعتاً پاپا لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے کمرے سے نکلے۔ آتے ہی انہوں نے تیز و تند لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا ہوگیا تھا کیوں چلا رہی تھیں؟“

یہ چند سیکنڈ میرے لیے گولڈن ٹائم تھے۔ میں نے برقی سرعت کے ساتھ تصویر کو جیب میں رکھ لیا۔ اماں نے کمال خوبی سے اپنے چہرے کے تاثرات کو ایک مصنوعی مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے گڑبڑا کر کہا۔ ”ارے یہ بھی پتا نہیں کیسی عجیب و غریب اشیاء کی تصاویر لے آتا ہے۔ کسی عجیب الخلقت بچے کی تصویر دکھا رہا تھا مجھے، میں تو دیکھ کر دہشت سے کانپنے لگی اور میری چیخ نکل گئی۔“

اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہتی میں وہاں سے رفو چکر ہوگیا۔ پاپا خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اب میری اور اماں کی خفیہ نوعیت کی میٹنگ اس وقت ہوتی جب پاپا گھر میں نہیں ہوتے۔ بہرحال میں نے جو اندھا قدم اٹھایا تھا۔ اماں اس سے قطعاً خوش نہیں تھیں۔ اماں کا نکتہ نظر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ خود اس کے لیے سزا تجویز کرتا تم نے جوش میں آکر اپنے ہوش کیوں کھو دیے لیکن میری اپنی دانست میں، میں نے جو کچھ کیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اس کی شاطرانہ چال کا جواب اگر میں نہ دیتا تو ایک دن پاپا کی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز صرف اور صرف ستارہ ہوتی اور میں اور میرا خاندان دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا۔ اماں اتنی معصوم اور سادہ لوح تھیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس عورت کو اچھے الفاظ میں یاد کیا اور ہمیشہ مجھے سرزنش کرتی کہ تم نے اپنے خاندان کے مفاد کے لیے انسانی خون سے ہاتھ رنگ لیے۔ ایک دن تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔ مجھے ان کی اس سوچ سے شدید اختلاف تھا۔ میرا بس ایک ہی اصول تھا مرو یا مارو اس لیے میں اماں کو ہمیشہ یہی سمجھاتا کہ خدا کو ہماری بہتری منظور تھی اس لیے اس نے خود یہ موقع فراہم کیا ورنہ اس عورت نے تو ہمارے گھر کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اماں نے میرے منع کرنے کے باوجود ستارہ کے شوہر اور اس کی بچی سے ملنے کی کوشش کی لیکن اردگرد رہنے والوں نے بتایا کہ اس حادثے کے بعد اس کے شوہر نے اونے پونے داموں میں گھر فروخت کیا اور اپنی بچی کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ کہاں گیا کہاں بسا اس کا علم کسی کو بھی نہیں۔ امی اس کی بچی کے لیے مزید دکھی ہوگئیں کہ بہت چھوٹی بچی ہے۔ پتا نہیں ماں کے بنا وہ کس طرح رہ پاتی ہوگی۔ اکثر و بیشتر صرف امی ہی اس خاندان کو یاد کرتیں ورنہ میں نے اپنے حافظے سے اس عورت کا نام ہی مٹا دیا تھا

اور ایسا ہی حال پاپا کا تھا۔ انہوں نے بھی کبھی گھر میں اس کا نام لیا اور نہ اس کے ساتھ ہونے والے اس سانحے کا ذکر کیا۔

وقت کی چرخی اپنی رفتار سے گھومتی رہی۔ اماں اور پاپا کے بالوں میں چاندی اترنے لگی۔ الفت اور سلطنت سن بلوغت میں قدم رکھ چکی تھیں اور دونوں گریجویشن کر چکی تھیں۔ عزیز و اقارب میں ہی دونوں کے لیے مناسب رشتے مل گئے اس لیے پاپا فوراً ہی دونوں کے فرائض سے سبکدوش ہوگئے۔ میں بھی ایم بی اے کر چکا تھا اور ملازمت کے لیے سرگرداں تھا کہ اسی اثناء میں ثمرہ مجھ سے ٹکرائی۔ پہلی ملاقات میں تو اجنبیت کی دیوار حائل تھی اس لیے آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ایک دن اپنے ہی دفتر میں اسے دیکھ کر میں چونکا اور پھر مجھے دفعتاً یاد آگیا کہ اپنے ایک دوست کی شادی میں لڑکیوں کے جھرمٹ میں، میں نے اسے دیکھا تھا۔ لڑکی کا پُرکشش سراپا اور من موہنی صورت دیکھ کر میں اپنے آپ کو نہیں روک پایا۔ میں نے پہل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میرے قدم اس کی جانب بڑھنے لگے لیکن ثمرہ اپنی جگہ پر تھمی رہی۔ وہ اپنے آپ کو بہت ریزرو رکھتی تھی۔ اس کی اسی ادا نے مجھے اور اس کے قریب کردیا۔

ان دنوں اماں زور و شور سے بہو تلاش کررہی تھیں لیکن کہیں بات نہیں بن رہی تھی۔ میں نے اماں کی مشکل آسان کردی اور اس دوست کی بیوی کے توسط سے ثمرہ کا ایڈریس لاکر اماں کو تھما دیا۔ اماں خوشی سے نہال ہوگئیں اور مسرت انگیز لہجے میں بولیں۔ ”اچھا ہے تمہاری اپنی پسند کی لڑکی آئے گی تو کم از کم تم ہمیں تو یہ الزام نہیں دو گے کہ میں آپ کی پسند بھگت رہا ہوں۔“ میں مسکرا کر خاموش ہوگیا اماں کو دراصل میرے مزاج کی شدت پسندی کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی ایسی لڑکی کو اپنی بہو بنا کر لے آئیں جسے بحیثیت بیوی میرا ذہن نہ قبول کرسکے۔ اماں تو ثمرہ سے اور اس کے خاندان سے فوراً ملنا چاہتی تھیں لیکن اسی دوران سلطنت کے پہلے بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی۔ پاپا اور اماں فوراً اس کے گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے لیکن پاپا نواسے کو نہیں دیکھ پائے ان کی گاڑی ایک خطرناک حادثے کا شکار ہوگئی۔ پاپا اور ڈرائیور جانبر نہیں ہوسکے۔ البتہ اماں کی زندگی تھی اس لیے وہ صرف زخمی ہوئی تھیں۔ انہیں فوراً اسپتال پہنچایا گیا اور وہ کچھ ہی دنوں میں رو بہ صحت ہوکر گھر واپس آگئیں۔

ان ایام میں، میں شدید ذہنی انتشار کا شکار رہا۔ اماں پاپا کو یاد کر کے شب و روز روتی رہتی تھیں۔ مجھے بھی شدید دھچکا پہنچا تھا لیکن اماں کے سامنے آتے ہی میں کمال ضبط سے اپنے رنج و الم کو دل میں مقید رکھتا۔ بڑا سخت وقت تھا۔

حرمت نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ ”جی اس وقت کی دھندلی دھندلی سی یادیں میرے ذہن میں بھی محفوظ ہیں۔ پاپا کی موت پر ہمارے گھر میں ایک کہرام مچا تھا اور پھر اماں بھی ہوسپٹلائزڈ تھیں اس لیے میں ہمہ وقت آپ کے سر پر سوار رہتی تھی اور مسلسل رو رو کر آپ کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ بسا اوقات آپ بری طرح جھنجلا جاتے تھے لیکن فوراً ہی سینے سے لگا کر دل بھر کر مجھے پیار بھی کرتے تھے اور پھر جب میں اپنی اشکبار آنکھوں سے آپ کی طرف دیکھتی تو آپ کی آنکھیں ساون بھادوں بن جاتیں۔“

حرمت کی بات سن کر گلریز نے طویل توقف کیا اور اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا۔ اماں جب گھر آئی تھیں تب جا کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا ورنہ تم مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑتی تھیں۔ اس وقت سے ہی ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بہت زیادہ اٹیچڈ ہوگئے تھے۔ اماں کی عدت کے خاتمے پر گھر کی سوگواریت میں کافی کمی واقع ہوئی لیکن پاپا مجھے اس وقت بہت یاد آئے جب ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے میری مہارت اور صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے زبردست عہدے کی پیشکش کی کیونکہ جہاں میں فی الفور کام کررہا تھا وہاں نہ کوئی پُرکشش مراعات تھیں اور نہ ہی کوئی ترقی کے چانسز تھے اس لیے پاپا ہمیشہ کہتے تھے۔ ”یہاں تو تم اپنا وقت ہی ضائع کررہے ہو۔ اگر کوئی اچھی آفر ملے تو لمحے بھر کی تاخیر کیے بنا فوراً اس ملازمت کو چھوڑ دینا۔“

میں نے پاپا کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس فرم کی آفر قبول کرلی۔ دفتر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اور خوشگوار تبدیلی آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں پاپا کو زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گا لیکن چند ہی دنوں میں، میں زندگی کی گہما گہمی کی طرف لوٹ آیا تھا۔

اماں نے ایک دن مجھے خوشگوار موڈ میں دیکھا تو پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔ وہ بے تابی دل سے منتظر تھیں کہ گھر کی پُرملال فضا کا خاتمہ ہو جائے اور گھر میں خوشی کے شادیانے گونج اٹھیں۔ میں نے بغیر کسی لیت و لعل کے اماں کے گوش

PakiBooks.site

گزار یہ بات کردی کہ ایک بار وہ ثمرہ اور اس کے خاندان سے ضرور ملاقات کریں۔ وہ لوگ اگر اس رشتے کے لیے رضامندی ظاہر کرتے ہیں تو میرے لیے عین خوشی ہوگی اور اگر وہ انکار کرتے ہیں تو آپ جہاں کہیں گی وہاں میں شادی کرلوں گا۔''

میرا سعادت مند جواب سن کر اماں نے فوراً میری پیشانی چوم لی اور ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ دوسرے ہی دن اماں نے الفت اور سلطنت کو ان کی سسرالوں سے بلوایا اور انہیں ساتھ لے کر وہ ثمرہ کے گھر روانہ ہوئیں۔ وہ سارا دن دفتر میں، میں نے نہایت بے چینی و بے قراری سے گزارا۔ میں رنگین تانے بانے بنتا رہا لیکن افسوس گھر سے میرے فون پر کوئی کال نہ آئی۔ اپنے خیالی تصورات کو تھپکی دیتے ہوئے میں نے سوچا یقیناً میری ماں بہنیں مجھے سرپرائز دینا چاہ رہی ہوں گی۔ یہ خیال اتنا دل خوش کن تھا کہ میں بھاگم بھاگ اپنی گاڑی سے فراٹے بھرتا ہوا گھر پہنچا لیکن گھر وحشت بنا ہوا تھا۔ تم اپنا ہوم ورک کر رہی تھیں۔ اماں خاموشی سے اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میرے چہرے پر سوالات کا جال بُنا ہوا تھا۔ اماں نے فوراً بھانپ لیا کہ میں کس مقصد کے تحت ان کے کمرے میں آیا ہوں لیکن اپنی نظریں چراتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اماں کا چپ کا روزہ بدستور قائم تھا۔ میرے کان منتظر تھے کہ اماں کچھ تو بولیں لیکن انہوں نے تو ہونٹ ہی سی لیے تھے۔ بالآخر میں نے جرأت اور بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دل کی بات زبان پر لے آیا۔

اماں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم نے کچھ کہا مجھ سے؟''

میں دل ہی دل میں جل کر راکھ ہوگیا۔ ہم دونوں ایک ہی بیڈ پر بیٹھے تھے پھر بھلا اتنے قریب سے وہ میری بات نہیں سن سکیں، میں دانت کچکچا کر رہ گیا۔ دوبارہ میں نے بلند اور کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''آپ جس مقصد کے تحت ثمرہ اور اس کے خاندان والوں سے ملنے گئی تھیں اس کا کیا رزلٹ رہا۔ اس کا گھر تلاش کرنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوئی۔''

اماں نے ایک گہری سرد آہ بھری اور بولیں۔ ''ارے بیٹا کیسا گھر اور کاہے کا گھر، وہاں تو ایک چھوٹا سا دو کمروں کا کوارٹر ہے۔ شہر کے مضافاتی اور گنجان علاقے میں واقع ہے۔ ان لوگوں نے ایک کمرے کو بیڈ روم اور ایک کو ڈرائنگ روم بنا رکھا ہے۔ بس وہ لڑکی ثمرہ اور ان کے والد ہیں اس لیے اس ڈربے نما گھر میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ شاید دور دراز کے رشتے دار بھی آتے جاتے نہیں ہیں تب ہی تو ہم لوگوں کو دیکھ کر دونوں باپ بیٹی بری طرح گھبرا گئے بلکہ یہ سمجھو کہ ہمیں دیکھ کر ان کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ بہرحال گھبرائی گھبرائی سی اس لڑکی نے ہمیں نشست گاہ میں بٹھایا۔ ارے گل بیٹا تجھے کیا بتاؤں ڈرائنگ روم کا فرنیچر اور آرائشی اشیاء اتنی معمولی نوعیت کی تھیں کہ تم......''

اماں کی اس طویل وضاحت پر میں بری طرح بھنا گیا اور بولا۔ ''آپ وہاں رشتے کی بات ڈالنے گئی تھیں یا اس کے گھر یا علاقے کا سروے کرنے۔''

اب اماں بری طرح سٹپٹا کر بغلیں جھانکنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں دنیا جہاں کے اندیشے سمائے ہوئے تھے کچھ دیر تک تو وہ سکتہ زدہ بیٹھی رہیں پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا اور دل فگار لہجے میں بولیں۔ ''گل بیٹا کاش وہ لڑکی میری بہو بن سکتی اگر تم طبیعتاً منتقم المزاج نہ ہوتے تو بس تم سے کہتی کہ آج ہی ثمرہ کو دلہن بنا کر اس گھر میں لے آؤ۔ ہائے کیسی ہرنیوں جیسی آنکھیں ہیں، دودھیا رنگت، نازک نازک نقوش، ہونٹوں پر سحر انگیز مسکراہٹ۔ تیری دونوں بہنیں تو اس پر ایسی واری فریفتہ ہوئیں کہ کہنے لگیں بس آپ اسی وقت رشتے کی بات چھیڑ دیں لیکن......'' اس نہج پر قطع کلامی کرتے ہوئے اماں نے بارود کے ڈھیر کو ماچس کی تیلی دکھا دی۔ میں نے تند لہجے میں کہا۔ ''اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھ رہی ہیں لیکن اصل اور اہم بات حذف کر رہی ہیں۔ جب وہ آپ سب کو پسند آگئی تھی تو آپ نے اپنے کام کا آغاز کیوں نہیں کیا۔ کیوں خاموشی سے گھر چلے آئے۔ آپ تو پہیلیاں بجھوا رہی ہیں اور اس سارے قصے میں میرے مزاج اور طبیعت کا تذکرہ کیوں آگیا۔ اماں آپ واضح الفاظ میں مجھے سب کچھ بتایئے ورنہ میں ابھی سلطنت اور الفت سے بات کرکے......''

اماں نے فوراً میری بات کاٹی اور قدرے رک کر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولیں۔ ''خبردار سلطنت اور الفت سے کسی قسم کی کوئی باز پرس مت کرنا۔ میں نے ان دونوں کو یہ تھپکی دے دی ہے کہ زبوں حالی باپ بیٹی کے چہروں سے ٹپک رہی ہے۔ یہ ہمارے ٹکر کے لوگ نہیں ہیں اس لیے ہم یہاں رشتہ نہیں کریں گے اور اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ثمرہ

PakiBooks.Site

سے تمہاری شادی کیوں نہیں ہوسکتی۔ ثمرہ دراصل ستارہ کی بیٹی ہے۔''

لفظ ''کیا'' میری زبان سے چیخ کی شکل میں نمودار ہوا۔

اماں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور کمزور تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔ ''گل میرے بچے ثمرہ کو دیکھ کر تو میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ تیری دونوں بہنیں بھی بہت مسرور اور خوش تھیں لیکن گفتگو کے دوران مجھے ثمرہ کے باپ شاہ نواز کا چہرہ جانا پہچانا اور شناسا سا لگا لیکن حافظے پر ایسے پتھر پڑ گئے کہ کچھ یاد نہیں آیا لیکن مجھے بجلی کا جھٹکا اس وقت لگا جب میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ان کی بیوی ایک حادثے میں فوت ہوئی ہیں۔ میں نے حادثے کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے جواب میں جو کہانی سنائی اسے سن کر میں چکرا کر رہ گئی۔ ہاتھ پیر برف کی ٹھنڈی سل بن گئے۔ میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں اپنی نشست سے اٹھی اور دونوں بیٹیوں کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں باپ بیٹی ہمیں روکتے ہی رہ گئے لیکن پھر میں وہاں ایک پل بھی نہیں رکی۔ ستم بالائے ستم کہ تمہاری دونوں بہنوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ میں جب بہانے بازیاں اور جھوٹ بول بول کر تھک گئی تو بالآخر میں نے جارحانہ انداز میں انہیں مزید سوال کرنے کے لیے منع کیا اور یہ کہہ کر ان کے منہ بند کردیئے کہ ہم بھی چار لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اب بالکل ہی مفلوک الحال لوگوں میں رشتہ کریں گے تو دنیا والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ دونوں نے مکمل چپ سادھ لی اور اپنے اپنے گھر کی راہ لی اور میں اپنی سوچوں میں گرفتار یہاں آکر لیٹ گئی۔ بتاؤ پھر میں کیا کرتی۔''

اماں کے چہرے پر زردی اتر آئی اور آواز بھرا گئی۔ میری ساری تنتناہٹ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ حواسوں پر چھائی دھند لمحوں میں چھٹ گئی۔ اپنی دونوں مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے میں پُرجوش انداز میں بولا۔ ''مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ ثمرہ اس بدکردار عورت کی بیٹی ہے۔ بھلا کہاں وہ کہاں ثمرہ، ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

میں اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا لیکن اپنے آپ کو طفل تسلیاں دے دے کر بہلا رہا تھا۔ اماں نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواباً کہا۔ ''کیا میں اتنی نادان تھی کہ ان سے ان کی بیوی کا نام نہ پوچھتی۔ بذات خود اس شخص نے بھی [illegible] بیوی کا نام لیا۔ اللہ کا شکر ہے میری سماعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

اماں سرہانے تکیہ رکھ کر یوں لیٹ گئیں جیسے کسی جنگ میں انہیں منہ کی کھانی پڑی ہو۔ اس کمرے میں میرا بھی سانس گھٹنے لگا تھا۔ اس سنسنی خیز انکشاف نے مجھے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔ دوسرے دن میں آفس بھی نہیں گیا۔ اماں ناشتا کمرے میں ہی لے آئیں لیکن میں نے سختی سے انکار کردیا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بھی اماں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے صرف ایک پیالی چائے پر اکتفا کیا۔ وہ خاموش ہو گئیں اور میرے کمرے سے چلی گئیں۔ جب میں رات کے کھانے کے لیے بھی نہیں اٹھا تو اماں نے جذباتی انداز میں مجھے لپٹا لیا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولیں۔ ''میرے بچے میں تیرا دکھ سمجھ رہی ہوں لیکن فیصلہ نہیں کر پارہی ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ دونوں باپ بیٹی انتہائی شریف، بھولے بھالے اور نیک طبیعت انسان ہیں لیکن بس جب ستارہ کا عکس ذہن میں آتا ہے تو ثمرہ سے بھی نفرت اور کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تجھ سے جو گناہ سرزد ہوا ہے تو اسے نہیں بھول پائے گا۔ ثمرہ کے روپ میں وہ گناہ ہر وقت تجھے منہ چڑھاتا رہے گا اس لیے بہتر ہے کہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرو۔''

میں گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا، اماں کے بہت اصرار و تکرار کے بعد میں نے چند نوالے زہر مار کیے تب جا کر ان کی ممتا کو قرار آیا۔

دوسری صبح میں حسب معمول ناشتا کر کے آفس چلا گیا۔ اماں سمجھیں بات آئی گئی ہوگئی اور میں سب کچھ بھول کر اپنی دنیا میں لوٹ آیا ہوں اس لیے وہ نہایت تندہی سے پھر لڑکی دیکھنے کے مشن پر نکل پڑیں اور پھر آناً فاناً دوڑ دھوپ کے بعد ایک قبول صورت لڑکی کا انتخاب کر کے منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتی تھیں لیکن میں نے اس وقت اس رشتے کو مسترد کردیا۔ اماں مبہوت مجھے تکتی رہیں پھر سکوت توڑتے ہوئے بولیں۔ ''کہیں نہ کہیں تو تمہیں شادی کرنی ہی ہے تو یہ لڑکی کیا بری ہے۔''

میں اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ اماں مستفسرانہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر اپنا سوال دہرایا، اس بار ان کے لہجے میں غصہ اور جھنجھلاہٹ تھی۔ میں نے خاموشی کی دبیز تہہ کو توڑتے ہوئے ہولے سے جواب دیا۔ ''اماں ثمرہ میری زندگی میں تازہ ہوا کے اس لطیف اور خوشگوار جھونکے کی طرح تھی جس کی لہروں

میں، میں ہمیشہ کے لیے الجھ کر رہ گیا ہوں۔ اس کی سادگی اور معصومیت نے میرے دل میں گھر کرلیا ہے اس لیے کسی اور کے لیے اس گھر میں جگہ ہی نہیں ہے۔''

اماں سر جھکائے افسردہ بیٹھی رہیں پھر ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔ ''تم اگر طبعاً مغلوب الغضب، جلد باز اور خود پسند نہ ہوتے ناں تو میں تمہیں یہ مشورہ دیتی کہ رب کریم کا دریائے درگزر بے حد وسیع و عریض ہے۔ وہ ستار اور غفار ہے۔ تم اگر ثمرہ سے شادی کر کے اسے ہمیشہ خوش و خرم رکھو گے۔ اس کی ماں کی بے حیائی کا کبھی اسے طعنہ نہیں دو گے۔ اس کی غلطیوں پر چشم پوشی اور درگزری سے کام لو گے تو وہ غفور الرحیم یقیناً تمہارے خون آلود ہاتھوں کو اپنے رحمت کے پانی سے دھو کر تمہیں پاک و صاف کردے گا۔ جب تمہارا ذہنی خلفشار یا احساسِ گناہ ختم ہوگا، تب ہی تم ثمرہ کے ساتھ ایک مکمل زندگی گزار سکتے ہو لیکن کل میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارے مزاج کو اچھی طرح جانتی ہوں تم میں اور تمہارے باپ میں صبر اور تحمل کا فقدان رہا ہے۔ بلا سوچے سمجھے تم ذہن کو لپیٹ لیتے ہو اور ہیجانی کیفیت میں نتائج کی پروا کیے بنا ایسے کام کر گزرتے ہو جس کا عام انسان تصور بھی نہیں کرسکتا اس لیے مجھے یقین ہے تم کبھی نہ کبھی ثمرہ کو ضرور اپنے غضب کا نشانہ بناؤ گے۔ ستارہ کو ہلاک کرنے کے بعد بھی اس کی طرف سے تمہارا دل میلا ہے۔ جب جب ثمرہ تمہارے سامنے آئے گی تمہیں ستارہ ضرور یاد آئے گی پھر اس صورت میں اس سے شادی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔''

اماں کا ناصحانہ انداز بیان نے مجھے بہت متاثر کیا، میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے پُریقین اور استقامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اماں میں اپنی ہر قبیح عادت ہمیشہ کے لیے ترک کردوں گا۔ میری اپنی زندگی میں اسے کانٹا بھی نہیں چبھنے دوں گا۔ اس سے اس کی ماں کی بابت کبھی کوئی سوال نہیں کروں گا۔ آپ مطمئن رہیے۔ میں ثمرہ کو زندگی کا ہر سکھ ہر خوشی دوں گا۔ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

اماں کا ستا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ انہوں نے فوراً میری بلائیں لے کر پیشانی چوم لی اور دل کی گہرائیوں سے دعا دیتے ہوئے بولیں۔ ''شاد رہو آباد رہو۔''

خوشی میں سرشار میں نے فوری دونوں بہنوں کو خوش خبری سنائی۔ ثمرہ کے حصول کے جو خواب میں نے دیکھے تھے وہ سارے حقیقت بن کر میرے گھر کے آنگن میں اتر آئے۔

ثمرہ کے ساتھ میرا ایک ایک لمحہ خوشی اور مسرت سے سرشار تھا لیکن میرے اطوار میں چنداں فرق نہیں آیا۔ میں نے اسے پُرتعیش زندگی ضروری آرام و آسائش کی ہر چیز فراہم کی لیکن دل و دماغ میں یہ سانپ ہمیشہ سرسراتا رہا کہ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ یہ بھی اپنی ماں کی طرح غیر مردوں پر اپنی رال ٹپکاتی ہوگی۔

زیادہ تر میں ثمرہ کو گھر کی چہار دیواری میں ہی مقید رکھتا اگر شاذ و نادر باہر لے کر نکلتا بھی تو اپنی آنکھیں اس پر مرکوز رکھتا۔ وہ بھی آخر میری بیوی تھی۔ میری کاٹ دار نگاہوں کی چبھن کو اس نے فوراً محسوس کرلیا لیکن کبھی مجھ سے شکوہ شکایت نہیں کی بلکہ ہمیشہ اپنی پُرجوش محبت کا اظہار وارفتگی سرشاری سے مجھے اپنے حسن و شباب کا اسیر بنائے رکھا۔ اماں کی آنکھوں کا بھی وہ تارا بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی صورت سے زیادہ اس کی سیرت کی پرستار تھیں۔ ثمرہ اماں کا ہر کام نہایت محبت اور جانفشانی سے انجام دیتی۔ اماں کے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سنوارتی، ہر دوسرے تیسرے دن ان کی ڈریسنگ چینج کرواتی۔ ان کی بیڈ شیٹ بھی وقفے وقفے سے تبدیل کرتی رہتی۔ اماں ہمیشہ ہاتھ پھیلا کر اسے دعائیں دیتیں اور کہتیں میری بیٹیوں نے بھی کبھی میری اتنی خدمت نہیں کی جو میری بہو کرتی ہے۔ لوگ میری اور اماں کی قسمت پر رشک کرتے، تمہیں بھی وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی۔

حرمت نے مثبت انداز میں سر ہلا کر ہنکاری بھری اور مغموم لہجے میں بولی۔ ''ہم دونوں کے درمیان نند بھاوج والا رشتہ تو تھا ہی نہیں، وہ تو مجھ سے اتنا پیار کرتی تھیں کہ انجان اور اجنبی لوگ ہمیں سگی بہنیں سمجھتے تھے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم وہ سب کے لیے سراپا مہر و محبت تھی لیکن آخر تھی تو اس بدقماش، آوارہ اور بدکردار ماں کی بیٹی۔''

حرمت نے کھلی آنکھوں سے بھائی کو بغور دیکھا۔ اس کے اپنے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات تھے۔ اس نے اکھڑ اور ترش لہجے میں استفسار کیا۔ ''ثمرہ بھابی نے ایسا کیا کیا کہ آپ کے ساتھ؟ وہ تو آپ سے اٹوٹ محبت کرتی تھیں اور جہاں تک میں سمجھتی ہوں آپ دونوں میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔''

گلریز نے انتہائی تلخ اور ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ ''سب دکھاوا ہی دکھاوا تھا۔ وہ ایک زہریلی ناگن تھی۔ بے وفا اور ہرجائی تھی۔''

حرمت کھوئی کھوئی سی سپاٹ نگاہوں سے بھائی کو تک رہی تھی جب کہ گلریز اپنی دھن میں بولے جارہا تھا۔ مشکل اور اضطراری کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ وہ تیز و تند انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''اس کی حرکات و سکنات سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک شوہر پرست اور باوفا بیوی نہیں ہے بلکہ اپنے حسن و شباب کے طلسم میں مجھے گرفتار کر رکھا ہے۔ کھانا پکانے میں بھی اسے مہارت حاصل تھی۔ تم، میں اور اماں ہی نہیں بلکہ میرے دوست احباب بھی اس کے ہاتھ سے بنے کھانے شوق و رغبت سے شکم سیر ہو کر کھاتے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے چند دوستوں کو گھر پر کھانے پر مدعو کیا۔ اس روز ثمرہ بضد تھی کہ آج کی دعوت ہم گھر پر نہیں بلکہ کسی بہترین ہوٹل میں رکھتے ہیں جب کہ میں مسلسل انکار کر رہا تھا۔ وہ خشونت سے بولی۔ ''ایک ہی طرح کے اور ایک ہی ہاتھ کے کھانے کھاتے کھاتے آپ اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتے۔ ایک ہی چیز استعمال کرتے کرتے انسان اوب جاتا ہے۔ انسان کے لیے تبدیلی بہت ضروری ہے۔''

کوئی اور اس کی بات سنتا تو شاید اتنا اثر نہ لیتا لیکن مجھے اس کا لہجہ بڑا معنی خیز اور پُراسرار لگا۔ پہلے پہل تو میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن اس کے کہے ہوئے جملے تشہیر بن کر دل و دماغ میں چبھ رہے تھے۔ میں چاہتا تو اسے طلاق بھی دے سکتا تھا لیکن میں جذباتی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا کیونکہ اس وقت زارا بہت چھوٹی تھی اس لیے میں چاہتا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں چاہتا تھا کہ زارا کچھ سمجھ دار اور باشعور ہو جائے تب میں ثمرہ کا قصہ تمام کردوں گا اس لیے میں صبر و ضبط اور احتیاط سے کام لے رہا تھا لیکن ایک دن میرا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ کالج میں تمہارا پہلا سال تھا اور ان ہی دنوں تمہارے لیے اصغر کا رشتہ آیا تھا۔ اماں بضد تھیں کہ ان کی زندگی میں ہی یہ کار خیر انجام پا جائے تو بہتر ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ دن تمہاری منگنی کا دن تھا۔ گھر میں سارے کام بکھرے پڑے تھے لیکن وہ گھبرائی گھبرائی سی باہر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ چہرے سے پریشانی ہویدا تھی، میں چوکنا ہوگیا۔ میری آنکھیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ہلکے گرے کلر کی ساڑی میں ملبوس کمرے سے نمودار ہوئی۔ سرو قد باوقار بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مجھے اس پر والہانہ پیار امنڈ کر آیا لیکن اس کی چال [illegible]

گئی۔ وہ انتہائی آہستگی سے دروازہ کھول کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی چھپتی چھپاتی باہر نکل رہی تھی معاً زارا کھیلتی کودتی اس کے سامنے آگئی اور اس کی ساڑی کا آنچل پکڑ کر بولی۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

لیکن اس نے بہت خوب صورتی سے اسے ٹالا اور بولی۔ ''پھپھو کو ان کی سہیلیاں مہندی لگا رہی ہیں۔ تم بھی ان سے کہہ کر اپنے ہاتھوں میں مہندی لگواؤ۔ میں پھولوں کے گہنے خریدنے جارہی ہوں، بس یوں گئی اور یوں آئی۔'' زارا بچی تھی بہل گئی اور وہ دوڑتی ہوئی تمہارے کمرے میں چلی گئی۔ جب کہ میں نے اس سنہری ناگن کا تعاقب شروع کردیا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔ اس وقت میں نے بھی کار کا استعمال نہیں کیا بلکہ رکشے کو ترجیح دی۔ رکشے والے کے ہاتھ میں بیٹھنے سے پہلے کئی نوٹ تھما چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے سیاہ اور موٹے موٹے ہونٹوں پر تیرنے لگی۔ وہ بڑی مہارت سے اس ٹیکسی کا پیچھا کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ٹیکسی کی رفتار دھیمی ہونا شروع ہوئی اور ایک جگہ ٹھہر گئی۔ وہ ایک متروک اور اجاڑ پارک تھا۔ ٹوٹی پھوٹی روشیں، ٹنڈ منڈ خزاں رسیدہ درخت، جا بہ جا سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ پارک کے آس پاس کوئی گنجان آبادی نہیں تھی۔ ہاں البتہ اطراف میں زیر تعمیر مکانات نظر آرہے تھے۔ مزدور کام کر رہے تھے اور اینٹ، سیمنٹ اور ریت کے تودے نظر آرہے تھے۔

ثمرہ نے ٹیکسی سے اتر کر اپنا پرس کھولا اور ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کے عقب میں ایک پیڑ کے پیچھے میں کھڑا ہوں اور اس کی ہر ہر حرکت کو نوٹ کر رہا ہوں۔

پارک کے سالخوردہ گیٹ کو عبور کر کے وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ایک خستہ شکستہ خوردگی بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ متلاشی نظروں سے وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ چہرے سے اضطراب مترشح تھا۔ پرس سے ٹشو نکال کر بار بار اپنا پسینا پونچھتی، کبھی اپنے ہونٹ کاٹتی اور کبھی اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگتی۔

میں دور کھڑا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ یقیناً کسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت ثمرہ کے لیے میرے دل میں نفرت ہی نفرت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا یہ ثمرہ نہیں بلکہ ستارہ کھڑی ہے۔ ماضی کا وہ مکروہ جذبہ پھر

PakiBooks.Site

مجھ پر عود کر آیا تھا۔ میری حساسیت میں جنون اور خون جوش مار رہا تھے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ ہاتھوں کی خارش کہہ رہی تھی جا کر اس بے حیا عورت کا گلا دبا دوں لیکن مجھے تم تین بہنوں کے علاوہ اپنی بوڑھی بیوہ ماں کا خیال آیا۔ اس کے بعد اپنی اکلوتی اور ننھی سی بیٹی کا خیال آیا۔ میں نے اپنے اندر بھڑکنے والے شعلوں پر صبر و تحمل کا چھڑکاؤ کیا اور درختوں کی آڑ لے کر چھپتا چھپاتا اس بینچ کی جانب کھسکنے لگا لیکن اچانک مجھے اپنے قدموں کو بریک لگانا پڑ گیا۔ ایک اسمارٹ اور خوبرو نوجوان جو یقیناً اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ثمرہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے دونوں کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دیکھی نوجوان بینچ کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ ثمرہ سمٹی سمٹائی سی ایک کنارے پر کھسک گئی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، شومئی قسمت کہ میں ان دونوں سے کافی فاصلے پر تھا اس لیے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن نہیں سکتا تھا لیکن ثمرہ بار بار اس نوجوان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ملتجیانہ انداز میں کچھ کہہ رہی تھی جب کہ نوجوان انتہائی مشتعل انداز میں ہاتھ ہلا کر اپنا موقف بیان کر رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کیا گیم چل رہا تھا میں فوراً سمجھ گیا۔ یقیناً یہ نوجوان ثمرہ کا پرانا عاشق ہے جو اسے اس کے وعدے یاد دلا رہا ہے اور ثمرہ اسے طفلِ تسلی دے کر سمجھا بجھا رہی ہے۔ یہ سارا منظر میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ دل چاہا دونوں کو خون میں نہلا دوں لیکن پھر میری بہن مجھے تمہارا خیال آیا کہ آج ہمارے گھر میں تمہاری منگنی کی تقریب ہے۔ اگر آج میں طیش میں کچھ کر بیٹھا تو تم بھی زندگی بھر کنواری اس دہلیز پر بیٹھی رہتی اور زارا بھی۔ ایک قاتل کی بہن اور بیٹی سے کون شادی کرتا۔ میں نے بمشکل جبر کر کے اپنے آپ کو روکا۔ اس نوجوان اور ثمرہ میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں لیکن میری سماعت ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے محروم رہی۔ اس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نوجوان کے خاموش ہوتے ہی ثمرہ دھواں دھار انداز میں بول رہی تھی۔ اس کے بولنے کا ردِعمل یہ ہوا کہ نوجوان کے چہرے کی تندی اور غصہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔

اب وہ کوئی ہارا ہوا کھلاڑی لگ رہا تھا۔ یکلخت وہ اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور جدھر سے آیا تھا اسی جانب واپس ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی ثمرہ کے چہرے پر طمانیت اور سکون کے آثار نظر آئے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پشت پر اپنا سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ میرے لیے وہاں سے بھاگنے کا وہی مناسب وقت تھا۔

ہم دونوں ایک مختصر سے وقفے کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ منگنی کی رسم تھی اس لیے سارا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا مہمانوں سے گھر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ثمرہ بنی سنوری، چہرے پر معصومیت کی ست رنگی دھنک، غنچۂ بہار بنی مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ شرمندگی پشیمانی یا خجالت کا عکس بھی اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہ ساری محفل میں تتلی بن کر اڑتی اڑتی پھر رہی تھی۔ ہرجائی اور بدچلن عورت صبح ایک غیر مرد سے ملاقات کر کے آئی تھی لیکن اس وقت سب کے سامنے مجھ سے ایسی والہانہ محبت کا اظہار کر رہی تھی جیسے اس سے زیادہ پارسا اور شوہر پرست عورت کوئی اور ہے ہی نہیں۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اپنے آپ کو انتہائی مجبور، بے بس اور بے غیرت محسوس کر رہا تھا۔ بادلِ نخواستہ ہر کام انجام دیتا رہا۔

رات گئے تقریب اختتام پذیر ہوئی اور جب میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو وہ تھکن سے چور اپنے بستر پر بے سدھ پڑی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اس کا ملکوتی حسن نیند میں بھی غضب ڈھا رہا تھا۔ بے ساختہ میرے دونوں ہاتھ اس کی مرمریں گردن کی طرف بڑھے تاکہ میں اس فتنے کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں لیکن اسی وقت قریب سوئی ہوئی زارا ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ کچی نیند کی جاگی ہوئی تھی، آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اس نے ہائی پچ میں رونے کے لیے اسٹارٹ لیا۔ میں نے فوراً تکیہ کھینچ کر سرہانے لیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر یوں لیٹ گیا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔

زارا کی آواز پر ثمرہ کسمسائی، نیم وا آنکھوں سے زارا کو دیکھا۔ اس کی پشت تھپتھپائی، زارا نے اپنی بانہیں پھیلائیں اور ماں سے لپٹ کر پھر سو گئی۔ دونوں ہم آغوش تھیں۔ میں بھی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔ حلق خشک ہو رہا تھا اٹھ کر جگ میں سے پانی انڈیل کر گلاس بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ دل و دماغ سے سنسنی کی کیفیت کافی حد تک کم ہو گئی لیکن سوچوں کا مرکز صرف ثمرہ تھی۔ میں زخم خوردہ ناگ بنا اسے ڈسنے کے لیے تیار تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کام کس طرح، کب اور کہاں کیا جائے۔

سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی اور میں گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد میں اس پر گہری نظر رکھنے

لگا۔ اسے اپنا والد... ملنا ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور واپس اپنے ساتھ ہی لے کر آتا۔ میرے اس فعل پر اس نے کبھی احتجاج نہیں کیا لیکن اماں کو یہ سختی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اس لیے انہوں نے ثمرہ کی حمایت میں آواز بلند کی۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے تشکیک کی آمیزش تھی۔

ایک دن تنہائی میں اماں نے کاٹ دار لہجے میں مجھ سے استفسار کیا کہ یہ کس قسم کا رویّہ بیوی کے ساتھ برت رہے ہو۔ وہ بوڑھے اور بیمار باپ کی عیادت کے لیے بھی نہیں جا سکتی۔ ستارہ کے کیے کی سزا تم اس غریب کو تو نہ دو۔ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ پُریقین لہجے میں پھر بولیں۔ ”مجھے لگتا ہے میرے بدترین اندیشے اب حقیقت کا روپ دھارنے لگے ہیں۔ میں تمہاری ماں ہوں اس لیے تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم اپنی انتقامی خصلت سے مغلوب ہو کر یقیناً اس کی جان لیے بغیر نہیں چھوڑو گے لیکن یاد رکھو میں اس کے سر پر چھتری کی چھاؤں کی طرح کھڑی ہوں۔ تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“

”اپنی ماں کی زبانی بدگمانی کی یہ بات سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ میں نے الفاظ ضائع کیے بغیر بلا کسی تمہید کے اماں کے سامنے حقیقت کا پردہ چاک کر کے ثمرہ کے کالے کرتوت کا راز فاش کر دیا لیکن اماں کسی طور یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ آخر تک اس بات پر اڑی رہیں کہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں اور بیوی کو پریشان کر کے اپنے جذبۂ انتقام کو تسکین دے رہا ہوں۔“

میں نے قطعیت کے ساتھ پُریقین لہجے میں جواباً کہا۔ ”اماں میں اپنی آنکھوں سے اس عورت کی بدچلنی اور بے حیائی دیکھ رہا ہوں اور آپ مجھے ہی جھٹلا رہی ہیں۔“

اماں کے ماتھے پر شکنیں مزید گہری ہو گئیں اور وہ زہر خند لہجے میں بولیں۔ ”کبھی کبھی آنکھوں سے دیکھا بھی جھوٹ ہو جاتا ہے۔ تم بات دل میں رکھ کر اپنے آپ سے الجھ رہے ہو۔ اسی وجہ سے تم نے اپنی بھی زندگی اجیرن کر رکھی ہے اور اسے بھی سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ اگر زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی تو تمہاری اپنی اولاد پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔“ ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکیں۔ ایک سرد آہ بھری۔ پھر بڑی اپنائیت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ”گل میرے بچے عقل کے ناخن لے۔ مالک نے تجھے ہر نعمت سے نوازا ہے۔ کیوں ایک معصوم کا صبر سمیٹ رہا ہے۔“

اماں کی نصیحت آمیز باتیں سن کر میری محبتِ گم گشتہ پھر در دل پر دستک دینے لگی لیکن دستک کی آواز انتہائی نحیف و نزار تھی چند لمحوں بعد ستارہ، پاپا، ثمرہ اور وہ اجنبی نوجوان چاروں میرے حواسوں پر چھا گئے۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھا اور دل گرفتہ آواز میں اماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اماں آپ کو کیا پتا میں کس اذیت اور کرب سے گزر رہا ہوں۔ میری زندگی میں جو ویرانی خلاء اور سناٹا ہے یہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کی تو میرے پاس یادیں ہی ہیں۔ کاش میں ثمرہ سے شادی کرنے کی حماقت نہ کرتا۔ بہرحال اب مجھے تنہا ہی اس جہنم کو پار کرنا ہے۔ میری زندگی میں ثمرہ نام کی کسی عورت کا وجود نہیں ہو گا۔ اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت مجھے تن تنہا انجام دینا ہے ورنہ کل کلاں کو وہ بھی نانی اور ماں کے نقشِ قدم پر چل کر میرے خاندان کی عزت کو تہس نہس کر دے گی۔“ یہ کہتے ہوئے میں کمرے سے نکل گیا۔

میری بات سن کر اماں کی بوڑھی آنکھوں میں بلا کا درد اتر آیا۔ اب ان کی آنکھوں کی نمی ان کے گالوں کو تر کر رہی تھی۔ اس کے بعد ان کے دل میں میرے لیے ایک انجانا خوف سا گیا کہ کہیں میں ثمرہ کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤں۔ ان کا اندیشہ اور خوف بے بنیاد بھی نہیں تھا کیونکہ میں ثمرہ کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا اور میری اپنی ماں میرا چہرہ اور آنکھیں پڑھ چکی تھی۔ جب تک اماں زندہ رہیں، مجھے اپنا داؤ کھیلنے کا موقع نہیں ملا لیکن جیسے ہی اماں نے اس دنیا سے کوچ کیا، میرے لیے آزادی ہی آزادی تھی۔

چند دن نہایت صبر و ضبط، اذیت، خاموشی اور تحمل کے ساتھ ثمرہ کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا لیکن رگوں میں خون آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ دماغ نت نئے منصوبے بناتا اور توڑتا رہا اور پھر بہت جلد اپنے ایک منصوبے پر عمل کر کے اسے عملی جامہ پہنا دیا۔

ثمرہ کو کار ڈرائیو کرنے کا بہت شوق تھا اور وہ ڈرائیونگ سیکھنا چاہتی تھی۔ پہلے پہل تو میں اس کی بات ہنسی میں اڑا دیتا تھا لیکن اب میں نے اس پر یہ ظاہر کیا کہ مجھے اس سے شدید محبت ہے۔ اس نے بھی میری محبت کا جواب انتہائی گرم جوشی سے دیا۔ منصوبہ بندی کے پہلے مرحلے میں اسے ایک ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ بہت قلیل عرصے میں اس نے ڈرائیونگ سیکھ لی جوں ہی اس نے

PakiBooks.Site

اسکول سے ڈرائیونگ سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ میں نے فوراً پہاڑی علاقوں کی سیر کا پروگرام بنا ڈالا۔ وہ نہیں نہیں کرتی رہی لیکن میں نے اپنی بانہوں کے حصار میں اسے سمیٹ کر شہد بھرے لہجے میں کہا۔ ''میری جان ایک عرصہ بیت گیا ہم دونوں کہیں گھومنے پھرنے ساتھ گئے نہیں۔ ایسا کرتے ہیں صرف تم اور میں چلیں گے۔ زارا کو حرمت کے پاس چھوڑ جائیں گے کیونکہ اس کے امتحانات ہونے والے ہیں۔''

معمولی سی رد و کد کے بعد وہ فوراً راضی ہوگئی اور ہم دونوں اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق گھر سے نکل پڑے۔ ہم دونوں کا قیام ہوٹل میں تھا، سیر و تفریح کے لیے رینٹ اے کار بک کروالی تھی۔ پہاڑی راستوں پر وہ مجھے ڈرائیونگ کرتے دیکھتی تو مجھ سے وقتاً فوقتاً استفسار کرتی۔ ''کل کیا ان ٹیڑھے میڑھے اونچے نیچے پتھریلے راستوں پر میں بھی کار ڈرائیو کرسکتی ہوں۔''

اس کا سوال سن کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے اپنا پلان کامیابی سے ہم کنار ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میں نے اسے ایک باصلاحیت اور ذہین خاتون قرار دیا۔ اپنی لچھے دار باتوں سے اس کے اندر کا خوف نکال پھینکا۔ میری زبان سے اپنی تعریفیں سن کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ خوشی اور حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس لمحے مجھے ثمرہ سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی لیکن میں نے اپنے تمام احساسات اور جذبات کو سرد خانے میں دبا کر اسے موٹی ویٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈر اور خوف اپنے دل سے نکال کر کل سے کچھ دیر کے لیے گاڑی لے کر نکل جایا کرو لیکن اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آجایا کرو کیونکہ یہ راستے ابھی تمہارے لیے اجنبی اور انجانے ہیں۔ محض تمہارے شوق اور صلاحیت کو دیکھتے ہوئے تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔''

ثمرہ نے میرے مشورے کو خلوص دل سے تسلیم کیا۔ ''جب بھی وہ ہوٹل سے گاڑی لے کر نکلتی میں اسے یہ نصیحت ضرور کرتا کہ فی الفور طویل اور غیر مربوط، بے ترتیب راستوں پر جانے کی کوشش نہ کرنا، جب ذرا ہاتھ جم جائے اور دل کھل جائے تب بھلے ہی اپنی مہارت دکھانا۔'' ثمرہ میری نصیحت سن کر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

وہ جب بھی کار لے کر لوٹتی تو اپنی کارکردگی مجھے سناتی لیکن میری دماغی کیفیت مالیخولیا کے کسی مریض کی طرح ہو جاتی۔ جو کسی سے آنکھ نہیں ملاتا ہے۔ میں بے خبر اور لاتعلق بنا اس کی باتوں پر ہوں ہاں کرتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ بری طرح جھنجلا بھی جاتی۔

ایک صبح وہ بڑی ہشاش بشاش تروتازہ موڈ میں گاڑی لے کر نکلنے لگی تو میں نے خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ ''پتا نہیں مجھے اپنے مقصد میں کب کامیابی ہوگی۔'' میری بڑبڑاہٹ ثمرہ کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور سوال کیا۔ ''مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو۔''

میں نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے جواباً کہا۔ ''محترمہ اب کافی پریکٹس کرلی۔ اب ذرا کسی آڑے ترچھے راستے پر قدم رنجہ فرمائیں تو ہم مان جائیں گے کہ آپ واقعی ایک قابل اور ماہر ڈرائیور ہیں۔''

''وائے ناٹ۔'' ثمرہ نے ہاتھ ہلا کر کہا اور کار فراٹے بھرتی ہوئی میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور پھر اس روز وہ ایک مخدوش اور خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی سمیت گہرے کھڈ میں جا گری۔ اس کی موت کی خبر سن کر میں نے چیخنا چلانا اور رونا شروع کردیا جب کہ دل ایک خوشگوار مسرت سے دھڑک رہا تھا۔ حیران پریشان رنج و الم کا پتلا بنا پولیس کے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ ہوٹل کا عملہ بھی میرے غم میں برابر کا شریک تھا۔ سب اظہار افسوس کرتے رہے۔ جب سب سے گلو خلاصی حاصل ہوئی تب میں نے گھر کی راہ لی۔ میری انتقامی کارروائی پوری ہوچکی تھی۔ جس نے میری محبت اور اندھے اعتماد کا خون کیا تھا۔ میں نے بھی اسے موت کی نیند سلا کر سکون کا سانس لیا تھا۔ پہلے اپنی ماں اور اپنے خاندان کے لیے اس کی ماں کا خون کیا اور پھر اپنے سکھ اور چین کی خاطر اس کو موت کی وادی میں سلا آیا۔

☆......☆

گلریز کی زبان سے یہ سنسنی خیز انکشاف سن کر حرمت کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو اس کے سارے وجود میں چنگاریاں سی سلگنے لگیں۔ وہ منجمد نگاہوں سے گلریز کو دیکھتی رہی بالکل ساکت کسی سنگی مجسمے کی طرح چند لمحے توقف کے بعد تھرتھراتی آواز میں اپنے آنسو پیتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی۔ ''بھائی جان مجھ میں کچھ کہنے کا یارا ہے اور نہ ہمت لیکن حقیقت آپ کو بتانی پڑے گی۔ ثمرہ بھابی کو ہلاک کرکے آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر آپ نے اپنی بیٹی کے سر سے ماں کا سایہ چھین لیا اور اپنی ہنستی کھیلتی زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں سے آگ لگادی۔''

اب وہ باقاعدہ سسکیوں کے ساتھ زار و قطار رو رہی تھی اور ساتھ ہی لڑکھڑاتی آواز میں کچھ کہہ بھی رہی تھی لیکن گلریز کے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا کیونکہ شدت گریہ کی وجہ سے اس کے گلے میں پھندا لگ جاتا اور اسے کھانسی کا دورہ اٹھ جاتا۔ گلریز نے اپنا کپکپاتا ہاتھ حرمت کے سر پر پھیرا اور مدھم آواز میں سرگوشی کی۔ ''اگر مجھے علم ہوتا کہ تم رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ کرلو گی اور اس سنگین اور تلخ حقیقت کو برداشت نہیں کرسکو گی تو میں کبھی اس داستان کو سنانے کی غلطی نہیں کرتا لیکن یقین کرو اپنا اعترافی بیان تمہیں سنا کر اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ برسوں سے ایک گراں بوجھ دل پر رکھا ہوا تھا۔ آج یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اپنے ہاتھوں میں نے اس بوجھ کو اتار پھینکا ہے۔''

گلریز کی بات سن کر حرمت نے بہ عجلت قریب رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کردیا پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ مضطرب اور رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''اب کچھ حقائق پر سے میں بھی پردہ ہٹانا چاہتی ہوں۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ آپ کا صبر، تحمل اور قوت برداشت کہاں تک آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس ساری کہانی میں آپ کا مرکزی کردار تھا۔ آپ بڑی آسانی سے سب کو مات دیتے رہے لیکن افسوس صد افسوس کہ قدرت نے آپ کو شہ مات دے دی اور آپ کو پتا بھی نہیں چلا۔ آپ نے بغیر کسی تحقیق کے ثمرہ بھابی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ بالکل معصوم اور بے گناہ تھی۔''

حرمت کے اس جملے پر گلریز اچھل پڑا اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ مردہ آواز میں بولا۔ ''اس کی معصومیت اور بے گناہی کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس۔''

حرمت نے چند لمحوں کے لیے اپنے ہونٹ سی لیے اور بالکل خاموش ہوگئی۔ کمرے میں اعصاب شکن سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گلریز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی اپنی سگی بہن ثمرہ کی حمایت میں کیوں بول رہی ہے۔ وہ بے یقینی سے بہن کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس گھٹن بھرے ماحول میں وہ اگلی سانس بھی نہیں لے پائے گا۔ اس نے اشارے سے حرمت کو کھڑکی کھولنے کے لیے کہا۔ حرمت نے فوراً کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سرد ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی اس نے جھرجھری لے کر شال کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لیا اور لرزیدہ قدموں سے واپس آکر گلریز کی پائنتی میں بیٹھ گئی۔ دکھ اور اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ حرمت نے ٹھنڈی آہ بھری اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''بھائی میری منگنی والے دن بھابی کے ہمراہ آپ نے جس شخص کو دیکھا تھا وہ کیسا تھا میرا مطلب اس کا حلیہ کیسا تھا۔ کچھ یاد ہے آپ کو۔''

گلریز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل بالکل بھلا اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں جس نے میری ہنستی کھیلتی زندگی میں آگ لگائی۔ چہرے مہرے لباس اور چال ڈھال سے ہی وہ اعلیٰ سوسائٹی کا پروردہ لگتا تھا۔ عمر میں بھی ثمرہ کے برابر ہی ہوگا۔''

حرمت اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے بولی۔ ''اف میرے خدا یہ سب کیا ہوگیا۔ بھائی جان آپ نے ناسمجھی اور عجلت پسندی میں اپنے شاد و آباد گھر کو خود ہی جلا کر راکھ کردیا۔''

گلریز نے تیوری پر بل لاتے ہوئے حیرت سے استفسار کیا۔ ''مجھے واضح الفاظ میں تفصیل سے بتاؤ میں تمہاری بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔''

حرمت آنکھیں پھاڑے منہ کھولے حیران پریشان نگاہوں سے بھائی کو تک رہی تھی۔ بھرائی ہوئی اشکبار آواز میں آہستہ سے بولی۔ ''اف میرے خدا بھائی جان آپ یہ کیا کر بیٹھے۔'' انداز خود کلامی والا تھا۔ گلریز اس کی حالت سے متاثر ہوئے بغیر منتظر تھا کہ حرمت فوری وضاحت کرے کہ اصل حقیقت کیا تھا۔ حرمت ہنوز خاموش تھی۔ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے ڈبڈبائی نگاہوں سے بھائی کو دیکھتی رہی پھر باقاعدہ ہچکیوں اور سسکیوں کا آغاز ہوگیا۔ وہ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی۔ ''ثمرہ بھابی مجھے اور میرے بھائی کو معاف کردو۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔''

ایسا لگ رہا تھا جیسے ریکارڈ پر سوئی اٹک گئی ہو۔ گلریز نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور اپنا سوال دہرایا۔ حرمت نے مضطربانہ انداز میں اپنے ہاتھ ملتے ہوئے شعلہ بار آنکھوں سے بھائی کی جانب دیکھا اور نتھنے پھلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ وضاحت طلب کر رہے ہیں ناں تو پھر سنیے اس لڑکے سے واقفیت اور شناسائی بھابی کی نہیں بلکہ میری تھی۔ اس لڑکے کا نام منیب تھا۔ میں اسے مانی کہا کرتی تھی۔ میری ایک سہیلی کا کزن تھا۔ سہیلی کے گھر ہی ہم دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم گاہے بگاہے ملتے رہے اور ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے

PakiBooks.Site

شادی کرنا چاہتے تھے لیکن اسی اثناء میں آپ اور اماں میرا رشتہ اصغر سے طے کر چکے تھے۔ بھابی میری راز دار تھی۔ انہوں نے بہت چاہا کہ آپ کے علم میں ساری بات لا کر اصغر کا رشتہ مسترد کر دیا جائے تا کہ مانی کے لیے راستہ صاف ہو جائے لیکن آپ کی خودسر اور خود پسند طبیعت سے میں بہت خائف تھی۔'' اپنی شہادت کی انگلی گلریز کے سامنے لہراتے ہوئے وہ تلخ لہجے میں بولی۔'' آپ بظاہر جتنے نرم خو، ذہین، تعلیم یافتہ، شائستہ مزاج اور مدبرانہ ذہنیت کے مالک ہیں۔ بباطن انتہائی شورہ پشت اور ذرا ذرا سی بات پر بھڑ کنے والے انسان ہیں۔ بغیر کسی سے مشورہ طلب کیے خود ہی فیصلے کرتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے عمل بھی کر ڈالتے ہیں۔ یہی آپ کی سب سے بڑی کمزوری اور خامی ہے۔ اماں آپ کی اسی غیر صحت مندانہ ذہنیت سے گھبراتی تھیں۔ ہائے بھائی آپ نے کچھ نہ کیا۔ کاش آپ بہت پہلے مجھ سے اس معاملے کو شیئر کرتے تو میں سارا راز آشکارا کر دیتی۔ اس روز بھابی میرے اصرار پر ہی مانی سے ملنے گئی تھیں تا کہ اسے حقیقت حال سے باخبر کر دے۔ منگنی کی خبر سن کر اس نے ہمیشہ کے لیے مجھ سے رابطہ منقطع کر لیا اور یہی میں چاہتی تھی۔ میں نے آپ کے اور اماں کے فیصلے پر سر جھکا دیا اور بھائی میں ایک وضاحت اور کر دوں۔ ثمرہ بھابی شاہنواز انکل اور ستارہ کی اولاد نہیں تھی۔ یہ دونوں تو لاولد تھے۔ ثمرہ بھابی کی پیدائش کے بعد ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے والد شاہنواز انکل کے دوست تھے اور وہ روزگار کے سلسلے میں باہر جانے والے تھے۔ ان کا ویزا لگ چکا تھا۔ اس وقت یہ ننھی سی شیر خوار بچی ان کے لیے بہت بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے دوست شاہنواز سے اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے استدعا کی کہ چونکہ ان کے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے اس لیے وہ اگر اس بچی کو عارضی طور پر متبنیٰ کر لیں تو فی الحال ان کا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ان دنوں شاہنواز انکل کی والدہ بیٹے کو دوسری شادی کی ترغیب دے کر ان کا ذہن بنا رہی تھی۔ ستارہ نے اس بچی کو تائید ایزدی سمجھتے ہوئے فوراً اس بچی کو گود لے لیا۔ شومئی قسمت کہ ثمرہ بھابی کے والد کی زندگی نے وفا نہ کی اس لیے وہ اپنا وعدہ بھی وفا نہ کر سکے۔ یعنی اپنی بیٹی دوست سے واپس نہ لے سکے۔ دونوں میاں بیوی نے ثمرہ بھابی سے یہ بات ہمیشہ پوشیدہ رکھی۔ یہ راز مجھ پر بھی اس وقت افشا ہوا جب آپ نے بھابی پر بے شمار پابندیوں کے ساتھ ساتھ یہ حکم نامہ بھی جاری کر دیا تھا کہ وہ اپنے کمزور اور ضعیف باپ سے ملنے بھی نہیں جا سکتی ہیں۔ آپ کی یہ فرعونیت مجھے اور اماں کو ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ہم دونوں آپ کی آنکھوں میں دھول جھوک کر کسی نہ کسی طرح چھپتے چھپاتے بھابی کو ان سے ملانے کے لیے لے جاتے اور آپ کے دفتر سے آنے سے پہلے ہی لوٹ آتے۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا بلکہ شاہنواز انکل کے انتقال سے ایک دن پہلے میں اور بھابی گئے تو انہوں نے اپنی لکنت زدہ زبان اور تھرتھراتے ہونٹوں سے اصلیت سے پردہ ہٹایا تھا۔ بھابی زار و قطار ان کے سینے پر سر رکھے روتی رہیں اور انکل نے اٹک اٹک کر برسوں سے سینے میں چھپے راز کو آشکارا کر دیا۔ دوسرے ہی دن ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اسی افراتفری میں، میں یہ بات نہ آپ کو بتا سکی اور نہ ہی اماں کو اور اس کے بعد تو ثمرہ بھابی نے مجھ سے قسم لے لی کہ میں اس بات کو یوں ہی ڈھکی چھپی رہنے دوں۔ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ وہ اماں کی شفقت سے بھی نہ محروم ہو جائیں۔ آپ کے ناروا رویئے سے وہ ویسے ہی ادھ موئی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان یہ معاہدہ طے پا گیا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے رازوں کی حفاظت مرتے دم تک کریں گے۔ بھابی تو اس معاملے میں سرخرو رہیں لیکن میں...... میں...... اف میرے اللہ میں ہار گئی۔ میں اپنے وعدے کا پاس نہیں رکھ سکی۔ بھائی آپ کاش ہر معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کرتے۔ صبر و تحمل سے کام لیتے تو نتائج اتنے خوفناک نہیں نکلتے۔ مسلسل آنسوؤں کی برسات نے حرمت کا چہرہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ آنکھیں اور ناک لال بھبوکا ہو رہی تھیں۔ اب اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ دوپٹے کے آنچل سے اس نے اپنا چہرہ صاف کیا اور نظریں اٹھا کر بھائی کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ گلریز کا جسم اکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ روتی بلکتی حرمت بھائی کے جسم سے لپٹ گئی۔ اس کی آہ و بکا اور گریہ و زاری سن کر مضو بابا بھاگتا ہوا آیا اور قدم رکھتے ہی سارا معاملہ بھانپ گیا۔ اس نے اپنا کمزور اور ناتواں ہاتھ حرمت کے سر پر رکھا اور اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کو بند کر لیا۔ آنسو ڈھلک کر اس کی داڑھی میں جذب ہو گئے۔ حرمت دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے مسلسل روئے جا رہی تھی۔''

PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site